آجکل

اس شمارے میں لکھنے والے

خواجہ غلام السیدین
نیاز فتح پوری
علی سردار جعفری
سکندر علی وجد
راجندر سنگھ بیدی
اپیندر ناتھ اشک

دسمبر ۱۹۵۶ء

آٹھ آنے

معتبرہ ٹیپو سلطان

ہماری
کتابیں
مستقبل کی تعمیر
پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن
سماجی بہبود
آسان پنج سالہ پلان
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
ہمارا پلان
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ادارہ

محمد مجیب - جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور حیدرآباد
گوپی ناتھ امن دہلی
خواجہ احمد فاروقی دہلی
رحمان راہی سری نگر
یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

سالانہ چندہ:- { ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک) }
غیر ممالک سے:- تو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ - { ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک) }

جلد ۱۵ ---- نمبر ۵

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

دسمبر ۱۹۵۶ء

سرورق:- مجاہد آزادی ٹیپو سلطان کا مقبرہ - سرنگاپٹم

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

حصولِ آزادی کے بعد بڑے معزز مہمان ہندوستان تشریف لائے ہیں۔ شاہِ ایران، شاہ سعود الاوّل، مارشل بلگانن اور دوسرے ممالک کے اکابرین نے ہندوستان کی ترقی و توسیع کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا ہے۔ حال ہی میں حبشہ کے بیدار مغز شہنشاہ ہیل سیلاسی ہندوستان تشریف لائے ہیں۔ آپ نے بمبئی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ حبش میں رہنے والے ہندوستانیوں نے حبش کی کلچری، سماجی اور معاشی ترقی میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستانیوں نے ادیس ابابا میں گاندھی میموریل اسپتال بنا کر حبشہ کے لئے ہندوستان کی خیرسگالی کا بہت اچھا ثبوت دیا ہے۔

ہندوستانی انٹرنیشنل کلب کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے شہنشاہ حبشہ نے فرمایا کہ بنڈونگ کی تاریخی کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ کیونکہ اس نے دنیا کے سامنے یہ بات صاف ظاہر کر دی کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک، مساوات اور باہمی احترام کی بنیادوں پر تمام ممالک سے پُرامن تعلقات رکھنے پر متفق ہیں۔

کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے مسودۂ آئین کی وہ دفعہ منظور کر لی ہے جس کی رُو سے کشمیر کو بھارت کا ایک حصّہ مان لیا گیا ہے۔ گویا سابقہ فیصلوں پر یہ ایک اور مہرِ تصدیق ہے جو عوام کے نمائندوں نے ثبت کی ہے۔ مخالفین کے مختصر سے گروہ میں بھی انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ لوک مت فرنٹ کی نام نہاد جماعت سے عبدالغنی گونی صاحب نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ امید ہے کہ کچھ اور لوگ جن پر ابھی حقیقت اچھی طرح روشن نہیں جلد وہ راہ اختیار کریں گے جس سے کشمیر اور اس کے عوام کا بھلا ہو۔

ساہتیہ اکاڈمی نے ہمارے کرم فرما ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی علمی خدمات کا اعتراف کر کے ان کی کتاب "ہندوستانی قومیت کا مسئلہ" پر انہیں پانچ ہزار کا انعام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے علمی تبحّر اور استقلالِ مزاج کی وجہ سے ہمارے نہایت ہی قابلِ قدر ادیبوں میں سے ہیں۔ یہ انعام تو محض ایک رسمی سی بات ہے لیکن اس دور میں اتنا بھی غنیمت ہے۔

پنڈت نہرو نے ایک بار پھر ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اپنی پریس کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں اس بات کو دُہرایا ہے کہ اردو زبان کو دستورِ ہند میں جگہ دی گئی ہے اور وہ صحیح و قطعی طور پر ہندوستان کی زبان ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں یقین نہیں کرتا کہ ایک زبان کو ختم کر کے دوسری زبان شاداب ہو سکتی ہے۔ ہندی اور اُردو بنیادی طور پر ایک ہیں صرف رسمِ خط اور الفاظ میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اردو کا رسمِ خط تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح سے اُردو بیرونی دنیا سے تعلقات کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ انھیں وجوہ سے اردو تعلیم کی زیادہ ہمّت افزائی ہونا چاہیئے۔

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو ہندوستان کی ازسرِنو تشکیل کا کام جو مرحوم گیاشی سردار ولبھ بھائی پٹیل نے شروع کیا تھا، مکمل ہو گیا۔ یہ ایک ایسا عظیم الشّان کارنامہ ہے جس پر ہند کے عوام اور ان کے رہنما بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اب ہماری ملکی ترقی کا کام دوسرے پنچ سالہ پلان کے تحت اور بھی زیادہ خوش اسلوبی سے انجام پا سکے گا۔

اس وقت جب کہ اقصائے عالم میں تیسری جنگِ عظیم کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں بلکہ مغربی ایشیا میں طبلِ جنگ کی دھمک بھی سنائی دے رہی ہے، ہند جس مستقل مزاجی کے ساتھ، اپنی بیرونی پالیسی کے ذریعے امن و مصالحت کے لئے تگ و دو کر رہا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

سکندر علی وجد

غزل

غمِ دُنیا کا اثر مجھ پہ کہاں ہے اے دوست
دِل جواں ہے تو مری فکر جواں ہے اے دوست

یوں تو ہے ارضِ دکن گلشنِ شمشاد قداں
تو مگر خسروِ شمشاد قداں ہے اے دوست

میرے ہمراہ تجھے دیکھ لیا ہے جب سے
اک زمانہ مری جانب نگراں ہے اے دوست

گل کھلائے نئے تری مست اداؤں نے جہاں
اسی منزل میں مری عمر رواں ہے اے دوست

محملِ حُسن ترا دُور نہیں ہے، لیکن
بیخودی راہ میں اک سنگِ گراں ہے اے دوست

میری پُر سوز خموشی کو تغافل نہ سمجھ
عشق ہنگامۂ بے آہ و فغاں ہے اے دوست

کوئی نسبت نہیں دل بازی و جاں بازی میں
عاشقی شیوۂ خونیں جگراں ہے اے دوست

ہم تری یاد میں دنیا کو بھلا بیٹھے ہیں
کچھ تجھے بھی خبرِ بے خبراں ہے اے دوست

گلشنِ دہر کی رنگین بہاروں کی قسم
زندگی مشہدِ صاحب نظراں ہے اے دوست

وَجد نے بادۂ حافظ کی دکاں کھولی ہے
ہر غزل معجزۂ حسنِ بیاں ہے اے دوست

خوشامدِ اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک دروازے کسی انعام کی خاطر
جئے تو بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش باقی نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

یہ نظم اور وجد کی بعض دوسری نظمیں ان لوگوں کے لئے بھی ایک مسکت جواب کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اردو شاعری کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے یہ نظم وجد سے بارہا سنی ہے اور اس کی تازگی ہمیشہ باقی ہی نہیں رہی ہے بلکہ برابر بڑھتی گئی ہے۔ اور جب میں نے وجد کے وجد آفریں ترنم کے ساتھ اس نظم کو اجنتا کے غاروں میں بیٹھ کر سنا تو یہ محسوس کیا جیسے ساری تصویریں مسکرا رہی ہیں۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ وجد کی شیروانی دھوکا دیتی ہے۔ اجنتا کے سفر میں یہ شیروانی اتر چکی تھی اور وجد اورنگ آباد سے لے کر اجنتا تک سارے راستے ہماری ہی طرح کا ایک آوارہ شاعر معلوم ہوتا تھا جو لہک لہک کر اقبال کی فارسی غزلیں گا رہا تھا۔

وجد کی ایسی ہی ایک اور نظم ایلورا ہے۔ اور یہ نظم میں نے پہلی بار وجد کی زبان سے ایلورا کے غاروں میں سنی اور اس نظم کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ ہو بھی نہیں سکتی ؎

نئے خیال ہیں سنگیں آبگینوں میں
دلوں کا سوزِ نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے لوحِ ازل بت ہیں آستینوں میں
حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں

یہاں جو سیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

اس نظم میں بھی ہندوستانی فن کاروں کی اس لگن کا ذکر ہے جو اجنتا کی نظم [illegible] بدولت ہے۔

غنیمِ عزم تھے جانباز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے
نظر عقاب کی تیشے تھے برق پاروں کے

تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ؎

نگار خانۂ عالم کا عکس یہ وادی
ہزار حشر بداماں خموش آبادی
ہنروروں کو ملی عرضِ ہنر کی آزادی
یہاں نہیں ہے کوئی نقش نقشِ فریادی

غلامِ مرضیٔ حالاتِ حسن کا ۔ نہیں
کمالِ فکر کا شہکار اشتہار نہیں

سکونِ روح اس آغوشِ کوہسار میں ہے
یہ زندہ خواب کسی چشمِ انتظار میں ہے
زمامِ شام و سحر دل کے اختیار میں ہے
زمانہ محو یہاں جستجوئے یار میں ہے

نگاہ ڈھونڈھ رہی ہے نشاں نہیں ملتا
غبار سامنے ہے کارواں نہیں ملتا

وہ وجد جسے ہم نے پہلی نظر میں حضور نظام کا مصاحب سمجھا تھا دراصل اجنتا اور ایلورا کے مندروں کا پجاری ہے جو ان کی تقدیس اور حسن کے نغمے گا کر سکونِ روح اور نروان حاصل کرتا ہے اور اپنے سننے والوں کو بھی اس نروان میں شریک کرتا ہے۔

ایک خصوصیت جو مجھے وجد کی اس قسم کی نظموں میں نظر آتی ہے اس کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔ قدیم ہندوستان کے فنونِ لطیفہ کے ایک بہت بڑے نقاد اور عالم کمار سوامی نے کسی جگہ ایک بڑی اچھی بات یہ لکھی ہے کہ قدیم ہندوستان میں فن کار اور دستکار میں، محنت کش اور معمار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ دونوں [illegible] ایک ہی [illegible] میں رہتی تھیں۔ گزشتہ چند صدیوں میں سرمایہ داری اور تجارتی سماج نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جس کی وجہ سے محنت کش کو گھٹیا اور [illegible] سمجھا جاتا ہے اور فن کار کو [illegible] الگ ایک غیر مفید سمجھا جاتا ہے جس کا کام صرف یہ خوش کرنا ہے [illegible] سماجی افادیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وجد کی شاعری میں ابھی موجود ہے [illegible] اہلِ فن اور اہلِ محنت کے درمیان تمیز نہیں کرتا چنانچہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر کرنے والے مزدوروں کو بھی

اہلِ ہنر کہتا ہے بلکہ ان کا ذکر اتنی ہی محبت اور عقیدت سے کرتا ہے جس کا اظہار اجنتا اور ایلورا کی نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی سی نظم پوری کی پوری نقل کرنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان ہے "مزدوروں کا پیغام"۔

نونہالانِ چمن، اہلِ ہنر جاتے ہیں
جوش زن قلب میں ہے شوقِ سفر جاتے ہیں
صورتِ خاک رہے، مثلِ شرر جاتے ہیں
یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کدھر جاتے ہیں

لو چلا قافلۂ کوہکنِ خانہ بدوش
کل سے ہو جائیں گی چھینیوں کی صدائیں خاموش

ہم کو جبر سے شکایت ہے نہ قسمت کا گلا
ہمیں غیب سے ہر روز نیا درس ملا
عشق کی سان پہ ہوتی ہے طبیعت کو جلا
ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلا

دل سے نکلا ہے یہ پیغام جگر داروں کا
عزمِ سرشار ہی خلّاق ہے شہکاروں کا

جوشِ اخلاص کی کوششِ پیہم ہم نے
نظمِ کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے
کر دیا قوم کا اک خوابِ مجسم ہم نے

ہم نے [illegible] خام نہیں چھوڑا
کام چھوڑا ہے نہیں نام نہیں چھوڑا ہے

جامعہ عثمانیہ کے محنت کش معماروں یا اجنتا کے فنکاروں اور ایلورا کے بت تراشوں نے کام چھوڑا ہے نام کسی نے نہیں چھوڑا۔ وجد کی شاعری بار بار یہی پیغام دیتی ہے:

شہرت پر وشواس نہ رکھ
دھن دولت غم پاس نہ رکھ
مطلب کی بو باس نہ رکھ
دیکھ صلے کی آس نہ رکھ

نیکی کر دریا میں ڈال
کل پہ آج کا کام نہ ٹال

وجد کی شاعری کے اور بھی کئی پہلو ہیں اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں حب الوطنی اور جذبۂ آزادی کا پہلو ہے۔ یہ خصوصیت اس دور کے تمام اردو شاعروں کے یہاں مشترک ہے لیکن ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہے۔ وجد کی ابتدائی شاعری میں "کسان" اور "ترانۂ دکن" جیسی حب الوطنی اور آزادی سے سرشار نظمیں ہیں جن پر جوش کا اثر اور بعض پر اقبال کا اثر ان نظموں کی معنوی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔ ہر نیا شاعر ابتداء میں اپنے پیش رو شعراء سے متاثر ہوتا ہے پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز پیدا کر لیتا ہے۔ وجد کی یہ اپنی آواز "ہو ترنگ" کے بعد "آفتابِ تازہ" میں زیادہ آسانی سے پہچانی جاتی ہے۔ سرکاری ملازمت کے باوجود انھوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریکِ آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ رکھا چنانچہ ان کی ۱۹۴۲ء کی ایک نظم "نیا [illegible]" خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔

دنیا کا بدلے گا رنگ
سنگیں جرم بنے گی جنگ
دھو جائے گا دلوں کا زنگ
سب کا ہوگا ایک آہنگ

کالے پیلے گورے لال
مل جل کر ہوں گے خوش حال

اٹھے محکوموں کے قدم
کھلے بغاوت کے پرچم
عظمتِ انساں مستحکم
بھاگ رہے ہیں اہلِ ستم

نذرِ خدمت خوابِ خیالی
جیت گئے دھرتی کے لال

۱۹۴۲ء میں دھرتی کے لال گو اخلاقی طور سے جیت گئے تھے اور اس اخلاقی فتح میں اُن کی مادی اور جسمانی فتح کا راز پوشیدہ تھا۔ اس کے بعد سخت مجبوریوں کے باوجود مایوس ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور آزادی اور اُس کے شاعروں کا ولولہ اور حوصلہ برقرار رہا۔ اس کی شہادت وجد کی ۱۹۴۳ء کی نظم "بشارت" ہے جس میں شاعر بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہے:

پائے گی [illegible] طاؤسی [illegible] | یہ [illegible] کل نہ رہے گی
آزادیٔ افکار کے محل دل میں کھلیں گے | یہ خوئے غلامی کہ جسے کل نہ رہے گی

یہ دشمنِ انصاف و کرم ظلم کی دیوی — بیکس کا لہو پی کے مگن کل نہ رہے گی
ارباب ہمم شاد و سرفراز رہیں گے — یہ مکر کی شیشہ دار و رسن کل نہ رہے گی
پُرہول فضا حسرتِ صد شامِ غریباں — یہ کیفیتِ صبحِ دلوں کل نہ رہے گی

اس کے بعد جب آزادی آئی تو وجد نے اپنی نظم "آفتابِ تازہ" لکھی جس پر اس نے اپنے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام رکھا ہے۔ دکن کی آزادی کو شاعر نے ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھا۔ شاید برسوں سے وجد یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو کچھ اسے کہنا ہے وہ کھل کے نہیں کہہ سکتا اور آزادی کی سب سے بڑی اہمیت اس میں ہے کہ زندگی کی دیوی کا سہاگ بن سکتے تھے —

سب نامرادِ عشرت و سلاسل چلے گئے
اے وجد لطف رقصِ متاعِ ہنر ہے آج

اس زمانے میں وجد نے ایک دل فریب اور مفکرانہ نظم "کاروانِ زندگی" لکھی۔ اس نظم میں بڑی وسعت ہے اور اس کے مدعے صدیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس نظم کی سرحدیں ہندوستان کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ شاعر ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ ساری انسانی دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور صرف ایک ملک، ایک قوم کی نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کی آزادی کی بشارت دے رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے دنیا کی نئی کروٹ اسی حقیقت کی ترجمان ہے کہ —

بہارِ حریت میں شہر کے عوام مل گئے
سفید و سرخ، زرد اور سیاہ فام مل گئے
الگ الگ کوئی نہیں رہا تمام مل گئے
طنابِ وقت یوں کھنچی کہ صبح و شام مل گئے

ازل سے تا ابد تکی ہے گردبادِ زندگی
بہ ایں شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

کرامتِ عمل سے عزمِ عام فتح یاب ہے
ہر ایک ذرۂ حقیر رشکِ آفتاب ہے
حیات زیرِ موج خیز امرت اک حباب ہے
جو میری کامرانیوں [illegible]

کھلے ہوئے ہیں پرچمِ [illegible] زندگی
بہ ایں شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

یہاں سے وجد کا نظریۂ انسانیت کا درس بن جاتا ہے اس کی فکر کی بلندی میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور وہ شاعری کے منصب اور مقام کو پہچاننے لگتا ہے۔ چنانچہ اس کا نیا مجموعہ "کلامِ وجد" جس غزل سے شروع ہوتا ہے اس کا یہ شعر شاعر کے احساسات کی پوری ترجمانی کرتا ہے —

غمِ حیات کی تاریکیوں کا خوف نہیں
ہر ایک شب کے لئے ماہتاب لایا ہوں

ہر چند یہ شعر اقبال کے اس شعر سے متاثر ہے —

مشرق سے گریزاں ہو نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

پھر بھی وجد کی شاعری کے نئے انداز کو سمجھنے کے لئے یہ شعر بہت اہم ہے۔

میں نے اب تک وجد کے تغزل اور رومانیت کا ذکر نہیں کیا ہے یہ دونوں چیزیں اس کی شاعری کی جان ہیں۔ اندھیری رات کو نیلی ناگن اور رقاصہ کے جسم کو چھلکتا ہوا پیالہ کہنے والا شاعر حقیقت کو خوابوں کے روپ میں ڈھالنے کا عادی ہے لیکن اس کے خواب بے حقیقت نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے آپ کو گرد و پیش کی زندگی سے سنوار رکھا ہے —

ہے تن بدن میں بوئے گُلِ تر بسی ہوئی
اتنے رہے قریب کسی گُل بدن سے ہم
نکلے جب اپنے گھر سے تو صورت خزاں کی تھی
آئے بہار بن کے تری انجمن سے ہم

آخر میں یہ کہنے کے بجائے کہ اردو شاعری کو وجد سے بڑی توقعات ہیں میں یہ کہوں گا کہ وجد نے اپنے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری عاید کر لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اس وعدے کو پورا کریں گے —

دو سو برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد
اُٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

خاکِ دکن کو یہ اپنا نیا شاعر مبارک ہو جسے ہم پورے ہندوستان کا شاعر سمجھتے ہیں۔

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ "جنگِ آزادی نمبر" ہوگا
تفصیلی اعلان کا انتظار فرمائیے۔ (ادارہ)

خواجہ غلام السیدین

اقبال کے پیغام کی عالمگیری

(یومِ اقبال کے موقع پر تقریر)

آج سترہ سال ہوتے ہیں کہ اقبال خدا کو پیارے ہوئے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۶ء تک کا یہ زمانہ بعض لحاظ سے دنیا کی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلاب آفریں زمانہ گذرا ہے کم سے کم یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی اور سترہ سال کی مدت میں آسمان کی آنکھ نے اتنا زبردست انقلاب نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک جانے بوجھے، روایتی خول کو توڑ کر ایک نیا چولا اختیار کر رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں دنیا کی دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی جس نے نہ صرف قوموں کی زندگی اور ملکوں کی تہذیب و تمدن کا نقشہ بلکہ تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔ اس کی بدولت ایک طرف نازی اور فاشسٹ طاقتوں کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف مشرق و مغرب کی وہ ہولناک اور بے امان رسہ کشی شروع ہوئی جس کا تماشہ ہم آپ آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی پُر آشوب زمانے میں دنیا کے بہت سے ملک غلامی اور نیم غلامی کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہوئے اسی عرصے میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور اسے آفتِ ارضی و سماوی کے ایک ایسے دور میں سے گذرنا پڑا جس کی یاد ہمیشہ تاریخ کے سینے پر ایک داغ بن کر رہے گی۔ اسی زمانے میں ہندوستان اور پاکستان دونوں آزاد ہوئے اور دونوں نے زندگی کا ایک نیا سانچہ تیار کرنے کی کوشش شروع کی۔ اسی دوران میں نہ صرف عالمِ انسانیت کے خلاف ایٹم بم گرانے کا جرم کیا گیا بلکہ ایٹم ریسرچ ایک ایسی منزل میں جا پہونچی جہاں انسان ایک معنی میں واقعاً اپنی تقدیر کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایسی قوت آگئی ہے کہ اگر وہ چاہے اور شیطانی طاقتیں اس کی ساتھی ہوں تو وہ سارے انسانوں کو عذاب کی گھاٹی کے راستہ ہلاکت کے غار میں گرا سکتا ہے برخلاف اس کے اگر توفیقِ الٰہی اس کے شاملِ حال ہو اور وہ اس طاقت کو بگاڑنے کی بجائے بنانے اور سنوارنے کے لئے استعمال کرے تو وہ زندگی کا ایک ایسا حسین، پاکیزہ اور بھرپور نقشہ تیار کر سکتا ہے جس کو شاید انسانی تخیل نے چھوا تک نہیں۔ وہ ایک ہی جست میں جاگیردارانہ تہذیب کی محرومیوں اور زوال آمادگی کو، سرمایہ داری کی چھینا جھپٹ کو، کمیونزم کے بنیادی جذبۂ کشمکش کو پیچھے چھوڑ کر فراغت اور خوشحالی کی معراج کو حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کا دماغ جس میں ایک فلسفی کی بصیرت اور ایک شاعر کے وجدان نے ناتہ جوڑا تھا، آنے والے واقعات کی تصویر اپنے خلاق تخیل کے آئینے میں دیکھتا ہے

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

اس نظم کا عنوان ہے "زمانہ"۔ لیکن یہ صراحی صرف زمانے کی صراحی نہیں بلکہ شاعر کے قلب و نظر کا ساغر بھی ہے جس کی گہرائی میں اسے مستقبل کی تصویریں اُبھرتی اور مٹتی دکھائی دیتی ہیں وہ ایک طرح اپنی شاعری کے ذریعے بشارت دیتا ہے اُن کو، جو آنکھیں رکھتے ہیں اور ان سے دیکھتے بھی ہیں، کان رکھتے ہیں اور ان سے سنتے بھی ہیں، دماغ رکھتے ہیں اور اس سے سوچتے بھی ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی فطرت میں خیر سازی کی کتنی قوتیں سوئی ہوئی ہیں۔ آپ نے فرشتوں کا وہ گیت پڑھا ہوگا جو وہ آدم کو جنت سے رخصت کرتے وقت گاتے ہیں۔ لیکن یہ محض فرشتوں کا الوداعی گیت نہیں بلکہ شاعر کی استقبالیہ نظم بھی ہے جس میں وہ انسان کو یعنی ہمیں اور آپ کو ہمارے مستقبل کی نوید دیتا ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے — ہزار ہوش سے خوش تر تری شکر خوابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر — کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ساتھ ہی اس کی حقیقت بیں نگاہ انسان کو ان خطروں سے بھی آگاہ کرتی ہے جو اس کی کمیں گاہ میں کہیں گھات لگائے بیٹھے ہیں اور وہ اتنی ہی وضاحت و صاف گوئی و کمالِ پیش بینی کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اُسے اندیشہ ہے کہ یہ فتنہ و فساد تہذیبِ مغرب کے بطن سے پیدا ہوگا، یا شاید یوں کہنا چاہیئے کہ ان غلط قدروں کی ناپاک اولاد ہوگا جنھوں نے اس تہذیبی نظام پر تسلط کر لیا ہے۔ اس نے آج سے تیس سال پہلے یہ خوش خبری سنا دی تھی کہ

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

خودکشی کی کوشش پہلی بار ۱۹۱۴ء میں کی گئی اور پھر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بیچ کے بیس سال میں مسلسل یہ کوشش جاری رہی اور اس عرصے میں انسانی تہذیب کے کیسے کیسے حسین نقوش نہیں مٹائے گئے! ۱۹۲۵ء میں جب بالِ جبریل شائع ہوئی تو شاعر کے سامنے آنے والے دور کا نقشہ واضح ہو چکا تھا۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

آشیانہ بے شک خطر میں ہے کیونکہ بجلیاں اس کو جلانے کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن شاعر کا دل خوف اور مایوسی سے ناآشنا ہے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ انسان کے مستقبل پر اس کو جو ایمان ہے اس کا سودا نہیں کیا بلکہ وہ اپنا دیپ جلائے آندھی کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا آخری شعر امید کا ایک سربلند علم ہے:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

میری اس تقریر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس مردِ درویش کے فکر کی ایک ہلکی سی جھلک آپ کو دکھاؤں جس سے آپ کو اندازہ ہو کہ اس کے کلام کی اپیل کس قدر عالمگیر ہے اور وہ کس طرح نسل اور رنگ اور جغرافیہ کی حدبندیوں کو پھلانگتا ہے

ان کے پاس سے کراہت کے ساتھ گزرتا ہوا، انسان کی اس بنیادی انسانیت کے تار چھیڑتا ہے جس کا نغمہ انسانیت کی اصلی اور سچی آواز ہے۔ اس کے سوا جو کچھ شور و غل سنائی دیتا ہے وہ سمندر کا بے فیض جھاگ ہے کہ اُٹھتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ اس پہلو پر زور دینے کی ایک خاص وجہ ہے۔ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ گزشتہ سترہ سالوں میں انسانی زندگی اپنے جانے بوجھے راستوں سے بھٹک کر نہ جانے کہاں جا پہونچی ہے اور کچھ اس طرح بدلی ہے کہ اس کے خد و خال کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام تبدیلیوں کے ایک حقیقت ہے جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے تہذیب و تمدن صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں کہ انسان انسانیت کی وحدت کو پہچانے اور جو دیواریں تعصب اور تنگ نظری اور خود غرضی اور جہالت اور رہبروں کی رہزنی نے (یا یوں کہئے کہ رہزنوں کی رہبری نے) انسانوں کے درمیان کھینچ دی ہیں ان کو گرا دیا جائے۔ اسی لئے اچھا اور بڑا شاعر یا ادیب یا مفکر یا فلسفی وہی ہے جو اس فکری تحریک کی رگوں میں خون دوڑائے۔ ہمارے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہر وہ چیز جو انسانوں کے دلوں اور دماغوں کو ملاتی ہے دھرم ہے، جو انھیں بانٹتی اور لڑاتی ہے وہ ادھرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی شاعر کی پرکھ کے لئے یہ ایک نہایت سچی کسوٹی ہے اور اس کسوٹی پر اقبال اس شان کے ساتھ پورا اُترتا ہے کہ صرف یہی چیز اس کی شاعری کو امر بنانے کے لئے کافی ہے۔ میں اس چیز کے ثبوت کے لئے کوئی مفصل دلیلیں نہیں دینا چاہتا بلکہ اس سخن شناس محفل کے سامنے خود اقبال کو اپنی شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ میرا کام تو صرف اتنا ہی ہوگا کہ اختصار کی خاطر کہیں کہیں سے پردہ ہٹاؤں اور جو جھلکیاں آپ کو نظر آئیں ان کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مسلسل تصویر بنا دوں۔

ادبِ عالیہ کا مقصد کیا ہے؟ یہ بات بار بار کہی گئی ہے لیکن اس کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ وہ انسان کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی داستان کو، اس کے دکھے ہوئے دل کی فریاد کو، اس کی طویل جد و جہد کے رزمیہ کو ایک اثر آفریں انداز میں پیش کرتا ہے اور جب ادیب کسی خاص قوم یا جماعت کے مخصوص جذبات اور تجربوں کی ترجمانی کرتا ہے اس وقت اس کی شاعری میں عالمِ انسانیت کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اقبال کے بہت سے نقادوں اور عقیدت مندوں نے اس کی شاعری کو پرکھنے میں اس بات کو بھلا دیا۔ اس۔ تم

خود اس چیز کی شکایت کی ہے

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت!

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی خیالات اور روایات کی ترجمانی کی ہے، اس لئے بعض لوگوں نے اعتراض کے رد پہ میں، بعض نے تعریف کے انداز میں کہا کہ وہ محض ایک اسلامی شاعر ہے اور یہ بھول گئے کہ کسی بڑے شاعر یا ادیب کو (بلکہ آپ اجازت دیں تو یہ کہوں گا کہ کسی بڑے انسان کو) کسی خاص ملک یا قوم یا مذہب کے ساتھ وابستہ کر دینا اس کے ساتھ بے انصافی ہے۔ یقیناً وہ ایک اسلامی شاعر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ عالمِ انسانیت کا شاعر بھی ہے اس بات کی تائید میں آپ کو سر تیج بہادر سپرو کے خطبہ کا ایک حصہ سناتا ہوں جس میں انھوں نے اقبال کی سچی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

"اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض ایک اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرہ اثر کو محدود کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفے، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہا کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالی داس کی نسبت یہ کہا کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو محدود نہیں کیا ۔۔۔ پھر اقبال کے بارے میں ایسا کیوں کہا جائے، مثلاً بال جبریل میں جو قدیم اسپین کے متعلق نظم ہے کیا اس کا اثر صرف مسلمان ہی کے دل پر ہو سکتا ہے! (ذرا یہ تین شعر سنیئے اور دل پر ہاتھ رکھ کر اس سوال کا جواب دیجئے)۔

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں
دیکھا بھی، دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

جیسا کہ اقبال نے نہایت وضاحت کے ساتھ خود لکھا ہے اس کی فارسی مثنویوں کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں بلکہ دنیا کے سامنے ایک عالمگیر نصب العین پیش کرنا اور ایک بہتر نظامِ معاشرت کی تلاش کرنا ہے۔ فکر کی اس یاترا میں اس نے قدرتاً اسلام کے اس بنیادی اصول کا خیر مقدم کیا ہے کہ وہ رنگ، نسل، ذات پات اور دولت کے تمام مصنوعی اور تباہ کن امتیازات کو مٹاتا اور وطنی اور قومیت کے تنگ نظریے کی مخالفت کرتا ہے۔ ہماری نسل جس نے بین الاقوامی محاذ پر نسل اور رنگ اور قومیت کے بھیانک سائے کو بڑھتے اور پھیلتے ہوئے اور شرافت و انسانیت کے چراغوں کو بجھتے ہوئے دیکھا ہے، جس نے قومی محاذ پر زبان اور مذہب اور ذات پات اور صوبائی تعصب کو قومی زندگی کے چشموں کو زہرآلود کرتے دیکھا ہے کس طرح اس شاعر کے پیغام کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ جب وہ دشمنی کی تحقیر کا راگ گاتا ہے، اس وقت بھی اس کی تہ میں انسانیت کا جذبہ اور محبت کا پیغام کارفرما ہوتا ہے۔ کیا آپ نے شاعرِ امید کا یہ پیغام بارہا نہیں پڑھا اور سنا:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!

اور پھر کس حسرت کے ساتھ کہتا ہے

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

لیکن باوجود اس کے شاعر کا، ہمارا آپ کا اور ہر شریف انسان کا فرض کیا ہے؟ مایوسی، بیزاری، بدزبانی اور نکتہ چینی نہیں بلکہ ۔۔۔۔۔۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر!

عام اس سے کہ رات کا اندھیرا ہندو کے گھر میں ہو یا مسلمان کے، ایشیا کے ملک میں ہو یا یورپ اور امریکہ کے، ہمیں تو ہر شب کو (شبِ تار کو) سحر کے نور میں بدلنا ہے کیونکہ اسی میں انسانیت کا شرف ہے۔

اور جب وہ ایک مثالی مسلمان کی تصویر کھینچتا ہے تو اس میں بھی ایک انسان کے خد و خال ابھرتا ہے اس کے لئے موقع اسلامی اصطلاحوں کا استعمال کرتا ہے لیکن جذبہ وہی انسانیت کا جذبہ ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اور ساتھ ہی چند شعر اور سنیئے جو مجھے بہت محبوب ہیں اور شاعر کے مزاج اور طبیعت اور اس کے دل و دماغ کی عکاسی کرتے ہیں

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کیوں؟

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

اس کو سب سے زیادہ دُکھ کس بات کا ہے؟ یہی کہ انسانوں کے دل اور دماغ کی کھڑکیاں بند ہیں اس کے من کے مندر میں تعصّب اور نفرت اور ہنسا کی مورتیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس کو دینے سے زیادہ لینے کی، بنانے سے زیادہ بگاڑنے کی، ملانے سے زیادہ بانٹنے کی فکر ہے۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

فرشتے انسانی سینہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں اور اس کو دیکھ کر انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے عقل بے لگام ہو کر انسان کی بربادی کا اہتمام کر رہی ہے اور عشق پر سمیٹ کر اپنے نشیمن میں جا بیٹھا ہے۔ امیر اور غریب سب ہوس کے بندے بن گئے ہیں اور جن لوگوں کو قلب و نظر کی رہبری کرنی تھی وہ راہزنی پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسی صورتِ حال کی شکایت بارگاہِ خداوندی میں کرتے ہیں:

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام — عشقِ گرہ کشای کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی — آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

اور اس کا علاج اقبال کی نظر میں بھی وہی ہے جو اُس سے پہلے سنتوں کی وانی اور زبان سے ادا کیا ہے۔ یعنی ایک صالح زندگی کی عمارت صرف انصاف اور محبت کے ستونوں پر قائم ہو سکتی ہے۔ یہ محبت اور انصاف کی کسوٹی ہر قوم، ہر مذہب، ہر نسل کو ایک ہی نظر سے جانچتی ہے اور کسی کے ساتھ جانبداری نہیں برتتی۔ اقبال کو یہ غلط فہمی نہیں کہ اس بارے میں مسلمانوں کو کوئی خاص برتری حاصل ہے۔ اگر مسلم کے دل میں عشق کی چنگاری سلامت نہیں تو اس کے سارے دعوے بے بنیاد ہیں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال کا بنیادی پیغام وہی ہے جو مسیح اور بدھ کا پیغام تھا، جو محمدؐ عربی کا پیغام تھا، جو گاندھی اور ٹیگور کا پیغام تھا جو دنیا کے بہترین مفکروں اور فلسفیوں اور انبیاء اور اولیا اور رشیوں، اور منیوں کا پیغام رہا ہے۔ اور جس کی طرف بار بار جھک مار کر، خوف کی ماری کی کڑیاں جھیل کر ان سب کو آنا ہوگا جو دنیا کی فلاح کے لئے دوسرے راستوں کی تلاش کرتے رہے ہیں۔ اور وہ پیغام کیا ہے؟ یہی کہ انسان کی نجات کا راستہ محبت کی سرزمین میں سے گزرتا ہے اور جب تک وہ فرقہ بندی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی سوئی ہوئی انسانیت کو آزاد نہیں کرے گا وہ اپنی منزل کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس پیغام کو اس نے جا بجا بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک انداز بیان آپ بھی سن لیجئے اور بس:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اس پیغام میں اقبال کی عالمگیری کا راز پنہاں ہے۔

میری دعا ہے کہ محبت کا یہ پیغام، جو اقبال کے کلام میں روح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے، جو اس کے تصورِ خودی میں رنگ بھرتا اور اس کے فلسفۂ عمل کو معنی بخشتا ہے دنیا کے سب ملکوں پر اور بالخصوص ہندوستان اور پاکستان کے اوپر اپنا سایۂ رحمت ڈالتا رہے۔

شمیم کرہانی

کوشش

پھر مجھے وقت جگاتا ہے کہ اُٹھ اے راہی
راستہ ڈھونڈھ، زمانے کو بدلنے کے لئے
میں بڑھاتا ہوں قدم، چھوڑ کے سارے سپنے
جادۂ کشمکشِ زیست پہ چلنے کے لئے

اور جادے کے ہر اک موڑ پہ ملتی ہے وہ زیست
جس کی نظروں میں لرزتی ہے غموں کی زنجیر
ابروؤں کی نہ کمانیں نہ کمانوں کی لچک
زندگی ایسی کہ جیسے کوئی ٹوٹا ہُوا تیر

کہیں جلتے ہوئے دیپک کہیں بجھتے ہوئے دیپ
کہیں دُنیا کا اُجالا، کہیں دُنیا اندھیر
کہیں ایوانوں کی جگمگ کہیں غم خانوں کا سوگ
کہیں مہ پاروں کا انبار، کہیں راکھ کا ڈھیر

آنکھ جھپکی کہ پڑا زخم، جگر پہ کاری
اس لئے آنکھ حوادث سے لڑی ہوتی ہے
ہر گھنی چھاؤں سے دامن کو چھڑا کر مرا دل
دوڑ جاتا ہے جہاں دھوپ کڑی ہوتی ہے

پا بہ جولاں ہے زمانے کے بیاباں میں حیات
ذرّہ و خورشید کو خاکِ رہِ انساں کر کے
شاد ہے دل کہ محبّت نے بڑا کام کیا
غمِ جاناں کو نثارِ غمِ دوراں کر کے

سانس رُک جاتی ہے، جُھک جاتی ہے کانٹوں پہ جبیں
دل پہ چل جاتے ہیں دھرتی کے دُکھوں کے آرے
ہا، بھر آتا ہے، جھپک جاتی ہیں بھیگی پلکیں
اور سرِ خاک بکھر جاتے ہیں لاکھوں تارے

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسی باتیں جو موجودہ ترقی یافتہ دور ہی کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں، اب سے چار ہزار سال قبل عہدِ عتیق کے معاشرے میں بھی پائی جاتی تھیں مثلاً نکاح و طلاق کے مسئلے کو لیجئے کہ آج کل تمام مہذب ممالک میں اس کی بنیاد صرف اس اصول پر قائم ہے کہ معاشرے میں مرد و عورت دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے حقوق کے مطالبے کا آزادانہ حق حاصل ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ بالکل یہی روح ہمیں قانونِ حمورابی میں بھی ملتی ہے۔ اس میں جہاں معاملات کا ذکر کیا گیا ہے اس امر کا صراحتاً اظہار ہے کہ تجارت و پیشے کی تمام صورتوں میں عورت و مرد برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔ اس کے ساتھ بیواؤں اور یتیموں کی حفاظت و نگہداشت کو بھی قومی فریضے کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ البتہ بسلسلۂ تعزیرات "آنکھ کے بدلے آنکھ" والی رسم ضرور رائج تھی جسے موجودہ نقطۂ نظر سے ہم وحشیانہ کہہ سکتے ہیں۔

مصر

اہم سابقہ میں، مصری قوم کو بھی خاص امتیاز حاصل ہے اور وہاں کے آثار سے جو نقوش و کتبات دستیاب ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال قبل وہاں کی حکومت بھی اپنا ایک خاص آئین رکھتی تھی اور وہ بڑی حد تک بلند اخلاق پر قائم تھا۔ چنانچہ قانونِ حمورابی کی طرح مصری قانون میں بھی عورت کی نگہداشت کا بڑا لحاظ رکھا گیا تھا اور جائیداد کی مالک زیادہ تر عورت ہی ہُوا کرتی تھی اور اسی کے ترکے سے اولاد مستفید ہوتی تھی۔ اسی طرح شادی کے باب میں بھی وہ کافی آزاد تھی اور جس سے چاہتی شادی کر سکتی، البتہ موجودہ اخلاقی نقطۂ نظر کے خلاف یہ رواج ضرور تھا کہ بھائی بہنوں میں بھی آپس میں شادی ہو سکتی تھی اور خصوصیت کے ساتھ شاہی خاندان میں تو یہ رسم ضروری سی ہو گئی تھی جس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ شاہی نسل کا سلسلہ شاہی خاندان ہی کے اندر رہے اور باہر کا خون اس میں نہ ملنے پائے۔ لونڈیاں رکھنے کی بھی اجازت تھی، لیکن ان کی حیثیت بیویوں کی سی نہ تھی بلکہ بہنوں کی طرح ان کو رکھا جاتا تھا۔

شریعتِ موسوی

دُنیا کے مشہور واضعینِ قانون میں، حضرت موسیٰ کا بھی شمار کیا جاتا ہے اور مشہور ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے انھوں نے متعدد قوانین وضع کئے تھے۔ لیکن غالباً یہ خیال صحیح نہیں۔ حتیٰ کہ "احکامِ عشرہ" جو توریت میں حضرت موسیٰ سے منسوب کئے جاتے ہیں، وہ بھی دراصل ان کی فکر کا نتیجہ نہ تھے۔ ہر چند احکامِ عشرہ میں جس اخلاقی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے وہ حضرت موسیٰ کا نقطۂ نظر ضرور تھا، لیکن یہ احکام ان کے وضع کئے ہوئے نہ تھے۔

قدیم ترین اسرائیلی قانون جو توریت میں درج ہے وہ دراصل بابل و اسیریا کے قوانین کا عبرانی ترجمہ ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ توریت کے یہ تمام احکام ایسے ہیں جو زیادہ تر کاشتکاروں کے لئے موزوں ہیں اور عہدِ موسیٰ میں بنی اسرائیل کاشت سے بالکل ناواقف تھے اور محض خانہ بدوشوں کی سی صحرائی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توریت میں جن احکام کا ذکر ہے وہ اس عہد سے متعلق ہیں جب بنی اسرائیل نے کنعان میں مستقلاً آباد ہونے کے بعد وہاں زراعت شروع کر دی تھی اور کنعانیوں ہی کے قوانین سے اخذ کر کے یہ احکام وضع کر لئے گئے تھے۔

فلسطین

فلسطین کے قانون کے جو حصے ہم تک پہونچے ہیں وہ بہت نامکمل ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہاں کے معاشری قوانین کیا تھے، لیکن جس حد تک تعزیرات کا تعلق ہے ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "قصاص بالمثل" کو اس میں زیادہ اہمیت حاصل تھی، یعنی اگر کوئی شخص کسی کو اذیت پہونچاتا تو اُسی قسم کی اذیت مجرم کو بھی پہونچائی جاتی، لیکن اس کا نفاذ زیادہ تر غلاموں یا آزاد شدہ غلاموں پر ہوتا تھا اگر کوئی آزاد اسرائیلی غلام کی آنکھ نکال لیتا یا ناک کاٹ ڈالتا تو اس کی آنکھ، ناک کو کوئی گزند نہ پہونچتا بلکہ اس کو صرف یہ سزا دی جاتی کہ وہ غلام کو آزاد کر دے۔

اگر آقا اپنے غلام یا نوکر کو سخت جسمانی اذیت پہنچاتا اور وہ ایک دن تک زندہ رہتا تو آقا سے کوئی باز پرس نہ ہوتی۔ اگر وہ اذیت کے صدمے سے بارہ گھنٹے کے اندر مر جاتا تو بھی اس کا قصاص نہ ہوتا اور کوئی معمولی سی سزا کافی سمجھی جاتی۔

غلامی کا رواج وہاں عہدِ مسیح میں بھی جاری رہا اور گو عیسوی تعلیم کی روح غلامی کے منافی تھی، لیکن مسیح نے اس قسم کی مخالفت نہیں کی اور مسیح کے بعد پال نے تو ارسطا طالیس اور افلاطون کی طرح اس کے قیام پر اور زیادہ زور دیا۔

قدیم یونان

یونان کی قدیم رزمیہ داستانوں ایلیڈ Iliad اور اوڈیسی Odyssey سے جو ہومر سے منسوب کی جاتی ہیں اور جن کا زمانۂ تصنیف

نویں صدی قبل مسیح ظاہر کیا جاتا ہے) قدیم یونان کے قوانین پر مزید کچھ روشنی پڑتی ہے لیکن ساتویں صدی مسیح سے پہلے وہاں کوئی قانون باضابطہ مدون نہ ہوا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے وہاں قانون وضع کیا۔ زیلوکس Zaleucus تھا۔ اس کا زمانہ ۶۶۳ سال قبل مسیح تھا۔ اس سے پہلے وہاں سزا و تعزیر کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا بلکہ ججوں کو اختیار تھا جس کو جو سزا چاہے دیں۔ ایک ہی قسم کے دو مجرموں کو وہ مختلف سزائیں دے سکتے تھے۔ لیکن زیلوکس نے اس خود رائی کا سدِ باب کر دیا اور ہر جرم کی سزا متعین کر دی۔

اس کے بعد ڈراکو Draco نے جو یونان کا بہت بڑا مقنن سمجھا جاتا ہے ۶۲۱ء ق م میں تمام مروجہ قوانین پر نظرِ ثانی کر کے ان کو از سرِ نو مرتب کیا اور قانون کا نفاذ غیر ذمہ دار ہاتھوں سے نکال کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جو عوام کے نزدیک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے۔

ڈراکو کے بعد جب وہاں کے مشہور مقنن سولن Solon کا زمانہ آیا تو اس نے ۵۹۴ء ق-م میں بالکل نیا نظامِ عدل و انصاف قائم کیا۔ اس نے ڈراکو کے قوانین میں سوا اس حصہ کے جو قتل و سزائے قتل سے متعلق تھا، باقی تمام ضوابط کو بدل دیا اس نے ایک عدالت اپیل بھی قائم کی جو عوام کے نمایندوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اسمبلی کی بنیاد بھی اس نے ڈالی جس میں یونان کا ہر بالغ مرد شریک ہو سکتا تھا، لیکن باوجود ان تمام اصلاحات کے اس کا وضع کیا ہوا قانون اس کی موت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

قبرص

قبرص یا کریٹ کے قدیم شہر گورٹن Gortyn کے کھنڈروں سے چند تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے وہاں کے قوانین پر کافی روشنی پڑتی ہے - یہ دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ۴۵۰ ق-م سے ۶۰۰ ق-م تک، دوسرا ۴۵۰ ق-م سے اس کے بعد تک کا اور اسی دوسرے زمانے سے ان تختیوں کا تعلق ہے جو وہاں دستیاب ہوئی ہیں -

ان کتبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس قدیم زمانے میں بھی بڑی شائستگی پائی جاتی تھی - مثلاً جرمِ زنا کی سزا وہاں صرف یہ تھی کہ زانی کو صرف نقد معاوضہ ادا کرنا ہوتا تھا اس طرح اور بہت سے سنگین جرائم کی سزا صرف جرمانے تک محدود تھی۔

شادی و ملکیت کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا اور شادی شدہ عورت کی ملکیت کو شوہر کی دست برد سے بچانے کے لئے بھی خاص قاعدے مقرر تھے اس کے علاوہ ترکہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کا برابر کا حصہ دار قرار دینے کی بھی دفعات اس قانون میں موجود تھیں۔

رومی قانون

سرزمین مغرب میں سب سے زیادہ مشہور روما کا قانون ہے جس کی تعلیم اب تک یورپ کے بعض ممالک میں رائج ہے۔ قدیم روما کا سب سے پہلا قانون وہ ہے جو ۴۵۰ ق-م میں وضع کیا گیا۔ اوّل اوّل یونانی قوانین ہی کو سامنے رکھ کر اسے بنایا گیا تھا، لیکن بعد کو اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ جب مملکتِ روما وسیع ہوئی تو یورپ اور بحر روم کے ممالک پر بھی رومی قانون چھا گیا۔ ہر چند روما والے جب کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو وہاں کے قانون یا رسم و رواج کو منسوخ نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی ان پر رومی قانون کا بہت اثر پڑتا تھا اور آخر میں اسی کو اختیار کر لیا جاتا تھا۔

چوتھی صدی کے آغاز میں جب کانسٹین ٹائین اعظم نے قسطنطنیہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو یہاں کے عیسائیوں اور یہودیوں کے بڑھے ہوئے اقتدار کے زیر اثر رومی قانون میں بہت رد و بدل کیا گیا اور ۴۳۸ء میں شہنشاہ تھیوڈیسیس نے مزید اصلاحات اس میں کیں۔ اس کے بعد ۵۲۸ء میں دوسرے فرمانروا جسٹی نین نے اس کو اور زیادہ وسعت دی اور یہ قانون اتنا مقبول تھا کہ اس وقت بھی اکثر ممالکِ مغربیہ کے قوانین کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔

اوّل اوّل رومی قانون کی رُو سے ملکیت و اقتدار کا حق صرف باپ کو حاصل تھا یہاں تک کہ افرادِ خاندان کی موت و زیست بھی اسی کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس کو چاہتا غلاموں کی طرح فروخت کر کے اس کی جائداد پر قابض ہو سکتا تھا۔ عورت کی قسمت کا فیصلہ بھی جب تک شادی نہ ہو، باپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ شادی ہونے کے بعد یہ اقتدار باپ سے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ بعد کو جب رفتہ رفتہ اہلِ روما مہذب ہوتے گئے اور عیسوی عہد آیا تو عورت بھی زیادہ آزاد ہوتی گئی اور وہ غلامانہ قیود جو اس پر قائم تھیں ختم ہونے لگیں۔

تعذیب و تعزیر

تاریخِ عدل و انصاف کا وہ حصہ جو تعزیرات سے تعلق رکھتا ہے اس میں شک نہیں بڑا دردناک حصہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان عہدِ وحشت کے بعد بھی عرصے تک درندہ بنا رہا اور اس کی خوئے درندگی نے بہت زمانے تک

اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

عہدِ قدیم میں مجرموں کو جسمانی عذاب میں مبتلا کرنا عام بات تھی، شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے اس وحشت کا ثبوت نہ دیا ہو۔ عراق، مصر، یونان، روما، چین، جاپان غرض ہر جگہ عام رواج تھا کہ مجرموں کو جسمانی اذیتیں پہونچائی جائیں، جن کا تعلق سزا اور اقبالِ جرم دونوں سے تھا۔ یعنی اگر صرف پاداشِ جرم میں کوئی جسمانی اذیت پہونچائی جاتی تو بھی غنیمت تھا، لیکن وہاں تو فراہمیٔ ثبوت اور اقبالِ جرم کے لئے ایسی سخت تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں کہ ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ——— شکنجوں میں کس کر جسم کی رگیں توڑ دینا، ناخن میں کیلیں ٹھونکنا، بھاری بھاری پتھر گلے میں لٹکا دینا، سُرخ تپتی ہوئی آہنی چادروں پر لٹا دینا، ایک ایک کر کے اعضاء جسم قطع کرنا، دار پر چڑھانا اور صحرائی درندوں کے سامنے ڈال دینا یہ تھے تمام طریقے تعذیب و تعزیر کے جو زیادہ تر غلاموں یا آزاد شدہ غلاموں پر صرف ہوتے تھے۔

تعذیب عہدِ عیسوی میں

ہر چند مسیح کی تعلیم یکسر رحم و محبت تھی لیکن ان کے ماننے والے مذہبی رہنماؤں نے عیسویت کی اشاعت کے لئے جو مظالم روا رکھے وہ چہرۂ انسانیت کے ایسے مکروہ داغ ہیں جن کی مثال کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی ——— آگ میں ڈال دینا، گلا گھونٹ کر ہلاک کر دینا، اعضاء کاٹ ڈالنا، آنکھیں نکال لینا، پتھر مار مار کر جان لے لینا، پانی میں ڈبو دینا، پہاڑیوں کی چوٹیوں سے نیچے ڈھکیل دینا، یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں عیسائی پیشواؤں کا معمول تھا جسے وہ بڑا کارِ ثواب خیال کرتے تھے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ سب کچھ یونہی بغیر کسی قاعدہ یا قانون کے ہوتا ہو بلکہ اس کے قواعد مقرر تھے، اور ایک خاص محکمۂ تعذیب ہی علٰحدہ قائم تھا، جس سے ان وحشیانہ مظالم کے احکام جاری ہوتے تھے۔ اس محکمۂ تعذیب اور ان علمبردارانِ مذہب نے صدیوں تک دنیا کو عذاب میں مبتلا رکھا، اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اسپین کے شعبۂ تعذیب کے ایک افسر نے جس کا نام ٹامس ٹورکوماڈو تھا اپنے ۱۸ سال کے دورِ اقتدار میں دس ہزار دو سو بیس انسانوں کو آگ سے جلا جلا کر ہلاک کرنے کا "مقدس فرض" انجام دیا۔

پھر یہی نہیں کہ یہ دورِ تعذیب صرف چند سالوں تک قایم رہا ہو مسلسل صدیوں تک یہ سلسلہ قایم رہا اور بہ مشکل تمام واٹرلو کی لڑائی کے بعد ۱۸۱۶ء میں یہ داغ کلیسائے روم کی پیشانی سے مٹا۔

تعذیب کے قوانین سب سے زیادہ سخت جرمنی و آسٹریا میں تھے۔ ریاستہائے جرمنی میں شکنجوں کے پھیر میں کس کر رگیں توڑ دینا، زندہ گاڑ دینا، جسم میں میخیں ٹھونک ٹھونک کر ہلاک کرنا۔ آگ میں سلاخیں گرم کر کے جسم کے اندر بھونکنا سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں مسلسل دو سو سال تک وہاں کا دستور رہا ہے، بلکہ ایک جرمن ریاست باڈن میں تو ۱۸۳۱ء تک یہی سلسلہ قایم رہا۔ پروشیا میں البتہ ۱۷۴۰ء میں تعذیب کا رواج عملاً ختم ہو گیا لیکن قانونی حیثیت اس کی ۱۸۰۵ء تک قایم رہی۔

اطالیہ میں بھی قانونِ تعذیب کی قانونی حیثیت اٹھارویں صدی کے آخر تک قایم رہی بلکہ نیپلس میں تو ۱۸۵۹ء تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ فرانس میں البتہ اس کا رواج زیادہ نہیں رہا تاہم تیرھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے آخر (۱۷۸۹ء) تک تعذیب وہاں کے قانون میں شامل تھی۔

روس میں بھی انیسویں صدی کے وسط تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ البتہ اس درمیان میں ملکہ کیتھرائن ثانی نے والٹیر (مشہور فرانسیسی ادیب و مصلح) کی تحریروں سے متاثر ہو کر اس قانون کے نفاذ میں کچھ نرمی اختیار کی۔ سویڈن میں یہ قانون رائج تھا لیکن اس پر زیادہ سختی سے عمل نہ ہوتا تھا۔ انگلستان کا بھی یہی حال تھا لیکن اسکاٹ لینڈ اس باب میں زیادہ سخت تھا اور وہاں سلسلۂ تعذیب عرصے تک قایم رہا۔

ایشیا میں چین و جاپان خصوصیت کے ساتھ اس باب میں بہت بدنام تھے اور وہاں بھی مجرموں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

قیدخانوں کی ابتداء

مجرموں کو سزائے قید دینا حال کی بات ہے۔ روما میں ایک مجرم صرف اس وقت تک قید رکھا جاتا تھا جب تک وہ سزائے تعذیب میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی انتہائی سخت جانی سے زندہ رہ جاتا تو چھوڑ دیا جاتا۔

ہر چند قید و زنداں کا تصور مسیح کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہو گیا تھا لیکن پانچ چھ سو سال تک قیدخانوں کا عدم و وجود برابر تھا۔ سب سے پہلے ۱۵۹۳ء میں امسٹرڈم کے پروٹسٹنٹ پادریوں نے مجرم عورتوں کی اصلاح و تادیب کے لئے ایک باقاعدہ قیدخانہ تعمیر کیا اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں اس کی تقلید کی گئی لیکن ان قیدخانوں کی اندرونی حالت حد درجہ دردناک تھی اور قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے زیادہ بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ جیلروں کو نگرانی کا کوئی معاوضہ نہ ملتا

تھا، وہ قیدیوں سے جو چاہتے وصول کرتے اور اپنے صرف میں لاتے۔ اس بدتمیزی کی طرف سب سے پہلے جان ہاورڈ کو توجہ ہوئی۔ اس نے جیلروں کا مشاہرہ مقرر کرایا اور انتہائی کوشش کے بعد ۱۸۲۳ء میں قیدخانوں کا ایکٹ پاس کرایا جو اس سلسلے میں اصلاح کا پہلا قدم تھا۔

سزائے موت

اوّل اوّل انگلستان میں سزائے موت بہت معمولی بات تھی اور تقریباً دو سو جرائم ایسے تھے جن کی پاداش میں سزائے موت کا حکم سنایا جا سکتا تھا، لیکن اس سے زیادہ عجیب سزائے موت دینے کا طریقہ تھا۔ پھانسی گلے میں ڈال کر یعنی گلا گھونٹ کر ہلاک کرنا برطانیہ کا پرانا دستور تھا۔ لیکن یہ بات اسی جگہ ختم نہ ہو جاتی تھی۔ جان نکلنے کے بعد مجرم کی لاش کو یا بہ زنجیر حالت میں شارع عام پر لٹکا بھی دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی سرجنوں کو عملی تشریح کی مشق کے لئے دے دیا جاتا تھا۔ بغاوت کے مجرموں کو زیادہ تر آگ میں ڈال کر ہلاک کیا جاتا تھا اور کبھی کبھی تیشے سے ان کی گردن مار دیتے۔

سڑکوں پر گھسیٹ کر مار ڈالنے اور جسم کو چورنگ (چار ٹکڑے) کرنے کی رسم بھی انگلستان میں رائج تھی اور سب سے پہلا شخص جس کو ۱۲۸۳ء میں اس قسم کی سزا دی گئی ویلیس کا شاہزادہ ڈیوڈ تھا۔ سب سے پہلے اس کا پیٹ پھاڑ کر اس کی آنتوں کو اس کے سامنے جلایا گیا، اس کے بعد اس کا سر کاٹ ڈالا اور جسم کو چورنگ کیا گیا۔

گردن مارنے کا وہ طریقہ جسے گلوٹین Guillotine

کہتے ہیں اسی نام کے ایک انگریزی ڈاکٹر سے منسوب ہے، جو اس کا موجد سمجھا جاتا ہے، لیکن انگلستان میں اس کے شروع ہونے سے بہت پہلے فرانس میں یہ طریقہ رائج تھا۔

اس کی صورت یہ تھی کہ لکڑی کا ایک بڑا چوکھٹا زمین پر نصب کر دیا جاتا اور اس چوکھٹے میں اوپر کی طرف ایک بہت بڑا وزنی چھرا رسیوں کے سہارے سے لٹکا دیا جاتا۔ چوکھٹے کے نیچے مجرم کی آنکھ پر پٹی باندھ کر بٹھا دیا جاتا اور چھرے کی رسی ڈھیلی کر دی جاتی اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چھرا مجرم کی گردن پر آگرتا اور سر فوراً کٹ کر علیحدہ ہو جاتا۔

تیشہ یا تبر سے گردن مارنے کا رواج سب سے پہلے رومیوں اور یونانیوں کے یہاں شروع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں میں رائج ہو گیا جیسا کہ فرانس اور انگلستان میں بہت سے اُمراء اور بادشاہوں کی گردن تیشے ہی سے اڑائی گئی۔

اسرائیلیوں میں سزائے موت بہت سے جرائم کی سزا تھی اور اس کا زیادہ مقبول طریقہ سنگسار کرنا یا آگ میں ڈال دینا تھا۔ بابل میں پانی کے اندر ڈبو کر ہلاک کرنے کا طریقہ زیادہ اچھا سمجھا جاتا تھا اور اسیریا میں گرم سلاخیں بھونک بھونک کر جان لینا زیادہ پسندیدہ امر خیال کیا جاتا تھا۔

قدیم روما میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ مجرم کو پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے ڈھکیل دیتے۔ وہاں کوڑے مارنے کا بھی وحشیانہ رواج تھا جس سے بمشکل ہی کوئی جانبر ہو سکتا تھا۔ یہاں ایک اور عجیب قاعدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کو مار ڈالتا تو اسے ایک بندر، ایک کتے، ایک مرغ اور ایک سانپ کے ساتھ ایک بورے میں باندھ کر پانی کے اندر ڈبو دیتے۔

کوڑے مارنے کی سزا انگلستان میں بہت سخت تھی۔ کوڑے میں کچے چمڑے کے نوکدار تسمے لگے ہوتے تھے، جن کی ہر ضرب سے جسم کا گوشت کٹ کٹ کر چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔

روس میں بھی بہ عہد زار کوڑے مارنے کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہاں کوڑے کے تسموں میں نوکیلے خاردار لوہے کے ٹکڑے بندھے ہوتے تھے جو جسم کے اندر پیوست ہو جاتے تھے اور جب وہ باہر آتے تو گوشت کے ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لے آتے۔

کوڑے مارنے کی سزا جسمانی اذیت پہونچانے کے لحاظ سے، بڑی ہی ظالمانہ سزا تھی، لیکن انسان یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان کو اذیت پہونچانے میں خود انسان نے کتنی بے رحمی سے کام لیا اور عہد تہذیب و تمدن میں بھی اس کی درندگی کم نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ دور شقاوت اب ختم ہو چکا ہے اور سزا کے مسئلہ پر زیادہ علمی طریقے سے غور کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ سزائے موت ساری دنیا سے اٹھ جائے اور قیدخانے جو مجرموں کو صرف محنت شاقہ میں مبتلا رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے اصلاح خانوں میں تبدیل کر دئے جائیں، جہاں مجرموں کی ذہنیت کی اصلاح نفسیاتی طور پر کی جائے اور وہ ایک مفید شہری بننے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکیں۔

کوثر چاند پوری

دُودھ کے جھاگ!

سامنے کھڑی اُونچی عمارت کو دیکھتے ہی لچھو بھنگن کا دل دھڑکنے لگا، اس نے سوچا نہ جانے ماں کہاں لے آئی، کچّی دیواروں کے چھوٹے سے جھونپڑے میں جس کے اُوپر پھوس کا چھپّر پڑا ہُوا تھا وہ پیدا ہوئی تھی اور پھر ایسے ہی ایک جھونپڑے میں بیاہ کر آ گئی اور اپنے پتی کے ساتھ نیا جیون بتانے لگی۔ آس پاس شوروں کے ٹول تھوتھنیوں سے زمین کرید کر آموں کی گٹھلیاں اور ایسی ہی دوسری چیزیں ڈھونڈتے رہتے، ان کے بچّے اپنی کالی یا بھوری ماؤں کے تھنوں سے چپٹے دودھ چوسا کرتے، ان دونوں جھونپڑوں میں اس نے کبھی اس عالیشان محل کا سپنا بھی نہ دیکھا تھا، یوں تو رات کو سوتے میں اسے روز ہی خواب دکھائی دیا کرتے تھے مگر ان کی شکل دوسری ہوتی تھی، مثلاً ایک رات اس نے خواب دیکھا اس کے قریب ہی ایک بہت بڑا محل بننے لگا ہے اس کے مالک نے گھسو بھنگی کو بُلا کر حکم دیا ہے کہ تم فوراً اپنا بوریہ بستر اُٹھا کر یہاں سے بھاگ جاؤ اور شوروں کے اس ٹال کو بھی لے جاؤ، یہاں میری اٹاری بن رہی ہے اور پھر وہ اٹاری بن کر تیار ہو گئی اور لچھو سیمنٹ سے بنی کھڑکیوں کو صاف کرنے وہاں گئی تو اُسے یوں لگا جیسے سورگ یہی ہو، مگر یہ محل تو اس سے بھی بڑا تھا، جہاں اس کی ماں نے اسے ٹم ٹم میں سے اُتار کر لا کھڑا کیا تھا۔ اندر بہت سی عورتیں سفید، دودھیا کپڑے پہنے گھوم رہی تھیں۔ ان کے سروں پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یوں لہرا رہے تھے جیسے دیوی کی مورتی پر لگے جھنڈے پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ ان عورتوں کو عمر میں پہلی بار ہی اس نے دیکھا تھا۔ یہ اپسرائیں نہ تھیں، پریاں بھی نہ تھیں مگر اُن سے بہت مختلف تھیں اور اپنے مقابلے میں وہ ان میں سے ہر عورت کو اپسرا یا پری ہی کہہ سکتی تھی۔

"لچھو تو یہیں کہیں بیٹھ میں کسی سے تو رو بوکا پتہ پوچھ لوں۔"

اس کی ماں بھوری نے کہا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے داماد گھسو مہتر کی پہلی بیوی بچہ جنتے وقت مر گئی تھی اس کے پیٹ میں آنول نال پھنس گئی تھی اور قصبے کی کوئی دائی اسے ہاتھ لگانے کو تیار نہ ہوئی تھی۔ زہر اس کے بدن کی ساری رگوں میں گھس گیا اور وہ ختم ہو گئی۔ چھ مہینے بیت جانے پر گھسو نے لچھو سے بیاہ کر لیا اور اب اسے بھی نواں مہینہ لگ چکا تھا۔ پہلی بیوی کے دم توڑنے کا۔ ماں گھسو کی آنکھوں میں بھی گھوم رہا تھا اور بھوری کے کانوں میں بھی سُنی سنائی باتیں گونج رہی تھیں۔ ادھر ہسپتال کی بہت سی باتیں اُسے نورو دھوبن نے بتائی تھیں، اسی لئے وہ بیٹی کو یہاں لے آئی تھی۔

"کوئی نکال تو نہ دے گا یہاں سے؟"

"کون نکال سکتا ہے باؤلی، یہ تو عورتوں کا ہسپتال ہے!"

"چھوٹے سے مندر میں تو کوئی گھسنے نہیں دیتا ہمیں اتنے بڑے ہسپتال میں کون رہنے دے گا۔" اس نے کہا اور پھر سوچنے لگی۔ سشترا آ کر ماں بھول تو نہیں گئی کہ وہ بھوری بھنگن ہے اور میں اس کی بیٹی لچھو ہوں گھسے مہتر کی دوسری بیوی۔

مندر اور ہسپتال میں بڑا بل ہے لچھیا مندر میں اونچی ذات والوں کے دیوتا رہتے ہیں جو نہ جانے کب سے ہمیں اپنے چرنوں سے دُور ہی رکھتے آئے ہیں اور تو رو کہتی تھی ہسپتال میں دیس کا نیا قانون لاگو ہو چکا ہے جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے وہ یہاں بیماروں کے کپڑے دھوتی ہے نا اسے سب چیزوں کا پتہ ہے۔

"جلدی کر ماں پیٹ میں درد بہت ہونے لگا ہے۔"

"یہیں بیٹھ جا میں ابھی آتی ہوں۔"

لچھو لال پھولوں سے لدے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی اور بھوری تو رو

کو ڈھونڈنے چلی گئی، لوہے کا پھاٹک کھلا تھا موٹریں اندر اور باہر آجا رہی تھیں ان میں گورے چٹے ملکھر ملوں والی عورتیں عمدہ کپڑے پہنے ہوئے بیٹھی تھیں ! ان کے بچے کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر ہنس رہے تھے کسی کے ہاتھ میں نارنگی تھی اور کوئی سیب دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا ———— ———— ماں نورو خالہ کی باتوں میں آکر نہ جانے کس بھول میں پڑ گئی اُس نے اپنے میلے اور پھٹے لہنگے کی طرف دیکھ کر سوچا یہ لہنگا سال بھر پہلے اپنے بیاہ میں اُس نے پہنا تھا میاں نے ٹھکانے جھاڑنے کے لئے ایک نیلی ساری بھی لا دی تھی جسے وہ سویرے پہن لیا کرتی تھی اور دوپہر کو اُتار کر یہی لہنگا پہن لیتی تھی اس پر جگہ جگہ ٹھکانوں سے ملی ہوئی ترکاریوں کے نشان تھے، اور ایک بہت بڑا دھبہ کڑھی کا بھی تھا۔ کئی مہینے پہلے سیٹھ کندن لال جی کی بہو نے ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کاڑھے ایک کٹورے میں بھری کڑھی اس کی ہنڈیا میں ڈال دی تھی اور اس کی بسا ہند ناک میں چڑھ گئی تھی اور اتنے زور کی ابکائی آئی تھی کہ سارا کھایا پیا نکل گیا تھا وہیں بیٹھ کر وہ اوں اوں کرنے لگی تھی تب سیٹھ کندن لال جی نے تیوری چڑھا کر نفرت کے ساتھ کہا تھا

" رام، رام، یہیں پھینک دیا! "

اور پھر گھر کی عورتوں نے خوب بُرا بھلا کہا تھا۔

اس وقت کڑھی کے اس دھبے سے اسی قسم کی باس اس کی ناک میں گھسی جا رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی بھلا اس میلے لہنگے کو پہن کر لچھو بھنگن جیسے مہتر کی دوسری بیوی یہاں کیوں کر رہ سکتی ہے جہاں اونچے گھرانے کی عورتوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ جس جگہ اس قسم کی عورتیں ہوتی ہیں وہاں کوئی نہ کوئی دیوتا ضرور ہوتا ہے اور دیوتا کے چرنوں میں بھنگنوں کا کیا کام، ہم میلا اٹھانے اور سیٹھ کندن لال جی کی جھاڑنے والی بھنگنیں تو ہمیشہ دیوتاؤں سے دور ہی رکھی جاتی ہیں ———— دیوتا ہمارے چھونے سے پلید ہو جاتے ہیں نا! وہ یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اُس کی ماں نورو ایک اور عورت کو ساتھ لئے آئی وہ بالکل چٹے کپڑے پہنے تھی اور سر پر ایک سفید ململ بنا ہوا تھا، جیسے دودھ پر جھاگ اکٹھے ہوئے ہوں۔

" ہمارے پیچھے آؤ بہن! "

اس نے بڑی نرمی سے چٹکی بجا کر لچھو کو مخاطب کیا یہ نرم اور لوچدار آواز پہلی مرتبہ لچھو کے کانوں میں پڑی تھی پہلے پہل گھسو نے بھی ایسی ہی میٹھی رسیلی آواز سے پکارا تھا۔ لیکن بعد کو وہ بھی گالیاں دینے لگا تھا اور بعض دفعہ تو بُری طرح جھڑک دیا کرتا تھا ان گالیوں اور جھڑکیوں سے تنگ آکر کبھی کبھی وہ رو دیا کرتی تھی اور اسے روتا دیکھ کر اس کی پڑوسن سکھیا بھنگن اسے تسلی دینے لگتی تھی ———— " یہ گھسا ایسا نہ ہوتا تو رنڈوا ہی کیوں ہو جاتا اس کا بس چلے تو تیرا بھی گلا گھونٹ دے، میں خوب جانتی ہوں اس کی ناک پر غصہ کیوں رکھا رہتا ہے ہر وقت " ———— اور لچھیا کی آنکھوں میں بھرے آنسو ایک دم سوکھ جاتے وہ چونک پڑتی! کیوں رکھا رہتا ہے غصہ میرے آدمی کی ناک پر، ٹھکانوں کی عورتیں بھی اسے جھڑکتی ہی رہتی تھیں۔

" ارے یہ آم کی گٹھلی یہیں چھوڑ دی تو نے! دن بھر مکھیاں بھنکتی رہیں گی ———— کیا چربی چھا گئی ہے آنکھوں پر؟ "

لیکن یہ عورت نہ جانے کہاں کی رہنے والی ہے شاید اس کے دیس میں بھنگی نہ ہوتے ہوں گے یا اسے پتہ نہیں کہ میں ذات کی بھنگن ہوں اسے معلوم ہو گیا تو ضرور یہ بھی بُری طرح مجھے ڈانٹ دے گی آگے آگے وہ عورت اس کے پیچھے نورو، پھر سب سے پیچھے لچھیا چلتی رہیں اور لچھیا کے پیٹ میں کلبلاہٹ ہوتی رہی کبھی درد کی ٹیس بھی چلنے لگتی، سیڑھیاں چڑھ کر سب ایک بڑے سے کمرے میں پہونچ گئیں، برابر بہت سے پلنگ بچھے تھے ان پر سفید چادریں پڑی تھیں، کچھ پلنگوں پر اونچی ذات کی گوری چٹی عورتیں ننھے ننھے بچوں کو بغل میں لٹائے پڑی تھیں۔ ہر پلنگ کے قریب ایک خوبصورت میز تھی۔

" یہ پلنگ خالی ہے بہن تم اس پر لیٹ جاؤ! "

دودھ کے جھاگ سے آواز نکلی — لچھیا نے ایک ساتھ اپنی ماں اور اور نورو خالہ کی طرف دیکھا پھر اپنے لہنگے اور ڈوپٹے پر نگاہ کی۔

" پہننے کو ساری مل جائے گی تم لیٹ جاؤ جلدی سے! " لچھیا لیٹی نہیں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اسے ڈر تھا کہیں یہ معلوم ہو جانے پر کہ وہ بھنگن ہے اور جنم بھر میلا اٹھاتی رہی ہے دودھ کا یہ جھاگ اُبال نہ کھانے لگے۔ پلنگ پر بچھی ہوئی چادر بہت ہی سفید تھی ایسی صاف سُتھری چادر پر تو کیا اس نے اور ایسی چیز پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا جو اتنی سفید ہو ایک مرتبہ سیٹھ کندن لال کا آنگن جھاڑتے وقت اس کا پاؤں ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑ گیا تھا تب سیٹھانی نے چڑ کر کہا تھا۔

" کیا آنکھیں چرنے چلی گئی ہیں کاغذ پر پاؤں رکھ دیا۔ "

اور اس وقت یہ آواز پھر اس کے کانوں میں گونج گئی اور اس نے سہم کر عورت کی طرف دیکھا کہیں وہی تو نہیں ڈانٹنے لگی لیکن وہ پٹی کے قریب کھو گئی

مسکراہٹ تھی۔ اس کی گوری گوری کومل اُنگلیوں میں قلم دبا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کاغذ تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا ؟"

"لچھو ! "

"اور گھر والے کا ؟"

وہ چُپ رہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی پھیل گئی۔ چنبیلی کی کلی سے بھی ہلکی اور گلاب کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک ہنسی،

"مجھے مہتر ـــــ" وہ جلدی سے بول اٹھی

"ہری جن ہو تم ؟"

"نہیں ہم بھنگی ہیں" مجبوری بولی

"ہاں ہاں وہی ہری جن ! ـــــ ہم بھنگی نہیں کہتے تمھیں ہری جن ہی کہتے ہیں۔ ہری جن کا مطلب ہے پاک۔ تم بھی بالکل پاک ہو پھول کی طرح پوتر"

لچھو کو ایسا لگا جیسے دودھ کے جھاگوں کی مٹھاس اس کے منہ میں آ بھر گئی ہو، اور جیسے اس شہر کی ریت ہی نرالی ہو۔ یہاں سفید کو سیاہ اور گرم کو ٹھنڈا کہتے ہوں۔

"ڈرو مت لچھو لیٹ جاؤ!" اس کا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا چھاتی پر آ لگا اور ہلکے دباؤ کے ساتھ اس نے لچھو کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اس دباؤ میں محبت اور انسانیت کی لچک تھی، نفرت اور حقارت بالکل نہ تھی۔ لچھو اپنے میلے چکٹ کپڑوں میں لپٹی سفید چادر پر لیٹی سوچ رہی تھی جیسے وہ بھی آدھی دودھ کی ہو گئی ہو اور پھر اسے پانی ملا ہوا دودھ یاد آ گیا، جو ننھے حلوائی کی دوکان سے روز ہی وہ اپنے لئے لیا کرتی تھی۔ اس میں دودھ کی سفیدی کے اندر پانی کی نیلاہٹ جھلکتی رہتی تھی بالکل اسی طرح جیسے چادر کی سفیدی میں اس کے میلے کپڑوں کا رنگ جھلک رہا ہو وہ بھی اپنے آپ کو پانی ملا دودھ سمجھنے لگی آدھی سفید آدھی نیلی اور جب اسے ایک سفید ساری پہننے کو دیا گیا تو یقین آ گیا کہ وہ ننھے حلوائی کی دوکان پر بکنے والا پانی ملا دودھ نہیں بلکہ گائے کے تھن سے ٹپکی ہوئی وہ دھار ہے جس میں ہلکی مٹھاس، سہتی سہتی گرمی، اور عجیب سی لذت ہے وہ بالکل خالص دودھ ہے اس میں کوئی میل اور کھوٹ نہیں، پیشہ نے اس کی آتما کو نہیں بگاڑا ہے اِن اونچی ذات والوں نے شریر کو اوپر سے گندہ کر دیا ہے۔ نورو اس عورت کے ساتھ چلی گئی، اور تھوڑی دیر بعد ہی ڈاکٹرنی آ گئی وہ

نئے آئے ہوئے بیماروں کو دیکھتی بھالتی لچھو کی طرف آئی تو قریب کے پلنگ پر لیٹی ہوئی ایک زچہ نے دبی زبان سے کچھ کہہ کر لچھو کی جانب انگلی اٹھائی۔

"آپ کو شکایت ہے کہ برابر کے پلنگ پر بھنگن کو لٹا دیا گیا ہے جسے مندر سے آپ لوگ بھگا دیتے ہیں۔ مگر یہ مندر نہیں ہاسپٹل ہے۔ یہاں ذات نہیں دیکھی جاتی بیماری دیکھی جاتی ہے اور ویسے آپ سب کی ذات ایک ہے، عورت عورت میں کوئی فرق نہیں، سب ہی اپنے پیٹ سے لڑکا یا لڑکی کو جنم دیتی ہیں آپ اطمینان رکھیں لچھو کی کوکھ سے بھی ویسا ہی بچہ پیدا ہوگا جیسا آپ کی چھاتی سے چپٹا ہوا ہے۔ بھنگن کُتے کو جنم نہیں دیتی، سانپ اور بچھو کو بھی نہیں وہ بالکل اسی طرح کا بچہ جنتی ہے جیسا کوئی اونچی ذات والی عورت جن سکتی ہے ہم لچھو کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ آپ کو اس سے ڈر لگتا ہے تو آپ اپنے گھر جا سکتی ہیں۔ ہاسپٹل میں سب برابر ہیں یہاں کوئی پلنگ آگے پیچھے نہیں سب ایک لائن میں بچھے ہوتے ہیں ـــ دیکھو ماتھے پر سلوٹ مت ڈالو، ہم لوگ ایک ٹیبل پر ہر عورت کو لٹا کر اس کے پیٹ سے بچہ نکالتے ہیں اور کسی کو چھونے سے نہیں ڈرتے انھیں ہاتھوں سے ہری جنوں کو چھوتے ہیں اور انھیں سے برہمنوں اور راجپوتوں کو، یہ ہاسپٹل ہے اور میں ڈاکٹر ہوں، میرا دھرم ہے سب کو سکھ پہونچانا۔ آپ لوگ میری نگاہ میں پہلے عورت اس کے بعد کچھ اور ہیں میرے اس دھرم سے کسی کو گھن نہیں آنی چاہیئے کیونکہ یہی اب سارے دیش کا دھرم ہے۔" وہ خفا سی ہو گئی تھی اس کے چہرے پر ہلکی سُرخی نمودار ہو چکی تھی اپنی بات ختم کر کے وہ لچھو پر جھک گئی اس کی لمبی اور نرم انگلیاں اس کے پیٹ پر دوڑ رہی تھیں۔ اچھی طرح دیکھ کر اس نے نرس کو آواز دی

"سسٹر ـــــ انھیں میز پر۔ ٹائم بالکل قریب ہے !"

اور پھر اس زچہ کی طرف مڑ کر کہنے لگی۔

"آپ آرام سے لیٹی رہیں ہری جن عورت آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس کے سر پر میلے کا ٹوکرا نہیں انسانیت کا تاج ہے آپ میلے سے گھن کر سکتی ہیں انسان سے نہیں" وہ جلد ہی زچہ گھر میں چلی گئی اور بھوری ایک جگہ کھڑی سوچتی رہی۔ گاؤں کی دائی ہمارے شریر کو چھونے سے بھی ڈرتی ہے اور یہ ڈاکٹرنی تو جیسے سچ مچ اپنی برابر ہی سمجھتی ہو ہائے شہر کی دُنیا تو بدل گئی گاؤں میں ابھی اندھیرا ہی چھایا ہوا ہے۔ پر یہ ہسپتال اور یہ ڈاکٹرنی موجود ہے تو جلد ہی گاؤں اور شہر ایک ہو جائے گا، یہاں جو نیا قانون لاگو ہے وہ سب جگہ دیے

جلا دے گا مجبوری آنکھیں بند کئے دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور نہ جانے وہ کب تک یوں ہی بیٹھی سوچتی رہتی لیکن پکے فرش پر دوہے کے پہیئے کھڑکھڑانے لگے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اسٹریچر پر لچھو آنکھیں بند کئے لیٹی تھی، پیچھے پیچھے ایک نرس بچہ کو لئے آرہی تھی۔ اس کے منہ سے مہین سی چیخیں نکل رہی تھیں، جیسے شہد کی مکھی بھنبھنا رہی ہو بچہ کے منہ سے نکلی ہوئی چیخیں سارے وارڈ میں اس طرح پھیل گئیں۔ جیسے پھول کھلتے ہی اس کی مہک ہر طرف بکھر جاتی ہے۔ لچھو کو اسی پلنگ پر لٹا دیا گیا وہ نیم بے ہوش تھی اور ننھا ہاتھ پاؤں مارتا اُسی طرح چیخے جا رہا تھا، جیسے وہ اپنی ماں سے کہہ رہا ہو ——— "ماں تو کسی سے چھوٹی نہیں، اب کوئی تجھے نیچ نہ سمجھے گا۔ میرے ساتھ وقت کا جو طوفان آرہا ہے وہ سب کے اونچے سر جھکا دے گا ——— میں کوئی معمولی بچہ نہیں وقت کا ایک اہم تقاضہ ہوں" ذرا دیر بعد ہی اس قریب والی زچہ کے پہلو میں پڑا ہوا بچہ بھی چیخنے لگا اور ایسا لگا جیسے ان دونوں کی چیخیں آپس میں گتھ گئی ہوں اور ان سے ایک ہی آواز آرہی ہو ——— ہم دونوں ایک ہیں ——— نئے قانون اور نئے وقت کے نقیب ہمارا دھرم اور ہماری ذات بھی ایک ہے ——— امن، دوستی اور انسانیت اسی وقت ڈاکٹرنی بھی مسکراتی ہوئی اُدھر سے گذری اس نے چلتے چلتے کہا "بچہ بچہ سب ایک ہے، ان میں کوئی فرق نہیں اور ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ دونوں مائیں ایک دوسرے کے بچے کو اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا دیں تاکہ بڑے ہو کر یہ پُرانے بندھنوں کو توڑ ڈالیں"۔ قریب والی زچہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "ہر بچہ ایک سا کیونکر ہو سکتا ہے ——— میچھ کہیں کی"، اس نے ساری کے پلو سے منہ ڈھانک لیا، شاید وہ اس گھونگھٹ کی مدد سے اپنے دماغ میں بھرے ہوئے اندھیرے کو اور زیادہ بڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکٹرنی کے الفاظ برابر اس کے دماغ میں آندھی کی طرح سنسنا رہے تھے۔ "بچہ بچہ سب ایک ہے" اور یہ سنسناہٹ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے بہت اندر سے امنڈتی ہوئی روشنی گھونگھٹ کے پھیلائے ہوئے اندھیرے کو پرے دھکیل دینا چاہتی ہو اور دودھ کے وہ جھاگ اب بھی ان عورتوں کے سروں پر جمے ہوئے تھے جو وارڈ میں اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔

ریویو کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

موسیقی نمبر کے باب میں

سید اختر علی تلہری

"آج کل" بہت اچھا نکل رہا ہے۔ فنِ موسیقی سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں لیکن پھر بھی آپ کا موسیقی نمبر دلچسپی سے پڑھا۔ آپ نے اس سلسلے میں خاصا مواد جو دوسروں کو مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتا تھا یکجا فرما دیا ہے اور اس طرح فنِ موسیقی کی نظری حیثیت سے گراں قدر خدمت کی ہے۔ اس نمبر کے پڑھنے سے اس فن کے بارے میں میری معلومات میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔

بھارت جیوتی، بمبئی

گذشتہ پندرہ سال سے ماہنامہ "آج کل" نے ایک ادبی اور ثقافتی رسالے کی حیثیت سے اپنا بلند معیار قائم رکھا ہے۔ اس رسالے میں جو پُر از معلومات اور مفید مضامین شائع ہوتے ہیں، اُن میں مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان کے مابین ثقافتی تعلقات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ رشتہ نہ صرف قائم رہنا چاہیئے بلکہ ملک کے وسیع تر مفاد میں ثقافتی لین دین کے ذریعے اس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

رسالہ "آج کل" اپنے خاص نمبروں کے لئے مشہور ہے۔ امسال اس نے اپنا "موسیقی نمبر" نکالا ہے جس میں ہندوستانی موسیقی کا ایک عام جائزہ پیش کیا گیا ہے مثلاً "علمِ موسیقی" کے زیرِ عنوان ہندوستانی موسیقی کا ایک علمی جائزہ دیا گیا ہے۔ "ہندوستانی موسیقی کا ارتقاء" ہندوستانی موسیقی کی عہد بہ عہد ترقی کا آئینہ دار ہے۔ "امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی" میں امیر خسرو کی خدمات کا ذکر ہے اور "ہندوستانی موسیقی اور ٹیگور" میں ہندوستانی موسیقی میں ٹیگور کے مقام اور ان کے تعلق سے بحث کی گئی ہے۔ رسالے کی کتابت، [illegible] اور شکل و صورت نہایت اچھی ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

پیام روزانہ حیدرآباد

"آج کل" کے ادارے نے جس خوش سلیقگی اور حسنِ اہتمام کے ساتھ اپنا "موسیقی نمبر" شائع کیا ہے بلاشبہ وہ ایک ایسا مفید اور قابلِ قدر اقدام ہے جس کی بدولت ہندوستانی موسیقی سے عام لوگوں کو روشناس کرانے اور فنِ موسیقی کے عالمانہ پہلو کو اُجاگر کرنے میں بہت بڑی مدد ملی ہے اور ادارہ "آج کل" اپنے اس لائقِ تحسین کارنامے کے لئے ہر طرح قابلِ مبارکباد ہے۔

اوپندر ناتھ اشک

نیا ہدایت کار

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ کچھ یہی حال سوشل ورکر کا ہے۔ اس کے سر میں جب کھجلی ہوتی ہے تو اسے ناٹک کھیلنے کی سوجھتی ہے۔ میں اپنے شہر کی ایک مذہبی معاشرتی سوسائٹی کا نیا نیا سیکرٹری ہوا تھا، جب مجھے بھی کچھ ایسی ہی سوجھی۔ میں جس کالج میں پڑھتا تھا وہ ایسے طبقے سے متعلق تھا جو فنونِ لطیفہ کا سخت مخالف تھا۔ نئی نئی عمر، نیا جوش اور کچھ کر گزرنے کی لگن لیکن کالج میں نہ کنسرٹ ہو نہ ناٹک نہ مشاعرہ۔ لڑکوں کو مکمل برہمچاری بنانا اُن کا آدرش۔ اس لئے کوئی نوجوان کچھ کر گزرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اپنے کالج اور سماج سے باہر ہاتھ پاؤں مارنا ضروری تھا، بدقسمتی سے میں انھیں نوجوانوں میں سے تھا۔

مجھے کچھ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا ناٹک بے حد اچھے لگتے تھے۔ نیو الفریڈ کمپنی اور ماسٹر رحمت کی کمپنی کے ایک دو ناٹک دیکھ چکا تھا۔ سینما گھر شہر میں نیا نیا کھلا تھا۔ اس کے ڈیرائرکٹر کو گانٹھ لیا تھا اور ہر فلم دیکھ آتا تھا۔

کالج کے اس روکھے سوکھے ماحول میں جی کیسے لگتا اور جی تھا کہ کچھ کر گزرنے کو بے قرار تھا۔ اک شام جاکر شہر کے سیوا دل کا ممبر بن گیا۔

ان دنوں شہروں میں 'سیوا دل' کی بڑی دھوم تھی۔ ہمارے دھرم شکشا کے پروفیسر لفرت سے اسے نہ جانے کیا کیا پکارا کرتے تھے۔ لیکن چوں کہ انھیں لفرت تھی اس لئے ہمیں الفت تھی۔ شاید لاشعور میں انھیں چڑانے کی غرض ہی سے میں دل' کا ممبر ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ صرف یہی بات نہ تھی۔ دل کی سرگرمیاں دلچسپ تھیں۔ شہر میں جتنے میلے ہوتے تھے ان میں دل کے والنٹیر سب انتظام کرتے تھے۔ رام لیلا کے جلوسوں میں دل کے والنٹیر فوجی وردی میں ملبوس اپنے شاندار بینڈ باجے کے پیچھے پیچھے قدم سے قدم ملاتے چلتے تھے۔ اور رام لیلا کے میدان میں رام لیلا کا سارا انتظام کرتے تھے۔ سالانہ تقاریب اور دھارمک تھاؤں میں بڑے بڑے پنکھے جھلتے اور 'سجنوں' اور 'دیویوں' کو پانی پلاتے تھے۔ اس کے علاوہ رام نومی اور جنم اشٹمی کے موقعے پر ایک ناٹک کھیلتے تھے۔ میں اسکول کے دنوں میں اسکاوٹ رہا تھا۔ مجھے سیوادل کی وردی، ورزش قواعد، بینڈ باجے اور رام لیلا کے جلوس میں آگے آگے فوجی طریق پر چلنا بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ دل کی ممبری کے دوسرے بھی فائدے تھے۔ دل کا ممبر دل کی تمام سرگرمیوں میں بلاٹکٹ حصہ لے سکتا تھا میں ممبر بنا تو دل نے ایک مشاعرہ کرنے اور ناٹک کھیلنے کی سوچی اور دو کمیٹیاں بنا کر ان دونوں کا سیکرٹری مجھے بنا دیا۔

دل کے پاس اپنے پردے تھے۔ والنٹیروں کی کمی نہ تھی بلکہ ناٹک کے دنوں میں ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تھیئیٹر ہال تو نہیں تھا لیکن سیوا سبھا کا، جس کے تحت یہ دل کام کرتا تھا چار دیواری سے گھرا ہوا احاطہ تھا۔ دل کے والنٹیر اس میں تختوں اور بانسوں کی مدد سے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسٹیج بنا کر اسے پردوں سے لیس کر دیتے تھے۔ میں دل کے ایک دو ناٹک پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے ان کا اہتمام بڑا آسان معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے جب مجھے جنم اشٹمی کے موقع پر "ویرابھیمنیو" کھیلنے کا حکم ملا تو میں بڑا خوش ہوا۔

جی تو میرا یہی چاہتا تھا کہ میں خود ایک دھارمک ناٹک لکھوں اور وہ دل کی اسٹیج پر کھیلا جائے، لیکن جب کئی بار کوشش کرنے کے باوجود میں ناٹک لکھنے میں کامیاب نہ ہوا تو کئی کاغذ اور کاپیاں پھاڑنے کے بعد میں نے یہی طے کیا کہ مشہور کتھا واچک ــــ کا ناٹک "ویرابھیمنیو" لے کر اس کی قطع برید سے ہی اپنے شوق کی تسکین کر لوں۔

لیکن پہلی مشکل یہی پیش آئی کہ دل کے ارکان جیسا کہ میں نے پہلے کہا

قریب قریب اَن پڑھ تھے۔ ان کے خیال میں ویراَ بھیمنیُو ناٹک سارا ان کا دھا رمک گرنتھ تھا اور اس کی ایک لائن بھی کاٹنا پاپ تھا۔ غنیمت یہی تھا کہ دَل کے سیکرٹری پڑھے لکھے تھے ان کو میں نے سمجھایا کہ ناٹک کے شروع ہی میں مصنف نے انگریزوں کی غلامی کا ثبوت دیا ہے۔ نٹی کہتی ہے۔ "یدی ہمارے ویر بلوان کا گئو گان سُن کر شترو تاپئوں میں ویر رس جھلک آئے اور یہ رسک سماج ویر سماج ہو کر برٹش سرکار کی طرف سے دشمنوں کا منہ توڑنے کے لئے بَیٹل فیلڈ میں پہنچ جائے۔" یہ فقرے آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کو نہایت بُرے لگیں گے۔ اس کے علاوہ ایمپیرا اسٹیج کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے کچھ ناچ گانوں اور مناظر کو کاٹنا ضروری ہے۔ ہمارے سیکرٹری اگرچہ برٹش سرکار والی لائن کو بُرا نہ سمجھتے تھے لیکن انھیں اپنی مخالف انجمن "سیوا سمتی" کا خوف تھا۔ جس میں بہت سے آزادی پسند لوگ تھے۔ اس لئے اُنھوں نے نٹ نٹی کا سارا منظر کاٹنے کی اجازت دے دی اور ناٹک میں حصّہ لینے والے ممبروں کی ایک میٹنگ بُلا کر انھیں سمجھا دیا کہ ناٹک کمپنی کا سیکرٹری ناٹک میں جو کاٹ چھانٹ کرے گا اسے وہ خود دیکھ لیں گے، پاس کریں گے اور تب ناٹک ہوگا۔ انھوں نے یہ بھی سمجھایا کہ ناٹک کو چھوٹا کرنا ضروری ہے تاکہ دو تین بجے تک ختم ہو جائے۔ پورا کھیلا جائے گا تو صبح کے پانچ بج جائیں گے۔

میں نے ناٹک کو اچھی طرح پڑھا اور نہ صرف اس میں قطع برید کی، بلکہ اپنے جوش میں کچھ مکالمے بھی بڑھائے اور دو چار جگہ اشعار کاٹ کر اپنی طرف سے جڑ دیئے۔ نام تو مصنف کا ہی رہا لیکن میرے شوق کی تسکین ہو گئی۔

یہاں تک کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن جب ڈرامے کے کرداروں کی تقسیم کا سوال آیا تو ایسا لگا جیسے میں نے بھڑ کے چھتّے کو چھیڑ دیا ہے۔ ابھیمنیُو کا پارٹ کون کرے اس بات پر جھگڑا ہو گیا۔ دَل کی ناٹک منڈلی میں دو اداکار ابھیمنیُو کا پارٹ کرنا چاہتے تھے۔ دونوں دوکاندار تھے ایک کپڑے کا دوسرا کوئلے کا۔ دونوں کی عمر پچیس سے تیس برس کے درمیان تھی جبکہ ابھیمنیُو کی عمر صرف پندرہ سولہ برس کی تھی۔ ممبروں کی کثرت رائے بزاز کے حق میں تھی۔ اس کا نام تھا۔ نِکّا۔ وہ نہ صرف دَل کا ایک سرگرم ممبر تھا بلکہ دَل کا بینڈ ماسٹر بھی وہی تھا۔ بانسری بجانے میں سارے شہر میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور وہ پہلے بھی دو ایک بار ویرا بھیمنیُو بن چکا تھا۔ تھا تو ناٹے قد کا۔ ناک بھی اس کی چپٹی تھی اور بدن بھی دوہرا تھا لیکن اس کے بال لمبے گھنگھریالے تھے اور اسٹیج پر پارٹ کرتا ہوا جب وہ جوش سے سر ہلاتا تو بڑا اچھا لگتا تھا۔ اسے ابھیمنیُو کا پارٹ دینے کے سلسلے میں مجھے ایک ہی اعتراض تھا۔ وہ یہ کہ اس کی عمر ابھیمنیُو کے نہیں اس کے پتا ارجن کے برابر تھی۔ آج جب میں دیکھتا ہوں کہ منجھے ہوئے ایکٹر ایسے کرداروں کے روپ میں اسٹیج یا فلم کے پردے پر اترتے ہیں جہاں عمر کے لحاظ سے ان کے پوتے ہونے چاہئیں تھے اور دیکھنے والوں کو ذرا بھی بُرا نہیں لگتا تو مجھے اپنی اس وقت کی ناتجربہ کاری اور بچکانہ ضد پر ہنسی آتی ہے۔

بہرحال جب میں نے ان دونوں امیدواروں کی جگہ اپنے ایک ہم جماعت کا نام تجویز کیا تو وہ شور مچا کہ خدا کی پناہ۔ دَل کے ارکان دو کانیں بڑھا کر اور کھانا وانا کھا کر نَو ساڑھے نَو بجے میٹنگ میں آئے تھے تو ساڑھے بارہ بجے تک ڈٹے ہوئے تھے اور کرداروں کی تقسیم کے سلسلے میں متواتر جھگڑا ہو رہا تھا۔ آخر اس رات چھوٹے چھوٹے کردار بانٹ دیئے گئے اور اہم کرداروں کی تقسیم دوسرے دن پر اُٹھا رکھی گئی۔

دوسرے دن جب میں کالج سے آ رہا تھا کہ امام صاحب کے چوک میں، جہاں بزاز کی دوکان تھی اس نے مجھے اپنے چند ایک غنڈے ساتھیوں کے ساتھ گھیر لیا اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کے ابھیمنیُو بننے کے راستے میں کچھ رکاوٹ ڈالی تو اس سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اور بھی بیسیوں دھمکیاں دیں اور بڑی مشکل سے میرا راستہ چھوڑا۔

بزاز ابھیمنیُو بنا تو کوئلہ فروش جیدرتھ۔ ایک تیسرے صاحب تھے جو شہر کے ایک سیٹھ گھرانے سے متعلق تھے اور جیدرتھ بننے کے متمنی تھے، لیکن مکالمہ ایک بھی ٹھیک نہ بول سکتے تھے۔ سوچ سوچ کر اُنھیں پروڈیوسر بنا دیا گیا اور خدا خدا کر کے کسی طرح ریہرسل شروع ہوئی۔

ان ریہرسلوں میں کیا کیا ہُوا کتنے دل چسپ اور تلخ تجربات ہمیں حاصل کئے، کتنے بحث مباحثے جھگڑے جھانسے روٹھنا منانا ہوتا رہا۔ ان سب کی تفصیل دینے لگوں تو نہ جانے کتنے صفحات رنگنے پڑیں، لیکن ویرا بھیمنیُو کھیلے جانے کے سلسلے میں ایک قصہ بڑا دل چسپ ہے جو مجھے بار ہا یاد آتا ہے۔

میرے اس ہم جماعت کو جس کا نام میں نے ابھیمنیُو کے سلسلے میں تجویز کیا تھا ناٹک میں پارٹ کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ تھا بھی خوبصورت اور سلونا۔ گاتا بھی اچھا تھا۔ جب میں اُسے ابھیمنیُو کا پارٹ دلانے میں کامیاب نہ ہُوا تو میں نے اُس سے کہا کہ چاہو تو میں تمھیں ابھیمنیُو کی بیوی اُتّرا کا پارٹ دلا سکتا ہوں۔ اس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ میرے دوست کو عورت کے

روپ میں اسٹیج پر اُترنا گوارا نہ تھا، لیکن میں نے آرٹ اور اس کے لئے ریاضت پر گھنٹوں لیکچر پلا کر اسے منا لیا۔ اس نے اپنا پارٹ بھی خوب یاد کر لیا۔ ڈریس ریہرسل میں اجینو اور اُترا کا پارٹ ہی بہترین سمجھا گیا۔ پہلے ایکٹ کے آخر میں بزاز نے اجینو کا پارٹ ادا کرتے ہوئے مرنے سے پہلے دھوکے سے کوروؤں کے چنگل میں پھنس کر اپنا لمبا مکالمہ —"تو تھو ہے —" سے شروع کیا تو آخر تک پہنچتے پہنچتے اس نے سامعین کی آنکھوں کو پُرنم بھی کر دیا اور اُن کا خون بھی کھولا دیا اور پھر اس ہم جماعت نے جب ایک ہی سین کے بعد اُترا کے روپ میں اپنا وہ ڈائلاگ ادا کیا۔ " ہاں پیچ پچ میں اُنمادِنی ہو گئی ہوں، ورہنی نہیں، دیوگنی نہیں، وشادنی ہو گئی ہوں

ستی وہی جس کا رہے ساجن سے انوراگ

دھنیہ وہی سنسار میں جس کا اٹل سوہاگ "

تو لوگ عش عش کر اُٹھے۔ لیکن ناٹک کی رات جب میرا ہم جماعت پہلے ایکٹ کے پانچویں منظر میں (جہاں اجینو رَن میں جانے سے پہلے اپنی بیوی سے ملنے آتا ہے) اپنا پارٹ کر کے آیا تو گرین روم میں ستور سا مچ اُٹھا اور دوسرے لمحے میرے ہم جماعت کے والد بزرگوار ہمارے دھرم شکھشا کے پروفیسر کے ساتھ آنکھیں لال کئے ہوئے والنٹیرز سے لڑتے بھڑتے اندر آئے اور اپنے بیٹے کو زبردستی انھیں کپڑوں میں گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ ان کے غیظ و غضب کا باعث یہ نہ تھا کہ اس نے ناٹک میں پارٹ کیا اور عورت کے روپ میں کیا بلکہ مخالف دَل کے ناٹک میں کیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آگ ہمارے دھرم شکھشا کے پروفیسر کی لگائی ہوئی ہے اور انھوں نے ہی میرے ہم جماعت کے والد کو بہکایا ہے۔ لیکن میری یہ سمجھ اس وقت میرے کسی کام نہ آئی کیوں کہ اس وقت میرے تو سبھی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ دوسرا کوئی ایسا ایکٹر نہ تھا جسے اُترا کا پارٹ یاد ہو اور جو اسے بخوبی انجام دے سکے۔ دَل کے سیکرٹری نے گرین روم میں آ کر سبھی والنٹیروں کو اکٹھا کر کے اُترا کا پارٹ ادا کرنے کے سلسلے میں بڑی زوردار تقریر کی لیکن کوئی بھی والنٹیر تیار نہ ہوا۔ تب وہ میری طرف بڑھے اور بولے کہ تم ڈائرکٹر ہو تمہیں پارٹ یاد ہوگا، تمہیں اُترو۔

پارٹ مجھے یاد تھا۔ میں اُترا بننے کو تیار بھی ہو گیا۔ میرا قد بھی اپنے ہم جماعت جتنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس منظر کے بعد اُترا بیدھوا کے روپ میں آتی ہے۔ سفید ساڑھی پہنے ہوئے، پہچانا نہ جاؤں اس لئے یہ طے کیا گیا کہ گھونگھٹ نکالے رہوں لیکن ایک ہی دقت تھی۔ ان دنوں میرے ہونٹ پر چارلی چیپلن جیسی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں مجھے چارلی چیپلن کے فلم بڑے پسند تھے۔ میں نے کالج میں داخل ہوتے ہی ویسی مونچھیں رکھ لی تھیں اور کبھی کبھار اس کی نقل بھی کیا کرتا تھا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی، حجام تو کیا ملتا، سیکرٹری صاحب نے ایک والنٹیر کو اپنے اور دوسرے کو میرے گھر بھیجا کہ حجامت کا سامان لائے اور میں اُترا کا میک اپ کرنے لگا۔

وِگ اور ساڑھی بلاوز پہن جب میں ریزر کے انتظار میں شیشے کے آگے بیٹھا تھا کہ پہلا ایکٹ ختم ہو گیا۔ وقفہ پندرہ منٹ کا تھا لیکن ہم آدھ گھنٹے تک انتظار کرتے رہے اور والنٹیر نہ آئے۔ آخر جب میں نے جھنجھلا کر پردہ اُٹھانے کا حکم دیا تو دونوں ہانپتے ہوئے آئے۔ سیکرٹری کے گھر تالا لگا تھا ان کی ماں اور بیوی ناٹک دیکھنے آئی ہوئی تھیں اور میرا گھر کسی کو ملا نہیں۔ والنٹیر غالباً نئے نئے بھرتی ہوئے تھے۔ تب یہ طے ہوا کہ جب مجھے گھونگھٹ ہی میں رہنا ہے تو مونچھیں ہوئیں تو کیا اور نہ ہوئیں تو کیا۔ دوسرے ایکٹ کا پہلا منظر بہت چھوٹا تھا۔ جلد ہی میری باری آ گئی اور میں پردے کے پیچھے جا کر اُترا کے سونے کے کمرے میں پلنگ پر سو گیا کیوں کہ اُترا خواب دیکھتی ہے اور وہیں سے وہ منظر شروع ہوتا ہے اور جب پورے منظر میں اپنا مکالمہ ادا کرتا ہوا آخر ان سطروں پر آیا——

" ہاں میں پیچ پچ اُنمادِنی ہو گئی ہوں۔ ورہنی نہیں دیوگنی نہیں —— وشادِنی ہو گئی ہوں —— " تو نہ جانے کیسے سکھیوں کا پارٹ کرنے والے لڑکوں میں سے کسی کی شرارت تھی یا میں پارٹ کرنے کے جوش میں اپنی جنس بھول گیا، میرا گھونگھٹ اُٹھ گیا اور سامعین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک بھیانک قہقہہ گونج اُٹھا۔

میری کیا گت بنی اس کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ میں دوسرے دن گھر سے نہیں نکلا اور کالج سے میں نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی اور اپنے پتا جی کے پاس شہر سے دور ایک گاؤں کو چلا گیا۔

'موسیقی نمبر' کی محض چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔ شائقین حضرات اس پتے سے طلب فرمائیں
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

رشید قریشی

اجنتا کی عورت کے زیورات

اجنتا کے آرٹسٹ نے عورت کے حُسن کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ نرگسی آنکھیں، جیسے ابھی ابھی بڑی گہری نیند سے جاگی ہیں، ابھی ابھی پھر سو جائیں گی۔ ستواں ناک جیسے پانی کی لہر کو کاٹتی ہوئی چاند کی کرن۔ گول شانے، جیسے ندی کا موڑ۔ نازک بازو جیسے پھولوں کی ڈالیاں۔ پتلی لانبی انگلیاں جیسے بانس کی پتیاں۔ لوچدار کمر جیسے گھنگھرو کی لرزتی گونج!

اجنتا میں عورت تصویر نہیں ایک گنگناتا ہوا شعر بن گئی ہے اور شاید انھیں جھکی جھکی پلکوں اور نیم باز آنکھوں کی التجاؤں کے جواب میں اجنتا کے آرٹسٹ نے عورت کی ان خوبصورتیوں کو زیورات سے بھی سجا دیا۔

مشاطہ گری کے اس کمال کی داد کس طرح دی جائے سمجھ میں نہیں آتا کہ زیورات کی خوبصورتی عورت کو حسین بنا رہی ہے یا عورت کا حُسن زیورات کو خوبصورت بنا رہا ہے۔ اس گتھی کو میں اس طرح سُلجھاتا ہوں کہ اجنتا میں عورت، عورت نہیں، تخلیق کے ماتھے کا ایک ایسا انمول زیور ہے جس کی چھاپ دمک سے صبحیں طلوع ہوتی ہیں۔ زمانہ عورت کے مقام کو اپنے اختیار اور مرضی کے مطابق متعین کرتا آیا ہے۔ لیکن یہ اجنتا کے آرٹسٹ کا احسان ہے کہ اس نے عورت کو اس کے حقیقی مقام پر پہونچا دیا۔ اجنتا میں عورت لطیف جلوہ سامانیوں اور الوہی خلوتوں کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہے۔ زیورات کے لئے عورت کی لگن اس کی کمزوری مانی جاتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کمزوری کے لئے اجنتا کے آرٹسٹ کا کمال جواب دہ ہے۔ عورت نے یہیں اپنے آپ کو دیکھ کر اپنے عورت پیدا ہونے پر فخر محسوس کیا۔ یہیں زیورات سے سجنے کی امنگ اس کے دل میں پیدا ہوئی ورنہ پھولوں کو شبنم کے موتیوں سے آراستہ ہوتے بھی دیکھا تھا۔۔۔ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں زیورات کی نئی نئی وضعیں، ان کی جدت پسند کاریگری ان کے استعمال کی مدرتیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ اس زمانے کی عورت اپنی نانیوں اور دادیوں سے بہت زیادہ خوش قسمت ہے۔ لیکن آج سے دو ہزار برس پہلے کے اجنتا کو دیکھنے کے بعد شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ آرزو نہ کرنے لگتی ہو کہ کاش وہ اس زمانے والی ہوتی اور کوئی پرواہ نہیں اگر اسے مر کر دو ہزار برس گزر چکے ہوتے۔۔۔۔ آئیے میں آپ کو زیورات کی اس کان میں لے چلوں جو عورت کا ایسا سنگھار گھر تھے کہ دنیا کے آرٹسٹ، شاعر، فلسفی اور ادیب اس کی جھلکیوں سے اپنے خیال بناتے ہیں، جہاں سے کوئی عورت سنور کر نکلتی ہے تو تخت و تاج اس کے قدموں میں سر جھکاتے ہیں۔ سجدے اس کے قدموں سے اپنی پیشانی رگڑتے ہیں۔ غار نمبر (۹) اجنتا کے بہت پرانے غاروں میں سے ہے۔ اس کی تیاری کا زمانہ ۵۰ ق۔م سے ۲۰۰ عیسوی کے درمیان ہے۔ اس میں ایک ناگا جوڑا دکھایا گیا ہے۔ عورت کی کمر میں موتی کی لڑیاں جھول رہی ہیں۔ کان جُھریوں سے آراستہ ہیں۔ بالوں کو جوڑے کی شکل میں ایک کپڑے کی مدد سے سر پر پیدا گیا ہے اور اس کپڑے پر موتی کی لڑیاں ٹنکی ہوئی ہیں۔ مرد ناگا کے بھی زیور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے پُرانے زمانے میں عورت اور مرد کے جمالیاتی ذوق میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ آرائش کے معاملے میں وہ دونوں بہت ہم مذاق تھے۔ مرد ناگا نے جو اپنے بال باندھے ہیں اس کی وضع عورت کے جوڑے سے ملتی جلتی ہے۔ بازوؤں پر تین جھکر دار ڈنڈولیاں اور ہاتھوں میں چوڑیوں کے بجائے دھاتی کڑے ہیں۔ گلے میں بھی باندوں کے دیوے کی شکل کی ہنسلیاں پڑی ہیں کانوں میں چکریاں بھی نظر آتی ہیں۔

غار نمبر (۱۰) کے صرف درمیانی حصے میں نقش و نگار باقی ہیں۔ اس میں مختلف جاتکائیں یعنی بھگوان بدھ کی جنم کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ اس میں عورت کے زیور

بہت عجیب اور انوکھے ہیں۔ ایک عورت کی کمر میں ٹیکا سا بندھا ہوا ہے اور اس کا فال Fall اور اس کا انداز استعمال ایسا آویزہ ہے کہ نئے سے نئے فیشن پرانے نظر آئیں۔ یہاں کی تصویروں میں جو عورت ہے اس کے ہاتھ میں چوڑیاں ڈنڈ پہ ڈنڈولیاں، سر پر کہیں پھولوں کہیں موتیوں کے گلٹ اور کہیں کپڑے کی پٹی نظر آتی ہے لیکن کانوں میں زیور نہیں جو غار نمبر (۹) میں ہیں اور ایک عجیب چیز یہ بھی دکھائی دیتی ہے کہ ایک عورت پاؤں میں چپل پہنے ہوئے ہے۔ غار نمبر (۶) میں ایک عورت بودھی ستو کے پیچھے کھڑی دکھائی گئی ہے۔ اس کا صرف بسٹ Bust نظر آتا ہے اور وہ ہاتھ میں تھال لئے ہوئے ہے۔ اس کا جوڑا بڑے انداز میں بندھا ہوا ہے اور اس پر موتی کی ایک لڑی اس طرح بل کھاتی گئی ہے جیسے کالے کالے بادلوں میں بجلی کوندتی چلی گئی ہو۔ اس موتی کی لڑ کا ایک سرا جوڑے کے چکر کاٹتا ہوا اس خوش نما انداز سے کان کے نیچے لٹک آیا ہے کہ بالوں کا زیور پورے چہرے کو نکھارنے لگا ہے۔ گلے میں موتیوں کی مالا بھی پڑی ہوئی ہے۔

غار نمبر ۱-۲-۱۶-۱۷ اور ۱۸ میں زیورات کی وضع بدل گئی ہے۔ ہر زیور میں نفاست اور کاریگری کا کمال جھلکتا ہے اور یہ زیور قیمتی جواہرات اور موتیوں کے بنے ہوئے ہیں اور راجاؤں رانیوں اور ان کی ساتھ والی عورتوں کے جسم پر آراستہ ہیں۔ خادماؤں اور کام کرنے والیوں کے جسم پر بھی زیور ہیں لیکن وہ ایک دو سے زائد نہیں اور وہ بھی بھدی قسم کے۔

غار نمبر (۱) میں دیکھنے والے کی طرف پیٹھ کئے جو عورت بیٹھی نظر آتی ہے اس نے اپنے گلے کے زیور کی ڈوریوں کو پشت پر ٹائی کی شکل میں باندھا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی میں چھلا ہے۔ اسی غار میں پدما پانی کی تصویر کی بائیں جانب جو نوجوان جوڑا دکھایا ہے اس میں عورت نے جو کمر پٹہ باندھ رکھا ہے وہ بہت ہی خوش نما ہے۔ وجرا پانی کا مالا اور پدما پانی کا تاج تو بناوٹ کی خوبی اور جواہرات کے فنکارانہ استعمال کا شاہکار مانے جاتے ہیں۔ اجنتا کے غار دوسری صدی سے آٹھویں صدی تک منقش ہوتے رہے لیکن چھٹی اور ساتویں صدی کے زیورات بے حد خوبصورت اور نفیس ہیں۔ اجنتا کے زیور کے بارے میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نفیس زیور اس زمانے میں واقعتاً مروج تھے۔ یا یہ صرف اجنتا کے آرٹسٹ کی حسن کارانہ تخلیق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجنتا کا بھکشو آرٹسٹ رانیوں اور راجکماریوں کی بانکی اداؤں سے بہت دور تھا۔ لیکن اس بات کا بھی قرینہ ہے کہ بھکشو ہونے کے باوجود اس نے اپنے آس پاس کی عورتوں کے زیور دیکھے ہوں گے۔ وہ داستانیں سنی ہوں گی جو راج محلوں کی آرائش و زیبائش سے متعلق ہر عورت کی زبان پر ہوں گی۔

اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ راجاؤں اور امیروں نے اپنی من پیاریوں کی تصویریں بنانے کے لئے اس کو طلب کیا ہو۔ بہرحال اجنتا کا آرٹسٹ زیورات کی نقاشی میں اصل کاریگر کو مات دے گیا ہے۔ اجنتا کی عورت عام طور پر ان زیورات سے آراستہ نظر آتی ہے ٹیکہ، کان کی بالیاں، ایک ایک ہاتھ پہ دو دو چوڑیاں، پاؤں میں کڑے، بازو بند، ڈنڈولیاں، کمر پٹہ، ایک تصویر میں تو ران پر بھی ہیرے اور موتیوں کا زیور دست بند کی وضع کا نظر آتا ہے گلے کی مالائیں اور ہار، موتی اور ہیرے کے سرپیچ، جھومر، کان میں دو چھوٹی چھوٹی بالیاں (ایک کان کے نچلے حصے میں دوسری اوپری حصے میں) اور چاند بالیاں۔ راجاؤں کے تاج بڑی چابک دستی سے بنائے گئے ہیں۔ لیکن جہاں عورت کے سر کی زینت کا سوال درپیش ہوا ہے اجنتا کے آرٹسٹ نے آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں۔ جوڑے کو سجایا تو جیسے آفتاب کو طلوع ہونے کی جگہ بتا دی۔ پیشانی پر ٹیکہ دمکایا تو جیسے چاند کو گہنا دیا۔ کوئی عورت ایسی نہ ہوگی جو یہ تمنا نہ کرتی ہو کہ اجنتا کی عورت زندہ ہو جائے، ان غاروں سے نکل کر دھرتی پر راج کرے، اپنی الوہی عظمتوں کے ساتھ، اپنی لطیف جلوہ سامانیوں کے ساتھ، اپنے دیدہ زیب زیوروں کے ساتھ، اپنے چمکیلے تاجوں کے ساتھ۔ اجنتا میں صرف تصویروں ہی میں زیور نہیں سنگین مورتیوں میں بھی زیورات بڑی ہنرمندی اور صفائی سے تراشے گئے ہیں ایسے کہ پتھر میں اصل موتیوں کی آب و تاب آگئی ہے۔

اجنتا کے زیورات میں موتیوں کی کثرت ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے راجاؤں اور امیروں کے لئے موتیوں کی بارش ہوتی تھی یا ایسے درخت اگتے تھے جن میں موتیوں کے خوشے لگتے تھے۔ موتیوں کے علاوہ ہیرے، فیروزہ اور یاقوت کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اجنتا کا آرٹسٹ زیورات کے معاملے میں بڑا فیاض ہے وہ آرائشی مصوری کا ماہر ہے۔ اور جہاں کہیں اسے جگہ خالی نظر آئی ہے اس نے زیور سجا دئے ہیں ہاتھیوں کی پیشانیوں پر پاکھریں زیوروں سے سجی ہوئیں، ان کے کانوں پر موتی کی لڑیاں جھولتی ہوئیں اور ان کے گلے میں گھنگھرو پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ستونوں تک پر زیور اتارے گئے ہیں۔ ایک انگریز ماہر فن گلاڈا اسٹون سالومن نے اس بارے میں بڑے لطیف خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ اجنتا کے آرٹسٹ نے عورت کو ہر اس زیور سے آراستہ کیا جو ایک فنکار ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے ممکن تھا۔ اور جب وہ ان زیورات سے عورت کو سنوار چکا اور اس نے دیکھا کہ کچھ زیور بچ رہے ہیں تو اس نے ان موتیوں کی مالاؤں کو ستونوں پر سجا دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ عورت کی ایسی سچی اور جاندار پرستش کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی

ٹیلیفون

مرزا خوش بخت کی خوش بختی پر کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ آدمی بھی وہ کہ مٹی کو ہات لگائے تو سونا ہو جائے۔ اللّے تللے خرچ کرتے لیکن چشم بددور، کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ کسی شوق کو جی چاہا اور وہ پورا نہ ہو سکا۔ اور روپیہ کمانا تو ان کے بائیں ہات کا کھیل تھا۔ بات کی بات میں روپیہ پیدا کرتے۔ مرزا کی خصوصیت یہ تھی کہ جو بات بھی دل میں ٹھان لیتے کر کے چھوڑتے، اب آخر یہ کون سی بڑی بات تھی کہ ان کے ایک مدرسے کے ہم جماعت جو اب بہت بڑے بیرسٹر ہو گئے تھے، ہزاروں کے آدمی تھے۔ ہاں تو ایک دن اُن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ پہچانے نہیں۔ آخر تیس برس بعد ملاقات بھی تو ہوئی تھی۔ بس یہ بات مرزا کے دل کو لگ گئی۔ غصے میں آگ بگولا ہو گئے اور ایسے گرمائے جیسے کسی نے چونے پر پانی چھڑک دیا ہو۔ جھٹ جا کر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور چند سال کے اندر اندر وکالت کا امتحان دیا اور باقاعدہ وکیل بن گئے۔ اپنے مکان کے سامنے ایک احاطہ اپنے نام کا بورڈ بھی لگوا دیا اور تب کہیں جا کر ان کو تسکین ہوئی۔

لیکن وکالت کہیں ایک دو دن میں چلتی ہے، کبھی کبھی تو برسوں لگ جاتے ہیں اور مؤکل کی شکل کو آدمی ترس جاتا ہے۔ دن بھر ایسے بیٹھا رہنا پڑتا ہے جیسے دریا میں ڈوگی ڈالے مچھلی کا شکاری۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور چونک پڑا۔ لیکن اللہ کا نام و مچھلی کہیں یوں آتی ہے۔ مرزا خوش بخت سارے دن بیٹھے رہتے لیکن مؤکل تو کیا کوئی آدمی مشورے تک کو نہ پھٹکتا۔ پہاڑ سا دن یونہیں ختم ہو جاتا۔ مرزا صبر کے قائل نہ تھے۔ سوطانوں پر ہمیشہ دعاؤں کو ترجیح دیتے۔ ایک مرتبہ جو ذہن پہ زور ڈالا تو اُچھل پڑے۔

"ارے رمضان خان! بتیا تا ذ عقل بڑی کہ بھینس۔"

رمضان خان وکیل صاحب کے محرر یہ عجیب بات سُن کر چونک پڑے۔ اب نہ جانے مرزا خوش بخت کیا کہلوانا چاہتے تھے، لیکن آدمی تھے زوردار، تڑپ کر بولے "سرکار اگر آپ کی عقل ہے تو بھینس چھوٹی ہے اور اگر میری ہے تو پھر بھینس ہی بڑی ہوگی۔"

مرزا خوش بخت نے قہقہہ لگایا۔ بولے "میاں ابھی بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب ذہن میں آگئی ہے، لیکن اگر تیسرے کو معلوم ہوا تو میری وکالت گئی اور تمہاری روٹی۔" رمضان خاں ایک چپکیت آدمی تھے علاوہ کیوں کسی کو اس راز میں شریک کرتے اور جب روٹی کا معاملہ بیچ میں اُلجھا ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بس پھر کیا تھا، چند روز میں دیکھتے کیا ہیں کہ مرزا خوش بخت وکیل کے گھر میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے گھنٹی بج رہی ہے اور مرزا خوش بخت بڑے بڑے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ رمضان خاں نے کچہری میں سارا دن گزارا اور اگلے دن صبح صبح دو مؤکل نمودار ہوئے۔ کاشتکاری کا مقدمہ تھا۔

مرزا نے مسکراتے ہوئے کاغذات دیکھے اور کہا۔ "ارے بھئی معاملہ کیا ہے، تم ٹھیک ٹھیک حال بتاؤ۔ مقدمہ جیتنا ہارنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ویسے اللہ کی مرضی میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مقدمے اور موت کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے۔ لیکن کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہے جو میں اتنے یقین سے کہہ رہا ہوں" ابھی مرزا خوش بخت شاید کچھ اور بولتے کہ دوسرے کمرے سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز آئی۔ مرزا کو اس وقت بہت غصہ آیا اُلجھ کر رہ گئے۔ ہنستے ہنستے پٹک دیا۔ "واللہ ہے رمضان خاں! اس ٹیلیفون نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ پانچ منٹ چین سے بیٹھنے کو نہیں نصیب ہوتا۔ ذرا دیکھنا تو کون کم بخت ہے جس نے ایسے بے وقت یاد کیا ہے۔"

رمضان خاں نے جا کر وہیں سے آواز دی۔ "وکیل صاحب! ڈپٹی صاحب

آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، کہہ رہے ہیں کوئی ضروری کام ہے۔"

مرزا کی تیوری پہ ایک ساتھ تین چار بل پڑ گئے: "ارے میاں ان کا ضروری کام، خوب جانتا ہوں حرامخور کو، یاد پڑا پریشان کر دیا۔ دن بھر فون کرنا۔ اب بھلا بتاؤ آدمی اپنا کام کرے یا ان کاموں کا ہو کر رہ جائے۔"

احمد دین کاشتکار نے کہا۔ "نہیں حضور کوئی بات نہیں۔ ہمیں ایسی کون سی جلدی ہے۔ آپ اطمینان سے بات کر لیجئے۔ وقت کہیں بھاگا نہیں جاتا۔"

مرزا نے ٹیلیفون پر باتیں شروع کر دیں۔ کہاں تو فون سے پریشان ہو رہے تھے اور کہاں اب جو باتیں شروع کی ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ مرزا خوش بخت کے آگے آیت تو مشکل ہی سے آتی ہے۔ کہہ رہے تھے

"ارے بھئی ڈپٹی صاحب، آج تو معاف کرو، کل دیکھا جائے گا۔ آج تو مجھے بے حد کام ہے۔ مؤکل بیٹھے ہیں اُن کو چھوڑ کر کیسے آ سکتا ہوں۔" پھر ذرا سی دیر کی خاموشی ہوئی۔ احمد دین کاشتکار کے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ارے بھائی یہ تو بڑے تعلقات کے آدمی ہیں۔ ڈپٹی صاحب سے ایسے بات کر رہے ہیں۔ اور پھر مرزا صاحب نے بولنا شروع کر دیا۔

"ارے بھئی رام چرن یہ صحیح ہے، تمہاری طرف سے مجھے خود اطمینان ہے کہ فیصلہ تو تم ہمارے ہی حق میں کرو گے، لیکن بھئی مؤکل سے تم کو کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ بیٹا تم تو تقدیر کے دھنی ہو جو تم کو یونیورسٹی چھوڑتے ہی ڈپٹی کلکٹری مل گئی اور ہم یہاں سارا دن خاک چھانتے ہیں تب کہیں جا کر بیس پچیس روپیہ کماتے ہیں تمہارا ہمارا کیا مقابلہ۔"

اب پھر مرزا خاموش ہو گئے۔ شاید ڈپٹی رام چرن اُدھر سے کچھ کہہ رہے تھے۔ احمد دین کاشتکار کے کان بدستور کھڑے تھے — ارے بھئی یہ تو ڈپٹی رام چرن کے دوست ہیں اُن ہی کے یہاں تو اپنا مقدمہ ہے واہ بھئی واہ — اب تو احمد دین کی باچھیں کھل گئیں۔ چلو کیا زوردار وکیل ملا ہے۔ پھر فوراً ہی وکیل صاحب کی صاف آواز سنائی دی۔

"بھئی رام چرن، مان جاؤ یار۔ آج معاف کر دو۔ کل ضرور آؤں گا۔ مجھے مقدمے کے بارے میں بھی بات کرنی ہے۔ اگر تم نے مدد کر دی تو پھر یقین جانو تمہاری شاندار پارٹی کروں گا۔ لیکن آج کسی طرح نہیں آؤں گا — اچھا بھائی آداب عرض۔"

اب مرزا خوش بخت سیدھے کمرے میں داخل ہوئے اور چپ چاپ سر جھکائے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں اور پھر اک دم بولے۔

"رمضان خاں! بھئی اگر اب ڈپٹی صاحب کا فون آئے تو کہہ دینا باہر گئے ہیں یا کسی طرح ٹال دینا۔ میں تو پریشان ہو گیا۔ صبح سے تین بار ٹیلیفون کر چکے۔"

احمد دین کاشتکار نے کہا۔ "وکیل صاحب آپ میری فکر نہ کریں۔ اگر ڈپٹی صاحب بُلا رہے ہیں تو ضرور جائیے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی بہانے ہمارا بھی کچھ کام ہو جائے۔ ان ہی کے یہاں تو ہمارا مقدمہ ہے۔"

مرزا خوش بخت نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی یہ مجھے خود معلوم ہے اسی لئے تو اتنی دیر کم بخت کی بکواس سنی۔ تمہارے مقدمے کا اشاروں ہی اشاروں میں میں نے ذکر بھی کر دیا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ وہ تو مسل دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے تو میں نے تم سے کہا تم آج جا کر چاور تان کر بے فکری کی نیند سوؤ۔ اللہ نے چاہا تو پالا اپنے ہی ہاتھ رہے گا۔ رام چرن میرے ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں، البتہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ایسی باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں ورنہ اُلٹی پڑ جائیں گی مقدمہ بھی ہاتھ سے جائے گا اور عزت بھی۔"

احمد دین کاشتکار بھلا کیوں کہنے لگے تھے، وہ کچی گولی تو کھیلے نہ تھے۔ بات کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اب رُپے کی بات ہوئی۔ مرزا نے منہ مانگی رقم طے کی۔ آدھی تو اسی وقت لے لی۔ پھر ڈپٹی صاحب کی دعوت کا خرچہ الگ سے۔ احمد دین کو مقدمہ جیتنا تھا رُپے کی انھیں فکر نہ تھی۔

اللہ کا کرنا ایسا ہُوا کہ سوا مہینے کے اندر ہی اندر احمد دین کے مقدمے کا فیصلہ ہو گیا اور وہ بھی موافقت میں۔ بس پھر نہ پوچھئے ان کی خوشی کا ٹھکانا۔ اب تو وہ خود وکیل صاحب کے مکان پر مؤکل لے لے کر آتے اور بے دام کے غلام ہو گئے۔ مرزا خوش بخت کی وکالت بھی انھیں تعلقات کے سہارے اچھی خاصی چلنے لگی۔

ایک دن رمضان خاں ایک مؤکل لے کر آئے اور سرگوشی کے انداز میں بولے "میاں یہ شکار ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ سیکڑوں کی بات نہیں ہزاروں کا معاملہ ہے۔ بس خیال رہے۔"

مرزا خوش بخت نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "واہ بھئی کیا بات کرتے ہو۔ میاں اگر مؤکل ہاتھ سے نکل جائے تو یہ مونچھیں ابھی کھڑے کھڑے منڈوا دوں وہ دن گئے جب سارا دن یونھیں گزر جاتا تھا۔ بس تم آدمی لے کر آؤ اور میں اسے نکلنے نہ دوں گا۔" وکیل صاحب پان کا بیڑا منہ میں رکھ کر اپنے دفتر میں داخل ہوئے ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور نظروں ہی نظروں میں دیکھ لیا کہ اسامی ابھی رقم طے کر جائے گا مرزا اپنی نظروں سے مؤکل کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے قصائی اپنے ہاتھوں جانور کو ٹٹولتا ہے۔ مرزا

کرسی پر آ کر بیٹھے اور مؤکل کا معاملہ سُننا شروع کر دیا۔ ابھی ان سے بات کرتے ہوئے ایک گھنٹہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ خادمہ داخل ہوئی اور بولی۔

"وکیل صاحب! محمود خاں مجسٹریٹ کی بیگم تشریف لائی ہیں اور آپ کو یاد کر رہی ہیں۔"

مرزا نے کہا۔ "بھئی ان سے کہہ دینا کہ ابھی ذرا سی دیر ٹھہریں میں ایک صاحب سے باتیں کر رہا ہوں۔ آتا ہوں۔"

مؤکل نے کہا: "وکیل صاحب آپ اندر ہو آئیے میں ابھی بیٹھا ہوں۔"

اب مرزا صاحب زنانخانے میں داخل ہوئے۔ زنانخانے کا کمرہ دفتر سے ملا ہُوا تھا۔ اندر کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

مرزا صاحب کہہ رہے تھے۔ "بھابی آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں محمود خاں کو چھوڑ دوں۔ اس زمانے میں مقدمات کی بھرمار ہے۔ سر کھجانے کو فرصت نہیں ملتی۔ ورنہ آپ بتائیے کبھی ایسا ہُوا ہے کہ میری محمود خاں سے ایک دن بھی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ کلب بھی جاتا تھا تو محمود خاں کی خاطر۔ بچپن کی دوستی ہے دو چار دن کی بات نہیں ہے۔ میں محمود خاں سے محبت نہیں کرتا مجھے تو اپنے محمود سے اتنی محبت ہے کہ اس کے لئے میری جان حاضر ہے۔ آئندہ ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالیئے گا۔"

اب بیگم صاحبہ بولیں۔ "بھائی جان! آپ بھی نہ جانے کیا سمجھے۔ اس روز جو لڑکیوں نے تمہیں پان کے بیڑے میں گُڑ مار رکھ کر کھلا دیا تھا اس کی وجہ سے وہ کہہ رہے تھے کہ کہیں مرزا ناراض نہ ہو گئے ہوں۔"

"ارے بھابی آپ بھی کیا بات کرتی ہیں! اس میں ناراض ہونے کی کیا بات تھی۔ مگر ہاں اس روز تفریح خوب رہی۔ اب جو میں کلّی کر کے مٹھائی کھاتا ہوں جیسے کوئی پھیکی پھیکی سی چیز ہے کسی مٹھائی میں کوئی مزا نہیں اور باقی لوگ خوب مزے لے کر کھا رہے تھے۔ میں سوچتا ہوں نہ جانے کیا بات ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پان کے ساتھ گُڑ مار کھایا ہے۔ یہ لڑکیاں بڑی شریر ہوتی ہیں۔"

بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں تو اس روز پھر لڑکیوں کو خوب ڈانٹ پڑی۔ اچھا تو آپ کب چل رہے ہیں۔"

"بھابی آپ مطمئن رہیں۔" مرزا خوش بخت بولے۔ "ابھی محمود کو فون کرتا ہوں انشاءاللہ سب شکایت دُور ہو جائے گی۔"

مؤکل حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا۔ اچھا وکیل ملا جس کا مجسٹریٹ سے آشنا یارانہ ہے۔ اب مقدمہ کون ہرا سکتا ہے۔ بس یہ وکیل ملے۔

مرزا یہ کہہ کر سیدھے ٹیلیفون کے کمرے میں گئے اور ذرا سی دیر میں فون پر محمود خاں مجسٹریٹ سے باتیں ہونے لگیں۔

"ارے بھئی معاف کرنا۔ یار فرصت نہیں ملتی۔ میں تو بس وکیل ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہ تمہارا خیال ہے کہ روپے کا لالچ ہے۔ ارے یار جتنا کماتا ہوں سب تو تمہارے یہاں کے ضلع افسر کھا پکا کے برابر کر دیتے ہیں۔ میں تو یار باشی میں تباہ ہو گیا۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ آج شام کو ملوں گا۔ ذرا ایک کام میں تم سے مدد لینی ہے ایک مقدمہ ہے یار اگر کام بن جائے تو بڑی بات ہے۔ اپنا دوست ہے۔ مفصل بات شام کو ہوگی، آداب عرض۔"

پھر مرزا کمرے میں آ کر بیٹھ گئے اور مؤکل سے بولے۔ "میاں تمہارا کام بن گیا۔ محمود خاں مجسٹریٹ کے یہاں تمہارا معاملہ ہے۔ ان کی بیگم صاحبہ یہاں آئی ہوئی تھیں اور ابھی فون پر میں نے معاملہ پکّا کر لیا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ آج ہی شام کو جا رہا ہوں۔"

مؤکل نے سارے کاغذات ان کے سپرد کر دئے اور ذرا سی دیر میں تمام معاملات طے ہو گئے۔ مقدمے کی فیس بھی پانچ ہزار طے ہوئی اور مرزا نے خوش خوش مؤکل کو رخصت کیا۔

دو تین مہینے کے بعد اس مقدمے کا فیصلہ بھی مرزا کے حق میں ہُوا۔ اور اب تو سارے شہر میں مرزا خوش بخت کی وکالت کی دھاک جم گئی۔ اس مقدمے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ہر طرف یہی چرچا ہونے لگا۔ سارے شہر میں مرزا کا طوطی بول رہا تھا۔ غرض دھوم مچی ہوئی تھی۔ مرزا کی آمدنی بھی سیکڑوں سے ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔

آخر ایک دن مرزا نے زیرِ لب مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی رمضان خاں یار اب تو اپنی کافی حیثیت ہو گئی ہے ٹیلیفون لگانے کے لئے ایک درخواست تو دے دو۔ اچھا ہے دروازے کے سامنے ٹیلیفون کا کھمبا لگ جائے اور پھر ہم واقعی ان ضلع افسروں سے باتیں کریں۔ اب یہ سلسلہ کچھ مناسب نہیں۔"

رمضان خاں نے ناک پر سے چشمہ سرکاتے ہوئے کہا۔ "اچھا حضور۔ ٹیلیفون تو ہے ہی تار بھی لگ جائے گا۔ ویسے اب ٹیلیفون کی ضرورت ہی کیا ہے لیکن اگر آپ کی مرضی ہے تو یہی سہی۔"

کبیر احمد جائسی

مولانا عبدالسلام ندوی

اور

اُن کی شاعری

یہ مضمون مولانا کی زندگی ہی میں موصول ہوا تھا۔ افسوس کہ ہم اسے جلد شائع نہ کر سکے۔ اب یہ اس وقت شائع ہو رہا ہے جب وہ خود اس دنیا میں نہیں اور کوئی بڑی یادگار ہم قائم نہیں کر سکتے تو یہی مضمون ہی سہی۔ ع کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است (ع۔ م)

غیر مشہور اشخاص کے سوانح و حالات مشہور اشخاص کے سوانح و حالات سے کم دلچسپ نہیں ہوتے۔ اس لئے جو لوگ مولانا سید سلیمان ندوی کو بہت سا جانتے ہیں ان کو تھوڑا سا مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی جان لینا چاہیئے کیونکہ دونوں مولانا شبلی کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور دونوں نے ایک ساتھ اُن سے تربیت حاصل کی ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کبھی سیاسی، مذہبی اور ادبی مجالس کے اسٹیج پر نمایاں نہیں ہوئے تاہم ان کے خلوت کدے اور گوشۂ عافیت کے زیارت کرنے والے ان کو اس دور کے مشہور ادیبوں، مشہور شاعروں اور مشہور مصنفوں سے کم اہم اور قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی زندگی ان کے حالات سے بہت زیادہ دلچسپ اور اہلِ نظر کے لئے جاذبِ توجہ ہے۔ حالات تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک گمنام گاؤں علاء الدین پٹی میں ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر اپنے گھر ہی کے ایک مکتب میں ایک فلک زدہ معلم سید امداد علی سے حاصل کی اور ان سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے خسر مولوی عبداللہ صاحب سے جو اسی ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں چاند پار کے رہنے والے تھے، فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے ایک عزیز مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم کے ساتھ جو کانپور کے مشن کالج میں الف، اے میں پڑھتے تھے، کانپور گئے، اور وہاں عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ الف، اے پاس کرنے کے بعد مولوی محبوب الرحمن خاں آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں بی اے میں داخل ہوئے، اور مولانا عبدالسلام بھی ان کے ساتھ آگرہ گئے اور وہاں جامع مسجد کے مدرسے میں عربی تعلیم حاصل کرنے لگے، اس کے بعد غازی پور گئے جہاں ان کے ایک دوسرے عزیز مولوی شبلی صاحب مدرسہ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے ان سے عربی کی متوسط کتابیں پڑھیں۔ غازی پور سے نکل کر لکھنؤ کے دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوگئے اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

اس وقت دارالعلوم ندوہ کے معتمدِ تعلیم مولانا شبلی نعمانی تھے، اور ان کی اڈیٹری میں ایک علمی رسالہ 'الندوہ' نکل رہا تھا۔ مولانا عبدالسلام نے اس رسالے کے لئے ایک مضمون تناسخ پر لکھا جس کو مولانا شبلی نعمانی نے بہت پسند کیا اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے پانچ روپیہ کا انعام دیا اور 'الندوہ' میں اس مضمون کو ایک مدحیہ نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ مولانا عبدالسلام کی ادبی زندگی شروع ہوئی اور آپ برابر 'الندوہ' میں مضامین لکھتے رہے، یہاں تک کہ 'الندوہ' کے سب اڈیٹر ہو گئے۔ زمانۂ سب اڈیٹری میں وہ دارالعلوم میں ادب کے مدرس بھی مقرر ہو گئے تھے۔ پھر جب مولانا شبلی سیرتِ نبوی کی تصنیف میں مشغول ہوئے تو فراہمیٔ معلومات کے لئے

مولانا کو اپنا اسسٹنٹ مقرر کر لیا، اسی زمانے میں کلکتہ سے 'الہلال' مولانا ابوالکلام آزاد کی اڈیٹری میں نکل رہا تھا اور وہ اس کے لئے دارالعلومِ ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ سے قلمی امداد حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو دعوت دی اور انھوں نے چند مہینوں تک الہلال کے ادارۂ تحریر میں حصہ لیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی انھوں نے کئی بار اس کی دعوت دی۔ بالآخر انھوں نے بھی اس دعوت کو قبول کیا اور چند مہینوں تک اس کے ادارۂ تحریر میں شریک رہے۔ اور بکثرت مضامین لکھے جو 'الہلال' میں گمنام شائع ہوئے۔ ورنہ وہ مولانا کی شہرت کے لئے کافی تھے، لیکن جنگِ عظیم کے بعد چند قابلِ اعتراض مضامین کی بنا پر نومبر ۱۹۱۴ء میں 'الہلال' کو گورنمنٹ بنگال نے ضبط کر لیا اور وہ بند ہو گیا۔ مولانا کے بہت سے مضامین جو 'الہلال' میں چھپنے سے رہ گئے تھے۔ بعد کو 'البلاغ' میں جو 'الہلال' کی جگہ مولانا آزاد کی اڈیٹری میں نکلا، شائع ہوئے، لیکن گمنام، اسی زمانے میں ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں انتقال کیا، مولانا ابھی تک کلکتہ ہی میں تھے۔ مولانا شبلی کے انتقال کے وقت صرف مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی اعظم گڑھ میں موجود تھے اور انھوں نے انتقال کے چند دنوں کے بعد دارالمصنفین کو اعظم گڑھ میں قائم کرنا چاہا اور سید سلیمان صاحب نے مولانا عبدالسلام کو دارالمصنفین میں شرکت کی دعوت دی اور مولانا نے ۱۵ دسمبر ۱۹۱۴ء کو شریکِ دارالمصنفین ہو کر مستقلاً اعظم گڑھ میں قیام کیا اور اب تک یہیں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔

مولانا نے دارالمصنفین میں جو کتابیں لکھیں ان میں اسوۂ صحابہ دو جلدوں میں، شعر الہند دو جلدوں میں، سیرت عمر بن عبدالعزیز، اقبالِ کامل، امام رازی، تاریخ اخلاقِ اسلامی، حکمائے اسلام چھپ کر مشہور اور متداول ہو چکی ہیں۔ یہ تو اوریجنل کتابیں ہیں، ان کے علاوہ متعدد کتابوں یعنی انقلاب الامم، تاریخِ فقہ اسلامی، ابن خلدون وغیرہ کے ترجمے عربی کی کتابوں سے کئے ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے انقلاب الامم کے ترجمے کی ایک خط میں مترجم کو بہت داد دی اور اس کو بہترین ترجمہ قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد کتابوں کے مسودات اب تک غیر مطبوعہ ہیں یعنی شعر العرب، تاریخ التنقید، حکمائے اسلام جلد دوم، تاریخِ اخلاقِ اسلامی جلد دوم۔ چند کتابیں یعنی تاریخ الحرمین اور فطرتِ نسوانی دارالمصنفین سے الگ مطبع صوفی منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات سے بھی شائع ہوئی ہیں اور ان کے علاوہ بے شمار علمی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین لکھے ہیں جو 'الندوہ' اور 'معارف' میں شائع ہوئے ہیں۔ سیرتِ نبوی کی مختلف جلدوں میں بھی ان کے مضامین شامل ہیں اور حیاتِ شبلی کے بہت سے اجزا وہی انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان تصنیفات پر تفصیلی ریویو اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا البتہ اجمالاً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ان میں بعض کتابیں نہایت مقبول ہوئیں، چنانچہ اسوۂ صحابہ جلد اول جامعہ ملیہ کے ابتدائی نصاب میں شامل کی گئی، اور شعر الہند مختلف یونیورسٹیوں کے ایم' اے کے نصابِ اردو میں داخل کی گئی، اس لئے ان تصنیفات نے مولانا کا پایہ بہت بلند کر دیا اور وہ مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن ہوتے رہے اور انٹرنس سے لے کر ایم' اے تک کے پرچے ان کے پاس آتے رہے۔ کانپور کی ایک ادبی مجلس کی صدارت بھی انھوں نے کی اور ملک کے مختلف رسائل ان سے برابر مضامین مانگتے رہتے ہیں۔ مولانا فلسفہ، علم کلام، فقہ، تاریخ، تفسیر، حدیث غرض تمام اسلامی علوم و فنون پر حاوی ہیں اور ان علوم پر مضامین اور کتابیں لکھ سکتے ہیں، علم ادب صرف ان کا تفریحی علم ہے اور اس حیثیت سے انھوں نے تفریحاً کبھی کبھی شاعری بھی کی ہے۔

اخلاق و عادات

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مولانا کے حالات سے زیادہ ان کی زندگی دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہے، اس مختصر فقرے میں میں نے اجمالاً ان کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی طرف جو اشارہ کیا ہے اب اس کی تفصیل کرتا ہوں۔

مولانا کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں صوفیانہ، فلسفیانہ، شاعرانہ بلکہ کسی قدر مجذوبانہ اخلاق و معاشرت کے اجزائے لطیف کی نہایت خوش گوار آمیزش پائی جاتی ہے۔ وہ نہایت سادہ کھانا کھاتے ہیں، نہایت سادہ لباس پہنتے ہیں، نہایت سادے کمرے میں رہتے ہیں، نہ اُن کو برقی پنکھے کی ضرورت ہے نہ بجلی کی روشنی کی حاجت۔ ریاح بواسیری کے مرض میں چالیس سال سے مبتلا ہیں اور کبھی کبھی اختلاج کا دورہ بھی پڑ جاتا ہے اس لئے اطبا نے ان کو ہدایت کی ہے کہ وہ شام و صبح تفریحی مقامات پر مشق کرتے رہیں، لیکن اس تفریحی سیر کو وہ بادیہ نوردی اور بادیہ پیمائی کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ شہر کا کوئی محلہ، کوئی کوچہ اور کوئی راستہ ایسا نہیں جو ان سے آشنا نہ ہو۔ بعض اوقات وہ اس حالت میں مجذوبانہ طور پر بعض ایسے مقامات پر بھی پہنچ جاتے ہیں جن کو اہلِ ظاہر قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ سیر میں وہ بکثرت اشعار آہستہ آہستہ پڑھتے جاتے ہیں، کوئی اس کی وجہ پوچھتا ہے تو کہتے ہیں کہ میں اس طرح ہر گلی کوچہ میں اردو زبان کا پروپیگنڈا کرتا ہوں۔

سکے یہاں متصل مہینوں قیام کرتے اور اپنے ترنّم خیز اشعار سے لوگوں کو محظوظ کرتے رہے۔
اسی زمانے میں اعظم گڑھ کے مشہور شاعر مولوی اقبال احمد سہیل نے اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی اور شاعری کے ذوق کو بلند کرتے رہے۔ اب اعظم گڑھ میں چھوٹے موٹے مشاعرے بھی ہونے لگے، اور مولانا ان میں شریک ہوتے رہے۔ اس کے بعد شعرائے دورِ جدید کا غلغلہ بلند ہوا اور ملک میں بڑے بڑے ہنگامہ خیز مشاعرے ہونے لگے جو اب بہت زیادہ عام ہوگئے ہیں۔ اعظم گڑھ میں بھی اس قسم کے متعدد مشاعرے ہوئے اور دورِ جدید کے مشہور شعراء اُن میں شریک ہونے لگے۔ مولانا نے بھی ان مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھیں بلکہ بعض مشاعروں کی صدارت بھی کی۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا ہوگا کہ مولانا کی زندگی کا ماحول ابتدائے طالب علمی سے لے کر اب تک شاعرانہ رہا اور انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ، بڑے بڑے نقّاد اور بڑے بڑے خوش گو شعراء کی صحبت اُٹھائی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے شاعرانہ حیثیت سے کوئی نمایاں شہرت حاصل نہیں کی، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کا خاص مشغلہ تصنیف و تالیف تھا اور اسی حیثیت سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ کتابیں تو انھوں نے بہت سی لکھیں جو شائع ہو کر مقبول ہوئیں، لیکن اپنا کوئی مجموعۂ کلام نہیں چھپوایا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا کلام کبھی اس مقدار میں جمع ہی نہیں ہوا کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت دورِ جدید کے شعراء کا رنگ مقبولِ عام ہو رہا تھا اور ان کا کلام اس جدید رنگ سے بالکل الگ تھا بلکہ امیر مینائی اور مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی کی شاگردی اور جلال کی حُسنِ عقیدت کی وجہ سے وہ شعرائے لکھنؤ کے متبع سمجھے جاتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لکھنوی شاعری کا رنگ اس زمانے میں کس قدر ناپسندیدہ تھا۔ اب اُن کی شاعری کے متعلق تنقیدی حیثیت سے یہ بحث نہایت اہم ہے کہ اُن کا خاص رنگ کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ناسخ اور تلامذۂ ناسخ کے کلام کا جو رنگ تھا وہ نہایت مبتذل تھا اس لئے رفتہ رفتہ شعرائے لکھنؤ بھی اس رنگ کو چھوڑنے لگے، بالخصوص ریاستِ رام پور میں جب شعرائے دلی و لکھنؤ کا اجتماع ہوا تو دونوں شہروں کی شاعری میں امتزاج ہوا اور امیر مینائی نے لکھنوی رنگِ تغزل چھوڑ کر داغ کی روش اختیار کی اور جلال تقریباً دلی کے رنگ میں کہنے لگے، لیکن اس وقت دلی اور لکھنؤ کا اصلی رنگ باقی نہیں رہا تھا۔ غالب کے فلسفے، میر درد کے تصوّف اور غالب و مومن کی فارسی ترکیبوں اور پیچیدہ اسلوب بیان کو داغ نے بالکل ترک کر دیا تھا، ناسخ کی مضمون آفرینی اور خیال بندی بھی باقی نہیں رہی تھی، صرف عاشقانہ رنگ باقی رہ گیا تھا جو لکھنؤ میں نہایت مبتذل اور عامیانہ ہوگیا تھا، منشی امیر احمد مینائی کا پہلا دیوان مراۃ الغیب اسی رنگ میں تھا لیکن دلی میں یہ عاشقانہ رنگ بہت زیادہ شوخ ہوگیا تھا۔ جلال نے ان دونوں سے الگ ہو کر جو روش اختیار کی وہ نہایت معتدل تھی نہ اس میں امیر کا ابتذال اور عامیانہ پن تھا نہ داغ کی بے باکی اور شوخی مولانا نے اسی معتدل روش کو اختیار کیا اور جلال کے معتقد ہوگئے، لیکن دورِ جدید کے شعراء کے رنگ کو وہ پسند نہیں کرتے، اگرچہ دورِ جدید کے مشہور شعراء کے کلام میں بھی عمدہ اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں تغزل کی چاشنی نہیں پائی جاتی جو غزل کی جان ہے اس لئے وہ جدید رنگ میں نہیں کہتے اور جلال کے معتقد ہونے کی وجہ سے اُن کو لکھنوی شاعر خیال کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ نہ دلی کے شاعر ہیں نہ لکھنؤ کے غزل گو، نہ دورِ جدید کے بے کیف شعر کہنے والے شاعر بلکہ صرف پاکیزہ، متین اور سنجیدہ شعر کہتے ہیں جن کو مہذب مجلسوں میں پڑھا جا سکتا ہے، لیکن دورِ جدید کے مشاعروں میں وہ بہت زیادہ مقبول نہیں ہوتے کیوں کہ دورِ جدید کے تقلیدی اور مصنوعی رنگ سے اُن کے اشعار خالی ہوتے ہیں چنانچہ ہم اس موقع پر اُن کے کلام کا ایک انتخاب درج کرتے ہیں جس سے اس کا اندازہ ہوگا۔

آزاد کیا عشق نے تو دونوں جہاں سے ۔۔۔ بندہ ہے غلام آج بھی سرکار تمھارا
دیوانوں یہ عزت تمھیں بخشی ہے جنوں نے ۔۔۔ وابستۂ دامن ہے ہر اک خار تمھارا
کم بادِ فنا سے دمِ عیسیٰ نہیں اس کو ۔۔۔ شمعِ سحری آج ہے بیمار تمھارا

یوں آشیاں کو دیکھ رہے ہیں قفس سے ہم ۔۔۔ گویا یہ کوئی پھول ہے فصلِ بہار کا
قاتل اگر کہے تو گلا خود ہی کاٹ لوں ۔۔۔ بس ایک صبر ہے یہ مرے اختیار کا
ہر جھوٹ سچ کو یار کے سُن کر جو مان لے ۔۔۔ پھر اعتبار کیا ہو مرے اعتبار کا
بے اختیار ہو کے لگائیں وہ قہقہہ ۔۔۔ کچھ تو اثر ہو گریۂ بے اختیار کا
سب کچھ انھیں سے ملے جو یہ ہو جائے نا امید ۔۔۔ بس آسرا ہے یہ ترے امیدوار کا

پریشانی بھی تھی وصلِ صنم میں دیدہ دلیمی ۔۔۔ سکونِ قلب تھا اس بت کی زلفوں کا بکھر جانا
خزاں دیدہ جو کچھ پتے پڑے تھے آشیانے میں ۔۔۔ انھیں کو برگِ گل سمجھے انھیں کو باغ پہچانا

کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہر اے واعظِ ناداں   ہمارے ساتھ زیرِ سایۂ دامانِ تر جانا
ہمیشہ نزع ہی میں اس لبِ جاں بخش نے رکھا
محبت میں شمیم آساں ہم سمجھے تھے مر جانا

قابلِ قدر ہے زاہد یہ تری ریشِ سفید   زیب دیتا ہے اسے پنبۂ مینا ہونا
خُورِ شیشے پہ قناعت نہ کبھی تم کرنا   ابھی باقی ہے تمہیں اور بھی کیا کیا ہونا
مست کر دے گی مجھے گردشِ چشمِ ساقی   بزم کو چاہیئے بے ساغر و مینا ہونا

رہِ عشق میں ٹھوکریں کھانے والے   خضر کو بھی ہیں راہ بتلانے والے
جنھیں تیرے ہاروں میں گوندھا گیا ہے   بھلا کب ہیں وہ پھول مرجھانے والے
یہ مے آج دم کر کے واعظ نے دی ہے   حرام اس کو سمجھیں نہ مے خانے والے

لگی ہے غیر کی تصویر در سے   بتاؤ اب میں آؤں تو کدھر سے
سر آنکھوں پہ مرے پتے خزاں کے   مشابہ ہیں یہ میرے بال و پر سے

دل میں نہ ہو بھی عشق تو آہ و فغاں رہے   یہ آگ بجھ بھی جائے تو گھر میں دھواں رہے
کہتا ہوں آج سوزشِ پنہاں کا اُن سے حال   شمعِ خموشِ بزم مری ہم زباں رہے
غیروں کی آنکھ میں وہ رہے نوک کی طرح   دل میں ہمارے صورتِ دردِ نہاں رہے

ڈوبا چہِ ذقن میں دلِ بے قرار آج   بیڑا ہوا غریقِ محبت کا پار آج
دیوانہ خیز اور ہوئی سرزمینِ نجد   شامل ہوا جو اس میں ہمارا غبار آج

دل میں لہر اٹھتی ہے موجِ بادۂ تر دیکھ کر   صورتِ ساغر چھلک اٹھتا ہے ساغر دیکھ کر
آہوئے صحرا بھی آ جاتے ہیں میرے ساتھ گھر   ہوتے ہیں وحشت زدہ کیا کیا مرا گھر دیکھ کر
غیر کی نظروں کا پرتو کیا نظر آیا انھیں   کیوں جھجکتی ہیں نگاہیں روزنِ در دیکھ کر

اللہ رے غرور پہنتے نہیں کبھی   گردن جھکا کے آپ تو پھولوں کا ہار تک
دستِ جنوں نے بڑھ کے گریباں سے کیا   ہم انتظار کر نہیں سکتے بہار تک

یہ صیاد کو کیوں پسند آئے اتنا   مرے ہم نوا میرے پر دیکھتے ہیں
انھیں دیکھنے کی کہاں راہ نکلی   ابھی تک تو دیوار و در دیکھتے ہیں
اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں   ابھی تو تمہاری نظر دیکھتے ہیں
نظر بازی کر کے شمیم اُس گلی میں
تماشائے اہلِ نظر دیکھتے ہیں

ڈھونڈتا ہے جو مجھے باغ کے اندر صیاد   خود اشارے مرے سارے ستم ہوئے پر کرتے ہیں
کیا مسرت ہے کہ خود ناوکِ قاتل سے شمیم   چھیڑ ہنس ہنس کے مرے زخمِ جگر کرتے ہیں

پی کے چلو ہے تو میخانے سے ہم اُٹھتے نہیں   لے نہ لیں ساقی سے جب تک جامِ جم اُٹھتے نہیں
رہنما اس جلسے آگے تو ہی خود اے شوق ہو   تھک گئے ہیں خضر اب آگے قدم اُٹھتے نہیں
سہہ نہ لے انساں جب تک چرخ کے جور و جفا   سرزمینِ کوئے جاناں کے ستم اُٹھتے نہیں
چند ہی چکر میں میرے ساتھ چکرا گیا   اب بگولے دشت کے بھی دم بدم اُٹھتے نہیں
آہ بھی اپنی مگر بادِ سحر کے ساتھ تھی   ورنہ ایسے تند جھونکے صبح دم اُٹھتے نہیں
رانے کے خط میں تمہارا نام لکھ کر اہلِ شوق   کس طرح کاٹیں کہ ہاتھوں سے قلم اُٹھتے نہیں

غیر کی آپ مانتے ہی نہیں   لیجئے ہم بھی مان لیتے ہیں
ہے مشابہ جو کوئے جاناں سے   خاکِ جنت بھی چھان لیتے ہیں
ہم جنوں میں برائے ویرانی   مول روز اک مکان لیتے ہیں
رازِ اُلفت نہ فاش کرنے کی   چپ سے بھی ہم زبان لیتے ہیں
آشنا ہو کے دل لیا تھا مگر   بن کے انجان جان لیتے ہیں

غبارِ معصیت کی اس طرح کی شست و شو برسوں   مئے صافی سے زاہد کیا میں نے وضو برسوں
تلاشِ یار میں تو بعد کو اے شوق نکلیں گے   ابھی تو ہم کو خود کرنی ہے اپنی جستجو برسوں
زبانِ بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا   تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں
قفس تک میں بھی گلگشتِ چمن کے لطف اٹھاؤں گا   رہے گی میرے بال و پر میں بھی پھولوں کی بو برسوں

بخود جو عشق میں ہوا اس دل کو ڈھونڈتے ہیں   ہشیار رہیں کہ ایسے غافل کو ڈھونڈتے ہیں
کھوئے گئے ہیں دونوں اس بت کی جستجو میں   دل ہم کو ڈھونڈتا ہے ہم دل کو ڈھونڈتے ہیں

ہر اک سے پوچھتے ہیں ... کہاں ہے اُس ... کا
منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

شبِ فراق کا قصہ ہی کر دیا کوتاہ
اجل کی عمر خدا اور بھی دراز کرے
کرے وہ چشمِ سخن گو جب اس قدر اغماض
شمیم کس سے کوئی گفتگوئے راز کرے

چلو جنت میں شغلِ ساغر و پیمانہ ہو جائے
جگر پُر لطف ہے اک صحبتِ رندانہ ہو جائے
نہ دیں گے زہر بھی وہ اپنے بیمارِ محبت کو
انھیں ڈر ہے کہیں اس سے بھی یہ اچھا نہ ہو جائے
نہ لانا کوچۂ جاناں میں ہرگز حسنِ یوسف کو
کہ یہ سامان اس بازار میں سستا نہ ہو جائے
مجھے خلوت میں اُن سے رازِ سوزِ عشق کہنا ہے
الگ کچھ دیر کو اب شمع سے پروانہ ہو جائے

بجھے دل کا چراغ ... شمع رو آج
جلا دے اپنے روئے آتشیں سے
مری تقدیر ایسی چاندنی میں
جو چمکے گی تو تم سے مہ جبیں سے
پڑھیں گے کلمہ ہم اُس بُت کا واعظ
ترے ایمان سے تیرے یقیں سے
فلک سے پیشتر کوچے میں اُن کے
نپٹ لینا پڑا ہم کو زمیں سے
مرا مطلب نکلتا ہے بہر طور
کبھی ہاں سے کبھی اُن کی نہیں سے

اجل سے کہہ دو کہ وہ حشر تک نہ نکلے گا
ذرا سا دم جو مری چشمِ انتظار میں ہے
ہمیشہ کوچۂ جاناں کی خاک اُڑاؤں گا
مرا نوشتۂ قسمت خطِ غبار میں ہے
کہیں دمی نہ دلِ سوختہ بسا رہا ہو
بجھی ہوئی سی جو اک شمع بزمِ یار میں ہے
کسے خبر ہے کہ در پردہ نیتِ زاہد
شریکِ صحبتِ رندانِ بادہ خوار میں ہے
جنونِ عشق میں ہے پختگی اگر تو شمیم
خزاں میں بھی ہے وہی رنگ جو بہار میں ہے

مولانا کے مختصر مجموعۂ کلام سے جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ شائع ہوگا ہم نے یہ مختصر انتخاب داد لینے کے لئے نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصد صرف ایک جاہلانہ اعتراض کا اٹھانا ہے جو اعظم گڑھ میں عموماً اُن کے کلام پر کیا جاتا ہے اور نہایت بیدردی سے کہا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے قدیم رنگ میں کہتے ہیں جو اس زمانے میں سخت مبتذل سمجھا جاتا ہے اس لئے اہلِ نظر کے سامنے یہ انتخاب اس غرض سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر غور کریں کہ ان اشعار میں لکھنوی شاعری کے کس قدر عناصر پائے جاتے ہیں، کیا ان میں فحاشی اور عریانی پائی جاتی ہے؟ کیا ان میں ابتذال موجود ہے؟ کیا وہ بازاری زبان اور بازاری جذبات کا مرقع ہیں؟ کیا اُن میں رعایت لفظی کی بھرمار ہے؟ کیا اُن میں جنازہ و نعش، قبر و میت، نوحہ و ماتم اور نالہ و شیون کی صدائیں آتی ہیں؟ کیا انگیا، کرتی، محرم، دوپٹہ کی وہ نمائش کی گیا ہے؟ بے شبہ اُن کے کلام میں شعرائے دہلی کی فارسی ترکیبیں نہیں پائی جاتیں، ان میں غالب و مومن کا اغلاق و ابہام نہیں ہے۔ دورِ جدید کے شعراء کے کلام کی طرح اُن کا کلام تغزل کے لطف سے یکسر خالی نہیں ہے۔ بلکہ ریاستِ رام پور میں دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے امتزاج سے جو جدید رنگ پیدا ہوا تھا اور جس کو حکیم ضامن علی جلال نے بہت زیادہ ترقی دی تھی، مولانا نے اُسی رنگ کی تقلید کی ہے۔ اس لئے اس کو دلی اور لکھنؤ کی شاعری کا ایک مخلوط رنگ ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو لکھنؤ کے قدیم مبتذل اور بازاری رنگ سے کوئی مناسبت نہیں اور اہلِ نظر اس انتخاب کو سامنے رکھ کر خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

صنفِ غزل کے علاوہ مولانا کو اور اصنافِ سخن سے کوئی دلچسپی نہیں قصیدہ سے تو اس لئے کہ

قصیدہ کارِ ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

بلکہ اس لئے بھی کہ وہ قصیدہ کہنے پر قادر بھی نہیں اور نہ اپنے کو قادر الکلام شاعر سمجھتے ہیں، نظموں سے جو شعرائے دورِ جدید کا بڑا شاعرانہ کارنامہ سمجھی جاتی ہیں، مولانا کو سخت نفرت ہے۔ کیونکہ اولاً تو وہ صرف یورپ کی نقالی ہے اور مولانا نقالی کرنا نہیں جانتے دوسرے یہ نظمیں ایسی ایسی چیزوں پر کہی جاتی ہیں جو مولانا کے نزدیک شاعری کا موضوع نہیں بن سکتیں۔ سیاسی اور قومی نظمیں بھی وہ نہیں کہتے کیونکہ وہ سیاسی اور قومی آدمی نہیں بلکہ ایک گوشہ نشین مصنف اور انشا پرداز ہیں۔ غرض ان کا شاعرانہ کارنامہ صرف غزلوں تک محدود ہے، جن کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور جو بچ رہا ہے وہ ان کے مرنے کے بعد ضائع ہوگا۔ آخر میں ایک تعجب انگیز بات اور بھی سن لینی چاہیئے مولٰنا[1] پر لکھنویت کا الزام سب سے زیادہ اقبال احمد سہیل مرحوم نے لگایا ہے اور ان کو جلال لکھنوی کے نام لینے سے بھی اُبکائی آتی تھی تاہم انھوں نے بھی مولانا کے ان اشعار کی بہت داد دی ہے۔

شاخوں پہ نظر ڈالی ایک ایک شجر دیکھا
صیاد نے گلشن میں شاید کوئی پر دیکھا
یوسف کو سستے دام زلیخا نے ... لیا
تقدیر یہ تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی
دیکھ لو ایک نظر دیر و حرم کی جانب
دو ہی گھر اور تو ٹوٹے کو ہیں ویراں ہو کر

---

[1] اگلے وقتوں کے تھے یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ (ادارہ)

مسعود جاوید

کچھ اور!

اب صبح ہوئی وہ رات گئی، طوفاں سوئے ساحل جاگے!

چل میرے سفینے! چل آگے!!

گرداب کا دم خم توڑ دیا، طوفاں کی کلائی موڑی ہے
ہر ظالم موج کے سینے میں اک موت سسکتی چھوڑی ہے
بھونچال میں بپھرے ساگر کے جینے کا سلیقہ سیکھا ہے
گھنگھور گھٹا کی دھمکی سے ٹوٹی ہوئی ہمت جوڑی ہے
اب صبح ہوئی، وہ رات گئی طوفاں سوئے ساحل جاگے

چل میرے سفینے! - چل آگے!!

وہ دیکھ افق کی سرخی میں اک نور ترانے گاتی ہے
ظلمت سے نکلنے والوں کو یہ راز نہاں بتلاتی ہے
اس وقت رہائی پاتی ہیں دراصل غلامی سے قومیں
باہر کی طرف جب آزادی اندر سے ابل کر آتی ہے
اک منزل ختم ہوئی پیچھے، اک منزل اور بھی ہے آگے

چل میرے سفینے! -- چل آگے!!

خوں ریز سزاؤں کی زد میں پرشوق خطائیں دیکھی ہیں
آزاد منش دیوانوں کی مرنے کی ادائیں دیکھی ہیں
لوہے کی صلابت کو پیہم زخموں نے لگایا آنکھوں سے
مرتے ہوئے بچے دیکھے ہیں، ہنستی ہوئی مائیں دیکھی ہیں
ان عزم کے دیوانوں سے آخر سب ظلم و ستم ہارے بھاگے

چل میرے سفینے! - چل آگے!!

ظاہر یہ ہے رخشاں نورِ سحر، باطن میں اندھیرا آج بھی ہے
لفظوں میں چھپا ابن آدم دراصل برہنہ آج بھی ہے
خاموش سمندر کے نیچے اک آگ ہے بطنِ گیتی میں
ناداں! مزاجِ عالم میں طوفان جو کل تھا آج بھی ہے
محدود مقامی قدروں میں الجھے [illegible]

چل میرے سفینے! - [illegible]

تہذیب کا خالق یہ انساں! اُف بھوک یہ چاندی سونے کی
ساحل پہ پہونچنے کے نعرے اور کوشش ناؤ ڈبونے کی
رفتار کی روز افزوں تیزی کیا بوجھ کو ہلکا کر دے گی؟
یہ دوڑ ہے منزل کی خاطر یا دوڑ اپاہج ہونے کی؟
وحشت تو ہے خود اپنے اندر۔ اپنے سے کہاں کوئی بھاگے!
چل میرے سفینے!۔ چل آگے!!

ذرّوں سے طلب ہے، قوّت کی، ناداں سے سحر کی طالب ہے
نادان خرد اب غیروں سے خود اپنی خبر کی طالب ہے
مدّت سے عروسِ مستقبل خلوت کو سجائے بیٹھی ہے
انسان کے دل سے انساں کی تقدیر نظر کی طالب ہے
یہ عقل ہے تن کی بیداری، یہ تن جاگے جب من جاگے
چل میرے سفینے!۔ چل آگے!!

آزاد وطن کے سینے میں اک جوت جگانا باقی ہے!
انساں میں چھپے اک انساں کو پھر بزم میں لانا باقی ہے
اس معبدِ عالم میں اب بھی مرّیخ کی پوجا ہوتی ہے
یہ دور نیا ہے دور ابھی کچھ اور بتانا باقی ہے
ساحل یہ "فریبِ ساحل" ہے، ساحل تو ہے ساحل سے آگے
چل میرے سفینے!۔ چل آگے!!

گُل کدۂ ریاض

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

قفس میں ہم تھے گھری بادلوں میں بجلی تھی
تڑپ تڑپ کے رہے ہم وطن آشیاں کے لئے

اے جوانی نہ جا بہار کے ساتھ
وہ تو آئے گی ایک سال کے بعد

میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

جنابِ شیخ اُلجھتے ہیں کس تعلق سے
یہ دخترِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں

عادت سی ہے، نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

اُٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

جام چھلکانے لگے پھر کرشمے کوثر سے آپ
حضرتِ واعظ بہت اُونچے گئے منبر سے آپ

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو
یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری

کوئی منہ چوم لے گا اِس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہیں جبیں پر

(نگار، ریاض نمبر)

راجندر سنگھ بیدی

سوانحی اور تاریخی فلمیں

سوانحی اور تاریخی فلمیں کیا ہیں؟ اگر ایک سادہ سے لفظ یا جملے کے لئے لغت تک ہاتھ بڑھانا ضروری ہو تو سوانحی فلمیں وہ ہیں جو کسی بڑے آدمی، کسی عظیم شخصیت کی زندگی کو فلم کی صورت میں ہمارے سامنے لے آئیں اور تاریخی وہ جو کسی ملک اور قوم کی گذشتہ زندگی کو مصور شکل میں پیش کر دیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا کسی بڑے آدمی یا بڑی شخصیت کی زندگی میں پیدائش سے لے کر موت تک کے واقعات کی فہرست گنوا دینا ایک سوانحی فلم کہلائے گا؟ یا کسی ملک اور قوم پر گزرے ہوئے حالات کو سیلولائڈ پر لے آنے سے تاریخی فلم بن جائے گی۔

افسانے کے بہت سے عنصروں کی طرح سوانح اور تاریخ بھی بند معنوں میں اینٹ اور پتھر ہیں۔ جب تک یہ اینٹ اور پتھر کسی کاریگر، معمار کے ہاتھوں میں نہیں آتے کوئی خوبصورت عمارت نہیں بن سکتی۔ آخر ایک انسان اور بہت سے انسانوں کی زندگی کی ـــــ سوانح اور تاریخ کا ایک تصور وہ ہے جو بچپن میں اسکول ماسٹر نے ہمارے ذہن میں پیدا کیا، اور ایک وہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو "دریافتِ ہند" کی شکل میں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ایک معمولی اسکول ماسٹر کا تصور سوانح اور تاریخ کے بارے میں ساکت ہے کیوں کہ اس میں ہم ہر انسان اور ہر واقعہ کو ایک جگہ ٹھہرا ہوا دیکھتے ہیں گویا انسان اور واقعات کا نہ گزرے ہوئے زمانہ کے انسان اور واقعات سے کوئی تعلق تھا اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں سے۔ انسان یا واقعہ جس سلسلے کی کڑی ہے اسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کسی بادشاہ یا اس کی رعایا پر خارجی حالات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اچھا آدمی، اچھا حاکم تھا تو اس لئے کہ اس کا باپ چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یا بہادر تھا تو اس لئے کہ اس کی ماں راجپوت کی بیٹی تھی یا اس سے بھی ایک قدم پیچھے جا کر ـــــ وہ پیدائشی طور پر ہی اچھا یا بُرا تھا۔ اگر اکبر کو عقلِ سلیم حاصل تھی تو خدا کی دین تھی۔ ایک بات جو اس قسم کا اسکول ماسٹر، تاریخ داں یا سوانح نگار نہیں دیکھتا وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کیا ہوا؟ اکبر کے باپ ہمایوں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور کیوں کر؟ اکبر نے اور کہیں نہیں تو مصیبت اور تجربے کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اس لئے وہ ایسا حکمراں بنا، اکبرِ اعظم کہلایا...... برخلاف اس کے "دریافتِ ہند" کے فاضل مصنف خارجی حالات اور داخلی کیفیات دونوں کا برابر تجزیہ کر کے ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور یہی بتاتے ہیں کہ اس زمانے کے سماج نے فرد پر کیا اثر ڈالا اور فرد نے سماج کو جوابی طور پر کیا دیا؟ آدمی اور ذرائع پیداوار کے آپسی رشتے کیا تھے؟ ہم پتھر کے زمانے سے لے کر چندر گپت موریہ کے سنہرے عہد تک پہنچتے ہیں تو کیسے؟ وہاں سے اکبرِ اعظم اور اکبرِ اعظم سے لے کر لارڈ کلائیو تک چلے آتے ہیں تو کیوں کر؟....... اور پھر کلائیو سے کرپس مشن تک......

...... ان کا تاریخ کا تصور ایک ٹھہرے پانی کا تالاب نہیں۔ ایک ایسا سمندر ہے جس میں دن رات لہریں آتی ہیں جاتی ہیں۔ ہر بار جو پانی آتا ہے وہ پہلے ہی کا پانی نہیں ہوتا کیوں کہ سمندر میں اگر نربدا اور تاپتی آکر مل جاتے ہیں تو دجلہ اور فرات بھی اس میں حل ہوتے ہیں اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بحیرۂ عرب کا پانی کہاں ختم ہوتا ہے اور بحرۂ ہند کا پانی کہاں سے شروع؟ گویا ان کے تصور کی تاریخ ساکن نہیں، متحرک ہے جس میں ہمیں نہ صرف سماجی اور طبقاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے بلکہ ہر وقت بدلتے ہوئے فرد کی شکل بھی نظر آتی ہے۔ یہ چیز کتنی فکر انگیز ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان ہی کی پیداوار ہوتے ہوئے جب ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھتے ہیں تو نئی ترتیب کو "دریافتِ ہند" کا نام دیتے ہیں۔ کیا ہندوستان پہلے کہیں کھویا ہوا تھا؟ یہ بات نہیں ہندوستان یہیں موجود تھا اور

موجود رہے گا مگر اس ملک کی تاریخ کو جس نظر سے مفاد پرستوں اور سامراجیوں نے دیکھا پنڈت جی اُس نظر سے دیکھنے پر تیار نہیں تھے ۔ ہند کی تاریخ کے بارے میں ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا جسے اُنھوں نے بڑی کھوج اور عملی جدوجہد کے بعد حاصل کیا۔

یہ کھوج اور آخر کار دریافت تاریخ اور سوانح حیات کے لیے بے حد ضروری ہیں کیونکہ انھیں سے آپ کا نقطۂ نظر وضع ہوتا ہے ۔ سوانحی اور تاریخی حالات اور واقعات یوں اپنی جگہ ساکن ہیں وہ موم کی ناک ہیں جسے آپ جس طرف جی چاہے موڑ کے رکھ دیں لیکن اگر آپ نے کسی شخص کی زندگی یا کسی ملک کی زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر وضع کر لیا ہے تو پھر آپ اسی زندگی کے واقعات میں ایسے رنگ بھر سکتے ہیں کہ کتاب کی صورت میں پڑھنے اور فلم کی صورت میں دیکھنے والوں کو وہ نئے اور دلچسپ معلوم ہوں اور وہ سوچیں کہ دوسرے لکھنے والے یا فلم پیش کرنے والے نے ہمیں پتے کی بات بتائی ہے ۔ کسی خاص شخص کی زندگی یا کسی خاص عہد کی تاریخ کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہم واقف نہیں تھے یا اگر واقف تھے تو یہ سب باتیں ہمارے عقلی اور جذباتی جسم کا حصّہ نہیں بن پائی تھیں ۔

یہ نقطۂ نظر کچھ بھی ہو ہمیں اس سے مطلب ہے تو صرف اتنا کہ اس کا مدار کسی دلیل پر ہے ۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے ، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے علم میں اضافہ ہو اور بہتری کے لئے انسان کی جدوجہد آگے بڑھے ۔ یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم ایک ایسی تفریح کا سامان ہو جو ہمارے بچوں ، ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق کو نقصان نہ پہونچائے ۔ انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے کسی ایک آدمی کی دین نہیں انسانی زندگی کا کُل اس وقت بنا جب بہت سے جُزو مل گئے ۔ بقول مرزا یگانہ :

اپنے اپنے رنگ میں ، اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں ، کوئی پریشانِ بہار

دُنیا کی کم ہی چیزیں ہیں جو ایک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ کچھ ہم نے عربوں سے سیکھا ، یونانیوں سے سیکھا ، کچھ اُنھوں نے ہم سے ۔ ہندوستان نے تصوّریت کا فلسفہ دُنیا کے سامنے رکھا جس سے برکلے ، کانٹ ، ہیگل سے فلسفی متاثر ہوئے ۔ مارکس نے انھیں فلسفیوں سے سیکھ کر ایک نیا اندازِ فکر پیدا کیا جسے ہم کائنات کا مادی تصوّر کہتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں انھوں نے خود سے پہلے آنے والوں کی عملی شرکت کو نہیں جھٹلایا گویا آپ چاہے روحانی نقطۂ نظر کے قائل ہوں چاہے مادی چاہے آپ کا کوئی اپنا ہی نقطۂ نظر ہو مگر اس کے بغیر کسی بھی اچھی سوانح یا تاریخ کا لکھا جانا یا فلمانا ممکن نہیں ۔ جب آپ اس نقطۂ نظر کو وضع کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ماضی کی چیزوں کو معنوی کرنے کے لئے آپ کو آج کے زمانے کا علم بروئے کار لانا پڑے گا گویا شراب پُرانی ہو گی بوتل نئی ۔

اس کو میں ایک مثال کے ذریعے سے واضح کروں گا ۔ خاندانِ غلامان کی سلطانہ رضیہ کے بارے میں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس کی محبت امیرِ آخور ۔ یاقوت سے ہوئی جو ایک حبشی غلام تھا ۔ رسمی تاریخ جب اس محبت کا ذکر کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زبان دانتوں میں دبا لی ہے آج بھی سینکڑوں ہزاروں لوگ ہیں جو ایک بادشاہ یا ایک شہزادی کی ایک عام آدمی سے محبت کو بغیر آہ یا واہ کئے نہیں دیکھ سکتے اور ایک خاص تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے گورے اور کالے کی محبت کو دیکھ کر جن کا خون کھول اُٹھتا ہے اور وہ کالے آدمی کو کھڑے کھڑے کچل دینا چاہتے ہیں ۔

ایسے لوگ اس زمانے میں بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں ۔ اس لئے اس قسم کے ظلم کو ہوتے دیکھ کر بغاوت یا قتل و خون کر دینا ایک ایسی بات ہوتی ہے جسے آپ سینکڑوں بار سُن چکے ہیں ، پڑھ چکے ہیں اور سینما کے پردے پہ دیکھ چکے ہیں ۔ اس لئے اگر اس زمانے میں آپ رضیہ سلطانہ اور یاقوت کا قصّہ بیان کریں گے تو آپ کو یہ نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑے گا کہ سلطانہ نے حبشی غلام سے اس لئے محبت نہیں کی کہ وہ بہت صحت مند تھا بلکہ اس لئے کہ وہ گورے اور کالے میں فرق نہیں سمجھتی تھی ایبک سے لے کر خود اس کے باپ التمش تک کی تاریخ نے اس پہ یہ چیز ظاہر کر دی تھی کہ ہر انسان میں صلاحیتیں موجود ہیں بشرطیکہ انھیں مناسب طریقے پر پنپنے کا موقعہ دیا جائے یا اگر آپ کو سلطانہ رضیہ اور یاقوت کی محبت کے واقعے کی صحت پر ہی شک ہو تو آپ یہ دکھائیں گے کہ نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد آج سے صدیوں پہلے ہمارے ملک میں شروع ہو چکی تھی ۔ جب یہ کہانی ایک نئے نقطۂ نظر کی دلیل ہو گی تو نہ صرف لوگوں کے لئے دلچسپ ہو گی بلکہ تاریخ کی تجدید Reorientation . . . . . . کی صورت میں دیکھنے والوں کے علم میں اضافہ کرے گی ۔ آپ رضیہ کے قصّے کو کسی نظر سے دیکھیں ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں کی ٹکر آپ کو سامنے نظر آئے گی ۔ رضیہ کی ماں ملکہ شہ ترکن اور اس کا بوڑھا وزیر جنیدی اور دوسرے ترک امرا نہیں چاہتے تھے کہ ایک نچلے طبقے کا اور پھر کالا آدمی کسی قسم کی طاقت حاصل کرے ۔ اس لئے اُنھوں نے رضیہ کی جگہ اس کے بھائی رکن الدین کو تخت پر بٹھانے

کی کوشش کی حالانکہ وہ ایک عیاش آدمی تھا اور زیادہ شراب پینے کے عمل نے اُسے بزدل اور حکومت کے ناقابل بنادیا تھا چنانچہ رضیہ ان سب باتوں کے خلاف عملی طور پر جنگ کرتی ہے مگر آخر کار دیکھتی ہے کہ چہ جائیکہ ترک امیر اور وزیر اس کی اور یاقوت کی محبت کو اچھی نظر سے دیکھیں وہ ایک عورت کے مردوں پر حکومت کرنے ہی کو اپنے لئے باعثِ شرم سمجھتے ہیں مگر وہ ڈٹی رہتی ہے۔ خود اس کی ماں ملکہ شاہ ترکن اسے قتل کرنے کے لئے التونیہ کو زہر ملا کر بھیجتی ہے اور اس کام کے لئے یاقوت ہی کو اکسایا جاتا ہے مگر یاقوت جب ملکہ کے حسن وجمال کو دیکھتا ہے تو اس ارادے کو تکمیل تک نہیں پہونچا سکتا۔ جمالیات کا احساس ایک کالے آدمی کو بھی ہو سکتا ہے اور یاقوت نہیں چاہتا کہ اتنی خوبصورت چیز کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سُلا دیا جائے۔ رضیہ کی زندگی کا آخری دور ہمارے اس افسانے میں محدود معاون ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ آخر میں وہ التونیہ سے شادی کر لیتی ہے۔ اس لئے اس کہانی کو ہم یا تو وہیں ختم کردیں گے جہاں التونیہ دوبارہ اسٹیج پر آتا ہے اور یا تھوڑے سے تصرف سے کام لیتے ہوئے ہمیں یہ دکھانا پڑے گا کہ جب وہ التونیہ کے ساتھ شادی کی قربان گاہ پر اپنا سر قربان کر بھی رہی تھی تب بھی وہ پہلے ہی کی طرح باغی اور بیدار عورت تھی۔ البتہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر اس نے ایسا کیا۔ یہاں پہنچ کر ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سوانح اور تاریخی باتوں میں آنے والے واقعات صرف افسانوی صلاحیتیں لئے ہوتے ہیں۔ بنے بنائے افسانے نہیں ہوتے جس طرح عام ادب میں ہمیں زندگی میں ہونے والے واقعات میں رنگ بھرنا یا تصرف کرنا پڑتا ہے اسی طرح سوانحی اور تاریخی کہانیوں میں بھی لیکن واقعات کو جھٹلائے بغیر۔ مثلاً اوپر کے قصے میں وہ واقعہ بھی لا سکتے ہیں جو مصر کی ایک ملکہ اور حبشی کے درمیان ہوا۔ ملکہ ہمیشہ حبشی غلام کے کالے رنگ کا مذاق اڑایا کرتی تھی ایک دن غلام نے کہا "ملکہ! میرے اس کالے رنگ کا ایک چھینٹا تمہارے چہرے پر پڑ جائے تو تمہارے حسن کو چار چاند لگ جائیں۔ لیکن اگر تمہارے رنگ کا ایک چھینٹا بھی مجھ پر آ پڑے تو لوگ مجھے کہیں گے کوڑھی ہے!" ..... اور اسی چھوٹے سے واقعے سے ملکہ اور غلام کے رومان کی ابتدا ہو سکتی ہے کیونکہ وہ زمانہ تھا جب حاضر جوابی اور برجستگی کی بہت قدر ہوا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر ہمارے لئے وہ نقطۂ نگاہ وہ پراپیگنڈا مقصد ہے جسے ہم عوام کے سامنے رکھے جا رہے ہیں۔

ایک انسان یا بہت سے انسانوں کے سوانح جسے تاریخ کہہ لیجئے نتیجہ ٹکر کھاتے ہوئے نظریات کا اور جتنی زیادہ سے زیادہ بار آپ اس ٹکر کو لائیں گے اتنا ہی آپ کے لئے اچھا ہے۔ کیونکہ بغیر تنازع Conflict کے آپ کا کوئی ڈرامہ نہیں بنتا۔ سوانح اور تاریخی قصے میں مرکزی اعتبار سے فلم کی صورت میں جو آپ دکھانا چاہتے ہیں وہ تو طے ہے ہی مگر اس کے بعد جزئیات میں کرداروں کو مختلف نظریوں کا حامل دکھانا پڑے گا۔ گویا یہ بات طے ہے کہ جہاں ملک اور قوم کی ترقی میں اور بہت سی باتیں ضروری ہیں وہاں سوانح اور تاریخ کا گہرا مطالعہ لازمی ہے مجھے یاد ہے بچپن میں میں نے جب بھرتری ہری اور گوتم بدھ کی زندگیاں پڑھیں تو مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے سے دماغ نے کسی مبہم طریقے سے زندگی کی چند قدروں کی طرف میری توجہ دلائی تھی اور طبیعت میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہو گیا تھا پھر اپنے ملک اور بیرونِ ملک کی بڑی شخصیتوں کے حالات پڑھے تو میں نے راتوں رات اپنے آپ کو ان کے کردار میں ڈھال لینے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی حیرانی سے دیکھا کہ سب بڑے لوگوں کی زندگی میں پیار زیادہ تھا اور نفرت کم۔ نفرت تھی بھی تو اسے کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا کیونکہ محبت کی طرح نفرت بھی ایک اساسی جذبہ ہے جس کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ آخر کیا بات تھی جس نے طالسطائی کو YASNAYA POLYANA کی اسٹیٹ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا اور آخر عمر میں کاؤنٹ طالسطائی بچوں کے اُستاد اور ہل چلانے والے کسان بن گئے؟ کون سی بات تھی جس نے مغربی رنگ میں رنگے ہوئے بیرسٹر گاندھی کو لنگوٹی پہنا دی؟ حقیقت وہی نہیں جسے ہم اپنے تجربے سے حاصل کرتے ہیں، حقیقت وہ بھی ہے جو ہم دوسروں کے تجربے میں دیکھتے ہیں۔ آج ہم گیہوں کھانے کے لئے خود گیہوں نہیں اگاتے، اگر گیہوں اُگانے اور کپڑا بُننے لگیں گے تو نہ کتاب لکھ سکیں گے نہ فلم بنا پائیں گے۔ آج کل کے بچے اور وہ لوگ جو صرف عمر کے لحاظ سے اکتا چکے ہیں مگر جذباتی طور پر بچے ہیں، ان کے دماغ پر جس طریقے سے فلم کا میڈیم اثر انداز ہوتا ہے ہم فلم بنانے والوں پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ چونکہ سوانح اور تاریخ مستند شخصیتوں کی حامل ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اثر ڈالنے والی ہوتی ہیں اس لئے ہم عوام کے دماغ کی انگنت فوٹو پلیٹوں کو لے سکتے ہیں اور ان پر تعلیم و تربیت کے نقش چھوڑ سکتے ہیں۔

سوانحی اور تاریخی فلموں کے سلسلے میں ہماری فلم انڈسٹری نے بحیثیت مجموعی لوگوں کو اچھی چیزیں دی ہیں اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ان تصویروں نے گہرا اور واضح اثر چھوڑا ہے۔ پربھات فلم کمپنی کی تصویریں "رام شاستری" "سنت گیانیشور" "سنت تکارام" آج بھی شاہکار گنی جاتی ہیں۔ سہراب مودی صاحب کی "سکندرِ اعظم" "پکار"

"پرتھوی ولبھ" "جھانسی کی رانی" "اور مرزا غالب" ایسی تصویریں ہیں جو مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ نیو تھیٹرز نے "راج رانی میرا" یونٹی پکچرز نے "چیتنیہ مہاپربھو" پرکاش نے "رام راجیہ" اور "وِدیو باورا" رنجیت نے "تان سین" ایسی فلمیں پیش کر کے ہمارا سر فخر سے اُونچا کیا ہے۔ یہ تصویریں نہ صرف ہر دل عزیز اور مقبولِ عام ثابت ہوئی ہیں بلکہ اُنھوں نے لوگوں کے ذہن میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ جہاں ان فلموں میں پیشکش کا انداز بے حد خوبصورت اور پیارا تھا وہاں کچھ ایسی بھی تھیں جن میں محبت کا عنصر آتنا اُبھر گیا کہ اُس نے سوانحی یا تاریخی شخصیت کی جامعیت کم کر دی یا تاریخ کے کسی دور کو ناچ رنگ کا دور ثابت کر دیا۔ میں خود کسی حیثیت میں فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے پروڈیوسروں کی مشکلات اور اُن کا نقطۂ نظر، عوام کی مقبولیت کا قائل ہوں لیکن اس پر بھی عرض کروں گا کہ جہاں تصویر کی عوام کے نزدیک مقبولیت فلم بنانے والوں کی زندگی کے لئے ضروری ہے وہاں ملک اور قوم کے تئیں بھی ان کا فرض نکلتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سوانحی اور تاریخی فلمیں بنانے والا جہاں مضمون کے ساتھ انصاف کرے، اپنے ساتھ انصاف کرے، وہاں ملک اور قوم کا بھی خیال اپنے دل میں رکھے؟

آج ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے ہماری قوم بن رہی ہے۔ دوسرا پنج سالہ منصوبہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب ہمارے راہنماؤں کی بدولت ہے کہ اُنھوں نے ہمارے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایک اکائی کی حیثیت سے ہم بھی قوم اور ملک کی ترقی اور بہبودی کی جد و جہد میں شعوری طور پر شرکت کر رہے ہیں؟ میں نہیں چاہتا کہ آج سے سو سال بعد جب آج کے ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے تو کوئی کہے: "ملک کے دانشوروں نے اپنے راہنماؤں سے غداری کی۔"

فلم انڈسٹری کے دانشوروں کے ہاتھ میں اتنا بڑا آلہ کار ہے جس سے وہ ملک کی تعمیر ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں۔ سوانحی اور تاریخی فلمیں چونکہ بنیادی طور پر زیادہ پُرشکوہ زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی طرف ہمیں زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ ہمارے ملک میں بے شمار عظیم المرتبت آدمی پیدا ہوئے ہیں جن کے سامنے دُنیا سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ ان کی زندگیاں فلم کے پردے پر لا کر ہمیں اپنے لوگوں کے وقار کا سر اُونچا کرنا ہے۔ ہماری تاریخ اتنی قدیم، اتنی حسین اور اتنی رنگین ہے کہ کہیں سے بھی اس کے دو ورق اٹھا لیجیئے آپ کو انھیں سے فلمی کہانی کا مواد مل سکتا ہے۔ ایک نقطۂ نظر اختیار کر کے جسے ہم لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ فلم چاہے تصوریت کی چھاپ لئے ہوئے اور چاہے مادیت کی ہمیں روحانی مسرت دے سکتی ہے اور پھر اس دُنیا کے ٹکراتے ہوئے نظریات کا مابین بھی ایک جگہ ہے جسے ہم "جیو اور جینے دو" کے ہلکے اور فاختئی رنگ سے بھر رہے ہیں۔ اس تاریخی رول کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے میں اپنے فلمی دوستوں سے یہی کہوں گا۔

کعبہ و دَیر کے مابین جگہ خالی ہے
کیوں یہ ویرانہ ہے کیوں نہ یہ میخانہ بنے؟

صوبوں کی پھر سے تنظیم کے قانون کے تحت ہند کے صوبوں کا رقبہ و آبادی

صوبہ	رقبہ مربع میل	آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق
۱۔ بمبئی	۱۹۰۹۱۹	۴۸۲۶۵۱۲۰
۲۔ مدھیہ پردیش	۱۷۱۲۰۱	۲۶۰۹۵۶۸۰
۳۔ راجستھان	۱۳۲۰۷۸	۱۵۹۴۶۷۳۱
۴۔ اُتر پردیش	۱۱۳۴۰۹	۶۳۲۱۵۷۴۲
۵۔ آندھرا پردیش	۱۰۵۹۶۲	۳۱۲۵۹۸۱۵
۶۔ جموں و کشمیر	۹۲۷۸۰	۴۴۰۰۰۰۰
۷۔ آسام	۸۵۰۱۲	۹۰۴۳۷۰۷
۸۔ میسور	۷۴۳۴۷	۱۹۴۰۱۶۱۲
۹۔ بہار	۶۷۳۰۰	۳۸۸۲۷۵۱۷
۱۰۔ اڑیسہ	۶۰۱۳۶	۱۴۶۴۵۹۴۶
۱۱۔ مدراس	۵۰۱۱۰	۲۹۹۷۴۹۳۶
۱۲۔ پنجاب	۴۷۴۵۶	۱۶۱۳۴۸۹۰
۱۳۔ مغربی بنگال	۳۳۸۰۹	۲۶۲۵۸۶۴۷
۱۴۔ کیرالا	۱۵۰۳۵	۱۳۵۴۹۱۱۸
میزان	۱۲۳۹۵۵۴	۳۵۷۰۱۹۴۶۱
دیگر علاقے		
۱۔ ہماچل پردیش	۱۰۹۰۴	۱۱۰۹۴۶۶
۲۔ منی پور	۸۶۲۸	۵۷۷۶۳۵
۳۔ تری پورا	۴۰۳۲	۶۳۹۰۲۹
۴۔ جزائر انڈمان و نکوبار	۳۲۱۵	۳۰۹۷۱
۵۔ دلی	۵۷۸	۱۷۴۴۰۷۲
۶۔ جزائر لکادیپ مینی کوائے اور امینی دیوی	۱۰	۲۱۰۳۵
میزان	۲۷۳۶۷	۴۱۲۲۲۰۸
کل میزان	۱۲۶۶۹۲۱	۳۶۱۱۴۱۶۶۹

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

نامۂ اقبالؒ

بنام

مولوی انشاء اللہ خاں

از کیمبرج ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء

(مندرجہ وطن لاہور نمبر ۴۹ جلد ۵ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء)

مولوی صاحب مخدوم و مکرم - السلام علیکم

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سویز پہونچ کر دوسرا خط لکھوں گا۔ مگر چوں کہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے اس واسطے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہاں پہونچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر میں روزانہ ... لکھتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہ کاغذ کہیں کھو گیا۔ یہی وجہ اب تک میرے خاموش رہنے کی تھی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہونچی۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کے نام لکھا تھا دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت میں ملیں گے

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک وقت کی بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چوں کہ ملک خشک ہے اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ میں بوجہ گرمی کے اور نیز قرنطینہ کے عدن کی سیر نہ کر سکا۔ انجنیری کے اس حیرت ناک کرشمے کی نظارگی سے محروم رہا۔ جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دوکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آ موجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلان تجارت مرکوز ہے۔ اور کیوں نہ ہو، ان ہی کے آباد اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم انھیں میں کا ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعتِ تجارت نے اقوامِ یورپ کو ڈرا کر ان کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔

کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے کوئی مصر کے پُرانے بُت بیچتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ ذرا سا بُت اٹھارہ ہزار برس کا ہے جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ گاہکوں کو قید کر لیتے ہیں۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ انھیں لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لئے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دوکاندار سے میں نے سگرٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں میں نے اُس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں مگر چوں کہ میرے سر پہ انگریزی ٹوپی تھی اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنے ہو؟ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا "تم بھی مسلم ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرت ہوئی میں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی داڑھی منڈی ہوئے تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کاش ہمارے ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروج ہو جاتا تاکہ ہمارے دوست موسمی علماء کے حملوں سے مامون و مصئون ہو جاتے۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چوں کہ حافظِ قرآن تھی اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا

اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دوکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ سب لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کرکے دعائیں دینے لگے یا یوں کہئے کہ دو چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہونچے۔

تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ میں نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور میں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔

آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کنال میں جا داخل ہوا۔ یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجینیر نے تعمیر کیا تھا دنیا کی عجائبات میں سے ایک ہے۔ کنال کیا ہے عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانہ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کی تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی، جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو اور سے کچھ اور کر دیا۔ بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں گزر سکتے ہیں اور کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں جو ٹھیک رہتی ہے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے اس کا انتظام ہوتا رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں بعض نہایت شریر ہوتے ہیں۔ جب ہمارا جہاز آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور جہاز کی چند انگریز بیبیاں کھڑی ساحل کی سیر کر رہی تھیں تو ان میں سے ایک مزدور از سر تا پا برہنہ ہو کر ناچنے لگا۔ یہ بیچاریاں دوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلفریب نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا۔ اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے ایک عربی غزل گاتے جاتے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پُر اثر تھا کہ اس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے۔

ابھی ہم پورٹ سعید نہ پہونچے تھے کہ ایک بارود سے بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جانے کی خبر آئی۔ تھوڑی دیر میں اس کے ٹکڑے کنال سے گزرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جان و مال کا بے اندازہ نقصان ہوا اور تھوڑی دیر کے لئے ہماری طبیعت اس مصیبت پر بہت متاثر رہی۔ پورٹ سعید پہونچ کر چھ مسلمان تاجروں کی دوکانیں تختۂ جہاز پر لگ گئیں۔ میں ایک کشتی پر بیٹھ کر مع پارسی ہم سفر کے بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا۔ پورٹ سعید جہازوں کو کوئلہ مہیا کرنے والے بندرگاہوں میں سب سے بڑا ہے اور سعید پاشا کے نام سے مشہور ہے جس نے سویز کنال بنانے کی اجازت دی تھی۔ عمارات کا نظارہ نہایت ہی خوبصورت ہے اور شہر چھوٹی سی بمبئی ہے جس کی نسبت خیال ہے کہ یہ کبھی دنیا کے تجارتی مرکزوں میں سے ایک ہوگا۔ مدرسہ دیکھا، مسجدوں کی سیر کی۔ اسلامی گورنر کا مکان دیکھا۔ موجد سویز کنال کی مجسّم دیکھا۔ غرض کہ خوب سیر کی۔ یہاں کے مدرسے میں عربی اور فرانسیسی پڑھاتے ہیں۔ جس حصّے میں انگریز آباد ہیں وہ حصہ خصوصیت سے خوب صورت اور پاکیزہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمان آباد ہیں وہ جگہ بہت میلی ہے۔ یہودی، فرانسیسی، انگریز، یونانی، مسلمان غرضیکہ دنیا کی تمام اقوام یہاں آباد ہیں۔ سب کے محلے جدا جدا ہیں۔ ہوٹل بھی جدا جدا ہے اور چرچ بھی۔ شہر کی سیر کرکے پورٹ آفس میں آیا۔ ملازم قریباً سب مسلمان ہیں اور خوب انگریزی اور عربی بولتے ہیں۔ اس عمارت میں داخل ہو کر بیٹھنے کی نوٹس بورڈ سے کچھ نئے عربی الفاظ جو لکھے تھے کو ایک کاغذ پر میں نے نوٹ کر دیا لیکن افسوس ہے کہ بعد میں وہ کاغذ بھی کھو گیا۔ کچھ ٹکٹ پوسٹ آفس سے خرید کئے اور خطوں پر لگا کر ڈاک میں ڈالے۔ تعجب ہے کہ ان میں سے کسی خط کی رسید نہیں آئی۔ آخر اپنے مسلمان راہ نما کو جو اکثر زبانیں جانتا تھا کچھ انعام دے کر جہاز کو لوٹا۔ یہاں جو پہونچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختۂ جہاز پر تین طائفے (حوتیں) اور دو مرد آمن بجا رہے تھے اور خوب رقص ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانت داری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہئیے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافرانِ جہاز سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا کیوں کہ

میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو، بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

الغرض قرہ دس گوشی اور کسی قدر جنّت نگاہ کے حظوظ اٹھا کر ہم روانہ ہوئے اور ہمارا جہاز بحرِ روم میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے بہت سے جزیرے رستہ میں ملتے ہیں جن میں سے بعض کسی نہ کسی بات کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن ان کے نظارے کی کیفیت ذہن سے اتر گئی۔ یہ جتنے سطور لکھے ہیں حافظہ سے لکھے ہیں۔ اگر میرے نوٹ ضائع نہ ہو جاتے تو امید ہے کہ میں آپ کے ناظرین کو زیادہ کامیابی کے ساتھ خوش کر سکتا۔

بحرِ روم کے ابتدائی حصّہ میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہوئی اور میں نے چند اشعار کی ایک غزل[ل] لکھی جو حاضر ہے۔

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیئے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں

عجیب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا
صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں

ہما جہاں کی ہے بیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں

نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

رہینِ لذّتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرر
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی
کہ خوش نواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری ہستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

[ل] بانگِ درا صفحہ ۱۴۰ میں یہ غزل درج ہے مگر اس میں صرف دس اشعار ہیں۔ بقیہ اشعار حذف ہو گئے ہیں۔ ـ بشیر

(مازنی اٹلی کے محسنین کا سرگروہ تھا۔ یہ شعر اس وقت لکھا گیا جب کہ اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا)

مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصّہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی راستے میں طوفان کا اندیشہ ہو گا، ہمارا کپتان جہاز کو ایک اور رستے سے لے گیا جو معمولی رستے سے کسی قدر لمبا تھا۔ ۲۳ کی صبح کو مارسیلز یعنی فرانس کے ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہونچے۔ اور چوں کہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا اس واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی۔ مارسیلز کا نوٹرڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی محرک ہوئی ہے۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی "حسن رہگذرے" کے طریق پر ہو گئی۔ کھیتیاں جو گاڑی کے اِدھر اُدھر آتی ہیں ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح ہوتا ہے۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام ہم لوگ برٹش چینال کو کراس کر کے ڈوور اور ڈوور سے لندن پہنچے۔ شیخ عبدالقادر کی باریک بیں آنکھ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے۔

مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا دوسری صبح سے "کام" شروع تھا یعنے ان تمام فرائض کا مجموعہ جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدّس ہے جیسے عبادت۔ والسلام

آپ کا اقبال

"بچوں کا آج کل"

'بچوں کا آج کل' بند کر دیا گیا ہے لیکن 'آج کل' کے صفحات میں کمی نہیں ہوگی یعنی ہر شمارہ حسبِ سابق ۶۰ صفحوں پر مشتمل ہو گا۔ مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ بچوں کے لئے مضامین، کہانیاں اور نظمیں وغیرہ ارسال نہ فرمائیں۔

(ادارہ)

اسرار احمد آزاد

سعودی عرب

گذشتہ چار دہائیوں سے مشرق کی سیاسی بیداری کی بدولت بین الاقوامی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے اس میں دنیائے عرب کو خصوصی دخل حاصل ہے اور دنیائے عرب آج اپنے جس سیاسی شعور، تنظیم اور اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے، اگر سعودی عرب کو اس کا محور اور مرکز قرار دیا جائے تو یہ دعویٰ بے محل نہ ہوگا۔

دنیائے عرب مشرق میں خلیج فارس سے شروع ہو کر مغرب میں بحر اوقیانوس کے مشرقی ساحل تک پھیلی ہوئی ہے اور اگرچہ اس صدی کی دوسری دہائی کے تقریباً وسط تک اس کا بیشتر حصہ سلطنتِ عثمانیہ میں شامل تھا۔ تاہم اس عہد میں عرب ممالک کے مابین کوئی حقیقی تنظیم موجود نہیں تھی اور اسی لئے پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد یہ وسیع خطۂ ارض ترکوں کے ہاتھوں سے نکل کر مغربی طاقتوں کے قبضے میں چلا گیا تھا لیکن آج چند چھوٹے چھوٹے علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیائے عرب آزاد ہو چکی ہے۔ اس وسیع خطۂ ارض میں عربوں کی گیارہ آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہیں اور باقی ماندہ علاقوں کے باشندے حصولِ حریت کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ بین اقوامی زندگی میں دنیائے عرب کا ایک وقار قائم ہو گیا ہے اور عرب ممالک قومی اور بین اقوامی معاملات میں اپنی ٹھوس یک جہتی کا مظاہرہ کر کے اپنے اس وقار کو مستحکم بنا رہے ہیں۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ دنیائے عرب کے سیاسی شعور کی بیداری کے یہ مظاہرے ان کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی تنظیم ہی کا نتیجہ ہیں اور پسماندہ اور نیم پسماندہ عرب ممالک کو قومی اور بین اقوامی زندگی کی بیشِ نظر سطح پر لانے میں سعودی عرب کو مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔

سعودی عرب کی موجودہ سلطنت کے بانی، اس سلطنت کے موجودہ حکمران شاہ سعود اوّل کے والد شاہ ابن سعود تھے اور انھوں نے ۱۹۲۱ء میں نجد اور ۱۹۲۶ء میں حجاز کو فتح کر کے ستمبر ۱۹۳۲ء میں اپنے سعودی عرب کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا تھا اور اس طرح تقریباً تمام جزیرۃ العرب کو ایک ریاست کی شکل دے کر عربوں کے اس اتحاد کی بنیاد رکھی تھی جو آج اُن کی تمام تر سیاسی بیداری اور قومی ترقیوں کا محور بنا ہوا ہے۔

سعودی عرب خلیج فارس اور بحیرۂ احمر کے درمیان پھیلا ہوا ایک وسیع خطۂ ارض ہے۔ اس کے رقبے کا اندازہ ۵۹۰،۰۰۰ مربع میل کیا جاتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ریگستان پر مشتمل ہے اور وہاں کم و بیش [illegible] افراد بستے ہیں۔ اس صدی کی تیسری دہائی کے اواخر تک سعودی عرب کے باشندے عموماً خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب انھیں بستیوں میں آباد کرنے کی جد و جہد کی جا رہی ہے اور اگرچہ ابھی تک شہری آبادی کا تناسب ۱۰ فی صد سے تجاوز نہیں کر سکا لیکن متمدن زندگی کی طرف بدوؤں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی کے آغاز تک اس کے ملک کے باشندوں کی اقتصادیات کا انحصار معمولی سی زراعت، مویشی کی پرورش اور حجاج سے وصول ہونے والے محاصل پر تھا۔ ضروریاتِ زندگی میں کام آنے والی تقریباً تمام اشیا دوسرے ممالک سے برآمد کی جاتی تھیں اور صنعت تقریباً مفقود تھی اور اس کی سیاسی اہمیت صرف اس بات تک محدود تھی کہ اس کی حدود میں مسلمانوں کے زاویۂ نظر سے مقدس ترین مقامات واقع ہیں لیکن تیسری دہائی میں ریگستان کی وسعتوں میں تیل کے عظیم ذخائر کی دریافت کے بعد نہ صرف سعودی عرب کی

اقتصادیات کا محور ہی تبدیل ہو گیا ہے بلکہ اس ملک اور اس کے توسل سے دُنیائے عرب کے ساتھ بین اقوامی تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی ہے

سعودی عرب میں تیل کے ذخائر اس صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں دریافت ہوئے تھے اور آج ان چشموں سے مغربی ایشیا کے تیل کی پیداوار کا تقریباً ۵۴ فی صد حصہ برآمد ہوتا ہے اور تیل کے ان چشموں سے سعودی عرب کو سالانہ اوسطاً ۲۰۰ کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ تیل کے چشموں کے علاوہ حال ہی میں مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ایک مقام مہد الذہب میں سونے کی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں اور ان سے سونا برآمد کیا جا رہا ہے۔ چناں چہ دولت کے ان قدرتی ذرائع کی بدولت سعودی عرب کی حکومت غیر ملکی امداد سے بے نیاز ہو گئی ہے اور اس نے ۱۹۵۲ء سے وہ ٹیکس بھی منسوخ کر دیئے ہیں جو حجاج سے وصول کئے جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سعودی عرب میں زراعت ابھی تک محدود ہے لیکن نہروں کی تعمیر کے ذریعہ سے آبپاشی کے وسائل کو ترقی دی جا رہی ہے اور ماہی گیری کی صنعت پر خصوصی توجہ مبذول کی جا رہی ہے۔ سعودی عرب سے کھالیں، تیل، کھجوریں اور عربی نسل کے گھوڑے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ تیل کی صنعت کی ترقی ہو رہی ہے۔ چناں چہ دمن اور ریاض کے درمیان ریل کی لائن تعمیر کی جا چکی ہے جدہ اور مکۂ معظمہ کو اچھی اور پختہ سڑکوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اور ریاض، جدہ اور دھران کے درمیان باقاعدہ طریقہ پر ہوائی جہاز چلتے ہیں۔ ملک میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔

سعودی عرب جمہوری ملک نہیں بلکہ وہاں ملوکیت قائم ہے اور نظم و نسق کے تمام تر اختیارات حکمران کے لئے مخصوص ہیں۔ لیکن اس ملک کا قانون قرآن کریم پر مبنی ہے۔ ملوکیت کے باوجود وہاں حکومت کے مختلف شعبوں سے متعلق امور کو انجام دینے کے لئے متعدد وزارتیں اور نظامتیں بھی قائم ہیں اور مکہ معظمہ نیز ریاض و جدہ ایسے شہروں میں مجالسِ بلاد یعنی میونسپل کمیٹیاں بھی عالمِ وجود میں آ چکی ہیں۔

دُنیائے عرب پر ترکوں اور ان کے بعد مغربی طاقتوں کے دورِ حکومت میں عربوں کی کوئی خارجہ حکمتِ عملی متعین نہیں تھی اور سعودی عرب کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بانی سلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم بھی اس معاملہ پر اپنی توجہ مبذول نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود اس معاملہ میں ان کے طرزِ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا دشوار نہیں تھا کہ وہ عربوں کے اتحاد و ترقی اور عرب ممالک کی آزادی اور خود مختاری کے حامی ہیں اور آج سعودی عرب کی خارجہ حکمتِ عملی انہیں نظریات پر مبنی ہے۔

چناں چہ بین اقوامی معاملات میں سعودی عرب کی حکومت دُنیائے عرب کے استحکام کے مقصد کے پیشِ نظر عرب ممالک کے ساتھ اشتراکِ عمل کی حامی رہی ہے ابنِ سعود مرحوم کی کوششوں کو عرب لیگ کے قیام میں بنیادی حیثیت حاصل تھی اور فلسطین کے تنازعہ میں سعودی عرب دوسرے عرب ممالک کے ساتھ متحد الخیال ہے مگر سعودی عرب کی حکومت عرب ممالک کے اتحاد اور استحکام کی حامی اور خواہشمند ہونے کے باوجود اس اتحاد اور استحکام کو مغربی اثرات سے متاثر نہیں دیکھنا چاہتی۔ چناں چہ چند سال قبل جب جارڈن اور عراق کے ہاشمی حکمرانوں نے بعض مغربی طاقتوں کے زیرِ اثر "عظیم تر شام" کے قیام کی تحریک شروع کی تھی تو سعودی عرب نے اس تحریک کے تاثرات کو مسدود اور زائل کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرامکو یعنی اریبین امریکن کمپنی کی بدولت جسے سعودی عرب کے تیل کی اجارہ داری حاصل ہے سعودی عرب اور متحدہ امریکہ کے تعلقات بے حد خوشگوار اور مربوط ہیں اور جون ۱۹۵۱ء کے ایک معاہدہ کے مطابق متحدہ امریکہ کو دھران کے فضائی مستقر پر خصوصی اختیارات اور حقوق بھی حاصل ہیں اس کے باوجود سعودی عرب کی حکومت اپنی خارجہ حکمتِ عملی میں بالکل آزاد ہے اور اس نے میثاقِ بغداد نیز نہرِ سویز کو قومی ملکیت بنانے کے سلسلہ میں مصر کی جو تائید اور حمایت کی ہے وہ مذکورہ بالا حقیقت پر گواہ ہے۔

عرب ممالک کو متحد، خوش حال اور مغربی اثر سے آزاد دیکھنے کی خواہش مندی کے علاوہ سعودی عرب کی حکومت نے ایشیا اور افریقہ کے اتحاد اور آزادی کی تحریکوں کو بھی اپنی خارجہ حکمتِ عملی کا ایک اہم جزو قرار دے رکھا ہے۔ چناں چہ سعودی عرب ادارہ اقوامِ متحدہ کے عرب ایشیائی یا افریقی ایشیائی گروہ کا ایک ممتاز اور فعّال رکن ہے۔ اس نے بنڈونگ کانفرنس میں شرکت کی تھی اور وہ اس کانفرنس کے فیصلوں کا محض مؤید ہی نہیں بلکہ ان پر عامل بھی ہے۔ اور بین اقوامی امن اور اعتماد کی بقا، تحفظ اور توسیع کے لئے پنچ شیل پر عمل درآمد کو ضروری تصوّر کرتا ہے۔

ہندوستان اور سعودی عرب کے روز افزوں دوستانہ تعلقات بھی موخر الذکر کی خارجہ حکمتِ عملی کی نشان دہی کرتے ہیں اور جیسا کہ گزشتہ سال شاہ سعود اوّل کے ہندوستان آنے اور اس سال ہندوستان کے وزیر اعظم

پنڈت جواہرلال نہرو کے سعودی عرب جانے کے بعد شائع شدہ مشترکہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے اتحاد اور اشتراک عمل کا مقصد مشرقی ممالک کی آزادی کے حصول و استحکام بین اقوامی امن کی بقا و تحفظ اور اقوام عالم کے مابین بے غرضانہ تعاون اور اشتراک عمل کے جذبہ کو ترقی دینے کے علاوہ کچھ نہیں اور دونوں ملک خود کو مشرق و مغرب کے عمومی اختلافات اور فوجی گروہ بندیوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

دُنیا کے بعض دوسرے ممالک کے برعکس سعودی عرب کی حکومت کو ملک کے تعمیری مسائل کے علاوہ کوئی داخلی اُلجھن درپیش نہیں اور اس لئے وہ اپنی تمام تر توجہات کو عرب قوم کے اتحاد، تنظیم اور فلاح پر مرکوز رکھتی ہے۔ ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ سعودی عرب کے تعلقات خوش گوار ہیں اور اس کی سعی سے عرب ریاستوں کے مابین مشترکہ دفاع سے متعلق متعدد معاہدے بھی ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کی حکومت عام مسلمانوں کی فلاح و ترقی سے بھی غافل نہیں اور اس سلسلہ میں اس کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ آج سے چند سال قبل شاہ سعود اول کی سرپرستی اور سرکردگی میں موتمرِ اسلامی یا اسلامک کانگریس کے نام سے ایک غیر سیاسی ادارہ قائم کیا گیا ہے اور یہ ادارہ ملک اور قوم کے امتیاز کے بغیر دُنیا کے ہر گوشہ کے مسلمانوں کی تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری جدوجہد میں ہر ممکن طریقہ سے ان کی امداد کرتا ہے۔

ہمسایہ ریاستوں کے علاوہ سعودی عرب کے تعلقات مغربی طاقتوں کے ساتھ بھی ہمیشہ خوش گوار رہے ہیں اور اگرچہ اس نے فلسطین کے تنازعہ میں ان حکومتوں اور خصوصاً برطانوی حکومت کے طرزِ عمل کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی برطانیہ اور اپنے تعلقات میں کسی قسم کی کشیدگی کو راہ نہیں دی اس کے باوجود نخلستانِ بریمی کے تنازعہ نے گذشتہ چند سال سے دونوں ملکوں کے تعلقات کو ناخوش گوار بنا رکھا ہے اور اسی تنازعہ کو سعودی عرب کا اُلجھا ہوا واحد خارجی مسئلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نخلستانِ بریمی سعودی عرب کے جنوب و مشرق میں چھ مربع میل کا ایک سرسبز قطع ارض ہے اور ۱۸۰۰ء سے نجد کے ساتھ وابستہ چلا آرہا ہے۔ لیکن چونکہ اس قطعۂ ارض میں تیل کی موجودگی کا امکان ہے اور برطانیہ کی زیرِ اثر ریاست مسقط کی سرحد نخلستانِ بریمی سے ملتی ہے اس لئے ۱۹۵۵ء میں برطانیہ نے بریمی کو ریاست مسقط کا علاقہ دے کر اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے سعودی عرب کی جانب سے جس قدر کوششیں کی جاتی رہی ہیں وہ ناکامیاب ثابت ہوئی ہیں اور اس لئے سعودی عرب کی خارجہ حکمت عملی بہت بڑی حد تک اس تنازعہ سے بھی متاثر ہوئی ہے۔

سعودی عرب کے روبرو دوسرا اہم مسئلہ جسے خارجی مسئلہ کی بجائے عربوں کا قومی مسئلہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسرائیل کے مقابلہ میں عرب ریاستوں کے دفاع کا مسئلہ ہے اس سلسلہ میں اس وقت مصر اور شام نیز شام اور جارڈن کے مابین جو مشترکہ دفاعی معاہدے ہو چکے ہیں ان میں سے پہلے معاہدے میں سعودی عرب شامل ہے اور چونکہ وہ پہلے معاہدے میں شامل ہے اور اسی قسم کا دوسرا معاہدہ پہلے معاہدے میں شریک ایک ریاست کے ساتھ ہوا ہے اس لئے وہ بالواسطہ طریقہ پر دوسرے معاہدے کے ساتھ بھی وابستہ ہو گیا ہے

اسی قدر نہیں بلکہ حال ہی میں شاہ سعود اوّل نے عرب ریاستوں کے سربراہوں اور وزرائے اعظم کی جو کانفرنس منعقد کی تھی اس میں دُنیائے عرب کے موجودہ اور آئندہ مسائل کو مشترک طور پر حل کرنے کے لئے عربوں کا متحدہ محاذ قائم کرنے کے علاوہ اسرائیل کے مقابلہ میں عرب ممالک کے مشترکہ دفاع کے مسئلہ پر بھی غور کیا گیا ہے اور سطور بالا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سعودی عرب کے حکمران اور اس کی حکومت جہاں بین اقوامی مسائل کو پُرامن طریقہ پر طے کرنے اور بین اقوامی تعمیری جدوجہد میں ہر ممکن اشتراک عمل کرنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں وہیں وہ ایشیا اور افریقہ کی محکوم اور نیم محکوم قوموں کو آزاد بھی دیکھنا چاہتے ہیں وہ مشرق اور مغرب کے تمام ملکوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات کے قیام کے حامی ہیں لیکن وہ ان تعلقات کو غیر ملکی اثر و نفوذ کا وسیلہ نہیں بننے دینا چاہتے۔ اور وہ دُنیائے عرب کو متحد، خوش حال اور سربلند دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اور اس طرح سعودی عرب کی حکومت کو بجا طور پر ایک ترقی پسند حکومت کہا جا سکتا ہے

ضروری نوٹ

غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

مالک رام

ع ۔ م

کتابیں اور رسالے

زبان اور علمِ زبان

از پروفیسر عبدالقادر سروری ۔ صفحات ۳۱۷، مجلد کتابت طباعت عمدہ ۔ قیمت سات روپے ۔ ملنے کا پتا: اُردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد دکن

جدید تحقیق کے مطابق زبان سے متعلق دو علم ہیں ۔ پہلا وہ جو زبانوں کے مختلف خاندانوں، اُن کے باہمی تعلق، ان کے نشو و نما اور ان کے تغیّر و تبدّل سے بحث کرتا ہے، اسے انگریزی میں فلالوجی اور ہمارے ہاں علم اللسان یا لسانیات کہتے ہیں ۔ دوسرا وہ جو زبان سے بحیثیت زبان گفتگو کرتا ہے یعنی اس کی آوازوں اور ان کے آغاز و ارتقاء اور اس کے نتیجے میں ان کے حروفِ تہجی کی تشکیل وغیرہ اس کے موضوع ہیں مغرب میں اسے لنگواسٹکس Linguistics کا نام دیا گیا ہے ہم اسے صوتیات کہہ سکتے ہیں ۔

اگرچہ لسانیات پر بھی ہمارے ہاں باقاعدہ کوئی کتاب لکھنے کی کوشش نہیں کی گئی لیکن گذشتہ نصف صدی میں دو چار کتابیں ایسی ضرور شائع ہوئی ہیں جن کا کچھ حصہ فن اسی علم سے متعلق ہے ۔ سخندانِ فارس (آزاد) سرگزشتِ الفاظ (احمد دین)، ہندستانی لسانیات (ڈاکٹر زور)، وضعِ اصطلاحات (سلیم پانی پتی) پنجاب میں اُردو (محمود شیرانی) مقدمہ تاریخِ زبان اُردو (ڈاکٹر مسعود حسین) ان میں سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہیں لیکن جہاں تک صوتیات کا تعلق ہے کتاب تو درکنار اُردو میں کوئی اچھا مضمون بھی نہیں ملتا اس لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر سروری نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو بہت اچھے طریقے پر دُور کرنے کی کوشش کی ہے ۔

کتاب میں چھ باب ہیں ۔ زبان اور اس کی اہمیت، زبان کا آغاز، علمِ زبان، زبان کا ارتقاء، علمِ زبان کی شاخیں، صوتیات، صوتی تبدیلی، صوت، تجزیہ، تشکیلیات، نحو، معنیات، تاریخی طریقہ، مماثلت اور دوسرے عوامل، زبانوں کی تقسیم، دنیا کی زبانیں، ہندوستان کی زبانیں، علمِ زبان کی تاریخ، تحریر کا آغاز اور ارتقاء

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتاب اپنے فن میں کتنی جامع ہے ۔ مصنّف نے مغربی عالموں کی کتابوں سے پورے طور پر استفادہ کرکے ان کے اصولوں اور نتائج کو ہندوستان کی زبانوں اور خاص کر اردو پر منطبق کیا ہے اور اس طرح اردو کو درجۂ اوّل کی ایک کتاب مل گئی ہے ۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک اس علم میں جو تحقیق ہو چکی ہے اس کا ضروری حصّہ اُردو میں منتقل ہو گیا ہے ۔

چونکہ کتاب میں اس فن کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں جو عام فہم نہیں، اس لئے ان کی فہرست اور ان کے انگریزی مرادفات آخر میں دے دئے گئے ہیں جو اپنی جگہ پر بھی بہت مفید چیز ہے ۔

اس فن سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں ۔

(مالک رام)

مُرقّعِ شعراء

مرتّبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۔ اُردو زبان کے دس نامور شعراء کے اس البم میں مندرجہ ذیل شعراء کے چار رنگوں کے مرقّعے شامل ہیں ۔

پروانہ لکھنوی، قتیل فریدآبادی، تسلّی لکھنوی، مصحفی امروہوی، حسرت دہلوی، مضطر لکھنوی، ضیاء دہلوی، مرزا مظہر جانجاں، فدوی لاہوری اور میر تقی میر ۔

یہ البم ایک صدی پرانا ہے اور اس کی تصدیق شعراء کے ان حالاتِ زندگی سے ہوتی ہے جو ان کے مرقّعوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں ۔ پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ۔ ڈاکٹر سکسینہ نے اردو ادب کو گراں قدر تصنیفات عطا کی ہیں یہ کارنامہ جو قابلِ وقعت بھی ہے اور قابلِ دید بھی، حال ہی کی تصنیفات میں نہیں بلکہ ماضی و حال

کی تمام اردو تصنیفات میں بڑا ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ آرٹ پیپر پر چھپا ہے۔ جلد اور جلدپوش نہایت حسین و جمیل۔ کتابت، طباعت اوّل درجے کی۔

میر، قتیل اور مرزا مظہر جانِ جاں کی تصویریں ایسے نوادر ہیں کہ صرف یہی ہوتے تو بھی مرقع اپنی جگہ لاجواب ہوتا۔ قیمت فی جلد بیس روپے۔ پبلشر دھومی مل دھرم داس چاوڑی بازار۔ دہلی

مثنویاتِ میر بخطِ میر

یہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا دوسرا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ میر کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی چار مثنویاں بلاک میں آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں ——— پیش لفظ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرقعِ شعراء کی تمام خوبیاں اس کتاب میں بھی ہیں ——
قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ ملنے کا پتہ دھومی مل دھرم داس چاوڑی بازار۔ دہلی

حیرت زار

مرزا عبدالقادر بیدل کے کلام کا انتخاب۔ مرتّب پروفیسر سید شاہ محمد عطا الرحمٰن عطا کاکوی ناشر ایوانِ اُردو پٹنہ ۴۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔ ضخامت ۱۸۰ صفحے کتاب مجلد ہے۔ یہ کتاب بیدل کی شاعری کا ایک بہت اچھا تعارف اور انتخاب ہے ' بیدل کے متعلق نیاز کے تاثرات' کے عنوان سے مرتّب نے مدیرِ نگار کی بیدل سے عقیدت کا ذکر نہایت خوش آیند پیرایے میں کیا ہے۔ کلامِ بیدل کے خصوصیات تک پہنچنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں اب جب کہ عطا صاحب نے ایک حد تک اس مشکل کام کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے تو وہ لوگ جو کلامِ بیدل کو دُور سے دیکھ کر ہی خوش ہو لیتے تھے بیدل ہی کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں گے ؎

زبیرنگ فسوں پردازئ الفت چہ می پُرسی
تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدن ہا

شکستہ کنگورے

پبلشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔ مصنّف حیات اللہ انصاری۔ کتاب ۳۰×۲۰/۱۶ کے ۲۱۰ صفحوں پر مشتمل اور جلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

یہ کتاب حیات اللہ انصاری کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انصاری صاحب اُردو کے صاحبِ طرز افسانہ نگار ہیں۔ یہ کتاب اُمید ہے اس دور میں جب کہ اچھے افسانے نہیں لکھے جا رہے بہت مقبول ہوگی ع

پس از مدّت گزر افتاد بر ما کاروانے را

دینِ الٰہی کے عناصرِ اربعہ

مصنّف طالب صفوی، مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ ضخامت ۳۰×۲۰/۱۶ تقطیع کے ۱۴۰ صفحے۔ اکبر کے دینِ الٰہی پر مستند حوالہ جات سے پُر از معلومات یہ کتاب تاریخ، مذہب اور ادب کے طلباء و شائقین کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ ابواب کی فہرست یہ ہے۔

دینِ الٰہی کا سیاسی اور مذہبی پس منظر
صوفی عنصر
شیعہ عنصر
ہندوستانی عنصر
عیسائی عنصر

گیت اور چیخ

ہربنس سنگھ دوست کے بارہ افسانوں کا مجموعہ۔ حرفِ اوّل از سہیل عظیم آبادی قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ امر کتاب گھر پوسٹ بکس ۴۵ جمشید پور

دوست ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ مزدور کی بہبود کے لئے آپ کا قلم تانا بانا بُنتا رہتا ہے لیکن مزدور کی کمزوریوں کا ذکر کرنے سے بھی 'دوست' نہیں جھجکتے۔ وہ کسی خاص مکتبۂ فکر سے متعلق نہیں ہیں اور اگر یہی نہج بیان کا مزاج قائم رہا تو وہ ہمہ گیر مصنّف کی حیثیت سے اپنے مستقبل کو تابناک دیکھیں گے۔

تنقیداتِ عبدالحق

مکتبۂ جینکاری گلی قاسم جان دہلی۔ قیمت دو روپے چار آنے مختلف مطبوعات پر ڈاکٹر عبدالحق کے تبصروں پر مشتمل یہ مجموعہ مزید تعارف کا محتاج نہیں۔

سلاطینِ ہند کی علم پروری

مصنّف محمد حفیظ اللہ۔ ناشر مسلم اکاڈیمی پھلواری شریف پٹنہ۔
قیمت بغیر جلد ۴/ مجلد ۵/ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔

اسلام اور غیر مسلم

مصنّف محمد حفیظ اللہ۔ ناشر مسلم اکاڈیمی پھلواری شریف پٹنہ ۲
قیمت قسم اوّل مجلد ۸/ قسم دوم بغیر جلد ۶/ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ تاریخی حوالہ جات اور مستند بیانات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خلفائے اسلام اور تاجدارانِ اسلام نے غیر مسلموں سے رواداری اور محبت کا سلوک کیا ہے۔ بالخصوص مسلم شاہانِ ہند اس باب میں

پیش پیش رہے۔

نذرِ عقیدت

از حکیم حبیب اللہ ایم، ایل، اے۔ یہ تذکرۂ سیرتِ رسولِ کریم ۴۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ پبلشر راجہ رام کمار پریس بک ڈپو لکھنؤ، وارث نول کشور پریس بک ڈپو لکھنؤ۔

اسلامی روایات

از محمد حفیظ اللہ۔ ناشر مسلم اکاڈمی پھلواری شریف پٹنہ۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت ۸؍ کتاب مجلد ہے۔ اسلامی تاریخ کے سبق آموز واقعات اور نتیجہ خیز روایات کا مجموعہ۔

خرام

ہیش چندر نقش کے کلام کا مجموعہ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب جلد عمدہ۔ قیمت ۸؍ ۔ ابتدائیہ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے اور دیباچہ احسان دانش نے۔

ملنے کا پتہ مکتبہ قصر الادب اردو بازار دہلی

نقش کا کلام صاف اور زبان شستہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی ٹکسالی زبان اور جدید عاشر کا تلازمہ ایک جگہ جمع ہیں۔ دیکھئے آورد و تصنع تک نہیں

نظارۂ بہارِ چمن ہے علش فروز
یہ گل بھی میری راہ میں کانٹے بچھا گئے

امید ہے اس نوجوان کے کلام کو جو پیشے کے لحاظ سے مزدور ہے اہلِ نظر تحسین کی نظر سے دیکھیں گے۔

سالار جنگ میوزیم

از سید مبارز الدین رفعت قیمت ۸؍۔ یہ مختصر سا رسالہ اس شاندار میوزیم کا تعارف نامہ ہے جس کی مثال ایشیا بھر میں نہیں ملتی۔ ملنے کا پتہ مصنف آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ

علم الحدیث

تالیف عبداللہ عمادی۔ ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۴؍ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔ اسلام کا قانونِ اساسی، فلسفۂ حدیث اور فلسفۂ تاریخ، علم حدیث کی تشریح، اصولِ حدیث، درایت، حدیث کے اجتماعی و عمرانی فواید، شبہات، روایت، اسناد، جرح و قدح، فہرست ماخذ

صحت حسن و مسرت

ہیلتھ اینڈ ایجوکیشنل پبلیکیشنز ۱۷۲ جی بلاک ۲، پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی کراچی (پاکستان) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ کتاب ۲۰x۳۰/۱۶ کے ۱۰۰ صفحوں پر مشتمل مفید معلومات سے پُر ہے۔

ساقی نامہ

از پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ایوانِ اردو پٹنہ ۷۔ قیمت نو آنے۔ جیبی تقطیع کے ۹۶ صفحے، کاغذ کتابت، طباعت عمدہ۔ ایک صفحے پر ایک رُباعی یا قطعہ درج ہے۔ تخاطب بالالتزام ساقی سے ہے۔ عطا صاحب بڑے کہنہ مشق شاعر اور صاحبِ علم و فن آدمی ہیں۔ امید ہے آپ کا یہ بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر مجموعہ مقبول ہوگا۔

صبر و شکر

ذکر و فکر کے بعد محمد منہ تہنیت صاحب کے نعتیہ کلام کا دوسرا مجموعہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ حُبِ رسولؐ کا یہ معجزہ کہئے یا خود تہنیت صاحب کے ادبی ماحول کا کرم کہ یہ صفائے قلب کا آئینہ ادب دوستوں کو دیکھنے کو ملا۔ اور پھر رجائیت کا پہلو غالب ہے ؎

نہ ہو کبھی درِ آقا سے تہنیت مایوس
بلاکشانِ محبت کو کب صلہ نہ ملا

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، رفعت منزل۔ خیریت آباد، حیدرآباد دکن قیمت دو روپے۔ کتاب مجلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

رسالے

نقوش شخصیات نمبر ۲ ۔ پہلے نمبر کے صفحات ۰۰۰ تھے۔ اب انھیں ملا کر کل صفحے ۱۵۱۶ ہوگئے ہیں۔ یہ بہت بڑا ادبی کام ہے جو طفیل صاحب نے انجام دیا ہے۔ ”انجام دیا ہے“ کہنا صحیح بھی نہیں کیونکہ ابھی اسی ضمن میں ایک آدھ نمبر اور شائع ہونا باقی ہے۔

یہ ہفتخواں طے کرنا بڑی ہمت ہے۔ شخصیت نگار بھی وہی لوگ ہیں جو شخصیت سے بالکل قریب ہیں۔ بہت سے مضمون اس میں انشاپردازی اور خاکہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ کچھ تعداد ایسی بھی ابتدا میں شامل ہیں۔

اگر حیدرآباد، علی گڑھ، بہار اور سرحد کی شخصیتوں پر مضامین کو

صرف چار تضمینیں سمجھا جائے تو کل ۸۰ تضمینیوں پر اس شمارے میں نہایت اچھے مضامین شامل ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ ادارۂ فروغ اُردو، ایبک روڈ انارکلی لاہور (پاکستان)

مشرب (تاریخ اُردو ادب نمبر) مُرتّب ابوالسلم صحافی۔ ۹۶۰ صفحات پر یہ قابلِ قدر شمارہ کراچی سے شائع ہُوا ہے۔ تقریباً ہر اچھے ادیب کی تصویر اور تخلیق اس کتاب میں شامل ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ کے تمام پہلوؤں پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک شمارہ ہی اردو ادب سے متعلق ہر قسم کی معلومات کا حامل ہے۔ لائبریریوں اور طلباء کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ مشرب تین ہٹی کراچی

علی گڑھ میگزین ۵۶-۱۹۵۵ء۔ ایڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی، نگران پروفیسر رشید احمد صدیقی، مینیجر پروفیسر ظہیر الدین علوی۔ پہلا حصّہ مجاز مرحوم کی یاد میں ہے۔ ۱۹۰ صفحوں پر مشتمل یہ حصّہ مجاز کے فکر و فن پر ایک مفصل کتاب ہے۔ دوسرے حصّے میں مقالات، افسانے اور نظمیں ہیں۔ یہ حصّہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت تین روپے۔ مندرجات سب کے سب معیاری ہیں۔ ملنے کا پتہ مینیجر علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سرفراز (محرم نمبر) ایڈیٹر سید مصطفےٰ حسن رضوی۔ قیمت ۸/ ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ اس نمبر میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۵ء تک کے محرم نمبروں کے اہم مضامین و نظمیات شامل ہیں۔ ملنے کا پتہ مینیجر سرفراز لکھنؤ۔

پگ ڈنڈی - ادب نمبر۔ ترتیب دینے والے مہندر بادا اور امریک آنند۔ قیمت تین روپے ضخامت ۲۶۴ صفحات مضامین، غزلیات، نظمیں، افسانے، طویل نظمیں، پنجاب رنگ، ڈرامے، جائزے، دوسری زبانوں کے افسانے اور نظمیں وغیرہ عنوانات کے تحت اِفادی ادب کے نمونے اس قابلِ قدر شمارے میں شامل ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ مینیجر رسالہ پگ ڈنڈی امرتسر پنجاب۔

سوغات - دہلی سے یہ ماہنامہ بڑی باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ ناظر ملیح آبادی اور ایڈیٹر شاہد خاں۔ قیمت سالانہ تین روپے۔ پتہ پوسٹ بکس ۲۳۲-نئی دہلی مولانا ملیح آبادی کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُردو صحافت میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ اس رسالے کے ناظر ہیں۔ رسالے کے مقاصد بہت خوش آیند ہیں۔ ملک میں ذہنی بیداری پیدا کرنا، جہل تعصّب اور فرقہ واریت کو ختم کرنا۔ یہ مقاصد پیشِ نظر ہوں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ ایک مقصد اور بھی اس رسالے کا ہے۔ مسلمانوں کو خصوصیت سے وہ راہ دکھانا جس میں ان کی زندگی اور شرع روشن ہے۔ یہ رسالہ بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کی بہت اچھی مثال ہے۔

کھلاڑی - بچّوں کا رسالہ علم پور سے جاری ہُوا ہے۔ ایڈیٹر شاہد احمد ناز قیمت سالانہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ مینیجر کھلاڑی چوک محمد سعید خاں رام پور، یو۔پی۔

ہماری زبان - انجمنِ ترقّیٔ اُردو ہند کا یہ ترجمان اب ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ انجمن اور اُردو سے متعلق خبریں اور شذرات اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُردو کے نامور ادیب، نقّاد اور شاعر پروفیسر آل احمد سرور اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ہر اردو دوست کو یہ پرچہ خریدنا چاہیئے۔ قیمت سالانہ تین روپے۔
ملنے کا پتہ۔ مینیجر ہماری زبان۔ دفتر انجمن ترقّی اُردو ہند، علی گڑھ۔

جنوری نمبر کے چند متوقّع مضامین

مضامین

وحدت میں یہ دوئی کیوں؟	ڈاکٹر عابد حسین
واجد علی شاہ کا سفرِ کلکتہ	سرشیخ تصدّق حسین
جے پور عجائب خانے کا ایرانی قالیچہ	ڈاکٹر ستیہ پرکاش سریواستو

افسانے و خاکے

یہ ایڈیٹر لوگ	بلونت سنگھ
جب عورت ناچتی ہے	کرتار سنگھ دگل
یہ ڈراما وہ ڈراما	جوگندر پال

بزمِ شعراء

آلِ احمد سرور، نوح ناروی، بسمل سعیدی، ارشد کاکوی، فضا ابنِ فیضی، نوری جیدآبادی وغیرہ

بھنڈار بھرپور ہو گئے تجویز کے مطابق ہی

بھنڈار سچ مچ ہی بھرپور ہو گئے ... کیوں کہ پہلے پانچسالہ پلان میں زراعتی پیداوار میں جہاں ۶،۷ میلین ٹن کے اضافہ کا اندازہ لگایا گیا تھا وہاں دراصل ۱۱ میلین ٹن کا اضافہ ہوا۔ ہندوستان کے کسان اس کارنامے کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان میں اناج کی پیداوار کو اور زیادہ بڑھانے پر اور مختلف قسم کے زراعتی مسئلوں پر زور دیا گیا ہے۔ اور ایک بار پھر اس پلان کی کامیابی کا دارو مدار کھیتوں کی پیداوار پر ہوگا جو کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو اناج مہیا کرے گی۔

برما شیل دور دراز کے زراعتی گاؤں میں ایندھن، تیل اور لبریکنٹ مہیا کر کے دراصل کسانوں کا اس اہم کام میں ہاتھ بٹا رہی ہے۔ شیل پٹرولیم کی مختلف مصنوعات جیسی کہ الڈرین۔ ڈائل ڈرین، اور انڈرین، اناج کی فصلوں کی حفاظت کرتی ہیں، اور فی ایکڑ زمین کی پیداوار کو بڑھاتی ہیں۔

ملک میں پھیلے ہوئے برما شیل کے ۱۶۳۱ ڈپو اور گوداموں کے ذریعے جن میں ۴۲۶،۰۰،۰۰۰ گیلن کی گنجائش ہے، پٹرولیم کی اہم مصنوعات ضرورت پڑنے پر ہر وقت اور ہر جگہ مہیا کی جا سکتی ہیں۔

برما شیل — ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے

ترقی کے لئے منصوبہ بندی

۴۸۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ روپے
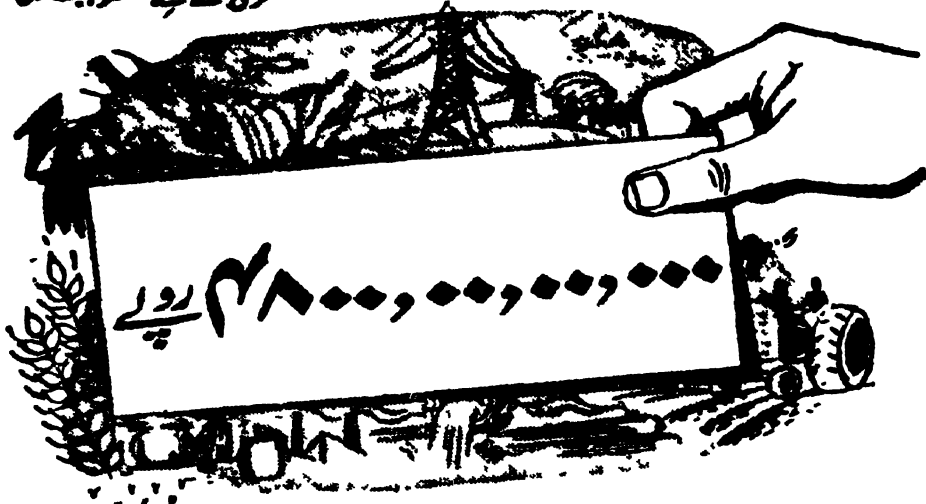
اگلے پانچ سالوں (۱۹۵۶ - ۶۱) میں نئے بھارت کی تعمیر کے عظیم کام پر صرف ہوں گے۔
یہ رقم پہلے پانچسالہ پلان کی ۲۳۵۶ کروڑ روپے کی رقم سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔

پہلے پانچسالہ پلان میں حسب ذیل امور کو ترجیح دی گئی:-

(۱) زراعت (۲) آبپاشی و بجلی (۳) سماجی خدمات

دوسرے پانچسالہ پلان میں حسب ذیل امور پر زور دیا جا رہا ہے:-

(۱) صنعتیں۔ خصوصاً بھاری صنعتیں (۲) ذرائع رسل و رسائل (۳) سماجی خدمات میں توسیع

اخراجات کی تقسیم

(کروڑ روپوں میں)

	پہلا پلان	دوسرا پلان
کھیتی باڑی و اجتماعی ترقی	۳۵۷	۵۶۸
آبپاشی و بجلی	۶۶۱	۹۱۳
صنعتیں و معدنیات	۱۷۹	۸۹۰
ذرائع رسل و رسائل	۵۵۷	۱۳۸۵
سماجی خدمات، مکانات و بحالیات	۵۳۳	۹۴۵
متفرق	۶۹	۹۹
	۲۳۵۶	۴۸۰۰

"بڑا آدمی پلاننگ کے معنی ہیں کام — محنت — منصوبہ بند، سوچی سمجھی اور منظم محنت۔ پلاننگ سے مراد ملک کے ذرائع اور سرمایہ کا بالخصوص انسانوں میں دستیاب طاقت کا استعمال انہی کے فائدے اور بہتری کے لئے ہے"

—— جواہر لال نہرو

دوسرا پانچسالہ پلان

قومی خوشحالی کے لئے

آج کل

موسیقی نمبر

اگست ۱۹۵۶ء

قیمت :- ایک روپیہ

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُرراز معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

شفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

سیریڈون

یہ تمام درد دور کرتی ہے

کمر کا درد

دانت کا درد

درد کی بے ضرر دوا سیریڈون دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ سبھی قسم کے درد نیز طبیعت کی الجھن کو فوراً دور کر دیتی ہے۔ سیریڈون درد کی دوا تو ہے ہی اس کے علاوہ بھی یہ اور کئی فائدے پہنچاتی ہے۔ اس کا اثر آپ پر تین طرح سے ہوتا ہے:

درد رفع کرتی ہے: سیریڈون دیکھتے ہی دیکھتے درد کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کے استعمال سے پیٹ میں گڑبڑی یا طبیعت میں بدمزگی نہیں پیدا ہوتی۔ زیادہ تر حالتوں میں درد آنے والی صرف ایک ٹکیہ ہی کافی ہوتی ہے۔

آرام پہنچاتی ہے: [illegible] آپ کے اعصاب کو بحال کرتی ہے۔ یہ درد کی وجہ سے پیدا ہو جانے والی گرانی [illegible] آپ کو پھر سے خوش و خرم بنا دیتی ہے۔

تازگی پیدا کرتی ہے: سیریڈون آپ کی طبیعت میں ابھار پیدا کرتی ہے جس کے باعث نیند پوری نہ ہونے یا درد کی وجہ سے محسوس ہونے والی کمزوری اور گرانی دور ہو جاتی ہے۔ آپ چند منٹوں میں ہی پھر سے چست و ترو تازہ بن جاتے ہیں!

سیریڈون میں یہ بے مثل خوبیاں اس میں شامل اجزاء کے مجموعی فعل کی وجہ سے ہیں۔ یہ اجزاء ایک دوسرے کو زیادہ موثر بناتے ہیں۔ یاد رکھئے، سیریڈون میں [illegible] لانے والی دوائیں نہیں ہوتیں!

- ★ دو آنے کی ایک ٹکیہ
- ★ ہر ٹکیہ ایک مکمل خوراک ہے
- ★ اس میں اسپرین (اسیٹل سیلیسلک ایسڈ) شامل نہیں

سیریڈون لے کر دیکھئے... آپ کو خود ہی یقین ہو جائے گا!

COOL
&
REFRESHING
رُوح افزا
مشرق کا بہترین مشروب

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان بنایا ہے وہ ایک بہت زیادہ صفحات پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم موضوعات بیان کر دیئے گئے ہیں

قیمت ۴ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کار نمایاں میں حصہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیر تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے ہاں کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُرازمعلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم وادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار لوگوں کو اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi

Regd No D—809

آجکل

آٹھ آنے

اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خدوخال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس ملک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے 'صرف' کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے اس کو اردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

بیماریوں سے شفا پانے کی نئی اُمیدیں

اِس وقت ہندوستان میں ڈاکٹروں کی بڑی کمی ہے. اتنے ڈاکٹر اور نرسیں نہیں ہیں، کہ تمام ضرورت مند مریضوں کی پوری خبرگیری ہوسکے. دیہاتوں میں یہ کمی خاص کر پائی جاتی ہے.

لیکن دوسرے پنج سالہ پلان، میں دیہاتوں میں علاج و معالجہ اور صحت عامہ کے لئے ۵۶-۱۹۵۱ کی بہ نسبت دوگنی رقم منظور کی گئی ہے

اور یہ تجویز ہوچکی ہے کہ ۱۹۶۱ تک تمام ان مقامات پر جہاں صنعتی منصوبے اور قومی توسیعات وغیرہ ہورہی ہیں موجودہ حالت سے ۳۰۰۰ سے زائد صحت کے مرکز قائم کئے جائیں گے

اسپتالوں میں اِنڈور علاج کا ۲۶ فیصدی اضافہ ہوگا، اور سارے ملک کے اسپتالوں میں ۳۰،۰۰۰ سے زائد بستر بڑھائے جائیں گے.

برما شیل ملک کے ملیریا اور فلیریا کنٹرول پروگرام کے لئے لاروی سیڈل تیل اور ربڑ ڈبل کے چھڑکاؤ کے تیل بڑی مقدار میں مہیا کر رہی ہے ہم پیٹرولیم سے تیار کئے ہوئے کیڑے مارنے والے تیل ملک بھر میں پہونچا رہے ہیں. شیل پیٹرولیم کی کیمیاوی مصنوعات الڈرین. ڈائل ڈرن اور اینڈرین ملک کے اناج کے ذخیروں کی حفاظت کرتی ہیں پیٹرولیم سے بنائی ہوئی دوسری مصنوعات انٹی بیوٹکس کے تیار کرنے میں بھی استعمال کی جاتی ہیں

برما شیل .... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے

چھوٹی چھوٹی بچتوں سے بڑے بڑے کام
قومی بچتوں میں
روپیہ لگایئے
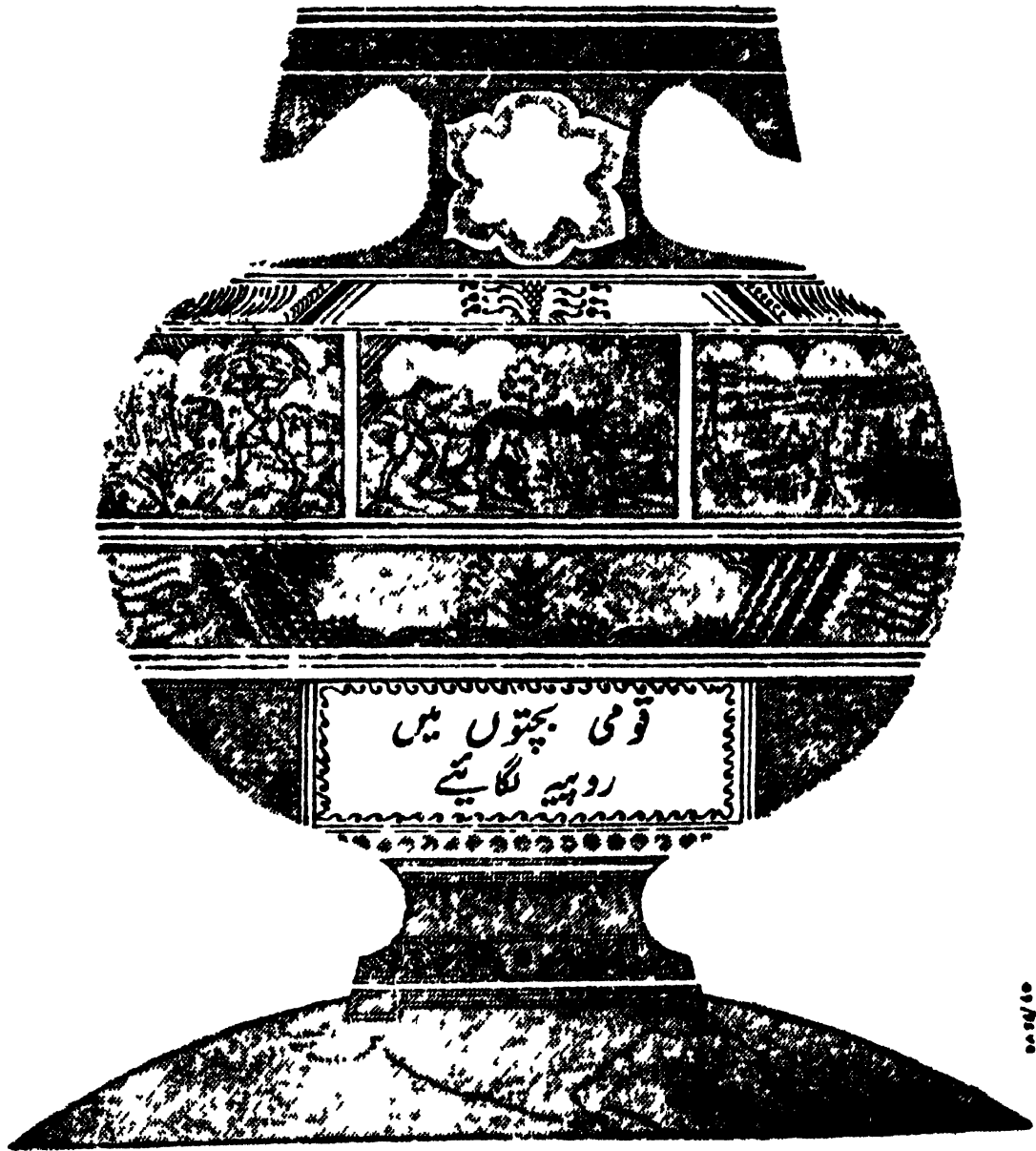
۲
۱۵۹۱۲۳

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مظفر شاہ

جلد ۱۵ —— نمبر ۳

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں چھ روپے
پاکستان میں چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں آٹھ آنے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

اکتوبر ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

ملاحظات

ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا مقصد بقائے امن ہے۔ لادینی اور غیر مذہبی بنیادوں پر اس کا دستور قائم ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ امن اور آزادی چاہنے والے ممالک اس کی دوستی کا دم بھر رہے ہیں۔ اسلامی ممالک بالخصوص ہندوستان کے ساتھ ہوا خواہی اور محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ ایشیائی اور افریقی ممالک میں ہندوستان کو ایک خاص عزت اور وقار مل رہا ہے۔ انڈونیشیا کو لیجئے۔ اس کی حصولِ آزادی کی مہم میں ہندوستان نے اس کا ساتھ دیا اور آج دونوں ملکوں میں محبت اور آشتی کا رابطہ و تعلق بہت استوار ہے۔ محافظِ حرمین شاہ ابن سعود، والیٔ سعودی عرب، ہندوستان میں بہ نفسِ نفیس تشریف لا چکے ہیں اور ان کی دعوت پر بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب بھیجے گئے ہیں۔ ملک شام کی جمہوریہ کے صدر ہندوستان آ رہے ہیں۔ شاہِ ایران ہندوستان کا دورہ کر کے گئے تو انھوں نے دونوں ملکوں کی ثقافتی ہم آہنگی کو تسلیم کیا مصر کے ساتھ بھارت کے تعلقات، تہذیبی اور سیاسی ہر اعتبار سے مضبوط ہیں۔ صدر جمہوریۂ مصر کرنل ناصر خود بھارت کا دورہ کر چکے ہیں اور حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے انھوں نے ان کے سفرِ یورپ کے دوران میں بھی ملاقات کی تھی۔ آزاد اور آزادی پسند ممالک میں یہ یک جہتی اور راست روی امنِ عالم کے لئے ایک خوش آیند فال ہے۔ ایشیائی اور افریقی ممالک اسی راہ پر گام زن ہو کر دوسرے ممالک کے ہم دوش ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔

سوئز کا قضیہ ابھی طے نہیں ہوا۔ لندن میں ۲۲ ممالک کی جو کانفرنس ہوئی اس میں سے ۱۸ ممالک نے کثرتِ آراء سے ایک کمیشن صدر جمہوریۂ مصر کے پاس بھیجنا منظور کیا تھا جو ان سے گفت و شنید کرے اور اس بات پر زور دے کہ سوئز کے انتظامات ایک بین الاقوامی بورڈ کے سپرد کر دیے جائیں۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر مینزی اس کمیشن کے قائد تھے۔ امریکہ، حبشہ، ایران اور سویڈن اس کمیشن کے ممبر تھے۔ پریزیڈنٹ ناصر اس کمیشن سے بات چیت کر چکے ہیں۔ ادھر ناٹو Nato کی ایک میٹنگ پیرس میں ہو رہی ہے۔ برطانوی بیڑا تیار کھڑا ہے۔ فرانسیسی فوجیں قبرص میں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن تمام باتوں کو محض دِ تحفظ سمجھ لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ معاملہ زیادہ نہیں بڑھے گا اور کوئی خاطر خواہ تصفیہ ہو جائے گا۔

احمد آباد میں پچھلے دنوں "دو زبانی" صوبۂ بمبئی بننے کی تجویز کے خلاف جو مظاہرے ہوئے وہ بہت افسوس ناک تھے۔ جس دھرتی سے گاندھی اور پٹیل اٹھے اور جس شہر پر انھیں ہمیشہ ناز رہا وہیں تشدد کا دھواں اٹھے یہ عبرت ناک بات نہیں تو اور کیا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ گجرات اور بمبئی کے مضبوط کردار قائد مرارجی ڈیسائی کے بروقت انتباہ اور تدبر سے صورتِ حال بہتر ہو گئی بلکہ سنور گئی۔ مہاراشٹر پراونشل کانگرس کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے بھارتی پارلیمنٹ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ بمبئی کا بڑا "دو زبانی" صوبہ بنایا جائے۔ امید ہے کہ اس فیصلے کے بعد ہندوستان کے صوبوں کی نئی تشکیل بہ وجہِ احسن عمل پذیر ہو جائے گی۔

۲۹ اگست کی شب کو مسٹر غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ موصوف ایک قابل منتظم، ہر دل عزیز دوست اور علم پرور انسان تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان آپ بزمِ اردو شملہ کے صدر تھے اور آپ کے اہتمام سے پانچ مشاعرے شملے میں اس نوعیت کے ہوئے کہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ شعر و ادب کے آپ بڑے دلدادہ تھے۔ تقسیم کے بعد آپ کا یہ ایمان تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں مستقل اور پائدار دوستی کا قائم ہونا ضروری ہے۔ آپ کی صحت ایک مدت سے خراب چلی آتی تھی۔ اپنی ۶۱ ویں سالگرہ کے دن آپ راہیٔ عالمِ بقا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

طیش صدیقی

حدیثِ وطن

مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من
مرے وطن کی سرزمیں جمیل و دلکش و حسیں
مرے وطن کا آسماں عظیم و عزم آفریں
یہ پُرخلوص بستیاں فلاح و خیر کی امیں
سکوں پسند و صلح جو، بلند ظرف و پاک بیں
یہ زر فروش کھیتیاں، ستارہ خیز و خوش جبیں
شگوفہ بار و گل چکاں، نظر نواز و نازنیں
رواں دواں ہے چار سو، فضا میں رُوحِ انگبیں
مذاقِ دید چاہیئے، تجلیاں کہاں نہیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہیں پہ رام و لکشمن پلے بڑھے جواں ہوئے
یہیں پہ نانک و کرشن و بُدھ گہر فشاں ہوئے
یہیں پہ سُور و تُلسی و کبیر نغمہ خواں ہوئے
یہیں معین و وارث و نظام حق بیاں ہوئے
یہیں سلیم و صابر و کلیم نکتہ داں ہوئے
یہیں نظیر و میر و میرزا رباب جاں ہوئے
حقائق و بصائر و نظر کے ترجماں ہوئے
رسولِ زندگی ہوئے، پیمبرِ زماں ہوئے
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
مٹا مٹا سا ہے شبِ سیاہ کا ہر اک سماں
اُڑی اُڑی سی ہیں اجل کی قوتوں کی دھجیاں
اُفق اُفق ہیں مریمِ سحر کی دلستانیاں
جہاں جہاں ہے زندگی کی دلبری کی داستاں
جفاکشی و تن دہی کی معترف ہیں کھیتیاں
خلوصِ کار کی گواہ ہیں ملوں کی چمنیاں
اُچھل رہے ہیں دیوتا، مچل رہی ہیں دیویاں
اُبل رہے ہیں زمزمے، بہک رہی ہیں مستیاں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من
یہ سادھوؤں کی جنم بھوم صوفیوں کا یہ وطن
تمدنوں کا مدرسہ، ثقافتوں کی انجمن
یہ سبز پوش وادیاں حریفِ خطۂ ختن
یہ چشمہ ہائے جاں فزا یہ گنگ اور یہ جمن
کہیں بہار مضطرب کہیں شراب موجزن
لطافتیں روش روش نفاستیں چمن چمن
یہ دلبرانِ شعلہ قد سحر جمال و سیم تن
اشارتیں ادا ادا، عبارتیں سخن سخن
مرا وطن مرا وطن حیات و کائناتِ من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من
یہ کاشغر کی نزہتیں، ہمالیہ کی رفعتیں
یہ صبح و شام کاشی و اودھ کی جاذبیتیں
یہ دہلی اور لکھنؤ کی یادگار عظمتیں
یہ ارضِ تاج کا علو، یہ سیکری کی شوکتیں
یہ پُر شکوہ مقبرے، یہ ذی وقار تربتیں
یہ دیدہ زیب باغچے یہ دل کشا عمارتیں
یہ سیم و زر کی بخششیں، یہ فکر و فن کی برکتیں
یہ عاشقی کے معجزے، یہ حسن کی کرامتیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من
یہ امن کا پیامبر، یہ آشتی کا دیوتا
مفاہمت کا راہبر، مصالحت کا رہنما
یہ بے بسوں کا خیر خواہ، بیکسوں کا ہمنوا
رفیقِ اہلِ یورپ و انیسِ آلِ ایشیا
اُٹھا تو لے کے دعوتِ نشاط و خرمی اُٹھا
بڑھا تو لے کے انتظامِ صلح و دوستی بڑھا
ملا تو سب سے عاجزی و انکسار سے ملا
رہا تو سب میں ہو کے سرفراز و سُرخرو رہا
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من
یہ فلسفے کا آستاں، حریمِ دانش و خبر
یہ گیانیوں کا آشرم، یہ عارفانِ حق کا گھر
کہیں یہ اجتماعِ شب، کہیں یہ محفلِ سحر
تلاوتیں نفس نفس، عبادتیں نظر نظر
جنوں یہاں کا محترم، خرد یہاں کی معتبر
یہاں کی خاکِ راہ بھی ہے طیش! کیمیا اثر
یہ باغ و دشت، یہ بحر و بر، یہ کاخ و کوئے دشت و در[1]
یہ لالہ زارِ بیکراں، یہ ایک خلدِ مختصر
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

[1] یہ عطف جائز نہیں

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

بُدھ نمبر

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی - بُدھ مت کی تعلیم اور فلسفہ اخلاق | پروفیسر محمد مجیب | انسانِ کامل
مسٹر ہمایوں کبیر کے بامولی - گاندھارا کا ارتقاء | پروفیسر سید احتشام الدین رفعت | اجنتا کا پیغام
میکش اکبرآبادی - بُدھ مت کا سلوک | تنویر احمد علوی، قمر مراد آبادی | منظومات

ڈاکٹر ذاکر حسین

گاندھی جی

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو اس پُر اثر تقریر سے بچوں کے ایک مجمع کو مخاطب کیا تھا۔ موصوف کے شکریے کے ساتھ یہ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

دیس کے نونہالو! جانتے ہو کہ آج تم سب کیوں جمع ہوئے ہو؟ آج ایک ایسے دن کی یاد ہمیں یہاں لائی ہے جس کا خیال کرکے ہم سب ہمیشہ اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں صدیوں تک نہیں رہتی دنیا تک شرم سے آنکھیں نیچی اور دکھ سے آنکھیں نم کرتی رہیں گی۔ آج ہی کی تاریخ تو تھی ۹ برس پہلے جب ہمارے ہی ایک نادان بدنصیب بھائی نے ایک ایسی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا جس سے ہماری غلامی کے اندھیارے میں آزادی کی روشنی آئی تھی۔ اس زندگی کو ختم کر دیا تھا جس سے ہم، ہمارا دیس، ساری دنیا کے بچے اور اپنے زندگی کی گندگیوں میں نیکی اور سچائی کو سمونے کا ڈھنگ سیکھ رہے تھے۔ جس نے بزدلوں کو بہادر سورما بنا دیا تھا۔ جس نے نہتوں کو توپ اور مشین گن سے، غریب، بے سرو سامان محکوموں کو ایک بہا سامراج کی طاقت سے ٹکرا دیا تھا، ممولے کو شہباز سے لڑایا تھا۔ اور معرکہ میں محکوموں غریبوں کو فتحیابی تک پہنچایا تھا۔ ممولے کو شہباز پر جتایا تھا۔

کیسی شاندار موت تھی یہ اس مردِ خدا کی! اس شہید کی، جس نے محبت اور سیوا سے بھری ہوئی زندگی کو یوں پورا کیا، جا لہو سے کر اپنی ساری زندگی کی سچائیوں پر تصدیق کی مہر لگائی، جو اُسے اپنا دشمن بتاتے تھے اُن کو ہلاکت سے بچانے کی خاطر اپنی جان دی اور اپنے خون سے 'اپنے' محبت بھرے خون سے نفرت اور دیوانگی کی اس آگ کو بجھایا جو دیس میں بھڑک اٹھی تھی۔ کوئی کیسے بھولے کہ اس پاک زندگی کو آج کی تاریخ میں ۹ برس پہلے ہم نے اپنے ہاتھوں کھویا۔ وہ ہمیں معاف کر چکا ہوگا اس لئے کہ اس نے کسے معاف نہیں کیا؟ پر آنکھیں تو نیچی رہیں گی اور وہ خود بھی پیار سے انھیں پونچھے گا تو بھی آنسو تو نہ سوکھیں گے۔

یہ شرم اور دکھ تو ہمارے حصے میں لکھ ہی گیا ہے۔ پر یہ شہید کی موت شرم اور دکھ کے ساتھ ساتھ ہماری اکیلی زندگیوں کا سہارا بھی ہے اور ہماری قومی زندگی کا سرمایہ بھی۔ اس شہادت کی یاد سے، اس شہید کے نام سے، کام سے، جیون کتھا سے، ہمارے دل میں اور رہتی دنیا تک آنے والوں کے دل میں امید کا ایک چراغ روشن رہے گا۔ بے لاگ سچائی اور بے غرض سیوا کا ایک تقاضا اُبھارتا رہے گا، لغزشوں پر، گمراہیوں پر ندامت کا ایک کانٹا دل میں کھٹکتا رہے گا۔ جس کی یاد سے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا ملے گا۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ ملے گی، جب جی چھوٹیں گے تو اس کی یاد ہمت بندھائے گی، جب دل ڈوبیں گے تو یہ طاقت اور توانائی بخشے گی۔

یہ کون آدمی تھا؟ نرالا انوکھا آدمی۔ پیارے بچو! یہ آدمی آج سے ۸۰ سال پہلے تم ہی جیسا ایک نونہال تھا۔ خاندانی نام گاندھی، باپ کا نام کرم چند، خود بچے کو موہن داس نام دیا گیا۔ موہن داس کرم چند گاندھی پورا نام پڑا۔ پوربندر کی ریاست میں ۱۸۶۹ء میں جنم لیا۔ ایک کم ۸۰ برس کی عمر پائی۔ تمھاری ہی طرح کا ایک نونہال تھا یہ، ایک شرمیلا سا لڑکا، ذرا الگ الگ رہنے والا، نہ کھیل کود میں لڑکوں کے بہت ساتھ، نہ ان کی شرارتوں میں۔ ایسا بھی نہ تھا کہ پڑھنے لکھنے میں سب سے آگے ہو۔ اور دیکھو۔ یہ شرمیلا لڑکا کس بلندی پر پہنچا! کوئی چیز ایسی نہ تھی اس میں جو دوسرے معمولی لڑکوں میں نہیں پائی جاتی۔ تم سب اس بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اور یہی اس مہاتما، مہا پُرش کا خاص وصف ہے کہ ایک معمولی لڑکا ہوکر اس نے اپنی سچائی سے، سچائی پر اڑنے کی عادت سے، اپنی محنت سے، جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کا حق ادا

کھنے سے یہ درجہ حاصل کیا۔ ادب سے، ہمیشہ اچھائی کی تلاش سے، دوسروں کی نیکیاں اور خوبیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے سے، ان کی کمزوریوں سے درگذر کرکے اپنی کمزوریوں پر کڑی پکڑ کرکے، اس نے اپنے جیون کی گود نیکیوں سے مالا مال کر لی، اپنی کمیوں کو ایک ایک کرکے چھانٹ ڈالا اور اپنے کو اس اونچے مرتبے پر پہنچا دیا۔ اس کی بڑائی کچھ پیدائش کے اتفاق پر نربھر نہ تھی۔ قدرت کی بے حساب دین نہ تھی۔ یہ ایک ہمت والے محنتی آدمی کی عمر بھر کی کوشش کا نتیجہ تھی، اپنے ہاتھوں اپنی تعلیم کا پھل تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی کچی دھات کو محبت کی بھٹی میں تپا تپا کر، سچائی کے نتھرے پانی میں بجھا بجھا کر، اور بے غرض سیوا اور محنت کے ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کر ایک ایسی کھری، ایسی پکی، ایسی وزن دار، ایسی حسین، ایسی دمکتی زندگی بنائی تھی جو صدیوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہے مگر جس کی ریس کا حوصلہ ہر سچا اور نیک اور محنتی آدمی کر سکتا ہے۔ پیارے بچو! تمہاری سب کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں۔ انھیں بنانے کی ذمہ داری تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔ زندگی کی کچی دھات تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کرو کہ اس کا کیا بناؤ گے۔ زندگی کے اس بڑے کاریگر کی جیون کہانی پڑھو اور سمجھو، اس کا انمول ہنر سیکھو اور اپنی زندگیاں بناؤ۔

زندگی بنانے کے اس گمبھیر کام میں گاندھی جی کے جیون سے بہت کچھ سبق ملتے ہیں۔ انھیں سیکھو۔ یہ وقت بات بڑھانے کا نہیں ہے۔ پر دو ایک باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی بنانے میں سب سے پہلے ارادے کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے جیون سے سبق ملتا ہے کہ ارادے کو آزاد ہونا چاہیئے۔ آدمی ارادہ آپ کرے ایسا نہ ہو کہ دوسرے کر کر کے اس کے سر تھوپ دیں۔ گاندھی جی ارادہ کرنے میں دوسروں کا منہ نہیں تکتے تھے۔ خود سوچتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور اس کا پھل اپنے اوپر سہتے تھے۔ وہ جلد فیصلہ کر سکتے تھے۔ اگر مگر میں فیصلے کو ٹالنے والا ارادہ نہیں کر پاتا اور زندگی نہیں بنا پاتا۔ گاندھی جی کا ارادہ مضبوط ہوتا تھا جیسے کہ [illegible] تھے۔ آپ کے اندر سے کوئی چیز اسے آسانی سے ہلا پاتی تھی نہ باہر سے۔ گاندھی جی اپنے ارادے پر جمتے تھے اور دیر تک جم سکتے تھے۔ اس لئے کہ ہر ارادے کے پورا ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جو کسی کام کو بڑے تنتنے سے اور اس سے زیادہ شور سے اٹھاتے ہیں اور چند دن میں ہی کڑھی کا سا ابال ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے، گاندھی جی جانتے تھے کہ کسی بڑے کام کی سرسوں ہتھیلی پر نہیں جمتی۔

دوسری چیز جو مجھے گاندھی جی کے جیون میں دکھائی دیتی ہے وہ اُن کی ٹھیک سوجھ بوجھ ہے، ان کی چترائی ہے۔ زندگی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ٹھیک سوچ سکے، ٹھیک سمجھ سکے۔ زندگی کے سفر میں یہ سوجھ بوجھ راستے کا اونچ نیچ بتاتی ہے، نظر کو دور تک لے جاتی ہے، اور آدمی اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر نہیں چلتا۔ ٹھیک سوجھ بوجھ کی عادت ڈالنے سے پڑتی ہے اپنے آپ نہیں پڑ جاتی۔ طرح طرح کی چیزیں اس میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کہیں خودغرضی فریب دیتی ہے، کہیں غصے کا طوفان دھیان کو اِدھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ کہیں لالچ دھکے دیتی ہے، کہیں جلد بازی قدم کو پھسلاتی ہے، کہیں تعصب اندھا کرتا ہے۔ نجات کے سستے نسخے بیچنے والے، وقت کی سہانی راگنیاں گانے والے بہکاتے ہیں، ضدیں اور ہٹ دھرمیاں ٹھوکریں کھلاتی ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے جیون میں ان رکاوٹوں سے بچنے اور صحیح سوجھ بوجھ کی عادت کی مشق کے بے شمار سبق دیئے ہیں۔

زندگی کے بنانے میں ایک اور چیز جو بہت کام آتی ہے وہ آدمیوں کی پہچان ہے۔ یہ خاص سمجھ ہوتی ہے، جس سے آدمی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے دل میں پہنچ گیا، دوسروں کو جھٹ بھانپ لیتا ہے۔ ان کی بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہے، ان سے ہمدردی کر سکتا ہے۔ ان کو سمجھ سکتا ہے۔ لکھے پڑھے لوگوں میں یہ صفت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ کتاب کے کیڑے اصلی آدمیوں کی دنیا سے اتنے الگ رہتے ہیں کہ اس کو برتنے کے قابل نہیں رہتے۔ جن کا دھیان اپنی غرض پر جما ہوتا ہے وہ بھی اس سے محروم ہوتے ہیں۔ گاندھی جی نے زندگی کی ریل پیل میں، سب سے میل ملاپ سے، بے غرض سیوا سے یہ ہنر حاصل کیا تھا۔ تمہارے لئے بھی اس کے حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

زندگی کے بنانے میں ایک چیز اور بڑی کارآمد ہوتی ہے [illegible] کہ آس پاس کے واقعات سے آدمی کے دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ کس [illegible] ہے یا بہ جاتا ہے۔ پھیلتا ہے یا مُرجھا کر ختم ہو جاتا ہے۔ [illegible] لیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ عمر بھر کے کام کا سا[illegible] کی بےبسی کا تجربہ جو دکھنی افریقہ میں ہوا اس کی تان دیکھو [illegible] میں دہلی میں ٹوٹی۔ اور ساری عمر اسی ایک غم کے دور کرنے [illegible] گئی۔ اپنی جذباتی زندگی میں یہ گہرائی اور ٹھہراؤ بھی ہمیں گاندھی جی سے سیکھنا چاہیئے۔

بچو! گاندھی جی کو اپنے دیس کے سب بچوں سے یہ امید تھی کہ وہ اپنا جیون

اچھا بنا سکیں گے۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ آسانی سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ بہت کے بیوک ذرا مشکل سے ہی مایوس ہوتے ہیں۔ تمہارے سامنے ان کی ایک تصویر ہے جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ "میری کون سنے گا؟" بچو! یہ مایوسی کا سوال نہیں ہے؛ یہ ان کی للکار ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ تم میں کون ہے جو میری سنے؟ یہ ہم سے تم سے ان کا سوال ہے۔ "اپنے" نا تمام کام کے متعلق ان کا سوال ہے۔ ان کا کام ایسا بڑا کام تھا، ایسا ہمیشہ چلنے والا کام تھا کہ اس کا پورا کرنا ان جیسے بڑے آدمی کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اچھے آدمی بننا اور اچھا سماج بنانا، اچھے آدمیوں کو اچھے سماج کی سیوا میں لگانا، اچھے سماج کو سارے سنسار کی سیوا میں لگانا، یہ کچھ ایک دو کی زندگیوں میں پورا ہونے والا کام نہیں ہے، بلکہ سچ تو یہ کہ کبھی بھی ختم ہونے والا کام نہیں ہے۔ یہ تو برابر کئے جانے اور برابر ہوتے جانے والا کام ہے۔ ہمیں اس کام کے کرنے کا موقع دینے کے لئے گاندھی جی نے ہمارے دیس کی آزادی چاہی تھی۔ آزادی ہوتی ہے بندھنوں سے، بیڑیوں سے پابندیوں سے۔ مگر بندھن ٹوٹ جائیں، بیڑیاں کٹ جائیں، پابندیاں ہٹ جائیں مگر یہ پتہ نہ ہو کہ جانا کدھر ہے یا پتہ ہو تو سستی اور کاہلی قدم نہ اٹھانے دیں کہ ہم تو آزاد ہیں جب چاہیں چل کھڑے ہوں گے تو یہ آزادی اکارت ہے۔ آزادی ہوتی ہے کسی کام کے لئے، کسی مقصد کے لئے۔ گاندھی جی نے ہمیں آزادی کس لئے دلائی تھی۔ اس لئے کہ ہمارا ارادہ آزاد ہو، ہم جو بن سکتے ہیں وہ بنیں۔ اچھے آدمی بن سکیں، اچھا سماج بنا سکیں۔ اچھا آدمی بننے اور اچھا سماج بنانے کا جو راستہ انھوں نے بتایا ہے وہ میں سمجھتا ہوں تین لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے: اہنسا، ودگیان اور کام

ہمارے غلامی سے بگڑے ہوئے اور کھوکھلے لفظوں کے الجھاووں میں پھنسے ہوئے دماغ نے اہنسا کو بھی ایک معمہ بنا دیا ہے۔ اہنسا کے اہم مسئلے یہ نہیں ہیں کہ ملیریا کے مچھروں کو مارا جائے یا نہ مارا جائے، یا جب کوئی تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے ذبح کرے تو تم اسے روکو یا نہ روکو۔ جو لوگ ہر بڑے سے بڑے میدان میں بھی حاشیے ہی پر رہنا پسند کرتے ہیں انھیں یہ سوال مبارک ہوں۔ اہنسا کا راستہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں محبت کا راستہ ہے، رواداری کا راستہ ہے، آدمیت کے احترام کا راستہ ہے، آدمی کو آدمی کے ظلم سے بچانے کا راستہ ہے، امداد باہمی کا راستہ ہے، سماجی ناانصافیوں کو مٹانے کا راستہ ہے، سہیوگ کا راستہ ہے، سیوا کا راستہ ہے، دلوں کی صفائی کا راستہ ہے، بھائی کو بھائی سے ملانے کا راستہ ہے، دشمن کو دوست بنانے کا راستہ ہے، پریم پر بھروسہ کا راستہ ہے، امن کا صلح و آشتی کا راستہ ہے۔

بچو! تمھیں اس راستے پر چل کر ایک نیا دیس، ایک نیا سماج بنانا ہے۔ جب تک اس دیس میں آدمی پر آدمی ظلم کرتا ہے، جب تک اس دیس میں بسنے والے ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے، جب تک یہاں کے بسنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اپنے کو بھائی بھائی نہیں جانتے اور نہیں مانتے، جب تک یہاں امیر غریب کو اور طاقت ور کمزور کو ابھرنے نہیں دیتا، جب تک یہاں کسی کی محنت مشقت سے کوئی دوسرا بے جا لابھ اٹھاتا ہے، اس وقت تک یہ دیس گاندھی جی کے وچاروں کا دیس نہیں ہے۔ ان کا کام باقی ہے اور تمھیں پورا کرنا ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لئے تمھیں آزادی ملی ہے۔

پھر دوسرا راستہ ودگیان کا ہے۔ گاندھی جی کا سچ پرچار نا سماجی اخلاقی معاملوں میں بھی تھا اور قدرت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں بھی۔ دونوں میدانوں میں سچ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ ایک جگہ اخلاق کا راستہ ہے دوسری جگہ سائنس کا راستہ ہے۔ جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمیوں کو جیتے جی پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، جب تک کروڑوں آدمیوں کو دوا دارو میں میسر نہیں ہوتی، جب تک ہمارے دیس میں آدمی کی جان مکھی اور بھنگوں کی طرح سستی ہے۔ جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمی ان پڑھ ہیں اور کروڑوں بچوں کو مدرسے میں جانا نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک انگریزوں کے راج سے آزاد ہو جانا کافی نہیں۔ بچو! تم اس دیس کے پہاڑ کاٹو گے، سمندر پاٹو گے اس کے دریاؤں کو موڑ دو گے، اس کے ریگستانوں کو گلزار بنا دو گے، اس کے پیٹ میں جو دولت بھری پڑی ہے اسے نکال کر اس کے باسیوں میں بانٹو گے جب یہاں سے جہالت کو ختم کر دو گے، غریبی کو مٹا دو گے، بیماری کو دور کر دو گے سب کے لئے امن چین سے رہنے کا سامان کر دو گے، اور ایک کو دوسرے پر شیر نہ ہونے دو گے، تب یہ دیس گاندھی جی کی آرزوؤں کو پورا کرنے والا دیس ہوگا۔

مگر بچو، اہنسا اور ودگیان خالی خیالی باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کتابی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں اور بہتوں کے لئے ہیں۔ گاندھی جی کا اہنسا اور گاندھی جی کا ودگیان خیالی اور کتابی نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے جو تیسرا راستہ بتایا ہے وہ کام کا راستہ ہے۔ اہنسا کو بھی جیون میں برتنا، ودگیان کو بھی جیون کے لئے کام

میں لینا۔ اُنھوں نے آخری عمر میں بنیادی شکشا کی یوجنا میں اسی خیال کو پیش کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مدرسوں میں کام کو بیچ کی جگہ دی جائے اور جہاں تک ہو سکے اسی کے ذریعے دوسری سکھانے اور بتانے کی چیزیں سکھائی اور بتائی جائیں۔ انھیں امید تھی کہ ہمارے سب مدرسے کام کے مدرسے بن جائیں گے۔ جہاں بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد اسے جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالی جائے گی تاکہ وہ جو کام کریں ہاتھ کا یا دماغ کا اس کا پورا پورا حق ادا کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کام کو کبھی اکیلے کی خودغرضی نہ بننے دیا جائے بلکہ سارا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی بستی بن جائے جس میں سب مل کر کام کرتے ہوں اور سب کے کام میں سے سب کا کام پورا ہوتا ہو۔ گاندھی جی کے اس تیسرے راستے کو اپناؤ۔ سب مدرسوں کو ایسا کام کا مدرسہ بناؤ اور یہی رنگ پھر ساری سماج پر چڑھاؤ تو وہ صفتیں پیدا ہوں جن کی ہمارے دیس میں بڑی کمی ہے، یعنی آدمی کا آدمی سے نباہ، اور وہ ذمہ داری جس میں سماج کا ہر کام ہر ایک کا کام بن جاتا ہے۔

ہاں، تو گاندھی جی کا یہ سوال کہ "میری کون سُنے گا؟" تم سب سے ہے۔ ان کے کام کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اور پیارے بچو، یاد رکھو کہ گاندھی جی کی زندگی کو ہم نے ختم کیا ہے، اس لئے کہ ہمارے ہی ایک نادان بھائی نے ختم کیا ہے۔ ہم پر ان کی زندگی اور ان کا کام قرض ہے۔ ان کے اس سوال کے جواب میں اپنے دل کی زبان سے کہو کہ ہم آپ کے کام کو انجام کو پہنچائیں گے۔ اپنی زندگیاں اس میں لگائیں گے، اس کے لئے جئیں گے، ضرورت ہوگی تو اس کے لئے مریں گے۔ ہم آپ کو زندہ رکھیں گے، اپنے خون کے ہر ہر قطرے میں، اپنی بے غرض سیوا کی مشقت کے پسینے کی ہر ہر بوند میں، آپ کو زندہ رکھیں گے۔ اپنی محبتوں میں اپنی محنتوں میں آپ کو زندہ رکھیں گے، اپنے وچاروں اور اپنے کاموں میں آپ کو زندہ رکھیں گے۔ ہم اپنی زندگی کو اور اپنی سماج کی زندگی کو ایسا بنائیں گے اور اس میں ان کے وچاروں اور ان کی روح کو ایسا رچائیں گے کہ ہماری زندگی اور ہمارے دیس کی زندگی گاندھی جی کی زندگی بن جائے۔ اس کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ یہ دیس گاندھی جی کے جیون کی تفسیر بن جائے، گاندھی جی ہمارا دیس ہو جائیں ٭

شفیع جاوید

بات کا رُوپ

جیون کی پھلواری میں جب آشاؤں کے پھول کھلے
من کی بگیا مہک اُٹھی اور پریم کے پگ پگ دیپ جلے

چندا کے اُجیارے میں بھی ڈگر ڈگر اندھیارا ہے
نگر نگر ڈاکو پھرتے ہیں من موہن کا سوانگ بھرے

پریت کی ریت نرالی ہے دل روتا ہے لب سلتے ہیں
نیر بہیں تو انکھیاں پھوٹیں آہ کریں تو سیس کٹے

آنسو شبنم کا ہو یا آنکھوں کا رہنے پاتا نہیں
مٹ ہی جاتا ہے دھرتی پر جب سورج کی جوت جگے

چپ بھی رہو جاوید کہاں تک بات کا روپ نکھاروگے
گیان کے موتی رول کے جگ میں کوئی کہاں تک بھوکوں مرے

(گل فروش کراچی)

گوپی ناتھ امن

ہمہ گیر ہستی

"سیاست گندہ کھیل ہے" یہ انگریزی کا مقولہ ہے جسے موہن داس کرم چند گاندھی نے نہ صرف اپنی دلیلوں بلکہ اپنے عمل سے جھوٹا ثابت کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی زندگی میں الگ الگ خانے نہیں مانتے تھے بلکہ اسے مسلسل بہاؤ مانتے تھے۔ سیاست، اخلاق، ان کے نزدیک زندگی میں اس طرح پروئے ہوئے تھے کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بار گاندھی جی نے پرارتھنا کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ابھی پرارتھنا کر رہا تھا، اب جو آپ سے بات کر رہا ہوں یہ بھی پرارتھنا ہے۔ یہ بات ہمیں کبیر کے اس مقولے کی یاد دلاتی ہے کہ

جو کچھ کروں سو پوجا

ہندوستان کی سیاست گاندھی جی کے آنے سے پہلے مغربی سانچے میں ڈھلی تھی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کو الگ الگ دیکھا جاتا تھا۔ تقریر و تحریر کی خوبیاں کیرکٹر کی بلندی پر فوقیت رکھتی تھیں۔ گاندھی جی نے یہ نقشہ بدلا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا فرق دُور ہُوا اور ہندوستانی سیاست ایک نئے دَور میں داخل ہوگئی۔ لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ یہ سچائی اور محبت کا اپدیش سیاست میں کیسے نبھے گا، یہ مہاتمائی سیاست ملک کو کیسے آزاد کرائے گی۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں ملک آزاد ہُوا، سچائی اور اہنسا کے علم بردار نے ملک کو آزاد کرا لیا اور خود محبت کے نام پر قربان ہوگیا۔ جوش اور جذبے کے عالم میں جان دے دینا پھر آسان ہے لیکن قربان گاہِ محبت پہ جان دینا گنے چنے مردانِ حق کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

آخر گاندھی کی شہرت کا راز کیا تھا۔ علمی اعتبار سے وہ خود کہتے تھے کہ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ مقرر ہونے کے اعتبار سے بھی انھیں صفِ اوّل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ چہرے بشرے کے بھی ایسے وجیہہ نہ تھے، پھر وہ اپنے زمانے کے مردِ اعظم کیوں کہلائے اس سوال کے جواب میں ہمیں اس ماحول پر نظر ڈالنی ہوگی جس میں سے وہ گزرے۔ غدر کے بعد جب ہندوستان پر انگریزی راج مستقل ہُوا تو انگریز مدبروں کا یہ خیال تھا کہ اب اس صدی کے آخر تک انقلابی قوتیں ہندوستان میں پنپ نہ سکیں گی۔ اگرچہ ان کا خیال بالکل درست تو نہیں ثابت ہُوا کیونکہ چودہ پندرہ سال بعد ہی پنجاب میں بغاوت ہوگئی لیکن یہ ضرور ہے کہ کوئی ایسی تحریک شروع نہ ہو سکی جو تمام ہندوستان پر چھا جاتی۔ انڈین نیشنل کانگریس جس صورت میں قائم ہوئی انقلابی جماعت نہ تھی بلکہ اصلاحی نوعیت رکھتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی طفلی کا زمانہ گاندھی جی کی نوجوانی کا زمانہ تھا لیکن بیسویں صدی تک گاندھی اور کانگریس میں کوئی تعلق نہ قائم ہوا تھا۔ گاندھی کی سیاست کی بنا ہندوستان میں نہیں بلکہ افریقہ میں پڑی، جہاں وہ گجرات کے ایک مسلمان تاجر کے مقدمے میں بیرسٹر کی حیثیت سے پیروکار ہو کر گئے تھے۔ مقدمے میں تو انھوں نے باہمی تصفیہ کرا دیا لیکن ساتھ ہی دکنی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کی حالت سدھارنے کے لئے کام بھی شروع کر دیا۔ اسی کام سے اُن کی سیاسی زندگی شروع ہوگئی۔ اُن کی سیاسی سرگرمی کا میدان دوسرے ہندوستانی لیڈروں سے بہتر تھا۔ ایک ملک کے رہنے والے جب دوسرے ملک میں ملتے ہیں تو اُن میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ افریقہ میں ہندوستانی ہندو اور مسلمان زیادہ مل کر رہتے تھے۔ اس ماحول میں کام شروع کرنے کا یہ نتیجہ ہُوا کہ مہاتما گاندھی کا ذہن ہمیشہ فرقہ وارانہ معاملوں میں نہایت صاف رہا۔ اُن کی زندگی باہمی اتحاد کے لئے وقف رہی اور ان کی موت بھی اسی مشن کی تکمیل کے لئے ہوئی۔

گاندھی جی کی خود نوشتہ جیونی پڑھ لیجئے، تجزیہ کیجئے پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک معمولی گھرانے کے آدمی نے، جس نے اپنی زندگی بیرسٹری سے شروع کی ہو اتنی اخلاقی بلندی کیسے حاصل کر لی۔ مشرق و مغرب کا جو امتزاج

اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا اس کا صحیح اندازہ بعض لوگوں کو اُن کی لنگوٹی اور نیم برہنگی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اکثر غیر ملکی مبصروں نے یہی دھوکا کھایا کہ اُن کی عظمت اُن کے سادھو ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن دراصل گاندھی جی اپنے دور کی ارتقائی منزل کا مناز تھے جس طرح انسان تہذیب کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا جمہوریت کی منزل تک پہنچا۔ گاندھی جی نے ایک قدم اور بہت بڑا قدم آگے رکھا کہ یہ جمہوریت اہنسا (عدم تشدد) پر مبنی ہو۔ اہنسا کا اصول مختلف بانیانِ دین نے دنیا کے سامنے رکھا تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اسے اجتماعی شکل دے کر 'لڑائی' کا ایک ہتھیار بنا دیا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے گاندھی جی کے متعلق لکھا تھا کہ سیاست داں بھی دنیا میں اُن سے بڑے ہوئے ہیں اور سنت بھی، لیکن اتنا بڑا سنت سیاست داں کوئی نہیں گذرا۔ دراصل یہی گاندھی جی کی عظمت کا راز ہے۔ جو لوگ ذرا بھی عملی سیاست کی راہوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ راہیں کتنی پُرپیچ ہیں، کتنے نشیب و فراز ہیں۔ ان راہوں میں اخلاق کا بار لے کر چلنا کتنا مشکل ہے۔ گاندھی یہ بار لے کر اس منزل سے گزرا۔ منزل تو کامیابی سے طے ہو گئی لیکن بار اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ منزل پر پہنچ کر اس نے دم توڑا۔ اب یہ بار دو حصّوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصّہ نہرو نے سنبھالا اور دوسرا ونوبا نے۔

دنیا کی بڑی ہستیاں بجائے خود انجمن ہوتی ہیں۔ گاندھی جی بھی ایک فرد نہیں بلکہ انجمن تھے۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر انھوں نے اثر نہ ڈالا ہو۔ مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت، معاشیات، جنسیات، غذا، لباس ہر معاملے پر انھوں نے اظہارِ رائے کیا اور ہر معاملے میں دو ہی کسوٹیاں تھیں، ستیہ اور اہنسا (سچائی اور محبت) انھوں نے اپنے آپ کو کبھی حق شناس نہیں کہا ہمیشہ جویائے حق کہتے رہے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ جو اپنے کو جویائے حق کہتے ہیں آپ یہ کب سمجھیں گے کہ آپ نے سچائی کو پا لیا ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ جب میرے سامنے کوئی جھوٹ نہ بول سکے۔ کتنا اونچا آدرش ہے، اتنا اونچا کہ زندگی میں اسے حاصل کرنا غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ سچائی کا معیار اُن کی نظر میں کیا تھا یہ ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے ایک شخص سے پوچھا کہ "جاڑے میں رنگین کپڑا کیوں پہنتے ہو سفید کیوں نہیں پہنتے" اس نے کہا کہ جاڑے کا کوٹ روز روز تو بدلا نہیں جاتا اس لئے سیاہ رنگ بہتر ہوتا ہے۔ سفید کپڑا تو دوسرے ہی دن میلا معلوم ہونے لگتا ہے۔" گاندھی جی نے کہا کہ یہ تو جھوٹ ہے کہ میلا ہو مگر میلا معلوم نہ ہو۔"

رنگِ مزاح

ہندوستان میں جن سنتوں نے اصلاحِ قوم کا کام ہاتھ میں لیا۔ اُن میں سے بیشتر خوش مزاج بھی تھے۔ اس ضمن میں کبیر صاحب کا نام اور ان کے لطیفے بہت مشہور ہیں۔ گاندھی جی کے بھی لطیفے بہت ہیں۔ اُن کے ہفتہ وار اخبار میں مختلف قسم کے سوال بھی شائع ہوتے تھے اور گاندھی جی اُن کے جواب لکھا کرتے تھے۔ کالج کے ایک طالب علم نے لکھا کہ میں کیا کروں جب میں پارک میں ٹہلنے جاتا ہوں تو میری نظر خوبصورت لڑکیوں کے چہروں کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے اسے بہت مختصر سا مشورہ دیا۔ 'کالی عینک لگا کر جایا کرو'۔

جس زمانے میں گاندھی جی دکھنی افریقہ میں بیرسٹری کرتے تھے ایک ہریجن اُن کا کھانا پکایا کرتا تھا۔ اس کے نہانے کا حال انھوں نے خود نوشت سوانح عمری میں یوں لکھا ہے کہ 'وہ پانی تو اپنے اوپر رونڈ لیتا تھا مگر بدن کبھی نہیں دھوتا تھا'۔

گاندھی جی ہریجن فنڈ کے لئے چندہ کر رہے تھے کہ ایک مدراسی نامہ نگار نے اُن سے دستخط دینے کو کہا۔ گاندھی جی نے دستخط کئے۔ اُس نے حسبِ معمول انہیں دس روپے دئے۔ گاندھی جی نے کہا کہ دیکھو میں نے تامل زبان میں دستخط کئے ہیں۔ اس نے دس روپے اور دئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے بالکل صحیح دستخط کئے ہیں اس نے دس روپے اور دے دئے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں جب کان پور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو کچھ لوگ پنڈال جلانے پر آمادہ ہو گئے منتظم بہت پریشان تھے۔ جب یہ خبر گاندھی جی تک پہنچی تو انھوں نے مسکرا کر کہا کہ 'ہمارے اور آسمان کے درمیان جتنا بھی پردہ ہٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے'۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں جب برطانیہ کے کیبنٹ مشن سے لیڈروں کی بات چیت ہو رہی تھی تو پنڈت مدن موہن مالوی بھی دہلی آئے۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ گاندھی جی نے اُن سے کہا کہ آپ بزرگ ہیں کیوں زحمت کرتے ہیں۔ یہ کام تو ہم نوجوانوں پر چھوڑ دیں۔ اس وقت مالوی جی کی عمر ۸۵ سال اور گاندھی جی کی عمر ۷۷ سال تھی۔

اور یہ سنجیدگی

اور یہی گاندھی جب عبادت میں غرق ہو جاتا تھا تو اس کی سنجیدگی کی بھی انتہا نہ تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وقتِ آخر میری زبان پر وردِ حق ہو اور یہی ہوا۔ جب قاتل نے اُن پر گولیاں چلائیں تو ان کی زبان پر آخری الفاظ تھے "رام" ہے۔ اور یہ تو وہ بہت پہلے کہہ چکے تھے۔ "ایشور اللہ تیرے نام سب کو سنمتی دے بھگوان" لیکن اُن کی شہادت کے بعد بھی یہ بات ابھی پوری طرح لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

گردیال ملک

گاندھی جی کے ساتھ ایک سنہری صبح

برسوں پہلے کی بات ہے ایک دن صبح سویرے میں گاندھی جی کو پریم پرنام کرنے گیا۔ اس وقت وہ بمبئی میں کچھ دنوں کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام "برلا بھون" میں تھا۔ جب میں وہاں پہونچا تو اُس وقت گاندھی جی باغ میں سیر کر رہے تھے۔ میں نے انھیں پرنام کیا۔ انھوں نے میری پیٹھ پر اپنے شفقت بھرے ہاتھ سے ایسی زور سے ایک تھاپ ماری جس سے میرے سارے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ پھر اُن کی اجازت سے میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ سیر کرنے لگا۔

گاندھی جی کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ پھر یکایک انھوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا:۔ "گردیال! کیا تم نے کبھی پتنجلی کا یوگ شاستر پڑھا ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اُسے ایک بار پڑھا تھا۔ مگر اُس میں سے سمجھا بہت ہی کم۔"

"مگر جتنا بھی تم سمجھے ہو مجھے بتلاؤ۔" گاندھی جی نے پھر کہا۔

"میں صرف اتنا ہی سمجھا ہوں کہ من کی دوڑ دھوپ جو دن رات رہتی ہے اس کے روکنے کو 'یوگ' کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

گاندھی جی: "مگر یہ گیان صرف تمہارا دماغی گیان ہی رہا۔ کیا تم نے اس پر کبھی عمل کرنے کی بھی کوشش کی؟"

میں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔ کہ "میں نے ایسی کوشش تو ضرور کئی بار کی تھی۔ مگر یوگیوں کو جو تجربے ہوتے ہیں اُن میں سے مجھے ایک بھی نہیں ہوا۔"

گاندھی جی: "تم کیا کہتے ہو۔ تمہیں کسی قسم کا کوئی بھی تجربہ نہیں ہوا۔"

میں نے کہا۔ "شاید جو کچھ میں نے دو چار بار محسوس کیا ہے اُسے تجربہ کہا جا سکتا ہے۔"

گاندھی جی۔ "تم نے جو کچھ محسوس کیا ہو وہ مجھے بتاؤ۔"

پھر میں نے بڑے انکسار سے انھیں بتلایا کہ خیالات کی لہروں کو جب کبھی ایک لمحہ کے لئے میں نے روکا ہے مجھے ایک گہری شانتی محسوس ہوئی۔ اس شانتی میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بلاوا ہے مگر کس کی طرف سے—؟ جو لامحدود ہے، اُس کی طرف سے؟ پھر ہر قسم کی تنگ نظری یا تمانعہ پیدا کرنے والا خیال کافور ہو جاتا ہے۔ اور پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں روشنی سے معمور ایک آسمان میں مسرت کے ساتھ اُڑ رہا ہوں۔ اس وقت میں اپنی مشکل کو اسی روشنی میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس مشکل کو حل کرنے کا راستہ بھی مل جاتا ہے۔ اس حالت میں میں اسے پربھو کی کرپا ہی سمجھتا ہوں۔"

یہاں گاندھی جی بیچ میں بول اُٹھے۔ "میں اسے اندرونی آواز کہتا ہوں۔"

اس پر میں نے اُن سے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ "مہاتما جی، تو کیا آپ مہربانی کر کے مجھے یہ تبلائیں گے کہ آپ یہ اندرونی یا غیبی آواز کیسے سُن پاتے ہیں؟"

گاندھی جی۔ "میرے لئے یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب بھی کبھی میں نے اس اندرونی آواز کو سُنا ہے اُس وقت میرے اندر کسی قسم کا کوئی اپنا خیال، کوئی اپنی خواہش موجود نہیں ہوتی اور وہ آواز ایسی آسانی سے میرے دل کے کانوں تک پہونچتی ہے جیسے سورج کی روشنی زمین پر براہِ راست اور سیدھی پڑتی ہے۔" (اُن کے کہنے کا مطلب مجھے ایسا معلوم ہوا)

میں نے پھر پوچھا۔ "مگر مہاتما جی، اس اندرونی آواز کا کچھ تو رشتہ آپ کے کسی نہ کسی خیال یا سوال سے تو ضرور ہوگا ہی، اگرچہ آپ جب اُسے سنتے ہیں اُس وقت ایسا آپ کو کچھ بھی یاد نہ پڑتا ہو۔"

گاندھی جی۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے خود بھی کبھی کبھی ایسا خیال آیا ہے میں

فطری طور پر سوچ بچار کا عادی ہوں۔ اسی لئے ہر ایک بات کا پورا پورا اور ہر پہلو سے خیال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اس طرح خیال کرنے کے بعد میں کچھ وقت کے لئے ہر ایک قسم کے خیال سے خالی ہو جاتا ہوں۔ پھر مجھے عجیب قسم کی خاموشی محسوس ہوتی ہے اور اس خاموشی میں مجھے جیسے میں اندرونی آواز کہتا ہوں سُنائی دیتی ہے۔"

اسی وقت کوئی برلا بھون سے وہاں آیا اور اس نے گاندھی جی کو اطلاع دی کہ ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے اندر آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے گاندھی جی نے اپنی سَیر ختم کر دی اور مکان کے اندر چلے گئے۔ میں نے انھیں پرنام کیا۔ ایک بار پھر اُن کا دستِ کرم میری پیٹھ پر پڑا۔ اُس تھاپ کی یاد اب تک بھی تازہ ہے۔ اور رہے بھی کیوں نہ ؟

اس سنہری صبح کو گاندھی جی کی بات چیت سے جو جھلک مجھے ملی اس سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ گاندھی جی ایک ولی بھی تھے۔

خالدِ کشمیر کی رائے

آپ کے خط مورخہ ۲۲۔ اگست اور آج کل کے موسیقی نمبر کے لئے شکریہ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ یہ نمبر اس مضمون پر ایک معیاری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یقیناً یہ ہندوستانی موسیقی کے شیدائیوں میں بہت مقبول ہوگا ؎

(غلام محمد بخشی)

کشمیر میں اناج کی پیداوار

سید میر قاسم وزیر مال حکومت کشمیر نے ایک بیان میں بتایا کہ اگلے پانچ سال میں ریاست کشمیر اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے گی۔ ریاستی سرکار نے اناج کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے ایک جامع منصوبہ مرتّب کر لیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت آب پاشی کے سسٹم میں توسیع کی جا رہی ہے۔ مزید غیر آباد زمین زیرِ کاشت لائی جا رہی ہے۔ کیمیائی کھاد کا استعمال بڑھایا جا رہا ہے اور زیادہ بہتر قسم کے بیج کسانوں میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے پورا ہو جانے تک ریاست میں اناج کی پیداوار میں چالیس لاکھ من کا اضافہ ہو جائے گا اور اناج باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی ؎

مختارالدین احمد

فیضی کی دو تحریریں

ملا فیضی کی صرف دو خود نوشت تحریروں کا اب تک راقم کو علم ہو سکا ہے۔ ایک ذخیرۂ برلین میں اور دوسری جامعۂ علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں تحریریں دو قلمی کتابوں پر ثبت ہیں جو کبھی فیضی کے کتب خانے میں یکجا رہ چکی ہیں اور اب حوادثِ زمانہ نے انھیں ایک دوسرے سے علحدہ کر دیا ہے ایک مشرق میں ہے تو دوسری مغرب میں۔

۱۔ موارد الکلم، فیضی کی مشہور تصنیف ہے جو صنعتِ غیر منقوطہ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا ایک بہت اچھا نسخہ کتب خانۂ برلین کے اُس ذخیرے میں جو اب ماربرگ میں محفوظ ہے دیکھنے میں آیا۔ نمبر ۲۴۹۳، ۵ اوراق ۱۱۹ سطور ۱۱ تقطیع خرد۔ خط نسخ

کاتب کا نام اور ترقیمہ درج نہیں۔ پوری کتاب فیضی نے خود پڑھی ہے اور جا بجا اغلاط کی تصحیح کی ہے۔ مقدمہ کی پہلی سطر: "قال العبد المفتقر ابو الفیض بن مبارک بن خضر" کو قلم زد کر کے فیضی نے: "قال المستفیض المستفی ابو الفیض فیضی" بنا دیا ہے۔

موارد الکلم کا یہ نسخہ فیضی نے مولانا صدرالدین شیرازی کو پیش کیا ہے اور سرورق پر اس نے اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے:

هو الفیاض

"جعلتُ هذه الرسالة تذکرةً للأخ الأعز الاجل صاحب النثر الفایق والنظم الرائق النایر فی السلوک التحقیق والمجانب مولانا صدرالدین محمد الفیدی الشیرازی سلمه الله وأبقاه۔

نمقه العبد ابو الفیض فیضی فی ربیع الأول لا زال مفتراً کاول الربیع سنة ثمان وثمانین وتسع مائة"

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے:

"مقتفه العبد الاقل ابو الفیض فیضی افاض الله علیه فیوضه۔"

نسخے کا سال کتابت معلوم نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس کی کتابت ۹۸۸ھ سے پہلے ہوئی ہے۔

یہ نسخہ مخطوطات کے ایک بڑے قدردان ابوبکر بن رستم بن احمد الشروانی کے کتب خانے میں رہ چکا ہے۔ جن کے کتب خانے کی بہت سی کتابیں ہندوستان مشرق اوسط اور یورپ کے کتب خانوں میں راقم کی نظر سے گذری ہیں۔

۲۔ دوسری کتاب، خواجہ حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ ہے جس کے سرورق پر فیضی کی تحریر، دستخط اور مہر موجود ہے۔ تحریر یہ ہے۔

"مالک هذا التاریخ النجیب العجیب بالهبة الصحیحة۔ الشرعیة ابو الفیض فیضی"

اسی صفحے پر دوسری جگہ اس کے دستخط ہیں۔ "ابو الفیض فیضی" مہر میں بھی "ابو الفیض فیضی" صاف پڑھا جاتا ہے۔ یہ نسخہ سرسید کے کتب خانے کا ہے اور اب جامعۂ علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

فیضی کی اہمیت کے پیشِ نظر ان دونوں تحریروں کے عکس شائع کئے جا رہے ہیں۔

ماربرگ، جرمنی ۵، جنوری ۱۹۵۵ء

فراق گورکھپوری

نیا ہندستانی کلچر اور اُردو ادب

قدیم ہندستان کے مختلف ادوار یا جگوں کا تمام کلچر وسطی دَور یا منجھلے زمانے کے ہندستان کا تمام کلچر پھر پچھلے سو برسوں کا یا ہندِ جدید کا کلچری سرمایہ ابھی تک اردو ادب میں تشفی بخش حد تک سمویا نہیں جا سکا ہے۔ اردو زبان و ادب کے آغاز سے اب تک ہندستان کی تاریخ کو اطمینان کی سانس لینا نصیب نہیں تھا۔ اور ہماری سماجی، اقتصادی، سیاسی، ذہنی و علمی زندگی اپنے تاریخی ورثوں کو لے کر اُبھرنے نہیں پائی تھی۔ پھر یہ حقیقت بھی بڑی اہم ہے کہ صرف ہندستان کے مختلف جگوں یا زمانوں کے کلچر سے نیا ہندستانی کلچر مرتب نہیں ہو سکے گا۔ نئے ہندستانی کلچر میں قدیم و جدید آفاقی کلچر کے عناصر کو بھی سمونا ہوگا جس میں یورپ کے کلچر کو اپنائے بغیر نئے ہندستانی کلچر کی تعمیر ناممکن ہوگی۔

ان پڑھوں ہی میں تو سب عوام ہی عوام ہوتے ہیں لیکن پڑھے لکھوں میں بھی عوام و خواص ہوتے ہیں۔ اور خواص میں بھی دماغ و مزاج و مذاق کے لحاظ سے کئی طبقے ہوتے ہیں۔ غالب و ذوق اس لحاظ سے ایک طبقے کے افراد نہیں تھے نہ پریم چند و رتن ناتھ سرشار، نہ شبلی و محمد حسین آزاد، نہ امیر مینائی و شاد عظیم آبادی۔ لیکن اس تفاوت سے یہ ضروری نہیں کہ کام بگڑے لیکن جن لوگوں کے نام مثالاً میں نے گنوائے ان میں سے ہر ایک کا کلچری سرمایہ اُس کے مقابلے میں ناکافی تھا۔ جس کلچری سرمائے کی ضرورت آج ہے یا جس کلچری سرمائے کا مطالبہ نیا ہندستان کرے گا۔

اُردو ادیب نئے ہندستانی کلچر کی تخلیق و تعمیر میں جبھی نمایاں اور بھرپور حصہ لے سکیں گے جب ہماری زندگی میں کچھ حالات رُونما ہوں۔ مثلاً لگ بھگ دو کروڑ آدمی اردو میں خاصی قابلیت پیدا کریں۔ اس دو کروڑ کی تعداد میں بہت بھاری اکثریت یعنی پچانوے فی صدی اس قابل ہو کہ پریم چند، آزاد، شبلی، عصمت چغتائی، چکبست، میر، نظیر اکبرآبادی، رتن ناتھ سرشار، انیس اکبرالٰہ آبادی، جوش ملیح آبادی، داغ و امیر اور اسی طرح کے دوسرے لکھنے والوں کی تصنیفوں کو سمجھ سکے یا جیسے اچھے رسالے اُردو میں آج کل ہند و پاک سے نکل رہے ہیں انھیں سمجھ سکے۔ دو کروڑ آدمیوں میں اندازاً پانچ فیصدی دُنیا بھر کے قدیم و جدید ادبیات و علوم سے اچھی خاصی واقفیت رکھیں۔ سنسکرت یونانی، لاطینی زبانوں کے بھی کچھ جاننے والے ہوں۔ یورپ کے گزشتہ پانچ سو برس کا فکری، علمی، ادبی سرمایہ جن کے پلّے پڑ چکا ہو۔

اس طرح کا جب ایک اردو داں و اردو خواں سماج وجود میں آ چکے گا تو اسی سماج سے سو ڈیڑھ سو ایسے افراد اُٹھیں گے جن کے ادبی و تخلیقی کارنامے اس ٹکر کے ہوں گے کہ ہندستان، ایران، روم، فرانس، انگلستان، جرمنی، روس یعنی ایشیا اور یورپ کے بڑے سے بڑے علمی و ادبی امر شاہکاروں کی ڈیوڑھی کر سکیں گے۔ وہ وزن اور گمبھیرتا جو قدیم یونانی ڈراموں، نظموں، افلاطون و ارسطو کی تصنیفوں میں موجود ہے۔ جو ورجل، والمیک، فردوسی، دانتے، گیٹے، کالی داس، بھو بھوتی، ویاس، شکسپیر، ملٹن، ورڈس ورتھ اور انگلستان و دیگر ممالک کے دوسرے عظیم شعراء یا اس پایہ کے نثر نگار جیسے پلوٹارک، اسپنسر، بیکن، ہیزلٹ، رسکن، وکٹر ہیوگو، بالزاک، تالستائی گورکی، تورگنیف، برنارڈ شا، ایچ جی ویلس، اڈورڈ کارپنٹر میں پائی جاتی ہے۔

تاریخ، سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، سائنس کی عظیم ترین کتابوں سے ٹکّا کھانے والا ادب اور ان کی تمام خوبیاں اور روشنیاں دینے والا ادب اسی حالت میں پیدا ہو سکے گا جب اردو داں و اردو خواں سماج

میں پانچ فی صدی اتنی ہی بلند تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں جیسے آج ترقی یافتہ ممالک میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سمجھا جاتا ہے ۔

جب ہم اب تک کے اردو ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ سوال ہمارے دلوں میں اُٹھے بغیر نہیں رہتا کہ میر، غالب، اقبال، جوش اور ایک آدھ دوسرے اُدبا کو چھوڑ کر ہمارے اُدبا کا عقلی و جمالیاتی شعور، اور ان کے محسوسات، پھر اُن کی ذہنی صلاحیتیں ان کے یہاں یہ سب باتیں کیوں اتنی سکڑی ہوتی ہیں۔ ہمارے اردو ادیب بہت کم ایسے گزرے ہیں۔ جن کا نام عُرفی، مولانا روم، تلسی داس، ٹیگور، سورداس، کبیر یا پھر برک، امرسن، ٹامس ہارڈی، ہیگل، کانٹ، برگساں، کروچے، ہیولاک ایلس، آئن سٹائن، ٹامس مان، برٹرنڈ رسل یا پھر ہمارے ہی ملک کے بلند ترین علماء، سائنس دانوں، فلاسفروں اور دیگر برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ لیا جا سکے۔ ہم اتنے چھوٹے کیوں ہیں۔ ہمارے قابلِ عزت ادیبوں کو بھی قد آور بننے کی ضرورت ہے ورنہ نیا اردو ادب نیا ہندستانی کلچر بنانے میں بہت کم مدد ہو سکے گا۔

خود رو درخت کی طرح اگر ہمارے صفِ اوّل کے ادیب نشو و نما حاصل کرنے کا خواب دیکھیں گے اور ہندستان میں جیسے آج اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بدنصیبی سے سمجھا جا رہا ہے۔ اگر وہی سستی اور نکمّی تعلیم ہمارے ذہین سے ذہین دماغوں کو ملتی رہی تو ہمارے کلچر کا مستقبل بہت دُھندلا رہے گا۔ ہمیں علماء ادب Humanists کے اسکواڈوں Squads کی ضرورت ہے۔ ہمیں اہلِ بصیرت، پڑھنے والوں، بلند نقادوں، اور اس سے وسیع تر، بلند تر و مختلف معنوں میں عظیم شاعروں اور تخلیقی نثر کے فنکاروں کی ضرورت ہے جنھیں ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ہم کو اپنے گھٹیا پن کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ مسئلہ صرف اردو ادب کو درپیش نہیں ہے ہندستان کی ہر زبان کے ادب کو درپیش ہے۔ ہم کب شدّت سے اس امر اور اس حقیقت کو محسوس کریں گے کہ ہماری اعلیٰ ترین تعلیم گھٹیا ہے۔

اُردو میں یا ہندستان کی کسی زبان میں جنھیں بلند ترین ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ ان بلند فنکار ادیبوں کی زندگی قوم کی سب سے قیمتی امانت ہے۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنا چاہییں کہ جن لوگوں میں بلند ادب تخلیق کرنے یا اہم علمی کتابیں لکھنے کی صلاحیت ہے وہ نامساعد حالات کے شکار ہو کر نہ رہ جائیں۔ انھیں یکسوئی کے ساتھ مشاہدہ، مطالعہ، غور و فکر کرنے کی سہولتیں ہوں۔ انھیں نیا ہندستان یا مستقبل قریب کا ہندستان وہ تمام تعلیمی و اقتصادی مواقع فراہم کرے جو مثلاً انگلستان میں نیوٹن، ڈارون، شیکسپیئر، ملٹن، ٹامس وردی اور دیگر اکابرِ علم و ادب کو نصیب تھے۔ ہندستان میں ایک فرصت یافتہ طبقہ Leisured Class رہا ضرور ہے لیکن علم دوستی اور کلچر سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہمیں ایک ایسا نیا فرصت یافتہ طبقہ پیدا کرنا ہے جو علمی و ادبی تحقیق میں زندگی بھر لگا رہے۔ ایسا طبقہ ہزارہا افراد پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ یہ بلند ادب کے پڑھنے اور سمجھنے والوں کا طبقہ ہوگا اور عموماً انھیں ہزارہا افراد میں سے وہ چند بلند ادب کے خلّاق و مصنفین ہوں گے۔ اس طبقے کے شعور کا افق وسیع، بلند اور تابناک ہوگا۔ ان کے مغزوں اور روحوں کے کیمیاوی عناصر بیش بہا ہوں گے۔ ہر دور کے آفاقی ادب اور آفاقی کلچر کو ہضم کرنے کی اس طبقے کے افراد میں صلاحیت ہوگی۔ ان کے محسوسات و وجدانیات مشاہیرِ عالم کے محسوسات و وجدانیات کے ہم پلّہ ہوں گے۔ اس طبقہ کے افراد قوم کی دماغی زندگی کی پست قامتی کو دُور کر سکیں گے۔

جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے لکھنے والوں کی ایک خاصی تعداد اُمید افزا کوششوں کی مثالیں پیش کر رہی ہے۔ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی کئی شعراء اور افسانہ نگار ایک ایسے Humanism یعنی انسانی تہذیب کی مثالیں اپنی تخلیقوں میں پیش کر رہے ہیں یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ہندستانی اور آفاقی کلچر، رعائتی اور انقلابی کلچر، قدیم و جدید کلچر کا سنگم نظر آتا ہے۔ یہ ادیب اقبال کی ملّت پرستی سے بے نیاز ہیں۔ ٹیگور اور پریم چند، گیتا اور مولانا روم اور جدید عالمی ادب کی پاکیزہ لامذہبیت Secularism سے ان کے دل و دماغ ہم آہنگ ہیں۔ ان کا شعورِ عنصر، ان کا فنی ضمیر، ان کا نظریۂ زندگی ہندستانیت اور آفاقیت کے صحیح امتزاج کا حامل ہے۔ یہ اندازہ ہے کہ ہزارہا پڑھنے والے بھی اپنے دل کی باتوں اور اپنے رجحانات اور آہستہ آہستہ جنم لینے والے نئے ہندستان کی روحانی و نفسیاتی تحریکات کی ترجمانی اردو کے نئے ادیبوں کی آواز میں سن لیتے ہیں۔ ہماری تعلیم کی کمیوں، خرابیوں، لاپرواہیوں اور کس مپرسیوں کے باوجود یہ حالات رونما ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری اعلیٰ تعلیم کی کمزوریاں دُور ہو جائیں اور متوسط طبقے کے مالی حالات ذرا بہتر ہو جائیں ہماری اقتصادی زندگی صحت مند ہو جائے تو اردو ادیب جو اچھا کام کر رہے ہیں اس سے بھی بلند و بہتر کام کریں گے اور ہندستان کے نئے کلچر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔

اُردو زبان و ادب میں فطری طور پر اچھی روایتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ ہماری بدلتی ہوئی تاریخ کو اپنانے اور اسے آگے بڑھانے کی خاص صلاحیت

یہی اُردو کا اصلی مزاج ہے۔ اُردو کا شعورِ حیات و کائنات بہت جاندار و مہذب ہے۔ اردو دورِ حاضر میں ہماری متحرک اور بدلتی ہوئی زندگی میں ایک اہم تاریخی قوت بن سکتی ہے۔ اُردو ادب ہندستان کے دوسرے ادبوں کی کاروان سالاری کر سکتا ہے اُردو ادب نئے ہندستان کا صحیح ترین ترجمان بن سکتا ہے۔ اُردو کے اسلوبِ بیان میں حیات اور بہتی قوتیں ہیں۔ اردو الفاظ میں ایک چوکناپن ہے۔ ان میں بیداری کے جیتے جاگتے عناصر ہیں۔ ان میں عطارد کے پر لگے ہوئے پاؤں کی سبکی ہے ان میں وزن کے ساتھ ساتھ لمس کا ایسا ہلکاپن Lightness of Touch ہے کہ ملک کی دوسری زبانیں بولنے والے ٹوٹے پھوٹے طور سے بھی اُردو فقرے سن کر پھڑک جاتے ہیں۔

مستقبل قریب کے اردو ادب میں اردو ادب کے ہونہار پہلو اور بھی چمک اٹھیں گے۔ کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ آج کے اردو ادب میں ایک پاکیزہ مہذب اور سہانی ارضیت Earthiness آچلی ہے۔ اُردو کی شعوری گرفت ہمارے بدلتے ہوئے ماحول پر روز بروز مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کی آواز میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہو چلی ہے۔ اُردو داں طبقہ ایک عارضی یاسیت کے دھندلکوں کے آر پار دیکھنے لگا ہے۔ کہرا چھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اردو ادب نے ہندستان کی رنگارنگ زندگی کو اپنے آغوش میں بھینچنا شروع کر دیا ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر کچھ لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ کیا مستقبل کا بلند ترین اردو ادب صرف بلند طبقہ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی وراثت و ملکیت ہوگی۔ شیکسپیئر، برنارڈ شا، ابسن، گالس وردی، ایچ جی ویلس، اسکاٹ، ڈکنس، حافظ، تلسی داس، ٹیگور، وکٹر ہیوگو، ایچس، فردوسی ان سب کا ادب بہت بڑی حد تک عوام کی بھی ملکیت ہے۔ لیکن ان کے ادب کی تخلیق کے لئے غیر معمولی علمی تبحر لازمی چیز ہے۔ عوام اپنی لامحدود لیاقت سے ان کے ادب کو سمجھ سکتے ہیں اور اس سے روشنی و زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن عوام اپنی محدود لیاقت سے ایسا ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر صرف مطالعۂ ادب کرنے والوں کا بھی ایک ایسا گروہ ہونا چاہیئے جو بلند ترین ادب کو عوام کے مقابلے میں زیادہ روشن طریقے پر سمجھے اور ایسا مطالعہ کرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جیسے شیکسپیئر کے بلند تعلیم یافتہ مطالعہ کرنے والوں میں بریڈلے یا شیکسپیئر کے دوسرے بصیرت افروز تنقیدیں لکھنے والے شارحین و مفسرین۔ بلند ترین خلاقانہ ادب پیدا کرنے والے اور اس ادب پر بلند ترین عالمانہ و خلاقانہ تنقیدیں و شرحیں لکھنے والے بھی کافی تعداد میں پیدا ہو سکیں گے۔ جب ہمارے ملک کی ابتدائی تعلیم اور تعلیمات عالیہ دونوں کی سطحیں جیسی آج ہیں اس سے بہت زیادہ بلند ہو جائیں۔

ہماری نئی مطبوعات

قیمت چار آنے

اس پمفلٹ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ پلاننگ کمیشن کی مجوزہ زمینی اصلاحات کیا ہیں۔ اور ریاستوں میں ان اصلاحات پر کہاں تک عملدرآمد کیا گیا ہے۔

قیمت:- ساڑھے چار آنے

حکومتِ ہند نے پہلے پنج سالہ پلان کے تحت محنت کش عوام کی حالت سدھارنے، اُن کے لئے معقول اُجرت پر کام مہیا کرنے اور سماجی حفاظت بہم پہنچانے کے لئے جو کچھ کیا ہے، اس پمفلٹ میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دس روپیہ یا اس سے زیادہ کا مال منگانے پر ڈاک کا خرچہ نہیں لیا جائے گا

پبلیکیشنز ڈویژن۔ اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

عبدالباری آسی مرحوم

غزل

نظر میں، دل میں، تخیل میں جگمگائے جا | چراغ خانۂ آشفتگی جلائے جا

جنونِ شوق کو اک راستہ بتائے جا | فریبِ وعدۂ فردا دے مسکرائے جا

کرم بہ شکلِ ستم یا ستم بہ شکلِ کرم | وہ کوئی رنگ سہی دل کو دل بنائے جا

شراب آگ ہے ساقی یہ جانتا ہوں مگر | بنا کے آگ کو پانی مجھے پلائے جا

سکون جس کا لیا نام ہمنشیں تو نے | کہاں ہے، کون ہے، کیا ہے ذرا بتائے جا

زمیں فریبِ تماشا فلک فریبِ نظر | فریب ہی کی ہے دنیا فریب کھائے جا

کہیں شکیب، کہیں حسرتیں کہیں آنسو | وفا کی راہ میں جو کچھ ملے لٹائے جا

فنا مآلِ بقا ہے بقا مآلِ فنا | سمجھ سے کام لے اور فائدہ اٹھائے جا

یہ میرا فرض کہ میں تجھ کو ڈھونڈنے نکلوں | یہ تیرا کام کہ رستہ مجھے بتائے جا

فریبِ وعدۂ پیہم کا واسطہ تجھ کو | کہ انتظارِ تمنا کو آزمائے جا

سفر لیا ہے تو ہمت نہ ہار تھک کے نہ بیٹھ | بہت قریب ہے منزل قدم بڑھائے جا

نگاہ منتظر اس وعدہ کی ہے اے آسی
کہ وہ پلائے مجھے میں کہوں پلائے جا

باسط بھوپالی

غزل

مشاہدات کی منزل ہے تا حدِ ادراک | خرد سکوت میں ہے مصلحت گریباں چاک

سوادِ شامِ الم اور رات ہیبت ناک | رکی رکی نظر آتی ہے گردشِ افلاک

فلک تو کیا سرِ عرشِ عظیم بھی نہ ملے | ستارہ ڈھال رہا ہے جو دیدۂ نم ناک

جہانِ نور کو دیکھا ہے میں نے سر بسجود | جہاں جہاں ہے نمایاں ہوئی حقیقتِ خاک

تمہارے حسنِ تمنا طلب نے کیا پایا | اگر نگاہِ محبت نہ ہو سکی بے باک

ابھی تک اس کو سرِ شکِ حیات دھو نہ سکے | کبھی خوشی نے ملی تھی جو میرے منہ پہ خاک

نہ پی سکیں تو بہارِ چمن پہ کیا الزام | مئے حیات تو ڈھلتی رہی ہے تاک بہ تاک

وہ زندگی نہیں ہو جس کو زندگی سے گریز | وہ دل ہی کیا جو رہے لوثِ آرزو سے پاک

خزاں سے شکوۂ بربادیٔ چمن بھی درست | مگر بہار نے گلشن میں جو اڑائی خاک

چمن میں ہم نے بنایا ہے آشیاں باسط
ہمیں سمجھتے ہیں کچھ قیمتِ خس و خاشاک

کوشلیا اشک

نروتم بابو

نروتم بابو اپنے نئے مکان میں آ کر بڑے خوش ہوئے۔ وہ ساٹھ روپے مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ لیکن یہ مکان تیس ہی میں ہاتھ آ گیا۔ پھر یہ ان کے دوست شرما کے مکان کے بالکل نزدیک تھا۔ شرما کی بیوی شانتا سلیقے والی سگھڑ عورت تھی۔ کام کاج میں چست اور رکھ رکھاؤ میں کامل۔ نروتم بابو کو "بھائی" کہتی تھی۔ یہ مکان بھی اسی نے ڈھونڈ کر دیا تھا۔ نوکر کو ڈھونڈنے میں بھی نروتم بابو نے اس کی مدد چاہی۔ شانتا نے انھیں تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں نوکر مل جائے گا۔ جب تک نہ ملے ہمارے ہاں کھانا کھائیے۔

شانتا کوشش کرے اور کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ جلد ہی نروتم بابو کو ایک اچھی مہاراجن مل گئی۔ صاف ستھری اور خوش شکل، کھانا بھی اچھا پکاتی تھی لیکن برتن ملنے سے اس نے انکار کر دیا۔ لہٰذا برتن صاف کرنے اور صفائی وغیرہ کرنے کے لئے مہری رکھی گئی۔ بیس روپے باورچن لیتی تھی اور تین روپے مہری۔ اس طرح تیئس روپے میں انھیں دو نوکرانیاں مل گئیں۔ کچھ دن اچھے گزرے پھر نروتم بابو کو مہاراجن سے شکایت رہنے لگی۔ ایک دو بار انھوں نے شانتا کے سامنے اسے بدلنے کا بھی ذکر کیا۔ شانتا نے انھیں سمجھایا کہ آج کل نوکروں کا ملنا مشکل ہے۔ صاف ستھرے اور ہوشیار نوکر قسمت ہی سے ملتے ہیں اور اس نے پوچھا کہ آخر انھیں مہاراجن میں کیا نقص نظر آتا ہے۔

"ارے مجھے روز ایک آدھ روٹی زیادہ کھلا دیتی ہے"۔ نروتم بابو نے شانتا کے بار بار پوچھنے پر بات بتا دی۔

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ "ارے بھائی آپ ہی کو کھلاتی ہے یا کسی اور کو۔" شانتا نے کہا۔

"یوں بھی پریشان کرتی ہے۔ آپ نہیں جانتیں بڑی تنک مزاج ہے۔"

"مجھے تو اچھی لگتی ہے خیر آپ جانیئے۔"

آخر ایک دن کسی چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر نروتم بابو نے مہاراجن کو چھٹی دے دی۔ نوکر کی غیر موجودگی میں وہ ڈبل روٹی اور دودھ پر گزارا کرتے۔ شام کو شرما انھیں پکڑ لے جاتے اور دونوں دوست اکٹھے کھانا کھاتے۔

شانتا نے اپنی جان پہچان والے تمام لوگوں سے نروتم بابو کے لئے نوکر ڈھونڈنے کی فرمائش کر دی۔ اپنی مہری اور مہاراجن کو بھی ان کے لئے نوکر لانے کے لئے کہہ دیا۔

ایک دن ایک بوڑھا نروتم بابو کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"سلام حضور۔۔۔!"

نروتم بابو چونکے۔ "کیا بات ہے؟"

"حضور آپ کو باورچی کی ضرورت ہے۔"

"ہے تو۔"

.... اور بات چیت شروع ہوئی۔ بوڑھا پہلے ریلوے میں کام کرتا تھا۔ اب ریٹائر ہو گیا تھا۔ اس کے دو تین لڑکیاں تھیں جن کی شادی ابھی ہونی تھی۔ اس لئے اس بڑھاپے میں بھی نوکری کرنے کے لئے مجبور تھا۔ بات چیت کرنے میں مہذب اور ہوشیار معلوم ہوا۔ تنخواہ کی بات چلی تو اس نے کہا۔ "حضور جو آپ پہلے دیتے تھے، وہی مجھ کو دے دیجئے گا۔ سارا کام کروں گا۔ آپ کچھ دن کام دیکھ کر اپنی تسلی کر لیجئے۔"

"دیکھو بابا۔" نروتم بابو بولے۔ "کیا دیتے تھے اس کی بات چھوڑو، تم کیا لوگے یہ بتاؤ؟"

"حضور بیس روپے دے دیجئے گا۔"

"دیکھو بابا۔ تم سب کام کرو گے کھانا پکانا، جھاڑو دینا اور برتن ملنا۔ ہم تمھیں اٹھارہ روپے دے دیں گے۔ ایک ہی بات کرتے ہیں زیادہ بات کرنے کی

ہماری عادت نہیں۔"

بوڑھے کو ضرورت تھی وہ تیار ہو گیا۔

نروتم بابو کو ساٹھ روپے کی بجائے بتیس روپے کا مکان پاکر اتنی خوشی نہ ہوئی تھی جتنی تیئیس کے بدلے اٹھارہ روپے کا ایک ہی نوکر پاکر ہوئی۔ بغیر کسی پریشانی کے دوسرا نوکر مل گیا۔ وہ بھی پہلے سے سستا۔ اپنی اس کامیابی پر انھوں نے خود ہی اپنی پیٹھ ٹھونک لی۔

بوڑھا اچھا کھانا پکاتا تھا۔ صفائی بھی رکھتا تھا۔ اور بلانے پر ہمیشہ "جی حضور" "آیا حضور" کہتا تھا۔ اس کے اس طرح باادب جواب دینے پر نروتم بابو کے انا کو تسکین ملتی تھی اور خوشی بھی ہوتی تھی۔

ان کا کام پھر نارمل طریقے پر چلنے لگا۔ اس دوران میں نروتم بابو اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ آس پاس زیادہ غریب لوگ رہتے تھے، اور تھوڑے پیسوں پر بھی کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ کچھ نے کم تنخواہ پر کام کرنے والوں کے نام بھی بتلائے۔ پہلی نوکرانی سے تیسری تک آتے آتے نو روپے کی بچت سے نروتم بابو اتنے خوش ہوئے کہ اسی شام اگلے اتوار کے لئے وہ شرما اور شانتا کو دعوت دے آئے۔

تیسرے چوتھے دن بوڑھا باورچی آیا تو انھوں نے اسے ٹال دیا۔ "بابا تم بوڑھے آدمی ہو، بیماری سے اٹھے ہو کچھ دن آرام کرو۔" اور پھر باتوں ہی باتوں میں انھوں نے اسے یہ بھی جتا دیا کہ نئی نوکرانی اس سے چار روپے کم پر سارا کام کرتی ہے۔

کچھ دن بعد شانتا مائکے چلی گئی۔ لوٹی تو اپنے شوہر کے ساتھ نروتم بابو کا حال جاننے ان کے ہاں گئی۔ دیکھا کہ نروتم بابو برآمدے میں چارپائی پر بیٹھے کسی نئے نوکر سے بات چیت کر رہے ہیں۔ گورا، چٹا چست چالاک نوجوان تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بات چیت کرنے میں کافی سمجھدار دکھائی دیتا تھا۔ نروتم بابو کے پچھلے نوکروں اور اُن کی تنخواہوں میں جو ترقی ہوتی رہی تھی اس کے بارے میں شاید سب کچھ جانتا تھا کیونکہ جب نروتم بابو نے تنخواہ کی بات چلائی تو بڑے ادب سے (جس میں شرارت کی ہلکی سی چاشنی اور استہزا بھی شامل تھا) کہنے لگا۔

"صاب آپ اکیلا آدمی ہے۔ آپ کا کام بھی زیادہ نہیں۔ ہم آپ کو ایک ایسا چھوکرا لادے گا۔ جو کام بھی اچھا کرے گا اور پگار بھی کم لے گا۔"

جب نروتم بابو نے پوچھا کہ کتنی کم پگار پر وہ چھوکرا کام کرے گا تو اس نے کہا۔ "کچھ بھی دے دیجئے گا صاب۔ پانچ سات رُپے۔" اور وہ چلا گیا۔

شانتا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر نیا چھوکرا کام بھی کرے اور پانچ سات رُپے اپنے پاس سے نروتم بھائی کو دے جب انھیں تسلی ہوگی نہیں تو چار چھ دن بعد وہ بھی چلا جائے گا۔"

اس پر شرما نے ایک پر زور قہقہہ لگایا۔ لیکن نروتم بابو کی رجائیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اس دن سے نروتم بابو متواتر اس چھوکرے کا انتظار کر رہے ہیں ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے۔ وہ نوجوان انھیں تیسرے چوتھے تسلی دے جاتا ہے کہ وہ چھوکرا اب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے نہ آسکنے کے سلسلے میں وہ کبھی کوئی بہانہ بنا جاتا ہے کبھی کوئی۔ نروتم بابو اس کے چکر میں کئی نوکروں کو جواب دے چکے ہیں۔ صبح دہی دودھ ڈبل روٹی، اور شام کو کبھی خود چار روٹیاں سینک لیتے ہیں اور کبھی شرما پکڑ لے جاتے ہیں۔

وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں اور ناامید نہیں ہوتے کہ اچھی چیز پانے کے لئے ریاضت تو کرنا ہی پڑتی ہے۔

تھی شبِ تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے ——— کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی ——— یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

سروس میں تو داخل نہیں ہوں قوم کا خادم ——— چندوں کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

اکبر الہ آبادی

ڈونی چند شرما ہمیرپوری

ہماچل کے لوک گیت

لوک گیت رواں دواں زندگی کی صدائے بازگشت ہوتے ہیں۔ وہ عوامی احساسات کا نغماتی پہلو ہوتے ہیں جو خود بخود روانی کے ساتھ عوام کے دلوں سے بہہ نکلتے ہیں، اسی لئے ان میں عوام کی سادگی، صدق اور تپاک پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا منبع عوام کا دل ہوتا ہے اس لئے بہ نسبت دماغ کے ان کا تعلق انسان کے دل سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سچے، بے ریا، قدرتی اور مسرور کن ہوتے ہوئے بھی ناتراشیدہ ہو سکتے ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو لوک گیت عقل حیوانی کی تحریکات کے اتفاع میں آلہ کار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ انسانی اور نفسانی جذبات کی شاعرانہ تشکیل کر کے ہوس کو ہوش کا روپ دیتے ہیں اور اس طرح وہ عام فرد کو جو زندگی کے بلند و پست سے دوچار ہوتا ہے ذہنی صحت مندی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ زندگی تجربات کی ہلکی ہلکی کڑیوں سے بنے ہوئے دراز سلاسل کا مجموعہ ہے اور ان سلاسل کے ہر حلقے میں ان گنت رنگ اور بوقلموں لہریں شامل ہیں۔ اس لئے لوک گیتوں میں زندگی کی رنگینیاں اور تلخیاں سبھی منعکس ہوتی ہیں۔

ہماچل گیتوں کی دھرتی ہے۔ یہاں انسان قدرت کا ہم نوا اور ہم نشین بن کر قدرت کی دنیا میں پلتا ہے۔ اس دنیا کے تار اس کے دل کی گہرائیوں تک پہونچے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ دنیا انسان کے دھڑکتے اور حساس دل کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔ صبح کا سہانا سماں ہو یا سمت الراس پر چمکتے ہوئے سورج والی دوپہر، خواہ رات کی پُر اسرار تاریکی ہو یا من کو لبھانے والی چاندنی رات، تخیل ہر گھڑی جاگ سکتا ہے۔ ہماچل کے علاقے خصوصاً منڈی اور بلاس پور کے اضلاع جغرافیائی قرب کے علاوہ زبان اور رسم و رواج کے لحاظ سے کانگڑہ کے نواحی ضلع سے بیشتر یکسانیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان علاقوں کے لوک گیت اپنی مسکان، چہک، زندہ دلی اور سودمان پروری کے لحاظ سے کانگڑہ کے لوک گیتوں کے ہم پایہ اور ہم نوا ہیں۔ ان تمام لوک گیتوں میں بھرپور اور گوناگوں زندگی کی جھانکی ملتی ہے۔

جب کوئی عورت پہلی بار گربھ وتی ہوتی ہے تو جلدی ہی اس کے جسم میں تبدیلیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں ارد گرد کی عورتیں قیام حمل کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگتی ہیں۔ لیکن حاملہ عورت کی شرمساری الاحجاب اسے حقیقت کا اعتراف کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ وہ استفسار کا جواب دینے سے گریز کرتی ہو۔ اگر کبھی اعتراف ہو بھی تو براہ راست نہیں ہوتا۔ منڈی کا یہ لوک گیت ایک ایسے ہی موقعے کی عکاسی کرتا ہے۔ گیت ساس بہو کے درمیان ایک مکالمے کے روپ میں ہے اور اس کی آخری سطریں گیت کے راز کا کام دیتی ہیں۔ بہو کے رُخ روشن پر زردی پھیل رہی ہے اور ساس یوں استفسار کرتی ہے:

سَس پچھدی ٹُوہاں گوریا
تیرے مکھ پر جردی آئی ہی
کی بھیہ لوسے

ساس اپنی خوبصورت بہو سے پوچھتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تیرے مُنہ پہ زردی چھا رہی ہے۔ پیپیا بولتا ہے۔

مائے جیٹھ مہینے ہلدی کُٹی
اس تے جردی آئی ہی
کی بھیہ لوسے

اے ماں میں نے جیٹھ کے مہینے میں ہلدی پیسی۔ جیٹھ کی گرم خشک ہوا کے ساتھ ہلدی اُڑ کر میرے مُنہ پر پڑی جس سے چہرہ زرد ہو گیا۔ پپیہا بولتا ہے۔

حاملہ عورت کی ضروریات اور تکلیفات کو وہ خود ہی سمجھ سکتی ہے۔ وہ اندھیری رات کو جاگ کر اپنے کمرے میں لیمپ روشن کرتی ہے۔ لیکن ساس کی تعاقب کرنے والی عقابی نگاہیں آدھی رات کے جلتے ہوئے لیمپ کو دیکھ لیتی ہیں۔ وہ بہو سے ہر بہانے ٹھوس جواب چاہتی ہے لیکن بہو ہر بار پُر معنی سوالوں کا مختصر اور معصوم جواب دے کر ٹال دیتی ہے۔

سس بھیدی دہاں گوریا
تیرے اندر دیپک بلیانی
کی بمبیہہ بولے

ساس اپنی حسین بہو سے پوچھتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ رات تیرے کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ پپیہا بولتا ہے۔

مائے کالے بھیئے ہنریاں راتیں
تا ہیں دیپک بلیانی
کی بمبیہہ بولے

اے ساس ماں یہ مہینے تاریک ہیں اور راتیں گھپ اندھیری۔ تبھی لیمپ جلایا تھا۔ پپیہا بولتا ہے۔

جب بچے کی پیدائش ہو جاتی ہے تو سب رازداری بے معنی ہو جاتی ہے۔ دیکھئے اس گفتگو کا اختتام کتنا پیارا ہے۔ اور بہو کی بچہ حاصل کرنے کی تفسیر کتنی دل کش ہے۔ بچہ پیدا ہو گیا تو ساس نے بہو سے پوچھا۔

اری اب تو تیری گود میں بالک کھیل رہا ہے۔ یہ کیسے؟

سس بھیدی دہاں گوریا
تیری گود ی بالک کھیلے
کی بمبیہہ بولے

اب گود میں کھیلتے بالک کی حقیقت سے کسے انکار ہو اور ہو بھی کیسے؟ لیکن بالک ملا کیسے؟ سنئے بہو ہی کی زبانی:

مائے ندی کنارے نہونے گئیاں
ملئے بالک رُڑھدا آشیانی
کی بمبیہہ بولے

مائے کیہے خلاصے نوں دردو نہ آئی
میں چُک گلے نال لائیانی
کی بمبیہہ بولے

اے ماں۔ ہم ندی کے تٹ پر نہانے کے لئے گئیں۔ اے ماں، وہاں لہروں پر بہتا ہوا ایک بالک آیا۔ اے ماں! کسی ملاح کو اس بے کس بچے پر ترس نہ آیا۔ اے ماں! میں نے اس بالک کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ پپیہا بولتا ہے۔

بالک پانے کی کہانی کتنی دلچسپ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک معصوم بچے کے انہماک کے ساتھ ہم پریوں کے دیس کی ایک داستان سُن رہے ہیں۔

بہت پرانی بات نہیں کہ ہماچل میں راجاؤں کی کئی ریاستیں موجود تھیں۔ آٹھ برس پیشتر ریاستوں اور جاگیروں کے الحاق سے ہماچل پرانت وجود میں آیا۔ یہ ریاستیں اپنے رنگ میں خوش حال تھیں اور راجاؤں کے دربار کی چمک دمک عوام کے لئے بڑی کشش رکھتی تھی۔ ان دنوں اچھی سے اچھی ملازمت مل سکتی تھی تو وہ راجے کی مصاحبت میں یا دربار میں ہو سکتی تھی۔ مندرجہ ذیل گیت ایک ایسے ہی خوش نصیب راجہ کے نوکر کے بارے میں ہے جسے اُس کی محبوبہ میزبانی کی پیش کش کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کے لاثانی جمال کی بھی مدح سرا ہے۔ گیت میں ایسے پہاڑی چھبیلے نوجوان کے خدوخال کی منظر کشی کی گئی ہے۔

اُچیا بنڈ ھیا جگو تبا ملری
پل بھر نیگو ئے بہی نے تو
ماہیے وُنیا نوکرا

مڈ تاں تیرے چنبے دیاں کلیاں
کھوڑا دی داتن لائی نے تو
راہیے وُنیا نوکرا

ہو چی پہاڑی پر بنگلہ بنایا جا رہا ہے۔ اے راجہ کے نوکر تم آؤ اور لمحہ بھر یہاں آرام کرو۔ تمہارے دانت چنبے کی کلیوں جیسے خوبصورت ہیں۔

اے راجہ کے نوکر تم انھیں اخروٹ کی چھال سے صاف کر لو۔

جُلفاں تاں تیریاں گھُنگھریاں
سیسی بھری تیلے دی پائی لے تُو
راجے دِیا نوکرا

اکھیاں تاں تیریاں انبے دیاں پھاڑیاں
سُرمے سلائیاں پا ہی لے تُو
راجے دِیا نوکرا

تمھارے سر کے بال گھونگھر والے ہیں۔ ان میں تیل کی بھری ہوئی شیشی ڈال لو
تمھاری آنکھیں آم کی پھانکوں جیسی ہیں۔ اے راجہ کے نوکر
دانتوں کو چنبے کی کلیوں سے اور آنکھوں کو آم کی پھانکوں سے تشبیہ دینا
کتنی شاعرانہ نازک خیالی ہے۔

سماجی قدریں ہماچل میں بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی کہیں اور۔ ازدواجی
رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ مقدس تار ٹوٹ جائے تو خاندان کے
تباہ کُن ہوں گے۔ جو ایک بار میاں بیوی وہ سدا میاں بیوی۔ میں کمبل کو چھوڑتا
ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا والی بات تو آپ نے سُنی ہی ہوگی۔ اگر نہیں سُنی
ہے تو سنیے سُنیئے۔ مذکورہ گیت میں بیوی صحیح طور پر خاوند کی نصف بہتر (نصف
بہتر) ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

عورت۔ جے تُو چانچڑی دا دانہ	تاں میں چانچڑی بن جانا
مرد۔ جے تُو چانچڑی بن جانا	تاں میں نوکریا چلے جانا
عورت۔ جے تُو نوکریا چلے جانا	تاں میں روندیا چُپ نی جانا
مرد۔ جے تُو روندیا چُپ نی جانا	تاں میں گھرے جو آئی جانا
عورت۔ جے تُو گھرے جو آئی جانا	تاں میں چرخے تند نی پانا
مرد۔ جے تُو چرخے تند نی پانا	تاں میں ہور بیاہ کرانا
عورت۔ جے تُو ہور بیاہ کرانا	تاں میں ادھا ادھ ونڈانا

اگر تم چانچڑی کے دانے ہو تو میں بھی چانچڑی کا دانہ بن جاؤں گی۔

اگر تم چانچڑی بن جاؤ گی تو میں نوکری کرنے پردیس چلا جاؤں گا۔
اگر تم نوکری کرنے پردیس چلے جاؤ گے تو میں روتی ہی رہوں گی۔
اگر تم رونا بند نہ کرو گی تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔
اگر تم واپس گھر چلے آئے تو میں چرخے پر بالکل سُوت نہ کاتوں گی۔
اگر تم چرخے پر قطعی سوت نہ کاتو گی تو میں اور بیاہ کراؤں گا۔
اگر تم نے دوسرا بیاہ کروایا تو میں جائیداد کی تقسیم کروا کر آدھا حصہ
لوں گی۔

اُو پیکی دل چسپ گفتگو پڑھیئے اور پھر نتیجہ نکالیئے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے
تین پات۔ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

ایک اور گیت پڑھیئے جس میں پہاڑ کی ایک بیٹی اپنے نقطۂ نگاہ کے
مطابق آدرش زندگی کا تصور پیش کرتی ہے۔

بانکے بانکے محل چاہئیں	سوہنے سوہنے محل چاہئیں
	دیکھنے کو موریاں
جینے کو رام نام چاہیئے	مت چیت لاندیاں
اماں چاہیئے باپو چاہیئے	بھائیاں دِیاں جوڑیاں
بانکے بانکے کھیت چاہیئے	بیلاں دِیاں جوڑیاں
جینے کو رام نام چاہیئے	مت چیت لاندیاں

۔ جینے کو خوبصورت محل اور سندر جھروکے ہوں۔ باہر جھانکنے کے لئے دریچے ہوں
جینے کے لئے رام نام ہو تاکہ تسکینِ قلب رہے۔ ماں باپ جیتے رہیں اور
بھائیوں کے جوڑے قائم رہیں۔ عمدہ عمدہ کھیت کاشت کے لئے ہوں اور
صحت مند بیلوں کے جوڑے ہوں۔ جینے اور تسکینِ قلب کے لئے رام نام کی دھن ہو۔
اور قدرت کے شیدائی اور فطرت کے پجاریوں کے لئے پہاڑ ایک ناگزیر
کشش اور مسحور کن جاذبیت رکھتے ہیں۔

جینا پہاڑے دا جینا	اُچیاں اُچیاں کھڑیاں دھاراں
	ٹھنڈی ٹھنڈی پین پھوہاراں
ٹھنڈا پانی پینا	جینا پہاڑے دا جینا

پہاڑوں کی زندگی بڑی دل کش اور حسین ہے۔ چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں
کھڑی ہیں۔ چاروں طرف ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ رہی ہے۔ پینے کے لئے
نرمل اور ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ پہاڑ کی زندگی ہزار نعمت ہے۔

---

[1] چانچڑی ایک حقیر اناج کا نام

گاندھی جی لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ
گورنمنٹ ہاؤس میں

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں سردار پٹیل کے ساتھ

ایشیائی ممالک کی کانفرنس میں - ۱۹۴۷

برلا ہاؤس سے شام کی سیر کے لئے روانہ ہو رہے ہیں - ۱۹۳۸

گاندھی جی انڈین نیشنل آرمی سے خطاب کر رہے ہیں - بھنگی کالونی
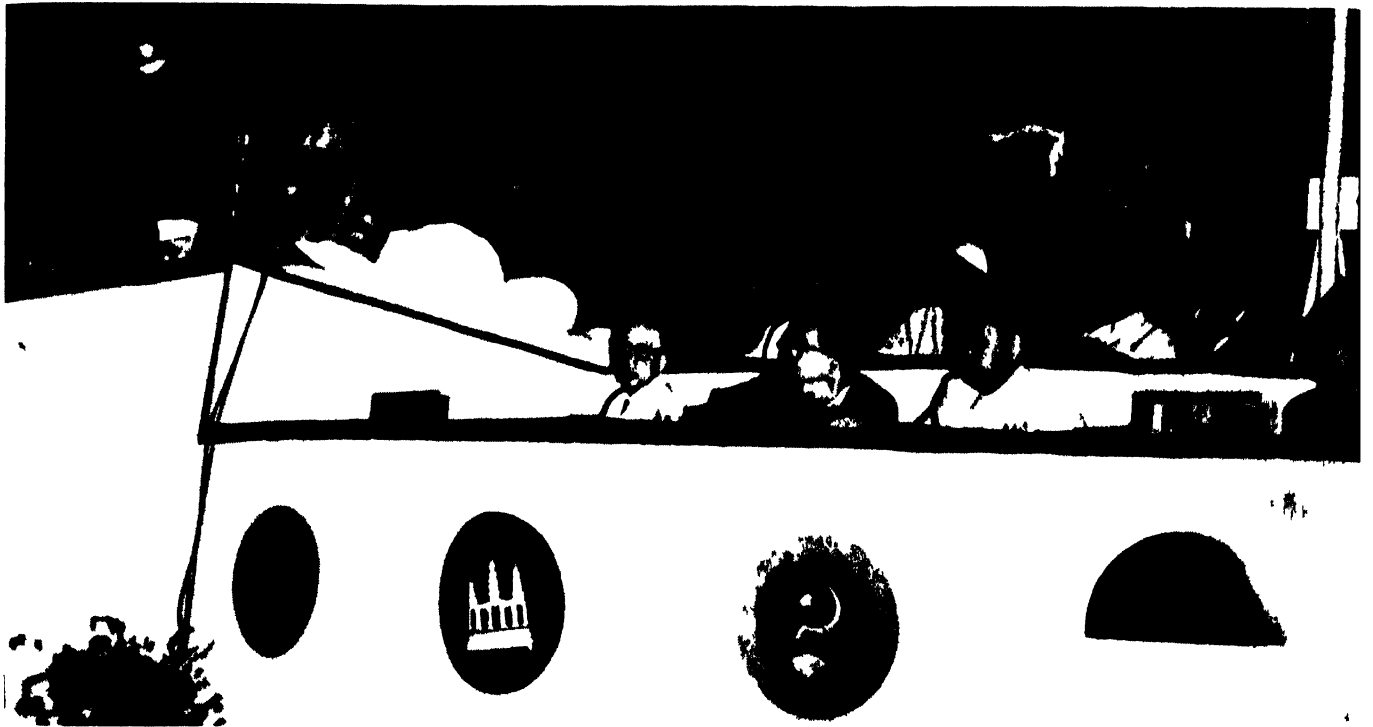
گاندھی جی اتمان زئی میں - ۱۹۳۸ - تصویر میں مہادیو ڈیسائی اور خان عبدالغفار خاں بھی موجود ہیں

گاندھی جی اور خان عبدالغفار خاں پرارتھنا سبھا میں
- بھنگی کالونی نئی دہلی

گاندھی جی پشاور میں

فیضی کی دو تحریریں

موارد الکلم نسخہ المانیہ پر فیضی کی تحریر

تاریخ گزیدہ پر فیضی کی تحریر دستخط اور مہر

ان عکسوں سے متعلق مختار الدین احمد کا مضمون فیضی کی دو تحریریں صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ فرمائیں

نہر سویز

عبداللہ خاور

غزل
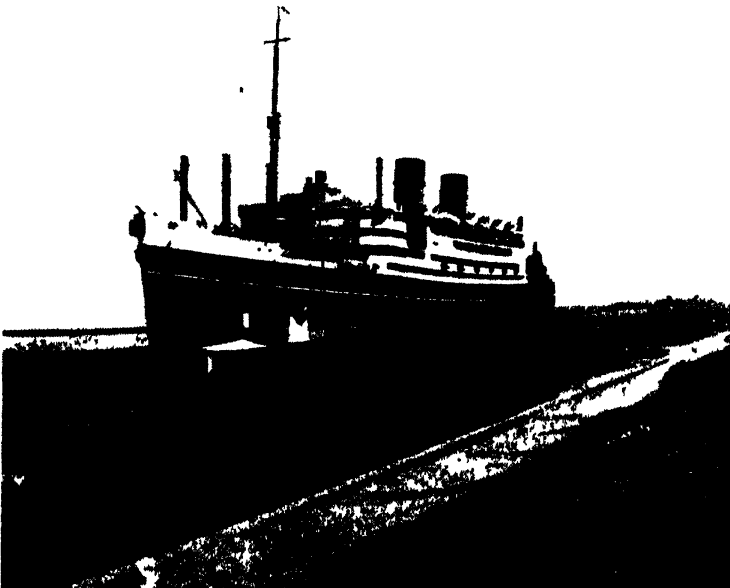
ترے خیال کی اک نکہتِ رواں ہے غزل
ترے جمال کی رنگین داستاں ہے غزل

ترا بیاں ہے، تری بزمِ ناز میں، تجھ سے
نیازِ عشق کی بے ربطیٔ زباں ہے غزل

ترے ہی پیکرِ رنگیں کا نقشِ مبہم ہے
ترے شباب کی رعنائی نہاں ہے غزل

خیال جنّتِ رنگیں تری اداؤں سے
جو تو نہیں ہے تو اک نقشِ رائیگاں ہے غزل

دراز اور مسلسل، حسین اور بے ربط
ادائے زلفِ پریشاں کی داستاں ہے غزل

یہ اختصار، کہ آنسو کی ایک لرزش ہے
یہ وسعتیں ہیں کہ اک بحرِ بیکراں ہے غزل

بہت ہی شوخ، بڑی زودحس، لطیف مزاج
ہر ایک رنگ میں ہم رنگِ دلبراں ہے غزل

اک انتشارِ حسیں بھی، جمیلِ وحدت بھی
جنون و ہوش کی موسیقیٔ رواں ہے غزل

لبِ بہار کا نغمہ، دلِ خزاں کی کسک
کہیں ہے ساز، کہیں سوزِ بیکراں ہے غزل

غمِ حبیب کی مونس، غمِ جہاں کی ندیم
ہر ایک حال میں دل کی مزاج داں ہے غزل

سفیرِ حسرت و ارماں، دیارِ خوباں میں
پیامِ شوق سوئے خلوتِ بتاں ہے غزل

کہیں ابھرتے ہوئے آفتاب کا پرتو
کہیں لرزتی ہوئی شمع کا دھواں ہے غزل

کبھی امڈتے ہوئے انقلاب کا ہے رجز
سرودِ مے ہے کبھی آتشِ جواں ہے غزل

ہے استعاروں کی وادی کی شوخ چشم غزال
کبھی عیاں ہے کبھی سرِّ دلبراں ہے غزل

رواں ہے آج بھی ممنوع وادیوں کی طرف
ہنوز لغزشِ آدم کی داستاں ہے غزل

وفورِ جذبۂ دل کی بھی آزمائش ہے
شعورِ نقد و نظر کا بھی امتحاں ہے غزل

یہ کائنات ہی خاور غزل کے طرز پہ ہے
جو ختم ہو نہ سکے گی وہ داستاں ہے غزل

ن شکیب

حاجی دولت

ایک زمانہ تھا جب حاجی دولت صرف دولت تھے۔ ان کے سیٹھ بننے کا وقت نہیں آیا تھا۔ غریب تو وہ کبھی نہیں تھے۔ ان کے باپ تو دولت ہی کے زمانے سے ان کے گھر میں سونا برستا تھا لیکن سونے چاندی کے کلس حاجی صاحب نے اٹھائے۔ پہلے وہ سیٹھ دولت ہوئے پھر حاجی دولت صاحب اور اب تو وہ صرف حاجی صاحب قبلہ ہیں۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھتے وقت انتہائی خاکساری برتتے ہیں۔ دولت نے اُن کو جتنا بھاری بھرکم بنا دیا ہے وہ اپنے خط میں اتنا ہی سمٹ کر صرف "عاصی حاجی" رہ جاتے ہیں۔ ان کے بیٹوں اور پوتوں کو یہ انکسار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جب کبھی وہ لوگ ان کی طرف سے خط لکھتے ہیں تو آخر میں تھوڑا سا بڑھا کر "الحاج سیٹھ دولت" لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو خط و کتابت کی بات ہے۔ عام طور سے لوگ اب یہ بھی بھول چکے ہیں کہ حاجی صاحب کا "حاجی صاحب قبلہ" کے سوا اب اور بھی کوئی نام ہے۔ نیا پوسٹ مین جب کبھی بدل کر آتا ہے تو بہت کم لوگ ملتے ہیں جو اتنے مشہور اور بڑے آدمی کا پتہ اس کے نام سے بتا سکیں۔ اور یوں تو حاجی صاحب کو سب ہی جانتے ہیں۔

حاجی صاحب خوبصورت نہ رہے ہوں لیکن ان پر بدصورتی کا الزام بھی کسی نے نہیں لگایا۔ حج کے بعد سے پیشانی پر نشانِ سجدہ نے اُبھر کر نُور کا ایک منارا تیار کر دیا ہے اور اب تو بہتوں کو یہ نور برستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جن سیاہ بختوں پر اس نور کی چھینٹیں بھی نہیں پڑتیں وہ بھی چاہے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن تکذیب کی ہمت نہیں کرتے۔ حاجی صاحب کو کالا تو کوئی کہہ نہیں سکتا لیکن ان کے گورے ہونے کا بھی کوئی مدعی نہیں۔ نشانِ سجدہ پیشانی پر ذرا اُبھر آیا ہے اس لئے جسم کی عام جلد سے اس کی تمیز قریب آ کر کچھ آسان ہو جاتی۔ عمر ساٹھ سال کے قریب پہونچ چکی ہے لیکن بال ابھی تک سیاہ ہیں۔ دانتوں نے بے وفائی ضرور کی لیکن حاجی صاحب نے پوری بتیسی لگا کر یہ خلا بھی پاٹ لیا۔ یہ بتیسی انھوں نے مکہ میں لگائی تھی اس لئے معتقدین رفع دشتر الاظم و غصہ ہر حالت میں حاجی صاحب کے ان دانتوں کی زیارت سے ثواب کی اُمید رکھتے ہیں۔ اگر حاجی صاحب کبھی چُپ ہو جاتے ہیں لوگ ان کو چھیڑ چھیڑ کر بولنے، ہنسنے یا کم سے کم غصہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں تاکہ سفید چمکیلے دانتوں کی زیارت سے ثواب حاصل کر سکیں۔

تجارت حاجی صاحب کے یہاں کئی پشتوں سے ہوتی ہے۔ ان کی نیک نیتی نے اس پیشے کو ان کے لئے واقعی "فضل اللہ" بنا دیا ہے۔ وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو سونا ہو جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر آدمی نیت ٹھیک رکھے تو اللہ ضرور برکت دیتا ہے۔ غریبوں کی خدمت اور خبرگیری کا انھیں ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ ان کے شہر میں بہت سے غریب اور بے یار و مددگار لڑکے خلقت کا نوالہ بنے پڑے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مالک کی دوکانوں سے کچھ سامان چُرا لاتے ہیں۔ حاجی صاحب اس حرکت کو کبھی پسند نہیں کرتے لیکن دیندار طبیعت رکھنے کی وجہ سے کسی گنہگار کا راز بھی افشا نہیں کرنا چاہتے۔ وہ سامان ان لڑکوں کے لئے بیکار بھی ہوتا ہے۔ اگر کبھی شبہ ہو جائے اور تحقیقات کی نوبت آئے تو سرقے کا مال برآمد ہونے سے ان غریب بچّوں کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشے بھی حاجی صاحب کو پریشان کر دیتے ہیں۔ رانڈ بیواؤں کے لڑکے اگر پکڑے جائیں تو ان کا یہ ٹوٹا پھوٹا سہارا بھی جاتا رہے۔ حاجی صاحب ایسے موقعوں پر یہ سامان ان بچّوں سے اونے پونے خرید کر اپنی دوکان میں رکھ لیتے ہیں۔ حاجی صاحب دولتمند آدمی ہیں انھیں مال کی کمی نہیں۔ یہ جرأت تو وہ صرف اپنے کلمہ گو بھائی کا عیب چھپانے کے لئے کرتے ہیں۔ اللہ کی ایک صفت ستاری بھی ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک صفت پیدا کرنے کی سعیٔ بلیغ کرتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے سامان کی پوری قیمت ادا

کرنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن وہ اس طرح چوری کی بُری عادت کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے اس کے وہ کم سے کم دام ادا کرتے ہیں تاکہ یہ چور لڑکے اس پیشے کو غیر نفع بخش سمجھ کر چھوڑ دیں۔ لیکن زمانہ اتنا خراب ہو گیا ہے کہ اب نیکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کو حیرت ہے کہ ایسی نفسیاتی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد بھی مجرمین کا یہ گروہ بڑھ رہا ہے۔

حاجی صاحب بڑے صابر اور تحمل والے بزرگ ہیں۔ کوئی کتنی ہی بڑی غلطی کیوں نہ کرے ان کو غصہ بہت کم آتا ہے۔ خشیتِ الٰہی ان کی روحانی غذا ہے۔ غصہ آتے ہی ان کو غضبِ الٰہی کا خیال آ جاتا ہے اور وہ پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک دن، ایک لڑکے نے جو ان کے یہاں ملازم تھا ایسی شرمناک غلطی کی کہ ان کا سا صابر آدمی بھی غصہ ضبط نہ کر سکا۔

انھوں نے محلے کے ایک بچے کو فاقوں میں گرفتار دیکھ کر کھانے کپڑے پر نوکر رکھ لیا تھا۔ لڑکا یتیم تھا اس لئے اس کی تربیت اور نگرانی میں، حاجی صاحب وہی توجہ کرتے تھے جو کسی باپ کو اپنے بچے کے لئے کرنی چاہیئے تھی۔ دولت آنی جانی ہے۔ وہ تین پُشتوں سے دولت مند ہونے کے باوجود حاجی صاحب اس حقیقت سے صدقِ دل سے قائل ہیں۔ اس لئے تربیت کے معاملے میں مستقبل کی "عدم یقینیت" ہمیشہ ان کے سامنے رہتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ بچے لڑکپن ہی میں ہر طرح کی سختی جھیلنے کا عادی ہو جائے تاکہ زمانے کی ناسازگاری اس کو پریشان نہ کر سکے۔

حاجی صاحب کھانے پینے کے زیادہ شوقین نہیں ہیں لیکن کفرانِ نعمت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اللہ نے دیا ہے اس لئے دسترخوان پر دو چار طرح کے سالن، مٹھائیاں، چٹنیاں، اور مربّے ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن اس امر کا وہ خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کے متعلقین ان تکلفات کے عادی نہ ہونے پائیں۔ وہ خود یہ تمام چیزیں شوقیہ استعمال نہیں کرتے ہیں صرف اظہارِ نعمت کے طور پر، محض جذبۂ تشکر و احسان مندی کے تحت یہ سب کچھ کر لیتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کو جب تک نفس پر پورا قابو نہ مل جائے، ان تعیشات میں نہ پڑنا چاہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ نفس موٹا ہو جائے گا اور یہ لت رفتہ رفتہ اسراف کے گناہِ کبیرہ تک گھسیٹ لے جائے گی۔

اسی نازک خیال کے تحت حاجی صاحب اس یتیم بچے کی بھی پرورش کرتے تھے۔ لیکن یہ بدبخت جب موقع پاتا ان کے عبادت کے کمرے میں رکھے ہوئے اچار، چٹنیوں، مربّوں اور مٹھائیوں پر ہاتھ صاف کرتا رہتا۔ اتنے دولت مند گھر میں ان چیزوں کی کیا قیمت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سے عادت بگڑنے اور اسرافِ بے جا تک پہونچنے کا احتمال تھا اس لئے حاجی صاحب کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزرتی۔ جب کبھی وہ پوچھتے یہ ظالم صاف مُکر جاتا۔

ایک دن جب حاجی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دبے پاؤں ان کے کمرے میں پہنچا۔ جب حاجی صاحب سجدے میں گئے یہ چپکے سے مربّے نکال کر کھانے لگا۔ عجیب اتفاق اُسی وقت ایک فطری مجبوری کی وجہ سے وضو کے لئے نماز ادھوری چھوڑنا پڑی۔ اس نے حاجی صاحب کو مڑتے دیکھ کر ہونٹ بند کر لئے۔ حاجی صاحب نے بہت پوچھا اس نے ہوں ہاں میں ٹالا۔ جب تک حاجی صاحب نے کھینچ کر طمانچہ نہیں مارا اُس نے منہ نہیں کھولا۔ تھپڑ پڑتے ہی مُربّہ منہ سے اُچھل کر جانماز پر جا گرا۔ مُربّے کی کوئی بات نہ تھی لیکن وہ دروغ گو کے لعابِ دہن میں لتھڑی ہوئی آملے کی گٹھلی اس مصلّے پر جا گری تھی جو حاجی صاحب نے مدینے میں خریدا تھا۔ مدنی تبرک کی یہ توہین ایک عاشقِ رسول کیسے برداشت کرتا! اس عالمِ جنون میں جو شدید جذبۂ محبت سے پیدا ہوا تھا، حاجی صاحب نے اس لڑکے کو بہت مارا۔ اور اُس کی صورت سے اتنے بیزار ہوئے کہ اس خبیث روح کو جو یقیناً آگے چل کر جہنم کا کُندہ ہوتی، فوراً نکال باہر کیا اور پھر اس کو اپنے یہاں کبھی نہیں رکھا۔

ایسے شدید جذبۂ نفرت پر قابو پانا بھی حاجی صاحب ہی جیسے خدا ترس آدمی کا کام تھا۔ یہ لڑکا دوسری جگہ نوکر تھا۔ اس نے اپنی کاٹ پیٹ کی عادت نہیں چھوڑی۔ اس کی بے شرمی اور دیدہ دلیری دیکھنے کے لائق ہے کہ وہ دوسری جگہ سے چیزیں چُرا چُرا کر حاجی صاحب کی دوکان پر بیچنے کے لئے لانے لگا۔ جب وہ آتا حاجی صاحب چشم پوشی کی نیت سے آنکھیں بند کر لیتے۔ ان کے منیم نے حاجی صاحب کی ناگواری سے واقف ہونے کی وجہ سے، خریداری سے پرہیز کرنا چاہا لیکن حاجی صاحب نے ازراہِ نیتِ کرم و عیب پوشی اشارہ کر دیا تاکہ وہ بد نصیب کہیں اور جا کر پکڑا نہ جائے اور بیٹھے بٹھائے اس بدخصلت کے ہاتھوں غریب بیوہ کے ایک ٹکڑے روٹی پر آفت آئے۔

حاجی صاحب جوانی میں بھی جوانِ صالح تھے۔ اب پیری میں تو ان کی معصومیت نابالغوں کے لئے بھی رشک کا موجب بنی ہوئی ہے۔ لہو و لعب میں وہ کبھی نہیں پڑے۔ روپیہ پیسہ کی افراط ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی تھیٹر سینما کا شوق نہیں کیا۔ ہاں دیہاتی نٹنیاں ناچ گا کر حاجی صاحب سے کچھ نہ کچھ ضرور اینٹھ لے جاتی ہیں۔ ظاہر ہے اس میں اعتراض اور شبہ کی کیا بات

ہے ؟ ایک غریب قوم جو رزق کے ہر ذریعے سے محروم ہے ، ایک ڈھولک ، گھنگھٹ کے
بھونڈے اور بے تال سُر کی چیخیں جس کا کل سرمایۂ تجارت ہیں ، بہرحال رحم کی مستحق ہے۔
ان ہیتیوں میں حُسن کا کوئی سوال نہیں رہا۔ اب رہا شباب ، وہ منگنیں اُس کے لئے ہوگا
جو پتھروں میں جونک لگانے کی نیت رکھتا ہو ، حاجی صاحب کو تو اس سنگلاخ میں
بھی صانع قدرت کی صنعت ہی نظر آتی ہے۔ اس احساس کے باوجود انھوں نے
ان کے ناچ کے وقت کبھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ بس گردن جھکائے "سبحان اللہ"
سبحان اللہ" کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

اچھے لوگوں کو بھی بعض وقت کچھ بندگانِ غرض بدنام کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں
کی نیت جو کچھ بھی ہو اللہ اس طرح نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور ان کے تحمل و برداشت
پر ان کے درجات بلند کرتا ہے۔ حاجی صاحب کو بھی بعض اوقات بڑی آزمائشوں کا
سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان ہی مجمعوں میں افسر جان طوائف کے اُٹھائے ہوئے فتنوں کو
یاد کیجئے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اس مردود نے ایک مرتبہ میلاد اور دعوت
میں قصبے کے بڑے آدمیوں کے ساتھ حاجی صاحب کو بھی بُلایا۔ ظاہر ہے اس کے یہاں
رزقِ حلال کے شبہ کے لئے بھی کیا گنجائش تھی! حاجی صاحب نے پیغام سنتے ہی انکار
کر دیا۔ وہ ظالمہ ، جس کا دماغ بعض شریفوں کی کمینہ حرکتوں نے خراب کر دیا تھا اس
صاف اور دو ٹوک جواب سے چڑھ گئی اور فوراً ساری کے پلو کو ڈھلکاتی اور سرکاتی
ہوئی حاجی صاحب پر چڑھ دوڑی۔ حاجی صاحب بے چارے بزرگ آدمی اس
بیسوا کے منہ کیا لگتے! لاحول پڑھتے ہوئے اندر گودام میں جا گھسے۔ وہ بڑی دیر تک
کھڑی بڑبڑایا کی کہ "میرا پیسہ حرام ہے اور میں حلال ہوں ، کیوں حاجی! یہ وہی تو
دولت ہے جو میں نے تیرے جیسے ولیوں کی جیب کاٹ کر جمع کی ہے ، اس میں حرام
کیا ہے ؟ اگر تیری کمائی حرام ہے تو میری پونجی بھی حرام ہے۔ تو دنیا کو فریب دے میں
تیری ریاکاری سے خوب واقف ہوں۔ میں گنہگار ہوں لیکن ریاکار نہیں — تو
گنہگار بھی ہے اور ریاکار بھی . . . ." وہ دراتی ہوئی گودام میں جا گھسی
حاجی صاحب گھبرائے ہوئے تو تھے ہی ، اس بلا کو آتے ہوئے دیکھ کر بالکل ہی بوکھلا
گئے۔ جیب میں جو کچھ تھا اپنی عزت و آبرو پر صدقے کیا۔ وہ ستم ظریف یا تو آگ کے
گھوڑے پر سوار آئی تھی یا جُھک جُھک کر روپے اور نوٹ چننے لگی۔ اس پر
بھی صبر نہ ہوا۔ بڑی ادا سے ٹھمک کر آگے بڑھی اور حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر
کہا۔ "چلو یا نہ چلو آج دعوت اور میلاد کا خرچ دے دو۔" حاجی صاحب نے
منیم جی سے پکار کر کہا۔ "دے دو عورت کو جو کچھ مانگے — یا اللہ رحم!
یا اللہ رحم!"

دنیا میں نیکی کی جگہ نہیں۔ حاجی صاحب اس ناشدنی مصیبت میں گرفتار
تھے اور منیم جی جو اُن کے قدیم نمک خوار ہیں۔ چپکے چپکے بیٹھے مسکرا رہے تھے جیسے یہ
حاجی صاحب کا گھریلو معاملہ ہو۔ بغیر کچھ جرح کئے ، جو اُس نے مانگا انھوں نے دے دیا۔
شام کو حساب چڑھاتے وقت انھوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ "یہ خرچ کس مد
میں لکھوں ؟" حاجی صاحب تھوڑی دیر گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر بولے "میاں
خیرات میں لکھ دو۔ سوال کے جواب میں جو کچھ دیا جائے وہ خیرات ہی ہے۔"

بعض نیک گھروں کے نمک میں "اچھو" ہونے کی خاصیت ہوتی ہے۔
حاجی صاحب کا نمک بھی ایسا ہی تھا جس نے کھایا بلبلانے لگا۔ رگ رگ میں ان کا
احسان دوڑا لیکن روئیں روئیں نے ان کی ناشکری کی۔ کریمن تو جوانی میں بیوہ ہو گئی۔
کوئی پرورش کرنے والا نہ تھا۔ حاجی صاحب کے ٹکڑوں پر پلتی اور اُن کی بیویوں کے
اُتارن سے تن ڈھانکتی رہی۔ حاجی صاحب "غضِّ بصر" پر بہت سختی سے عمل کرتے
ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بدقماش ادا کر اُن کی راہ میں آنے کی کوشش کرتی۔ ایک دن
ان کی نگاہ بھی پڑ گئی۔

"ارے بیٹی کریمن! ابھی تو بچہ ہے۔ تیرے کھانے پہننے کے دن تھے۔ مگر جو
اللہ کرے وہ ہو۔ تیرے پاس کپڑے نہیں ہیں کیا ؟ . . . . . اچھا . . . . . اچھا
. . . . . یہ لے . . . . دو جوڑے ڈھنگ کے کپڑے بنا لے . . . . . اچھا . . . . .
پھر . . . . . اچھا جاؤ . . . . جاؤ۔"

کریمن کی تو جوانی پر اوس پڑی ہوئی تھی۔ حاجی کی ذرا سی نیکی نے سوئی ناگن جگا
دی۔ وہ جب نیا جوڑا چمک کر نکلی منیم جی ، چھوٹے حاجی ، مرزا حاجی نما سبھی اس
کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ اگر حاجی صاحب کا خوف نہ ہوتا تو اپنی نگاہوں کو زبان
بنا کر یہ سب اُسے چاٹ جاتے۔ کریمن ظرف کی چھچھلی تھی۔ حاجی صاحب کی مہربانی
نے اُسے اُتاتا کر دیا۔ اب وہ چھچھلے اور اترانے بھی لگی۔ ستم یہ کہ اب وہ حاجی صاحب
کے نام سے دوسروں کو دھونسیں بھی دینے لگی۔ منیم جی پر تو جب دیکھئے وہ غرایا
ہی کرتی تھی۔ مرزا حاجی نما سے تو پہلے اس کی خوب چھنتی تھی لیکن اب وہ اُس کے
سامنے تو چپ رہتے تھے لیکن چپکے چپکے منیم جی سے کہتے تھے۔ "بھائی اسے
بھگاؤ ، نہیں تو یہ سب چاٹ جائے گی۔"

گھر کا پُرکھا ، جس کے ہاتھ میں کمائی کی باگ ڈور بھی ہو ، جب کسی کے ساتھ
کچھ سلوک کرتا ہے تو دوسرے لوگ خواہ مخواہ اس سے جلنے لگتے ہیں۔ حاجی صاحب

کا پورا کنبہ اب کریمن سے چلنے لگا تھا۔ مرزا حاجی نما تو حاجی صاحب کی محلسرا میں بھی دخیل تھے۔ انھوں نے معلوم نہیں کیا جڑا کہ ایک دن بارہ بجے رات کو بڑی بحن نے ڈیوڑھی میں کریمن کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ حاجی صاحب بھی کہیں پاس ہی تھے۔ غریب بڑی پر یہ ظلم برداشت نہ کر پائے۔ چھڑانے لگے۔ لیکن بڑی بحن نے دو چار ایسی بے شرمی کی باتیں کہیں کہ حاجی صاحب لاحول پڑھتے ہوئے اپنے عبادت والے کمرے میں آ کر بیٹھ رہے۔ کریمن پٹ پٹا کر باہر نکلی۔ جاڑے کے دن تھے۔ سب لوگ دبکے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر پڑے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کے سوا اس غریب کا اور کون ہمدرد تھا! وہ ان کے عبادت خانے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حاجی صاحب بھی اب صبر کی تلقین کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ غریب بھوکی بھی تھی۔ اب اتنی رات گئے کیا ہوتا وہ تو کہیئے کہ الماریوں میں کچھ نہ کچھ رہتا تھا ورنہ غریب کو مار کھانے کے علاوہ بھوکا بھی رہنا پڑتا! فرش فروش جو کچھ تھا حاجی صاحب نے اس کے اوپر ڈال دیا اور مصلّا بچھا کر رو رو کر اپنے پیدا کرنے والے سے شکوہ کرنے لگے۔ لوگ ان کی فریاد سنتے سنتے غافل ہو گئے۔

دوسرے دن جیرا تو جو حاجی صاحب کا ہے پالک تھا کریمن کو لے اڑا۔ حاجی صاحب سے کیا مطلب؟ دونوں جہنم کے کندے ہیں جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔ لیکن جائے عبرت یہ ہے کہ اب وہ نمک حرام طرح طرح کی باتیں سناتی پھرتی ہے ...... —————— !" بڑی ناشکری ہے حرافہ کہیں کی۔

حاجی صاحب ملک التجار تو تھے ہی۔ سبھی طرح کا مال ان کے گودام میں بھرا رہتا تھا۔ لیکن چائے اور سگرٹ کے بنڈلوں سے تو مال کے مال بھرے رہتے تھے۔ کمال تو یہ ہے بعض وقت کمپنی کی تھوک شرح سے بھی کم نرخ پر یہ چیزیں سپلائی کر دیتے تھے۔ بقول حاجی صاحب جب وہ کھڑی کراچیاں چکا کر خرید لیتے تھے تو ان کو سستا بیچنے میں کیا عذر ہو سکتا تھا! وہ تاجر تھے سمگلر نہ تھے۔ ان کا نفع دال کا نمک تھا۔ اس نمک میں اللہ نے اتنی برکت دی تھی کہ دوسرے حسد کرنے لگے تھے۔

کچھ دنوں سے اخباروں میں خبریں اڑنے لگیں کہ ٹھگوں کا کوئی گروہ ریلوے پر لاکھوں کی چوریاں کر رہا ہے۔ پولیس حیران ہے۔ کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لوگ تو دشمن تھے ہی، لے اڑے کہ ہو نہ ہو حاجی صاحب اس سازش میں شریک ہیں۔ کمبخت سازشی خدا سے بھی نہیں ڈرتے۔ ایک دن کپتان صاحب پولیس کی دوڑ لے کر آ دھمکے۔ وہ تو کہئے مرزا حاجی نما کو پہلے ہی سن گن مل گئی تھی اور مقامی تھانے والے ان کو بھید بتا دیا تھا نہیں تو حاجی صاحب کو بڑی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حاجی صاحب وارنٹ آنے سے پندرہ منٹ پہلے مرزا حاجی نما کے ساتھ اونہ جانے کے کوٹھے پر جا چھپے۔ البتہ چھوٹے حاجی بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور پولیس کی دھر پکڑ میں ان کا عضو عضو ڈھیلا ہو گیا۔ کونے کونے کی تلاشی ہوئی۔ لوگ اڑاتے ہیں کہ ایک لاکھ کا مال پکڑا گیا۔ جھوٹی گواہیوں کی یہاں کیا کمی ہے! حاجی صاحب پر مقدمہ چلا۔ ہزاروں کے وارے نیارے ہوئے لیکن قابلِ تعریف ہیں مرزا حاجی نما کہ سچ کو سچ ثابت کر کے ہی دم لیا۔ واقعی اعلاء کلمۃ الحق بھی بڑی بات ہے جس سے بری آئے! دھوم سے دعوتیں ہوئیں۔ ہزاروں آدمیوں نے شکرانے کے چاول کھائے۔ ان حالات میں پتھر کا کلیجہ ہوتا تو شق ہو جاتا۔ حاجی صاحب تو نہایت نرم دل اور پرگداز طبیعت رکھنے والے آدمی تھے۔ اگر توفیقِ الٰہی شامل نہ ہوتی تو یہ ذلّت ہرگز برداشت نہ کر پاتے۔ پوری دنیا خوش تھی کہ حاجی صاحب جیت گئے۔ لیکن حاجی صاحب کو ملال تھا کہ "دنیا اب ایسی بگڑ گئی ہے کہ حق کو حق ثابت کرنے کے لئے ہزاروں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔"

اب حاجی صاحب کا دل اس ملک سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب ان کو دیارِ حبیب کی یاد ستا رہی تھی۔ انھوں نے حج کے لئے رختِ سفر باندھا۔ ہندوستان میں وہ کیا کم نیکی کرتے تھے جو حجاز میں اٹھا رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ لے کر چلے رفاقت کے لئے صرف مرزا حاجی نما ساتھ چلے۔ چلتے وقت حاجی صاحب نے بڑی دھوم سے رخصتی کا کھانا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں نے ان کی بخیریت واپسی کے لئے دعائیں کیں۔ حاجی صاحب کو تو نمود و نمائش سے سخت نفرت ہے لیکن دنیا والوں سے کس کا زور چلتا ہے۔ زبردستی لوگوں نے پھولوں اور ہلکوں کے ہار پہنائے۔ حاجی صاحب محض سب کا دل رکھنے کے لئے سر جھکائے کھڑے "دل بدست آور کہ حجِ اکبر است" پڑھتے رہے۔ گاڑی چلی اور انجن کی بھک بھک اور وداع کرنے والوں کے نعروں میں حاجی صاحب کا درود اچھی طرح سنائی نہیں پڑا۔

حاجی صاحب نے دھوم دھام سے حج کیا۔ مرزا حاجی نما تمام تفصیلات معتقدین کو لکھتے رہے۔ واپسی بھی بہت شان سے ہوئی۔ حاجی صاحب بے شمار تحائف اپنے ساتھ لائے۔ ان تحائف میں سونے کے ڈبلے بھی تھے۔ قرآن میں آیا ہے "زمین اور آسمان کے خزانے اللہ کے لئے ہیں۔" اگر کوئی حکومت سونے اور چاندی پر پابندی لگاتی ہے تو وہ مجرم ہے۔ کوئی دین دار آدمی ان دنیوی قواعد کے آگے گردن نہیں جھکا سکتا۔ حاجی صاحب سے یہ توقع کہ وہ فرمانِ خدا کے آگے ان طاغوتوں

کے احکام کی عزت کرتے، کبھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے سونا خریدا اور جی بھر کر خریدا۔ حجاز کا سونا ہر ہندوستانی کو کہاں نصیب!

معلوم نہیں کس بے دین نے مخبری کر دی اور ساحل پر تلاشی لی گئی۔ کپڑوں کی تہوں، جوتوں کے استروں اور تلووں، دگلوں اور عباؤں کے جوڑوں میں سونے کے ٹکڑے سلے ہوئے نکلے، تمام سونا، کوئی پچاس ہزار کی مالیت کا اندازا گیا۔

حاجی صاحب جب سونا لائے تھے تو چھپانے کی بھی کوئی بات نہ تھی کپڑے ادھیڑ ادھیڑ کر ٹکڑے نکالے جاتے۔ وہ بے تکلف اقبال کرتے کہ "ہاں یہ سونا ہے۔"

پوچھا گیا۔ "یہ آپ کیوں لائے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں یہ جرم ہے؟"

حاجی صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ "تم دنیا والوں کی نگاہ میں یہ جرم ہوگا۔ میں تو اللہ کے گھر سے اللہ کا خزانہ صرف اس لئے لایا ہوں کہ اس کے نفع سے اپنے دیس میں مسجدِ نبوی کے نمونے پر ایک مسجد بنواؤں اور اسی کے ایک حجرے میں اپنی باقی عمر اعتکاف میں بسر کردوں۔"

بات بڑھی اور گھٹی۔ معلوم نہیں کیسے کیا ہوا۔ لوگوں کو حاجی صاحب کی نیک نیتی اور خلوص کا یقین آگیا۔ حاجی صاحب نے بھی سونے کا تبرک بانٹنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ جب اللہ سے تو بخل سے کام لینا گناہ ہے۔

مرزا حاجی نما بمبئی کا معرکہ جیت کر حاجی صاحب کے ساتھ لوٹے۔ حاجی صاحب تو نہیں چاہتے تھے کہ ان کی حرمین شریف سے مراجعت کی خبر کو عوام تک پہنچایا جائے، لیکن مرزا حاجی نما ان بندگانِ خلوص کی تشنہ لبانِ اشتیاق کو کیا جواب دیتے جو حاجی صاحب کے انتظار میں مہینوں سے سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے پورے پروگرام کا ترجمہ تار میں کر ڈالا اور جب حاجی صاحب وطن پہنچے تو اسٹیشن پر زائروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ نعرۂ تکبیر اور حاجی صاحب قبلہ زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ دوسرا ہوتا تو استقبال کی یہ شان دیکھ کر آپے میں نہ رہتا اور گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی پھاند پڑتا۔ مرزا حاجی نما بھی کچھ کم برگزیدہ آدمی نہ تھے لیکن ان سے ذرا لیک کر کھڑکی سے کھسیں نکال کر جھانکنے لگے۔ جیسے یہ سارے ہار انھیں کے لئے آئے ہوں۔ لیکن حاجی صاحب؟ وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے بلکہ بڑے سکون وقار سے بارگاہِ ایزدی میں دستِ بدعا ہے۔ وہ تو کہئے زائرین صبر نہ کر سکے اور ڈبے میں گھس کر زبردستی حاجی صاحب کے گلے میں ہار ڈالنے لگے ورنہ ریل چھوٹ بھی جاتی اور ان کے استغراق میں فرق نہ آتا۔ دعا کے اس پرکیف عالم میں حاجی صاحب کو ان بدتمیزوں کی مداخلت بہت کھلی لیکن محبت کا مارے کریگلے کا ہار بنے تھے اس لئے حاجی صاحب ٹھکرا نہ سکے اور بادلِ ناخواستہ اٹھ کر بغلگیر ہوئے۔ اب بیٹی بھی ہو رہی تھی اس لئے حاجی صاحب مریدوں کے دوشِ عقیدت پر سہارا لیتے ہوئے نیچے اترے اور چشم زدن میں معتقدوں کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے لگے۔

ہفتوں مریدوں نے جشن منایا۔ دعوتیں ہوئیں، قوالیوں کی محفلیں گرمائی گئیں۔ حاجی صاحب سماع کو جائز تو نہیں سمجھتے تھے لیکن دلِ دوستاں کے احترام کے قائل تھے اس لئے اس زہر کو شہد سمجھ کر پیتے رہتے تھے۔ پھر قوالی اسکے لئے بری ہو سکتی ہے جس کے جذبات کا رجحان سفلی ہو۔ حاجی صاحب کا ذہن اس گندگی سے پاک تھا اس لئے نالۂ مجاز بھی ان کے لئے ترانۂ معرفت بن جاتا تھا۔

اب مسجدِ نبوی کے نمونے پر ایک مسجد بنوانے کی مہم تھی۔ لیکن حجازی سونے کی اچھی خاصی مقدار تبرک بن کر بمبئی ہی میں رہ گئی تھی۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس سونے کو تجارت میں لاکر مزید زرِ حلال کا انتظام کر لیا جائے۔ حجاز کا سونا جب تجارت میں لگ کر "فضل اللہ" کی شکل اختیار کرلے گا تو اور بھی خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ اس نیت کی نیکی میں کیا شبہ ہو سکتا تھا۔ مرزا حاجی نمانے کاروبار میں یہ سرمایہ بھی لگا دیا۔ حاجی صاحب تو دنیوی کاروبار سے سبکدوش ہونے کا پورا ارادہ کرکے آئے تھے۔ لیکن اب کیا کرتے؟ مسجد کی مہم اتنی اہم تھی کہ اب تجارت کو کارِ خیر کی نیت سے چلانا ہی تھا۔ مجبوراً حاجی صاحب اسی آبائی پیشے میں نیتِ خیر کا پیوند لگا کر گم ہو گئے۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن حضرت بے نظیر شاہ کا کلام اور زندگی کے حالات مرتب فرما رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی مواد کسی صاحب کے پاس ہو تو موصوف سے خط و کتابت فرمائیں۔ (ادارہ)

[illegible]

دُنیائے افسانہ کے باشندے

(کردار نگاری میں ایک مطالعہ)

جب بھی کوئی افسانے کے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کرتا ہے تو اُس کی شکایت عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ افسانے کے دو اہم عناصر، پلاٹ اور کردار، آہستہ آہستہ شعور کے بہاؤ میں بہتے جا رہے ہیں۔ اشروڈ اینڈرسن نے تو پلاٹ کو 'افسانے کا زہر' قرار دے دیا ہے۔ لیکن کردار کے بارے میں اتنا فیصلہ کن ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ کیونکہ جب تک افسانہ نگار چرند پرند اور سنگ و خشت کے بارے میں قصے کہانی لکھنا شروع نہیں کر دیتا بلکہ انسانوں کی زندگی کے گرد ہی کہانی کا تانا بانا بنتا رہتا ہے کردار نگاری کی نوعیت اور اہمیت پر بحث ضرور ہوتی رہے گی۔ چاہے وہ کردار، 'بے کردار' یا 'بدکردار' ہی کیوں نہ ہو جائے یا یونگ کا آرکی ٹائپ بن جائے، کیونکہ 'بے کرداری' یا 'بدکرداری' سے بھی کردار کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔

کچھ افسانہ نگاروں کے لئے کردار پلاٹ کا ہی ایک جزو ہوتا ہے اور اس کی نشو و نما میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بعض افسانہ نگار پلاٹ کو بنیادی اہمیت دے کر کردار نگاری کو ہی اہم ترین جزو سمجھتے ہیں۔ جب بھی اُن کے سامنے کسی افسانے کا خاکہ آتا ہے تو وہ پلاٹ کی صورت میں نہیں بلکہ کرداروں کے باہمی ربط کی صورت میں ہوتا ہے۔ ان کرداروں میں کوئی نہ کوئی بات خاص ہوتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے خیال میں ایسے کردار کوئی ایسا عمل ضرور کریں گے جو دوسروں سے مختلف اور دلچسپ ہوگا۔ افسانہ نگار کا مقصد اسی عمل کی ہیئت کو افسانوی شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسی نقطے سے کردار نگاری کے ایک اہم پہلو پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ کیا افسانہ نگار کردار کے نمائندہ پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے یا منفرد پہلو کی؟ کیا نمائندہ پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے منفرد پہلوؤں کی ترجمانی ہو سکتی ہے؟ اور اس صورت میں کیا وہ کردار اپنی نمائندگی کے علاوہ دوسروں کی نمائندگی بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کی نمائندگی بھی کر سکتا ہے تو اس کی منفرد حیثیت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ یا پھر اس کے منفرد پہلوؤں کو پیش کر کے اُسے نمائندہ کردار کا روپ دینا ممکن ہے؟ بنیادی بات تو یہ ہے کہ کیا کردار کے خصوصی اور عمومی پہلوؤں میں تصادم ناگزیر ہے یا ان کا امتزاج ممکن ہے۔ بحث کردار اور شخصیت کے فرق پر بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ نقاد تو مثبت اور منفی کردار قسم کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں مثبت[1] کردار پیش کرنے چاہئیں۔ اس بحث کو آگے بڑھانے والے کرداروں کے کئی ٹائپ مقرر کرتے ہیں۔ بحث کردار کی خارجیت اور داخلیت، دونوں کی علیحدگی، تصادم، یگانگی اور امتزاج پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس مضمون میں ان تمام اہم سوالات میں سے کسی ایک پر بھی بحث مقصود نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی بات پیشِ نظر ہے جس کا براہِ راست تعلق افسانوی کردار نگاری سے ہے اور وہ بات یہ ہے کہ حقیقی کردار اور افسانوی کردار پر اکثر جو بحث ہوتی ہے اس کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے اور یہ بحث یہاں بھی ضروری ہے کہ ایک اچھے بھلے افسانے پر اعتراض کرتے ہوئے فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں کردار حقیقی نہیں (حالانکہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ماورائی ہے)

یہ بات تو ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ افسانے میں جب بھی کوئی واقعہ رونما

---

[1] مثبت: سے عام طور پر صحت مند کردار مراد لی جاتی ہے۔ صحت مند کس نقطۂ نظر سے، جسمانی، ذہنی یا روحانی؟ اس گروہ کے نقادوں کے لئے یہ بات سمجھنا انتہائی دشوار ہے کہ جسے عام طور پر اخلاقی مجرم کہا جاتا ہے وہ بھی روحانی طور پر صحت مند ہو سکتا ہے یعنی وہ بھی مثبت کردار ہے۔

ہوتا ہے تو ہم یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کس پر بیت رہی ہے یا کس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ذہین قاری اس سوال میں ایک جزوی سوال بھی شامل کر لیتا ہے کہ پھر اس سب کچھ ہونے کی اہمیت کیا ہے؟ درحقیقت وہ اس کردار کو اس مخصوص شکل میں پیش کرنے کی اہمیت معلوم کرنا چاہتا ہے اور پھر عمومی طور پر اس سب کچھ کی جسے ہم افسانہ کہتے ہیں، قدر معین کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یہاں "اہمیت" کی بات کی ہے۔ کیونکہ ادب اور غیر ادب میں اسی "اہمیت" کا فرق ہے ورنہ پلاٹ، کردار، داستان گوئی، واقعات، موضوع، مواد، الفاظ اور اسلوب بیان تو ہر افسانے میں شامل ہوتے ہی ہیں چاہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔

یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ کردار نگاری کا ذکر کرتے ہوئے قدر کی بات کہاں سے آگئی؟ درحقیقت مجھے اس قدر کی بات سے یہ سہولت حاصل ہے کہ میں بغیر کسی مزید بحث کے یہ فرق بتانے کے قابل ہو جاتا ہوں کہ سڑک پر چلتے پھرتے افراد اور افسانوی کرداروں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے بحث ادبی افسانے میں کردار کی نوعیت اور قدر پر ہو جاتی ہے اور کردار سے مراد افسانوی کردار ہو جاتی ہے۔ جب ہم افسانوی کردار کی بات کرتے ہیں تو بعض نقاد فوراً اسے حقیقت کے مقابلے میں "خیالی" سمجھ لیتے ہیں یا الف لیلوی قرار دے دیتے ہیں۔ اس وقت میرا مطلب ان کرداروں سے ہے جو افسانے یا ناول میں پیش کئے جاتے ہیں اور جو روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر نظر آنے والے کرداروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ افسانہ نگار کا مقصد کردار کی چھپی ہوئی زندگی نمایاں کرنا ہے۔ انسانی کردار کا یہ خاصہ ہے کہ وہ افسانے میں ہو یا زندگی میں، قدم قدم پر اس کی یہی کوشش اس کی زندگی کی ساخت کو معین کرتی ہے۔ مسرت اور غم انسان کی چھپی ہوئی زندگی سے وابستہ ہے۔ افسانہ نگار کا کام اس چھپی ہوئی زندگی کو پیش کرنا ہے۔ چھپی ہوئی زندگی سے مسرت کی وابستگی پر بھی بحث کی گنجائش ہے۔ فلسفے کے خیال میں خوشی یا تو حیوانی سطح پر یا عرفانی سطح پر ممکن ہے۔ لیکن اگر ہم اس خیال کو تسلیم کر کے کردار کو تخلیق کریں گے تو ماسوائے سپاٹ کردار نگاری کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا (حالانکہ فلسفے کے کردار سپاٹ نہیں ہیں) لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم یہ انکشاف کرنے بیٹھے ہیں کہ اچھے آدمی کے دل میں کتنی برائی ہوتی ہے یا برے آدمی میں بھی کتنی اچھائی ہوتی ہے اور پھر افسانے میں چھپی ہوئی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں افسانے میں اخلاق کے بجائے نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے۔

بہرصورت افسانے میں کردار کی چھپی ہوئی زندگی ہی اہم ہے۔ اس کی عیاں زندگی کم دلچسپ اور کم اہم ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی کردار کی ایک حرکت یا ادا اس کی چھپی ہوئی زندگی کو عیاں کر دے جو کہ اس کی روزمرہ کی حرکات و سکنات یا اس کی زندگی کے کارہائے نمایاں اور واقعات پیش نہ کر سکیں۔ اس کی روزمرہ کی زندگی میں اس کی معمولی حرکت کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھوں سے واردات قتل کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کئی افراد اور سماج متاثر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار اس واقعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کرے گا۔ اگر یہ واردات اس کی چھپی ہوئی زندگی سے ہمیں آگاہ نہیں کرتی۔ ایسے سنسنی خیز واقعات سے وابستہ کردار، رومانوی ناولوں کے ہی کردار بن سکتے ہیں ادب کے نہیں۔ اس لئے وہ قارئین جن کی نگاہ ظاہر پر ہے باطن پر نہیں یہ سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں کہ حقیقی کردار اور افسانوی کردار میں فرق ہے۔ اس قسم کے حقیقت پرست قارئین کا یہ مطالبہ عام طور پر ناجائز ہوتا ہے کہ فلاں کردار غیر فطری ہے۔ ویسے بھی اگر آپ افسانے میں بعینہ اسی کردار کو دیکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ آپ نے اسے حقیقی زندگی میں دیکھا ہے۔ ان کے ان احساسات و جذبات کی عکاسی چاہتے ہیں جن سے آپ کو روزمرہ واسطہ پڑتا ہے تو بھی آپ افسانہ پڑھنے کے بجائے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالیں اور مشاہدہ کریں۔ احساسات و جذبات نئے یا اچھوتے نہیں ہوتے بلکہ ایک نئے انداز میں ان کی قدر و اہمیت معین کرنا ہی افسانہ نگار کا کام ہے۔

افسانہ نگار کا یہ فریضہ ہے کہ جس کردار کو آپ برسوں سے جانتے ہیں جس کی زندگی کے حالات اور واقعات سے آپ واقف ہیں اس کے بارے میں ایسی بصیرت عطا کرے جو اس کی زندگی کا اصلی جوہر ہے۔ لیکن جو کسی نفسیاتی یا خارجی وجہ سے عیاں نہیں ہوتا جسے آپ حقیقی سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کی نظروں کے سامنے روزمرہ آتا رہتا ہے، درحقیقت مصنوعی اور غیر حقیقی ہے۔ اس کی حقیقت محض اتنی ہے کہ آدمی فطری حالات میں زندہ نہیں رہتا بلکہ سماجی بندھنوں میں گرفتار رہتا ہے۔ اس لئے جب قاری کسی افسانہ نگار کے کردار کو خیالی اور غیر فطری قرار دیتا ہے تو اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

(۱) کہ افسانہ نگار یقین آمیز طریقے سے کردار کی حقیقی زندگی کو عیاں نہیں کر سکا۔

(۲) کہ قاری کی بصیرت اتنی کمزور ہے کہ جسے وہ حقیقی سمجھتا ہے اسے وہ غیر حقیقی سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔

ادب میں تو اپنی رضا سے غیر یقینی کیفیت کو تیاگنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

لہٰذا افسانوی کردار کے بارے میں نقّاد اور قاری ہمیشہ اس بحث کو جاری رکھیں گے کہ کیا حقیقی ہے؟ جسے افسانہ نگار حقیقی سمجھتا ہے وہ قاری کے نزدیک غیر فطری ہے اور جسے قاری حقیقی سمجھتا ہے وہ افسانہ نگار کے لئے سطحی ہے۔ ویسے بھی بے چارے ادیب سے ہر قسم کے مطالبے کئے جاتے ہیں۔ کچھ مطالبے تو اب ادیب کو اپنے پڑھنے والوں سے بھی کرنے چاہئیں۔ موسیقی، رقص اور مصوری سے لطف اندوز ہونے کے لئے کچھ باتوں کا علم ضروری ہے۔ لیکن ادب سے محظوظ ہونے کے لئے صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواندہ مگر غیر تربیت یافتہ پڑھنے والوں کی تسلّی کے لئے افسانہ نگار کبھی بھی کوئی کردار مکمل پیش نہیں کر سکتا۔ کردار نگاری کو کامیاب بنانے کے لئے افسانہ نگار کچھ تو قاری کے تصوّرِ حقیقت کو قبول کرے گا تاکہ وہ افسانے کو پڑھ سکے اور کچھ اپنا تصوّر پیش کرے تاکہ کردار میں بصیرت ملے۔ اس بات میں خطرہ یہ ہے کہ کردار مسخ نہ ہو جائے اور مسخ شدہ کردار در حقیقت نامکمل ہے اور نامکمل کردار زندگی اور افسانہ دونوں کے نقطۂ نظر سے غیر حقیقی ہوتے ہیں۔

سومرسٹ مام نے لکھا ہے:۔

"ادیب اصل کی نقل نہیں کرتا۔ وہ اس سے جو لینا چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ کچھ خصوصیات ہیں جنہوں نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔ ذہن کا موڑ ہے جس نے اس کے تخیّل کو متحرک کیا ہے افسانہ نگار ان سے کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ اس سے اُسے کوئی سروکار نہیں کہ کردار اصل سے صحیح مماثلت رکھتا ہے یا نہیں، وہ صرف اپنے مقصد کو بآسانی پورا کرنے کے لئے امکانی یگانگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔"

اس مقام پر ایلیبی کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں:۔

"ہر انسان کے دو پہلو ہوتے ہیں جو تاریخ اور افسانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ وہ سب کچھ جس کا کہ آدمی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے یعنی اس کے اعمال اور اس کا روحانی وجود جو کہ اس کے اعمال سے اخذ کیا جا سکتا ہے، تواریخ کے شعبے میں شامل ہے۔ لیکن اس کا رومانی پہلو خاص جذبات کا حامل ہے یعنی خواب، شدّتِ غم اور خود کلامی جن کا بیان شرم کے باعث نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت کے اس پہلو کو پیش کرنا ناول نگار کے اہم ترین فرائض میں سے ایک ہے۔ تواریخ نگار قلمبند کرتا ہے جب کہ ناول نگار کے لئے تخلیق کرنا ضروری ہے۔"

افسانوی کردار روزمرہ کی زندگی سے مکمل اور مجموعی طور پر مماثلت نہیں رکھتا بلکہ وہ اُن سے محض مناسبت رکھتا ہے۔ جس طرح عام زندگی میں افراد کے باہمی رشتے اور تصادم ہوتے ہیں اسی طرح افسانے اور ناول میں کرداروں کی اپنی دنیا اور اپنی زندگی جنم لے چکی ہوتی ہے۔ اُن کا باہمی رشتہ اور تصادم، پلاٹ، ماحول اور دوسرے کرداروں کی باہمی آمیزش اور آویزش سے متعین ہوتا ہے اس لئے روزمرہ کی زندگی میں چلتے پھرتے افراد کی کسوٹی پر افسانوی کردار کی حقیقت کو پرکھنا صحیح نہیں۔ فارسٹر نے ہوموسیپینز اور ہوموفکٹس کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہوموفکٹس یعنی افسانوی کردار پیدا ہوتا ہے وہ مر سکتا ہے، وہ کچھ خوراک اور نیند چاہتا ہے، وہ انسانی رشتوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اس کے بارے میں اپنے کسی بھی دوسرے فرد سے زیادہ جان سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے خالق اور راوی ایک ہی ہیں۔

فارسٹر نے ایک اہم حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے کہ افسانہ ایک فن پارہ ہے جس کے اصول روزمرہ کی زندگی کی مانند نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر کردار اصلی ہے تو اس کو پرکھنے کا معیار روزمرہ کی زندگی نہیں ہو سکتا بلکہ کہانی کی وہ دُنیا ہے جس میں کہ وہ پیدا ہوا ہے اور نشو و نما پا رہا ہے۔ افسانے میں کردار نگاری کی کامیابی افسانے کے ماحول کی مناسبت سے معین کی جا سکتی ہے جو کہ اُس روزمرہ کی زندگی سے مختلف ہے جو ہم عام طور پر بسر کرتے ہیں۔ اس لئے جب افسانے پہ بحث ہوتی ہے تو اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ افسانہ زندگی نہیں اور نہ ہی زندگی کا نعم البدل ہے بلکہ زندگی کی صداقت کی بنیاد پہ ایک نئی زندگی کی تخلیق ہے، ایک نئی دنیا کی تعمیر ہے جس کے اپنے بھی کچھ اصول ہیں جو کردار پہ اثر انداز ہوتے ہیں اور جن سے کرداروں کی زندگی معین ہوتی ہے اور ان اصولوں کی بنا پہ ہی کردار کی حقیقت کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ افسانوی کردار پہ روزمرہ کی زندگی کے اصول منطبق کر کے اُسے غیر فطری قرار دے دینا ظاہر کرتا ہے کہ قاری کو نہ تو زندگی سے آگہی ہے اور نہ فن سے آشنائی۔ ورنہ وہ اس کردار کی اصلیت کو جاننے میں غلطی نہ کرتا۔ زندگی کے کردار اور افسانے کے کردار میں فن کی ایک جھلی ہے جو دیوارِ چین نہیں۔ لیکن زندگی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اسے زندگی کی ریاست سے فن کی عملداری میں لے آتی ہے جس کے باعث کردار اس کا طرزِ زندگی

1. Ahmad Ali Khan
NEWS PAPER AGENT.
ROAD HYDERABAD-DN.

اور حقوق شہریت بدل جاتے ہیں جبکہ بہت سے بنیادی حقوق مشترک رہتے ہیں عام طور پر قاری ایک ریاست سے دوسری ریاست میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتا رہتا ہے جس کے باعث فن کے لئے ضابطے کے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کردار ہم سے مماثلت رکھتا ہو۔ لیکن اگر وہ مماثلت نہیں رکھتا تو اس بنا پر اُس کی شخصیت چھین نہیں جاتی ۔ افسانہ نگار کو اپنے تخلیق کردہ کردار کی مکمل زندگی کا شعور لازمی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کو بیان کرے۔ اگر افسانہ نگار اپنے کردار کی مکمل زندگی سے آگاہی کے بغیر کسی ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو وہ نہ صرف نامکمل ہوگا بلکہ اس کی اصلی زندگی کی نمائندگی بھی نہیں کر سکتا۔ کردار کی منقسم شخصیت کو بھی پیش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ ترگنیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کردار کا علم حاصل کرنے کے لئے اس کی سوانح حیات تیار کرتا تھا۔ ہر وہ عمل جو اس نے کیا ہے اور کہانی کے شروع ہونے تک اس کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے، جس طرح کہ پولیس کسی عادی مجرم کا ریکارڈ تیار کرتی ہے۔ اس لئے وہ افسانہ نگار جو اپنے کردار کا مکمل اور جامع شعور رکھتا ہے وہی اس کے اصلی خاصہ کو بیان کر سکتا ہے جو عام طور پر ہماری نظر سے پوشیدہ رہتا ہے، کیونکہ وہ ہمارے اُس مشاہدے سے باہر ہے جو آنکھ نے کیا ہے اس لئے غیر حقیقی ہے۔ افسانہ نگار کی آنکھ میں وہ آنکھ تو شامل ہے ہی جو ہم سب کے پاس ہے لیکن اس کی بصارت میں تخیل کی پرواز اور وجدان کی گہرائی بھی ہے۔ فطری کردار پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا کھاتا ہے سوتا ہے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اور پیش کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اعمال کسی حد تک اور کبھی کبھی اس کی اصلی زندگی کو عیاں کر سکتے ہیں۔

فارسٹر کے خیال میں صرف پیچیدہ کردار ہی کچھ عرصے کے لئے المناک طور پر چل سکتے ہیں اور ہمارے احساسات کو تحریک دے سکتے ہیں کیونکہ ایسے کردار کی یہ کسوٹی ہے کہ وہ ہمیں یقین آمیز طریقے سے متحیر کرنے کی قوت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ کبھی بھی متحیر نہیں کرتا تو وہ سپاٹ ہے۔ اگر وہ یقین آمیز نہیں تو بھی وہ سپاٹ ہے جو پیچیدہ بننے کا فریب دے رہا ہے۔

کردار نگاری کی یہ بحث کہ کردار فطری ہے یا اصلی، حقیقی ہے یا خیالی مثبت ہے یا منفی، سپاٹ ہے یا مرکب وغیرہ اس پر منحصر ہے کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ کردار نگاری کے لئے نقطۂ نظر بڑی اہم چیز ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار اس کردار کو کیسے پیش کرتا ہے۔ فن کے علاوہ اس کا انحصار بھی نقطۂ نظر پر ہے۔ افسانہ نگار کردار کو بے لاگ خارجیت سے اس کی زندگی میں بصیرت حاصل کر کے یا اپنے آپ کو اس میں شامل کر کے پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری کے اس پہلو پر غور کرنے کے لئے کردار کی زندگی سے آگہی ضروری ہے۔ کردار کا سماجی پس منظر کیا ہے؟ کردار کی نفسیاتی ساخت کیا ہے؟ اس کردار سے متعلق اصلی اخلاق کیا ہے؟ افسانہ نگار کی اپنی شخصیت کیا ہے؟ کردار نگاری کے سلسلے میں یہ سوالات کافی اہم ہیں۔

افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ کردار کے سماجی پس منظر کا شعور حاصل کرے۔ سماجی پس منظر ایک وسیع بات ہے جس میں ہم کردار کی پرورش، تربیت، خاندانی حالات، ماحول اور معاشرتی بنیادوں کو جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے افسانے میں ان میں سے کسی چیز کا ذکر نہ آئے اور عام طور پر ان کا بیان کرنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ لیکن کردار سے ملتے ہی ہم اس کے سماجی پس منظر سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سماجی پس منظر کی بات میں کسی ترقی پسند نظریے کے تحت نہیں کر رہا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کردار کی ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر وہ استوار کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی کردار خلا سے پیدا نہیں ہوتا اور اسے ہوا میں معلق پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی پس منظر کو سماجی حقیقت نگاری سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری بات کردار کی نفسیاتی ساخت ہے۔ اس ساخت میں اس کی عمیق نفسیات کو گہرا دخل ہے۔ یعنی وہ زندگی نہیں جو وہ بسر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ حرکات و سکنات نہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں بلکہ اُس کی وہ پوشیدہ زندگی جس سے وہ غم اور مسرت اخذ کرتا ہے۔ جو عیاں ہونے کے لئے ہماری نظر سے پرے چشم بینا کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم افسانے میں چہرے نہیں شخصیت چاہتے ہیں۔ ہمیں کردار کی کیس ہسٹری نہیں چاہیئے ورنہ اس کے علاج کے لئے مشورے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کی اصلی پوشیدہ زندگی میں بصارت لازمی ہے جس میں ایک فرد شخصیت بنتا ہے اور ایک شخصیت افسانوی کردار بنتی ہے۔ اس لئے اسے نفسیاتی حقیقت نگاری کا نعم البدل نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔

تیسری بات اس کردار کی قدر اور اہمیت ہے۔ اس قدر یا اہمیت کا تعین کسی مخصوص رومانی اخلاقی اصول کے مطابق نہیں بلکہ اصلی اخلاق سے کرنا چاہیئے جو اخلاق اس کے کردار کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے یہ بحث کہ کردار مثبت ہے یا منفی بے سود ہے۔ جسے ہم منفی کردار کہتے ہیں اگر اس میں اصلی اخلاق کا جوہر

موجود ہے تو وہ چھوڑ گیرا اور ہنری ہزنی ہونے کے باوجود بہشت کر رہا ہے۔

آخری بات افسانہ نگار کی اپنی شخصیت کی ہے جو سماجی پس منظر، عمیق نفسیات اور اصلی اخلاق میں ایک رابطہ اور وحدت پیدا کرتی ہے۔ اس میں افسانہ نگار کا فن اور اس کا مزاج شامل ہے۔ ان تمام چیزوں کی امتزاج کے بغیر کسی اعلیٰ افسانے کی تخلیق ممکن نہیں خارجیت کے فریب میں ہمیں افسانہ نگار کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ ہنری ہزنے درست کہا ہے کہ دوسرے لوگوں کے بارے میں ہمارا علم اپنے بارے میں ہمارے علم سے اخذ کیا ہوا ہوتا ہے۔ فلابیر نے کیا خوب کہا ہے کہ میں ہر وقت دوسرے لوگوں کے جسم میں شامل ہوں جو مجھ سے مختلف ہیں۔ بارہا افسانہ نگار یا ناول نگار اپنی شخصیت کے مختلف اجزا مختلف کرداروں میں شامل کر دیتا ہے۔ اس لئے کسی ایک کردار میں افسانہ نگار کی شخصیت تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ فلابیر حقیقی شخصیت ہے اور اس کا تخلیق کردہ کردار "ایما" (مادام بوواری) افسانوی کردار ہے۔ لیکن فلابیر نے لکھا ہے کہ "میں ایما ہوں"۔ اور فلابیر نے اپنے جسم میں زہر کے اثرات محسوس کئے۔ اس کے باوجود فلابیر نے اس کی خودکشی کا واقعہ حقیقی زندگی سے لیا تھا۔ ترگنیف کا خیال تھا کہ وہ کردار کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنے تخیل کو کسی زندہ آدمی پر مرکوز نہ کر دے۔ بغیر کسی خاص آدمی کے وہ اپنی تخلیق کو زندگی اور ادائے خاص نہیں دے سکتا تھا۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ کردار کی تشکیل میں ادیب کی ذاتی شخصیت اور فن کارانہ شخصیت شامل رہتی ہے۔ بہت سے آدمی ایک کردار میں شامل ہو جاتے ہیں جسے امتزاج کہتے ہیں۔ ہنری جیمز نے لکھا ہے "ذاتی حالات کی کسی تصویر کا مواد زیادہ تر ڈیزائنر کے اپنے ذہن کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے۔" اور یہی بات کردار نگاری میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔

ایک حقیقی کردار کا افسانوی کردار بننا اور ایک افسانوی کردار کا حقیقی شکل اختیار کر لینا ہی کردار نگاری کے فن کا کرشمہ ہے۔ زندگی کے حقیقی کرداروں کو فن کے افسانوی کرداروں میں ڈھونڈنے کی کوشش میں ہم زندگی اور فن دونوں کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر حقیقی کردار کی روح کو افسانوی پیکر عطا کر کے اُسے پھر حقیقی کردار بنا دینے میں ہم زندگی اور فن دونوں حاصل کر لیتے ہیں۔

ہماری تازہ کتب

دیہاتی صنعتیں

یہ انگریزی پمفلٹ کا ترجمہ ہے ۔ اس میں دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے پروگرام کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ پنج سالہ پلان کے تحت اس سلسلے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

قیمت ۴ر ڈاک خرچ ۲ر

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

شعر و سخن

ابو محمد سحر

عشق کی سعیِ بدانجام سے ڈر بھی نہ سکے — ہم تری چشمِ مروت سے اُتر بھی نہ سکے

تو نہ ملتا مگر اللہ رے محرومیِ شوق — جینے والے تری امید میں مر بھی نہ سکے

برق سے کھیلنے طوفان پہ ہنسنے والے — ایسے ڈوبے ترے غم میں کہ اُبھر بھی نہ سکے

حسن خود حسنِ مجسم سے پشیمان اُٹھا — آئینہ لے کے وہ بیٹھے تو سنور بھی نہ سکے

تشنہ لب بیٹھے ہیں میخانہ ہستی میں سحر

دل وہ ٹوٹا ہوا پیمانہ کہ بھر بھی نہ سکے

پھولن سنگھ ہنر

جس گھر میں کبھی عیش کی بہتات ہوئی ہے — برسوں ہی وہاں بارشِ آفات ہوئی ہے

انداز یہ کہتا ہے ترے لطف و کرم کا — پہلے بھی کبھی تجھ سے ملاقات ہوئی ہے

ہر عہد میں گھٹتی رہی تقدیس حرم کی — ہر دور میں تکریم خرابات ہوئی ہے

محتاجِ ملاقات رہا ہے وہ ہمیشہ — اک بار تری جس سے ملاقات ہوئی ہے

مطلب کی تو ہوتی ہی نہیں تم سے کوئی بات — یہ بات ہوئی ہے کبھی وہ بات ہوئی ہے

سنتے ہیں ہنر آج گئے اُس کی گلی میں

حضرت کی وہاں خوب مدارات ہوئی ہے

زیب بریلوی

غم کے شعلوں سے پُر نور ہوتی گئی — منزلِ آرزو طور ہوتی گئی

جو کہانی چھپائی گئی ہم نشیں — وہ زمانے میں مشہور ہوتی گئی

جتنی ملتی گئیں زیب آسانیاں — عاشقی اتنی مجبور ہوتی گئی

کاش وہ نظرِ کرم سے میری جانب دیکھتے — کاش اس مضراب سے بجتا ربابِ زندگی

ساری دنیا جس کو پی کر آج دیوانی ہے — کس قدر پُر کیف ہے جامِ شرابِ زندگی

دورانِ اسیری نظروں میں ہر وقت نشیمن رہتا تھا — جب چھوٹ کے آئے گلشن میں ہم اپنا ٹھکانا بھول گئے

ہم کیفِ نظر کے عالم میں سرشارِ جمالِ مستی تھے — جب سامنے جام آیا ہم جام اُٹھانا بھول گئے

پریم وار برٹنی

ابھی واقف نہیں اس سے جو ہے وہ جانِ غزل — اس کے جلووں سے منور ہے شبستانِ غزل

شاعری سے ہے بہار اور ہے تعلق جب تک — اسی انداز سے مہکے گا خیابانِ غزل

زلف، مے، پھول، شفق، جام، ستارہ، نگہت — ایک سے ایک دل آویز ہے عنوانِ غزل

اتنا گستاخ نہ ہو دستِ جنوں دیکھ تو لے — پھول کی رگ سے بھی نازک ہے گریبانِ غزل

زندگی تھک گئی حالات سے لڑتے لڑتے — حوصلہ پھر بھی محبت میں نہ ہارا میں نے

منزلِ زیست نہ مل سکی تیرے بغیر — ہر قدم پر تجھے رک رک کے پکارا میں نے

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی

مکتوبِ اقبالؒ

بنام

مولوی انشاء اللہ خاں

مولوی انشاء اللہ خاں لاہور کے مشہور ہفتہ وار اخبار وطن (مرحوم) کے ایڈیٹر تھے۔ مندرجہ ذیل "مکتوبِ اقبال" ان ہی کے نام ہے جو وطن کے فائل ۱۹۰۵ء میں ملا ہے۔

"شیخ محمد اقبال جو بعد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے چار دانگِ عالم میں مشہور ہوئے جب بغرض تعلیم علوم و فنون یکم ستمبر ۱۹۰۵ء براہ دہلی و بمبئی ولایت روانہ ہوئے تو میر نیرنگ انبالوی اور شیخ محمد اکرام صاحب نائب ایڈیٹر رسالہ مخزن لاہور دہلی تک اُن کے ساتھ رہے۔ تینوں بزرگ ۲ ستمبر کی صبح میں ۶ بجے میل سے دہلی پہنچے وہاں خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی، منشی نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ دہلی، منشی نور الدین ڈرائنگ ماسٹر نارمل اسکول دہلی وغیرہ موجود تھے۔ پہلے تو اسٹیشن سے یہ جماعت نذر محمد صاحب کے دولت کدے پر پہنچی وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سب لوگ درگاہِ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر درگاہ تک پہنچے۔ اوّل اقبال نے عالمِ تنہائی میں خواجہ علیہ الرحمۃ کے مزارِ مبارک کے سرہانے بیٹھ کر اپنی مشہور نظم "التجائے مسافر" پڑھی اور اُن کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں بیٹھے رہے بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے "التجائے مسافر" کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزارِ اقدس کی طرف منہ کر کے دوبارہ درد انگیز اور دل نشیں لہجے میں پڑھا۔ درگاہ کی زیارت سے فارغ ہو کر وہ خشک روٹی جو حضرتِ محبوبِ الٰہی کے توشہ خانے کی جانب سے فقراء اور درویشوں کو دی جاتی ہے ان سب گریجویٹ درویشوں نے خوشی خوشی مزے سے کھائی۔ پھر سماع کا دور چلتا رہا۔ ولایت نامی قوال نے خوب رنگ جمایا۔ اس نوجوان قوال کو بھی حضرت محبوب الٰہی سے خاص واسطہ تھا کیوں کہ وہ حضرت سمائی کی اولاد میں تھا جو حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کے خاص اور پسندیدہ قوال تھے۔ جب درگاہ سے یہ جماعت رخصت اور روانہ ہوئی تو واپسی میں چلتے چلتے مرزا غالب کے مزار پر بھی گذر ہو گیا۔ مرزا غالب کے مزار کا آدھا چبوترہ مٹی میں پوشیدہ تھا۔ خواجہ سید حسن نظامی اُسی رُخ ایک کچی دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ چھوٹی دیوار مزارِ غالب کے بائیں پہلو میں کھڑی تھی۔ نیرنگ اور اقبال پر اس سین کا اتنا اثر تھا کہ افسردگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اکرام، نذر محمد، نور الدین کی حالت بھی ایسی ہی تھی اور مزارِ غالب کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ ولایت قوال نے لوگوں کی اجازت سے غالب کی مشہور غزل ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

گانا شروع کیا۔ جب سُریلی اور مہین آواز میں غالب کا یہ شعر

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

گایا تو سب پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اقبالؒ جھوم جھوم کر شعر کی تکرار کراتے تھے۔ اس پُر عبرت و پُر حسرت سین کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور جب سب لوگ چلنے کو اُٹھے تو اقبال نے جوشِ محبت میں غالب کے مزار کو بوسہ دیا اور سب لوگ شہر کو روانہ ہوئے۔ شب مولوی نذر محمد کے مکان پر بسر ہوئی اور ۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح میں ۹ بجے بمبئی میل سے اقبال بمبئی ہوتے ہوئے ولایت

روانہ ہوئے۔ ۴ ستمبر کو بمبئی پہنچے   ایک انگلش ہوٹل میں قیام کیا۔ جہاں ۶ ستمبر کو دو بجے وکٹوریہ ڈاک پر پہنچے۔ طبی معائنہ کے بعد اپنے جہاز "نیرا" پر سوار ہوئے اللہ کی قدرت تین بجے جہاز نے حرکت کی۔

(محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی)

نامۂ اقبال از عدن

(وطن لاہور نمبر ۳۹ جلد ۵ - مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

مخدوم و مکرم مولوی صاحب - السلام علیکم -

آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں پہونچا جس کو دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام لیا۔ بعد ازاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ - حضرت محبوب الٰہیؒ کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مرزا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران گوشہ میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے۔ جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا۔ اس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر ع دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی - کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔ بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنکھیں پرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے دل کو تڑپا جاتا ہے

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھا دارا شکوہ کے مزار کی تاریکی اور خاموشی میں دل کے کانوں سے ہوا الموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

۱۳ ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۳ کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلباء کے لئے جو ولایت جا رہے ہوں، نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب ہے غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔ صرف تین روپیہ یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ "محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے۔" میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی۔ اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو۔ خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پیے ہوئے بھی تھا، بولا

ع شرابِ شوق کے پینے سے سبھی غم دور ہو جائے

ف پارسی بڈھے نے اس مصرع میں شرابِ شوق اور غم کی مٹی پلید کی ہے (وطن)

میں نے سن کے کہا۔ واہ رے بڈھے۔ خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوہ نورس پیدا ہو کر بمبئی کمبخت باڑی میں بکتا پھرے۔

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو۔ بولا جاپان سے آیا ہوں۔ اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا جاپان میں تم کیا کام کرتے تھے۔ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا۔ لیکن جاپانی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سن کر دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ ایسی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں شاباش افیمیو، شاباش نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اسی سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔ مولوی صاحب! معاف کیجئے گا میں بے اختیار ہوں۔ لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں۔ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے۔

ایک شب میں کھانے کے کمرہ میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یوروپین ہیں۔ فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اوٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یوروپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر بمجبوری میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔

یہ نوجوان ترک ینگ ترکی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا میں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں ؎

ظلم و جورِ تو سفو جہ بر ملّت محو ایلیدہ
آدمیت ملک و ملّت دشمنی عبدالحمید

(یعنی ذ بیرِ ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے)

اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اوٹھانا چاہیئے۔ کیوں کہ جس طریق سے رعایاء انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کئے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہو جانا یہ کچھ خاک انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول کی گراؤنڈ میں چند مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور سکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس سکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی؟ کیا فنڈ نہیں ہے۔ یا اور کوئی وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لئے نہیں آتے اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی ہم سردست یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا۔ کیوں کہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجیب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سربفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے تجاوز نہ ہو

ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمدورفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کر دے، فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی نوے ہزار کے قریب ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ۔ مگر میں اس قوم کے لئے کسی اچھی فیوچر کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشہ میں ہے اور اسی پر اوس کے حُسن کا دارومدار ہے۔ میں نے سکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چُستی کی مورتیں تھیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان کی خوب صورت آنکھیں ۸۰ فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ اُن کے قومی ریفارمر اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا با خبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے۔ بولا "مجور کا لوں کے لئے لڑتا ہے"۔ ہوٹل کے نیچے مسلمان دوکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز اُن سے پوچھا تم اُردو پڑھ سکتے ہو کہنے لگے نہیں۔ سمجھ سکتے ہیں پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا کہ جب مولوی تمہارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے۔ مُسکرا کر بولا "اُردو۔" یہاں پر ہر کوئی اُردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (دہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان میں نہیں گیا مگر اُردو خاصی بولتا تھا۔

میں بمبئی یعنی بابِ لنڈن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لنڈن کیسا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۷ ستمبر کو ۲ بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ) پر پہنچے۔ جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر یہاں کی دُنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈرو۔ خدانے چاہا تو، ہم تجھے صحیح و سلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے۔ خیر ڈاکٹری معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہُوا۔ لالہ صفپت رام وکیل لاہور اور اُن کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اوس روز حُسنِ اتفاق سے بمبئی میں تھے۔ میں ان کا نہایت سپاس گذار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لئے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اور لوگ بھی اس جہاز پر سوار ہوئے اور اُن کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا۔ کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے۔ یہاں تک کہ موجیں اِدھر اُدھر سے آ آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں۔ فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے۔ ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں معروف ہوتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفاء کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں۔ اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے۔ ایک روز ایک افسر تختۂ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا ادھر سے گذر ہُوا۔ اتفاق سے یا غالباً ارادتاً یہ عورت اوس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گذری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اُتار سکتے۔

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ میز بھی فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے۔ مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک بڑی دقت ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاز کے قریباً سب مسافر فرانسیسی ہیں۔ انگریزی کوئی نہیں بولتا جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات ان کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسائش ہے تاہم میری رائے یہی ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرنا چاہیئے۔ اُن کے مسافر سب کے سب انگریزی داں ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جہاز پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ ہمارے اس جہاز میں ۶۰ مسافروں سے زیادہ نہیں ہیں۔

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختۂ جہاز پر کُرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے۔ کوئی باتیں کرتا ہے

کوئی پھرتا ہے۔ کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر تختۂ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز "مرضِ بحری" میں مبتلا ہو گئے۔ مگر الحمدللہ کہ میں محفوظ رہا۔ مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا کیا تم نے کبھی پہلے بھی بحری سفر کیا ہے؟ جب میں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ حیران ہوئے اور کہا کہ تم بڑے مضبوط آدمی ہو۔ بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی۔ خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اتنی اونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختۂ جہاز پر آ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سُلا دیا۔ مگر دفعتاً ایک خوفناک موج نے اُچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں بچے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے۔ رستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یک رنگیت سے اُکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اُٹھتی ہیں۔ ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دل فریب ہے، اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشاکش کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے۔ آسمان اوپر تلے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ آنکھیں اس نظارے سے کسی قدر مانوس ہو گئی ہیں اور نیز جہاز والوں کے چہروں کا اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات ہے اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا۔ یورپین لڑکے لڑکیاں تختۂ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور یہ محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز میں ہیں۔

ہمارا ہم سفر ایک پادری ہے جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اور اب اٹلی کو جا رہا ہے۔ گذشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تختۂ جہاز کی ایک طرف ایک کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو سگرٹ یا سگار سُلگانا ہو وہ اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اُٹھا لیں۔

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالےٰ کی قوتِ نامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں ان سے قطعِ نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارع اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔

بابی انت و امی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اُٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمۂ آب میں سے اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پُرتاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ سکونِ قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی اُلجھن اور بے تابی اچھی نہیں۔ طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ

ع نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے میں تو ان کو قابلِ معذوری سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھئے ۔۔۔ تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو ۱۰ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں اور وہ پادری صاحب جو ٹالسٹائی کے نام سے ناواقف معلوم ہوتے تھے، اس وقت جہاز کی اوپر کی چھت پر کھڑے اسی نظارے کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں مگر بہت شکستہ اور مجھ کو جب بلاتے ہیں ٹالسٹائی کے نام سے۔ کل مجھ سے پوچھتے تھے تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر کھاتی ہے تب جا کے کہیں ایک ٹالسٹائی

پیدا ہوتا ہے۔

کونٹ کے ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات ان سے ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کاش یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا۔ عمر خیام کے بڑے مداح ہیں۔ مگر میں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس یہی دل چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں ؂

اللہ رے خاک پاک مدینہ کی آبرو

خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی! باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا۔ لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ آہ! اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی سیاہ خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دُنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

از عدن مورخہ ۳ ستمبر — راقم محمد اقبال

بانہال سُرنگ

نئی بانہال سرنگ کی ایک گزرگاہ مکمل ہو گئی ہے۔ دونوں طرف سے پہاڑ کو اندر ہی اندر سے کاٹا جا رہا تھا۔ دونوں سروں کے درمیان آخری چٹان کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا ہے اور راستہ مکمل ہو گیا ہے۔ نئی سرنگ ۱½ میل سے زائد لمبی ہوگی اور ۱۹۵۵ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گی۔ اس کی دو گزرگاہیں ہوں گی دونوں ۱۶½ فٹ چوڑی اور ۱۶ فٹ بلند ہوں گی۔ دونوں گزرگاہوں میں یک طرفہ ٹریفک ہوگا۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سرنگ کی تعمیر کا کام بہت زیادہ تیزی سے ہوا ہے اور یہ سرنگ دنیا کی نصف درجن بہترین اور بڑی سرنگوں میں سے ہوگی۔ سرنگ مکمل ہو جانے پر یہ دنیا کی جدید ترین سرنگ ہوگی۔ اس میں ٹریفک پر کنٹرول، گاڑیوں کی گنتی وغیرہ سب کام آٹومیٹک ہوگا۔ نئی گزرگاہ کو اس سال کے آخر تک ٹریفک کے لئے کھول دیا جائے گا۔ اس سے جموں و سری نگر کے درمیان ۸ میل کا دشوار گزار فاصلہ کم ہو جائے گا۔ اس سرنگ میں سے دونوں طرف نارمل طور پر اڑھائی، اڑھائی سو موٹریں ایک گھنٹے میں گزر سکیں گی۔ سرنگ میں تازہ ہوا پہنچانے کے لئے لمبائی کے رُخ انتظام کیا جائے گا۔ ہوا کی رفتار ۔ افٹ فی سیکنڈ تک محدود ہوگی، کیوں کہ ہوائی رفتار اس سے زیادہ ہو تو پیدل چلنے والوں کو دقت کا سامنا ہوگا۔ تازہ ہوا سرنگ میں داخل کرنے کے لئے مشینری سرنگ کے داخلی دروازے کے گرد نصب کی جائے گی اور یہ گول دائروں کی شکل میں ہوگی۔ سرنگ کے اکثر حصوں میں اسّی اسّی فٹ کے فاصلے پر روشنی کا انتظام ہوگا تاہم دروازوں کے نزدیک دس دس فٹ کے فاصلے پر روشنی ہوگی۔ سرنگ میں چار چار سو فٹ کے فاصلے پر فائر سٹیشن ہوں گے جہاں پانی، آگ بجھانے والی کیمیائی اشیاء کے آلات۔ ریت کے بورے، ٹیلیفون اور خطرے کے سگنلوں کا انتظام ہوگا۔

کاربن مونو اکسائڈ گیس کو ماپنے والے آلات کا بھی انتظام ہوگا۔ تمام فائر سٹیشنوں، گیس ماپنے والے آلات، ٹریفک سگنلوں اور ہوا کا انتظام کرنے والی مشینری کا کنکشن کنٹرول روم سے ہوگا۔ گیس ماپنے والے آلات کا تعلق خطرے کی گھنٹیوں سے ہوگا۔ جو نہیں گیس بڑھ جائے گی خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں گی۔ الیکٹرک ٹریفک کاونٹر، ہوا کی رفتار اور رُخ کو ماپنے والے میٹر، سڑک کو کیچڑ سے صاف کرنے کے لئے ٹینک اور ریت کے گودام ہوں گے۔

ڈال ڈال کے پات

زندگی بے لطف ہو جائے اگر ․․․․․

بے قاعدگی نہ ہو

کنہیا لال کپور

ڈاکٹر، حکیم اور فلسفی کہتے ہیں کہ اگر زندگی میں باقاعدگی نہ ہو تو انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ خدا جانے ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ ڈاکٹر، حکیم اور فلسفی جو ٹھہرے! ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ اگر زندگی میں باقاعدگی آجائے تو زندگی، زندگی نہیں ہوتی یعنی زندگی کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی ہر صبح ایک مقررہ وقت پر اُٹھے۔ ہر روز ایک ہی سڑک پر سیر کرنے جائے۔ سیر سے واپس آکر غسل کرے۔ مقررہ وقت پر چائے پیئے۔ چائے میں نپی تُلی چینی ڈالے۔ شام کے پانچ بجے کلب میں پہنچ جائے۔ گپیں ہانکے، ٹینس یا برج کھیلے اور رات کے دس بجے بستر پر دراز ہو جائے۔ آدمی نہ ہوا ٹک ٹک کرنے والا کلاک یا کلاک کے پرزے بنانے والی مشین ہوا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

سچ پوچھئے تو زندگی کو پُر لطف بنانے کا راز علامہ کے اس شعر ہی میں مضمر ہے۔ دراصل جو مزہ بے قاعدگی میں ہے وہ باقاعدگی میں کہاں، مثال کے طور پر ہمیں ہر روز شیو بنانے کی عادت ہے۔ لیکن آج صبح بارش ہو رہی ہے اور دل شیو کرنے کو نہیں چاہ رہا تو بیجئے ہم شیو نہیں کریں گے۔ آخر کون سی آفت آجائے گی جو ایک دن شیو نہیں کیا۔ مزے سے بستر میں بیٹھیں گے۔ اخبار پڑھیں گے یا گرم گرم چائے پئیں گے۔ یہی ہوگا نا جب آئینے میں اپنی صورت دیکھیں گے تو چہرہ کچھ خیرا نوس سا دکھائی دے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں ہم اس چہرے کی اجنبیت سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس کے باوجود اگر وحشت محسوس ہوئی

عرفانِ عشق

حسرت موہانی

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا — حامل ہوں کس کے نغمۂ نَے کے پیام کا
متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس — دنیائے جاں میں شور ہے اس کے دوام کا
مخلوق اک نگاہِ کرم کی اُمیدوار — مستانہ کر رہی ہے مجھے بادۂ شیام کا
محبوب کی تلاش ہوئی رہبرِ عجب — برسانے سے جو قصد کیا نندگام کا
گوکل کی سرزمیں بھی عزیزِ جہاں بنی — کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا
برندا کا بن بھی رُوکشِ جنت بنا کہ تھا — پامالِ ناز انھیں کی بہارِ خرام کا

لبریز نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اک عشق خشک خام کے شوق تمام کا

(قومی آواز)

تو لاحول پڑھ کر آئینہ پٹک دیں گے لیکن شیو کرنے کے مخمصے میں نہیں پھنسیں گے۔ اور اگر موسم چار پانچ دن خراب رہا تو اور بھی اچھا ہے۔ داڑھی بڑھنے دیں گے۔ ممکن ہے بڑھی ہوئی داڑھی اتنی اچھی لگے کہ ہم داڑھی رکھ لیں اور یوں شیو کرنے کی زحمت سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔

روزانہ غسل کرنا بھی عادت ہے۔ لیکن جنوری کے مہینے میں جب پانی کے تصور سے روح لرزنے لگتی ہے یہ کیا ضرور ہے کہ ہم غسل خانے کا رُخ کریں۔ ہم تب تک انتظار کریں گے جب تک کپکپی چڑھانے والے جاڑے کا موسم نہیں آتا اور پھر نہایت اطمینان سے غسل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جسم سے کافی غلاظت اُترے گی۔ اس شخص کے حق میں دعا کریں گے جس نے صابن ایسی مفید چیز ایجاد کی اور غسل کرنے کے بعد محسوس کریں گے کہ عمل جسم کی صفائی کے لئے کتنا ضروری ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ روزانہ غسل کرنے میں وہ لطف کہاں جو ایک لمبے عرصے کے بعد غسل کرنے میں ہے ․․․․․․․․ (آواز دہلی)

موسیقی نمبر کے باب میں

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی:-

اُردو رسالوں میں "آج کل" ہر حیثیت سے ممتاز رہا ہے۔ اس کے خاص نمبر عموماً قابلِ قدر ہوتے ہیں اور اس سال کا "موسیقی نمبر" مجموعی حیثیت سے سب پر سبقت لے گیا۔ "آج کل" کا ادارہ اس شاندار کارگزاری پر مبارک باد کا اور شکریے کا مستحق ہے۔

میرے مخدوم اور مکرم،

۱۷- اگست کا خط ملا۔ میں نے اس شمارے کے مقالوں کو بہت دل چسپی سے پڑھا۔ موسیقی کی الف، بے سے بھی واقف نہیں ہوں لیکن موسیقی کم بخت ایسی چیز ہے کہ اس کے اثر سے کوئی نہیں بچا۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ مجھ پر بھی اس کا جادو کارگر ہوتا ہے۔ میری رائے مشکل ہی سے وزن رکھ سکتی ہے۔ مگر آپ کی فرمائش کو کیسے بجا نہ لاتا۔ یہ چند سطور جو اوپر لکھ آیا ہوں، حاضر ہیں۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

"آج کل" کا موسیقی نمبر فقط دیدہ زیب ہی نہیں دل چسپ اور مفید معلومات سے بریز ہے گویا موسیقی کی ایک مختصر مگر جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔

مکرمی تسلیم،

موسیقی نمبر کے متعلق میری ناچیز رائے حاضر ہے۔ اس نمبر کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

کاش لکھنؤ کے ماہرینِ موسیقی خصوصاً نواب وزیر مرزا صاحب قدر کے متعلق جو ماہرِ موسیقی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت اچھے شاعر تھے اس نمبر میں کچھ ہوتا۔

اُن کی ٹھمریاں خصوصاً ہولیاں صرف لکھنؤ ہی نہیں دُور دُور مشہور ہیں

پھول گیندوا نہ مارو مہراج
لگت کرِجوا میں چوٹ
ایسے برج کے کیا تھیں ہوا چارے دار
موپے رنگبی نہ ڈارو سیاں بار بار

اور نہ معلوم کیا کیا جواہر پارے ہیں۔

موسیقی میں ان کے شاگرد نواب صادق علی خاں تھے اور اُن کی شاگرد اُس زمانے کی تمام طوائفیں اور گویّے۔

جوشش ملسیانی

رسالہ 'آج کل' اردو کا موسیقی نمبر بابت ماہ اگست ۵۶ء نادر اور جدّت آمیز تحفہ ہے جو ادارے نے فنونِ لطیفہ کی خدمت کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ یہ خاص نمبر اپنے متنوع مضامین کی وجہ سے بہت دل کش، بہت جامع اور بہت قابلِ قدر ہے۔ اس میں زندہ و مرحوم سازندوں اور نوازندوں کی ۹۰ تصاویر بھی ہے۔ جن میں چار پانچ تصاویر رنگین بھی ہیں۔ مختلف ماہرانِ موسیقی نے بہ حیثیت مضمون نگار اس فن کے ہر ایک پہلو پر بحث کی ہے۔ یہاں تک کہ راگ کی تقطیع اور اقسام پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ مختلف قسم کے ساز بھی تصویروں کے ذریعے منظر نواز ہیں۔ اس فن کے بڑے بڑے مشاہیر اور ان کے کمالاتِ سازندگی و نوازندگی پر سیر حاصل تبصرے کیے گئے ہیں۔ ادارہ نے جس محنت اور جس دُور رس جستجو سے کام لے کر یہ خاص نمبر مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے وہ بہت کچھ داد اور تحسین کا مستحق ہے۔ یہ خاص نمبر بلاشبہ دیکھنے اور پڑھنے

کے قابل ہے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ طویل اور کامیاب محنت کے ذریعے ہندوستان بھر کے مشاہیر موسیقی اور ان کے کمالات کو زندۂ جاوید رکھنے کی کوشش کی گئی ہے

تلوک چند محروم

تمام عمر میں دیکھی سُنی نہ تھی ہم نے | جو "آج کل" نے دکھادی ہے شانِ موسیقی
ہزار نغمۂ خاموش گوشِ دل نے سُنے | ہے صفحہ صفحہ میں اس کے بیانِ موسیقی
نظر نواز تصاویر سے مزیّن ہے | ہر ایک نقش ہے شرحِ بیانِ موسیقی

ستائش اس کی کریں گے فقط آشنا محروم
جناب کب سے ہوئے نکتہ دانِ موسیقی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

جب سے رسالہ "آج کل" نکلنا شروع ہُوا ہے، میں اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک اونچے درجے کا رسالہ ہے۔ عرش ملسیانی صاحب کے زیرِ ادارت اس نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔ "آج کل" کے علاوہ ہندوستان میں کسی دوسرے رسالے نے ایسے نئے نئے دلچسپ سالانہ نمبر نہیں نکالے۔ "آج کل" کا موسیقی نمبر تو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے لئے "آج کل" کا ادارہ محبانِ اردو کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہے۔ میری دُعا ہے کہ "آج کل" روز افزوں ترقی کرتا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

موسیقی نمبر موصول ہُوا۔ دل کا سرور اور آنکھوں کا نُور بڑھ گیا ہے۔ آپ نے بڑی محنت کی ہے اور اسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اس موضوع سے متعلق اتنا سامان شاید ہی اردو میں کہیں یک جا ہو۔

مالک رام

"آج کل" کا موسیقی نمبر ملا۔ آپ کی محنت کی داد نہیں دے سکتا۔ کہاں کہاں سے مضمون جمع کئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب مضمون اردو میں نہیں لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن ترجمے میں بھی اصل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس ایک پرچے ہی سے ہندوستان کی موسیقی، اس کے مختلف مرکزوں، مشہور گانے والوں اور والیوں وغیرہ سے متعلق اتنی معلومات مل جاتی ہیں کہ انسان بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ ایسے کامیاب نمبر کی ترتیب و اشاعت کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

امتیاز علی عرشی

"آج کل" کا موسیقی نمبر ملا۔ دیکھ کر اور پھر پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ بعض مقالے (جن میں خود میرا مقالہ شامل نہیں) بہت ہی معلومات افزا ہیں۔ راگ اور راگنیوں کی تصاویر بھی بہت خوب ہیں۔ ہمارے یہاں بھی راگ مالا کا ایک بہت عمدہ مخطوطہ تھا۔ وہ آج کل دہلی ہی میں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ تصاویر بھی دیں گے، تو اس کی نشان دہی کر دیتا۔ بہرحال، یہ شمارہ ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ برابر ترقی کرتا رہے گا۔
مختلف اساتذہ کے موسیقی سے متعلق شعروں کے انتخاب کی بھی داد دیتا ہوں

معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف

"آج کل" کے ہر نمبر کو میں شوق اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں، اگرچہ فنِ موسیقی سے نابلد ہونے کی وجہ سے بعض مضامین میری فہم سے باہر تھے۔ پھر بھی قریب قریب کل مضامین پڑھے۔ میرے خیال میں اُردو میں اس موضوع پر اتنے معلومات یکجا نہیں مل سکتے اور آپ نے یہ نمبر نکال کر نہایت مفید کام انجام دیا ہے۔ اس کی حیثیت تو مستقل تصنیف کی ہے اُردو لٹریچر میں یہ نمبر یادگار رہے گا۔

سکندر علی وجد

میں نے "آج کل" کا موسیقی نمبر بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا ہے۔ آپ نے یہ دلکش گلدستہ شائع کرکے اُردو اور موسیقی دونوں کی صحیح خدمت انجام دی ہے۔ میں اس کارنامے پر آپ اور آپ کے ساتھیوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تصاویر اور مضامین کے سلسلے میں آپ کا حسنِ انتخاب لائقِ ستائش ہے تمام مضامین کی زبان نہایت فصیح اور رواں ہے اور اس کو میں آپ کا "تصرّف" سمجھتا ہوں۔ ان مضامین کے ترجمے اور تصحیح میں آپ لوگوں کو کتنی محنت اور دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی۔ اگر آپ اسی طرح جنوری ۱۹۵۶ء میں آرٹ نمبر یا رقص نمبر شائع کریں تو کتنا اچھا ہوگا۔ میں اس کارِ خیر میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کرنے کا وعدہ کرتا ہوں کیونکہ مجھے اس دنیا سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء

قاضی معراج دھولپوری

نکدانِ تاریخ
۷۶ ہجری ۱۳

ازمنشآتِ معراج دھولپوری

۷۶ ہجری ۱۳

مُعلومرتبت "موسیقی نمبر" سال نامہ "آج کل" دہلی

۵۶ عیسوی ۱۹

آویزۂ تاریخ و فن

۷۶ ہجری ۱۳

رفیع قدر ، مشہور خلایق

۵۶ عیسوی ۱۹

منطقۂ نو ، عرش حدیقہ - فرخندہ کمال بانغ

۱۳ ہجری ۲۰ ۱۳ بکرمی ۲۰

اُردو کا مقبولِ عوام ، محسنِ ہند ، مصوّر رسالہ

۷۶ ہجری ۱۳

(۱)

حسن آراء ماہ پیکر ، دیدہ زیب ، دل پذیر
خاطرِ معراج برجستہ یہی سال گفت

خوش بیان ، خوش لسان ، خوش نظام ، خوش بیاں
تحفۂ موسیقیٔ ہندوستاں شیریں کلام

۵۶ عیسوی ۱۹

(۲)

نشرِ عالم ہوگیا ہے "آج کل" کی معرفت
لکھ دو ہجری سال اے معراج ، بہر یادگار

صورتِ راز سراپا تھا ابھی تک جو نہاں
مستند آوازۂ موسیقیٔ ہندوستاں

۷۶ ہجری ۱۳

(۳)

درخیابانِ ادب آراستہ گلزارِ نو
مصرعِ تاریخِ ہجری ہاتفِ معراج گفت

عرش کردہ شوکتِ ہندوستاں را مستزاد
اے خوشا موسیقیٔ نازک زباں طوطی نہاں

۷۶ ہجری ۱۳

(۴)

"آج کل" کا سال نامہ دل پسند و دل فریب
مصرعِ سالِ مسیحی خامۂ معراج لکھ

حسن نہالِ طلعت ، سربلند و سرفراز
نو بہاراں ارمغانِ ہند موسیقی نواز

۵۶ عیسوی ۱۹

شمس کنول

سرگم کے سات سمندر ہیں اُن کو یک جا کرنے کے لئے "جتنے" بڑے ظرف کی ضرورت ہے اس کا تصور میں آنا بھی محال ہے۔ مگر آپ نے نہ صرف دریا کو کوزے میں بند کیا ہے بلکہ سات بحر کو ایک کتاب بنا دیا ہے۔ "آج کل" کا موسیقی نمبر دیکھنے کے بعد بس یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نمبر نہیں ہے بلکہ ایک قیمتی اور مفید کتاب ہے جس کو ہر صاحبِ ذوق کی لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کو تصنیف کرنے والے بھارت کے وہ ملے ہوئے موسیقار اور گایک ہیں جن پر بھارتیہ سنگیت ناز کرتا ہے۔ حُسنِ باطن اور حُسنِ ظاہر دونوں خوبیوں نے "موسیقی نمبر" کو ممتاز بنا دیا ہے۔ جہاں تک میری یاد اور معلومات کا تعلق ہے یہ "موسیقی نمبر" اردو ادب میں پہلا نمبر ہے۔

عصرِ جدید ، کلکتہ

آج کل کا یہ موسیقی نمبر مضامین اور تصاویر کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا پہلا نمبر ہے۔ ادارے نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ ویسے تو فنِ موسیقی پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ آج کل کے اس شمارے میں جس قسم کے مضامین پیش کئے گئے ہیں اس کے ذریعے دنیا کو ہندوستانی موسیقی کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ فنِ موسیقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا تذکرہ اس شمارے کے اندر موجود نہ ہو۔

اس نمبر کی ترتیب میں جس قدر محنت ہوئی ہے اس کا اندازہ پرچہ دیکھنے کے بعد آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ موسیقی کے مختلف موضوعات پر مضامین حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں، اس کے لئے ادارے کو کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی محنتوں سے آج یہ شمارہ ہمارے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ علمِ موسیقی پر اتنا بہتر شمارہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ فخر ادارہ آج کل ہی کو حاصل ہے۔ اس شمارے میں فنِ موسیقی پر مضامین کے ساتھ ساتھ جتنی بھی قلمی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں فنِ مصوری نے بھی کافی ترقی کی ہے، اس شمارے میں ہمارے مستند مصوروں نے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں کتابت و طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ امید ہے کہ اسے ہر طبقہ میں بے حد پسند کیا جائے گا۔

ہندوستان کی سیر کیجئے

سیّاحوں اور یاتریوں کے لئے اسپیشل ٹرین

اور

گشتی سفر

"ہندوستان کی سیر کیجئے": یہ نعرہ نہ صرف غیر ملکی سیاحوں کے لئے ہے بلکہ ہندوستانیوں کے لئے بھی ہم میں سے بہت سے لوگوں کو ابھی اپنے ملک سے واقفیت پیدا کرنا اور اس کے بڑے بڑے پہاڑوں، خوبصورت وادیوں قدیم عمارتوں، تاریخی مندروں اور نئی بستیوں کو دیکھنا ہے۔

مقررہ گشتی سفر

ناردرن ریلوے مقررہ کرایہ کے ۳/۴ کے حساب سے رعایتی ٹکٹ جاری کر رہی ہے۔ بہت سے مقررہ دوروں کے لئے پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے ٹکٹ جاری ہو رہے ہیں۔ ان دوروں کے لئے بہت سے راستے متعین کر دئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیلات ناردرن ریلوے کے اسٹیشن ماسٹروں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر عوام کی طرف سے اس ریلوے کے چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ (RATES) کے نام دیگر سفری راستوں کے بارے میں تجاویز بھیجی جائیں تو ان پر غور کیا جائے گا اور رعایتی کرایے منظور کئے جائیں گے بشرطیکہ بعض شرائط پوری ہوتی ہوں۔

اسپیشل ٹرین - سیّاحوں اور یاتریوں کے لئے بڑی لائن پر اسپیشل ٹرین چلانے کی درخواست پر غور کیا جائے گا اور مندرجہ ذیل رعایتیں دی جائیں گی

۱- باورچی خانے کا انتظام - ہر ایک ٹرین کے ساتھ ایک ڈبہ لگا دیا جائے گا جس کا کوئی کرایہ نہیں لیا جائے گا۔

۲- ایک کنڈکٹر اور چار باورچی یا نوکر مفت جا سکیں گے۔

۳- بعض شرائط کے تحت پندرہ سو (۱۵۰۰) میل سے اوپر کے سفر کے لئے مقررہ کرایہ کے ۳/۴ کے برابر کرایہ لیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لئے چیف کمرشل سپرنٹنڈنٹ (RATES) ناردرن ریلوے کشمیری گیٹ دہلی کو لکھیں

پبلک ریلیشنز آفیسر ناردرن ریلوے کی طرف سے شائع کیا گیا

ترقی کے لئے یوجنا

سوشلسٹ سماج کی طرف

ہمارے ملک میں پلاننگ کا اہم ترین مدعا عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور لوگوں کو خوشحال و بھرپور زندگی کے لئے مواقع مہیا کرنا ہے۔

پہلے پانچسالہ پلان ۵۶-۱۹۵۱ء کی کامیابیاں:-

- مزید خوراک
- مزید اشیاء
- بہتر سماجی خدمات
- مزید روزگار
- بہتر معیارِ زندگی
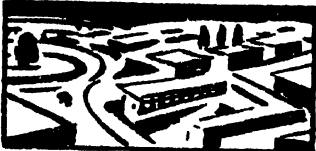
دوسرے پانچسالہ پلان ۶۱-۱۹۵۶ء کے نشانے:-

- قومی آمدنی میں مزید اضافہ
- صنعتی پھیلاؤ کی رفتار میں تیزی
- روزگار کی سہولتوں میں اضافہ
- لوگوں کی آمدنی و دولت کے فرق میں کمی لانا
- اقتصادی طاقت کی مساوی تقسیم

ہمارا دوسرا پانچسالہ پلان
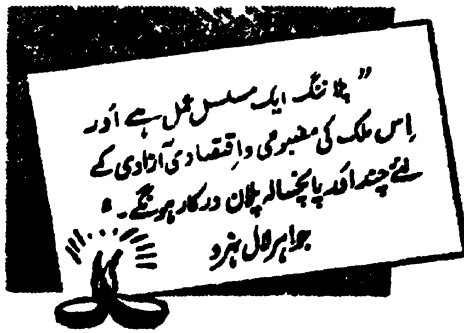
باپو

بچو - ۲- اکتوبر کو باپو کا جنم دن ہے - تم جانتے ہو باپو کی اس قدر عزت دنیا میں عام طور پر اور

بھارت میں خاص طور پر کیوں ہوتی ہے، ہم سب انھیں باپو کیوں کہتے ہیں

وہ دیش باسیوں کو اپنی سنتان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے اس لئے مہاتما گاندھی کی جے کا نعرہ

لگانے والے 'باپو کی جے' کا نعرہ لگانے لگے - وہ نڈر تھے، بہادر تھے اور سچے تھے -

سچائی کی خاطر وہ جان کی بازی لگا دیتے تھے - کتنی ہی مصیبت ہو وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے -

وہ کسی سے دشمنی اور کینہ نہیں رکھتے تھے - اپنے سیاسی مخالفوں سے بھی دوستوں الساب رتاؤ کرتے تھے -

۲- اکتوبر کو ہم ان کی سال گرہ کے دن یہ برت کریں کہ ہم کبھی

جھوٹ نہیں بولیں گے اور باپو کے نقشِ قدم پر چلیں گے

(ادارہ)

ظفر علی سید

رُوپ رنگ

جب دیوتا سب پرندوں کو بنا چکا تو اس نے ان کو جلدی جلدی خوبصورت رنگوں سے رنگنا شروع کیا۔ کئی پرندوں کے بعد مور کی باری آئی۔ دیوتا نے سب سے پہلے مور کے سر کے تاج کو رنگا۔ بازوؤں پر خوش نما رنگ دیئے اور دُم کے پروں پر بڑے بڑے زَرّیں چھلے بنائے۔ مور یہ دیکھ کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے اپنے رنگ روپ پر گھمنڈ ہونے لگا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ یہ خوبصورتی دوسروں کو بتاؤں۔ ابھی دیوتا اُس کے پیروں کو رنگنے ہی والا تھا کہ مور نے کہا۔ "میں ذرا گھوم کر ابھی آتا ہوں اب تو صرف میرے پاؤں ہی رہ گئے ہیں۔" یہ سُن کر دیوتا اُس کو چھوڑ کر دوسرے پرندوں کو رنگنے میں لگ گیا۔

مور اُڑ کر ان پرندوں کے پاس پہنچا جو رنگے جا چکے تھے۔ سب پرندے مور کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ غرور سے سینہ تان کر چلنے لگا اور اُن پرندوں کا مذاق اڑانے لگا۔ پہلے وہ کوّے کے پاس آیا اور کہا "اے کالے کلوٹے! تیرا رنگ کتنا خراب ہے"

کوّے نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ پسند ہے۔"

مور نے ہنس کر کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ رُوپ ہو تو ایسا ہو۔"

پھر وہ چیل کے پاس آیا اور کہا۔ "بڑی بی! تمھارا رنگ کتنا بھدا ہے" چیل نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ پسند ہے۔"

مور نے کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ روپ ہو تو ایسا ہو"

پھر وہ اُلّو کے پاس آیا۔ اور بولا۔ "میاں فلسفی! واہ کیا رنگ ہے تمھارا بھی۔"

اُلّو نے جواب دیا۔ "بھائی مجھے یہی رنگ اچھا لگتا ہے۔"

مور نے کہا۔ "میری طرف دیکھو، رنگ روپ ہو تو ایسا ہو"

سامنے طوطا، کبوتر اور دوسرے پرندے تھے۔ وہ ابھی اُن کے پاس جانے ہی والا تھا کہ مینا چلاتی ہوئی آئی۔ "بھائیو، اب تھوڑا سا رنگ رہ گیا ہے جس کو جانا ہو جلدی جاؤ۔"

مور نے یہ سُنا تو گھبرا کر بھاگا۔ لیکن جب وہ ہانپتے کانپتے دیوتا کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا۔ کہ تمام رنگ ختم ہو چکا ہے۔

مور نے کہا۔ "میرا جسم کس قدر خوبصورت ہے لیکن میرے پاؤں تو ایسے ہی رہ گئے۔"

دیوتا نے کہا۔ "افسوس تم نے بہت دیر کر دی۔"

مور نے یہ سُنا تو مایوس ہو کر اڑ گیا۔

کہتے ہیں جب مینھ برستا ہے تو سارے پرندے خوش ہوتے ہیں۔ مور بھی اپنے خوبصورت جسم کو دیکھ کر ناچتا ہے۔ مگر جب وہ اپنے پاؤں دیکھتا ہے تو اس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

احمد جمال پاشا

دُنیا کا پہلا اخبار

دُنیا کا سب سے پہلا اخبار آج سے دو ہزار برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اخبار کی ایجاد کا سہرا رومیوں کے سر ہے۔

روم کی حکومت آج سے دو ہزار برس پہلے اپنے زمانے کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ حکومت تھی۔ دُنیا کا سب سے پہلا ایڈیٹر جولیس سیزر تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلا اخبار ایجاد کیا۔ اس اخبار کا نام "ایکٹا ڈیورنا" تھا۔

اس زمانے میں لکھائی کا کام مٹی کے کتبوں، پتھر، بھوج پتر، چمڑے درختوں کی چھال اور پتوں وغیرہ پر ہوتا تھا۔ کاغذ کی ایجاد تو بہت بعد کی بات ہے۔ وہ عرب ہی تھے جنھوں نے کپڑے کے چیتھڑوں سے پہلے پہل کاغذ ایجاد کیا اس کے بعد ریشم سے چینیوں نے کاغذ بنایا۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے بیان کے مطابق جولیس سیزر روزانہ بڑی محنت سے دن بھر لکھ لکھ کر ایسے کتبے تیار کرتا اور صبح سویرے شہر کے چوک پر اس کتبے کا چربہ اُتار دیتا۔

اس کا ثبوت مٹی کے اُن پکے ہوئے کتبوں سے ملتا ہے جو روم کی پُرانی بندرگاہ سیٹا ڈیلیکا کی کھدائی کے وقت برآمد ہوئے۔ ان مٹی کے کتبوں میں جولیس سیزر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خبریں ملتی ہیں۔

رومیوں کو اپنے ملک اور باہر کی خبریں پڑھنے کا اس قدر انتظار اور اشتیاق رہتا تھا کہ ہر شخص صبح اُٹھتے ہی یہی کوشش کرتا کہ سب سے پہلے وہیں اخبار پڑھنے پہنچوں۔ ایسا کچھ تو شوق کی خاطر ہوتا اور کچھ بھیڑ بھاڑ سے بچنے کی خاطر۔ مگر پھر بھی بھیڑ اس قدر ہو جاتی کہ لوگ جب پڑھنے کے لئے جمع ہوتے تو اُن کی ایک قطار بنا دی جاتی اور ہر شخص اپنی باری کا انتظار کرتا۔ جس طرح آج ہم لوگ اسکول بس، پوسٹ آفس اور سنیما کے ٹکٹ وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیو (لائن) لگاتے ہیں۔ کیا عجب کہ کیو لگانے کی ایجاد اسی زمانے کی دریافت ہو۔

اکثر لوگ اخبار پڑھنے اس قدر جلدی آجاتے کہ ابھی اندھیرا ہوتا اور وہ یا تو پہلی صبح کی روشنی کا انتظار کرتے یا پچھلے پہر کی مدھم چاندنی یا مشعل کی مدد سے خبریں پڑھنے کی کوشش کرتے اور اگر اخبار آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو لوگ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے۔

جولیس سیزر کا یہ اخبار جس کے کاتب سے لے کر مدیر اور نگراں تک وہ خود ہی تھے بہت جلد روم اور باہر کے ملکوں میں مشہور ہو گیا۔

اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شہر کے ایک ہی مقام پر پڑھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ تمام خبریں اور اہم اعلانات وغیرہ پکّی ہوئی مٹی کے کتبے پر کھود کر اس کا نقش ایک خاص مقام پر اُتار دیا جاتا تھا جہاں روم کے لوگ با آسانی جمع ہو کر اس کو پڑھ سکتے تھے۔

یہ اخبار آج کل کے چھپے ہوئے اخباروں سے بالکل مختلف تھا۔
آج کل اخبار خریدنا اور اُس کا پڑھنا ہر شخص کے لئے بہت آسان اور ضروری ہے۔ اُس وقت تک چونکہ کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اخبار مٹی کے پکائے ہوئے کتبوں پر ہی تیار ہوتا تھا۔ پھر اس اخبار نے بڑی ترقی کی اور بڑے بڑے کاروباری لوگوں نے اپنے غلاموں کے ذریعے سے جولیس سیزر کے کتبے کی نقلیں ایک خاص قسم کے کپڑے پر اُترواکر فروخت کرنا شروع کر دیں۔ ایک غلام دن بھر میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ تک نقلیں اُتار لیتا تھا مگر ان نقلوں کا خریدنا بھی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کو بھی صرف بڑے بڑے دولت مند ہی خرید سکتے تھے۔

مگر ان نقلوں سے نہ صرف اخبار کو مالی فائدہ ہوا بلکہ اس طرح اخبار ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جانے لگا اور دوسرے مقامات پر بھی یہ خبریں پڑھی جانے لگیں۔

اس اخبار کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور وہ تقریباً نیم سرکاری اخبار تھا۔ جولیس سیزر کے اس اخبار کی خبروں میں بہت اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ عام طور پر انتہائی ضروری اور دلچسپ خبریں اور نہایت اہم اعلانات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ یہی اخبار تھا۔ اس اخبار کی تمام خبروں پر پورا پورا اعتبار کیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ خبریں تازہ اور دلچسپ ہوں۔ اس اعتبار سے اخبار نویسی (صحافت) کی تاریخ میں جولیس سیزر کا نام بہت اہم اور نہ بھولنے والا ہے کہ وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔

انور برہان پوری

ترکیب فیل ہو گئی

ایک دن امی نے گاجر کا حلوہ بنایا اور مجھے اور خورشید کو ہمارا حصہ دینے کے بعد سب کا سب جو کہ قریب آدھا سیر تھا۔ ابا جان، نانی جان، آپا جان اور خود اپنے لئے الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔ کیوں کہ اس دن چاروں روزہ دار تھے اور ہم روزہ بچے! اس میں شک نہیں کہ حلوہ بے حد لذیذ اور مزے دار تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں خورشید سے باہر ملا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "خورشید حلوہ کیسا تھا؟" "بہت مزے دار" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔ "خیال تو نیک ہے، لیکن حلوہ کس طرح حاصل کیا جائے؟"

اس نے نرمی پر سوالیہ نشان بناتے ہوئے کہا۔ "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں"۔ میں نے کہا "خیر کوئی ترکیب سوچو!"

اور پھر "حلوہ کس طرح حاصل کیا جائے۔" یہ جملہ ہم دونوں کے دماغ میں بُری طرح چکر لگانے لگا — آخر کار میں نے ایک ترکیب نکال ہی لی۔ اور جب میں نے وہ ترکیب خورشید کو بتائی تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

تقریباً دو بجے میں نے امی سے کہا۔ "امی تھوڑا سا حلوہ دیجیے نا!" "نہیں بیٹا وہ اب ہمارا حصہ ہے تم تو اپنا حصہ کھا چکے۔" انھوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بس تھوڑا سا۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔" میں نے منت کی۔ آخر بڑی منت وسماجت کے بعد امی نے مجھے تھوڑا سا حلوہ دے ہی دیا کیونکہ ہماری امی جان ہماری خوش قسمتی سے بڑی رحمدل واقع ہوئی ہیں۔

حلوے کا پہلا نوالہ چکھتے ہی میں نے امی سے کہا۔ "امی حلوہ تو کچھ کڑوا سا لگ رہا ہے۔" "کیا کہا۔ کڑوا لگ رہا ہے؟" انھوں نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں" میں نے کہا۔ "اگر آپ کو یقین نہ ہو تو خورشید کو چکھا کر پوچھ لیجیے۔"

اور جب امی نے خورشید کو بلا کر حلوہ چکھایا تو اس نے بھی منہ بناتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں امی جان۔ انور بھائی سچ کہہ رہے ہیں۔"

جب یہ خبر نانی جان اور آپا جان کے کانوں سے ہوتی ہوئی ابا جان تک پہنچی تو انھیں بڑا تعجب ہوا۔ لیکن پھر انھوں نے امی سے مشورے

کے طور پر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ حلوہ دونوں بچوں کو دے دیا جائے۔ کیونکہ شام تک تو اور زیادہ خراب ہو جائے گا جس سے نہ ہمارے کام کا رہے گا نہ بچوں کے۔"

"جی ہاں - میرا بھی یہی خیال ہے۔" امی نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "کم از کم بچے تو کھا لیں گے۔"

اور پھر سارا حلوہ ہم دونوں کے سپرد کر دیا گیا اور ہم کڑوا منہ بناتے ہوئے اسے جلدی جلدی صاف کرنے لگے۔

لیکن اسے اتفاق کہیئے یا ہماری بدقسمتی کہ ابھی ہم آدھا حلوہ بھی نہ کھا پائے تھے کہ میرا ہم جماعت دوست اظہر آ دھمکا۔ جیسے دیکھتے ہی ہم دونوں کی روح فنا ہو گئی۔ کیونکہ ہمارے ہاں جب بھی کوئی مٹھائی بنتی ابا اسے ضرور دیتے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ ابا نے اس سے کہا۔ "آؤ بیٹا اظہر تم بھی تھوڑا سا حلوہ کھا لو۔"

پہلے تو اس نے انکار کیا تو ہماری جان میں جان آ گئی۔ لیکن جب ابا جان نے اسے مجبور کیا اور وہ کھانے بیٹھ گیا تو ہماری حالت اس چوہے کی مانند ہو گئی جو چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اسے اشاروں سے کچھ سمجھاؤں۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خورشید ایسی سو گئی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

ادھر تو اظہر حلوہ کھا رہا تھا اور ادھر ہم یہ دعا کر رہے تھے کہ کاش ابا اظہر سے حلوے کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ لیکن کہیں چھوٹوں کی بھی دعا قبول ہوتی ہے

جب اظہر نے منہ بناتے ہوئے اور بہ مشکل تمام آدھا حلوہ صاف کر دیا تو ابا نے اس سے کہا۔ "بیٹا اظہر تم تو حلوہ اس طرح کھا رہے ہو جیسے اس میں کچھ کڑواہٹ سی نہ ہو۔" "کڑواہٹ؟" اس نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون کہتا ہے کہ اس میں کڑواہٹ ہے؟" "یہ انور اور خورشید۔" ابا نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور ہمارے دل دھڑکنے لگے۔ "تو کیا واقعی حلوہ بالکل کڑوا نہیں لگ رہا ہے..."

"ہو سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ خود شام کو روزہ کھولنے کے بعد چکھ کر دیکھ لیجیئے گا کہ آیا کڑوا ہے یا نہیں..." "ہاں یہ ٹھیک ہے،" امی نے بقیہ حلوہ الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور ہم شام نہ ہونے کی دعا کرنے لگے! - لیکن کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

اور جب شام کو ابا نے روزہ کھولنے کے بعد حلوہ چکھا اور ہمارا جھوٹ ظاہر ہوا تو وہ اتنے خفا ہوئے کہ خدا کی پناہ اور ہم دونوں کی وہ مرمت ہوئی کہ ہمیں جلدی چونا لگانے کی نوبت آئی اور ہم تین دن تک ایک بستر کے لئے بھی بستر کو نہ چھوڑ سکے۔

لیکن اتنا ہم ضرور کہہ دیتے ہیں کہ ہم کو اپنی پٹائی پر اتنا ملال نہیں تھا جتنا اپنی ترکیب فیل ہونے پر ۔

سوم دت

اصلیت نہیں جاتی

شام کا وقت تھا۔ ایک بڑا نامی جادوگر گنگا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اوپر سے ایک اُلو اُڑتا ہوا گزرا۔ اُلو کے منہ میں ایک چوہیا تھی۔ اس سمے یکایک میں انسان کو دیکھ کر اُلو ڈر گیا اور گھبراہٹ میں چوہیا اس کے منہ سے نکل کر زمین پر جا گری۔

جادوگر نے بڑھ کر دیکھا تو چوہیا ابھی تک زندہ تھی۔ جادوگر رحم دل تھا اس نے چوہیا کو اُٹھا لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ گھر آ کر اس کی مرہم پٹی کی جس سے چوہیا بہت جلد تندرست ہو گئی۔ جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے اسے خوبصورت لڑکی میں بدل دیا۔

اب جادوگر نے اس لڑکی سے کہا۔ "میں اب تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک بڑا جادوگر ہوں۔ تم جس سے بھی شادی کرنا چاہو اُسی سے تمہاری شادی کرا دوں گا۔"

جادوگر کی منہ بولی بیٹی یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ بولی۔ "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میری شادی میری اپنی مرضی سے ہو تو میں اس سے شادی کروں گی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوگا۔"

جادوگر نے کہا۔ "سورج سے زیادہ طاقت ور اس دنیا میں اور کون ہوگا میں اسی سے تمہاری شادی کئے دیتا ہوں۔" چنانچہ جادوگر نے سورج سے شادی کرنے کے لئے کہا۔

سورج بولا "بھلا میں سب سے زیادہ طاقت ور کہاں۔ بادلوں کو ہی دیکھو۔ جب چاہتے ہیں مجھے ڈھانپ لیتے ہیں اور میری روشنی کو چھپا لیتے ہیں۔ مجھ سے تو وہ کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔"

جادوگر نے بادلوں سے کہا "تم کو میری منہ بولی بیٹی سے شادی کرنا ہوگی"

بادل بولے "ارے بھائی دنیا میں ہم سے بھی زیادہ طاقتور موجود ہیں۔ اس ہوا ہی کو دیکھو۔ جہاں چاہتی ہے ہمیں پہنچا دیتی ہے۔ ہم سے زیادہ طاقت تو اس میں ہے۔"

جب ہوا سے کہا گیا تو اس نے بتلایا کہ پہاڑ اس سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور ہوا کے طوفان و تھپیڑوں کو بھی روک لیتے ہیں۔

جب جادوگر نے پہاڑوں سے کہا تو انھوں نے جواب دیا "بھائی دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور موجود ہیں۔ ذرا ان چوہوں کو دیکھو جہاں چاہتے ہیں میرا اندر بل بنا لیتے ہیں۔ میری مرضی ہو نہ ہو، ان بلوں میں بڑے مزے سے رہتے ہیں۔ ان کو میری طاقت سے ذرا بھی خوف نہیں۔"

اپنی محنت کا یہ نتیجہ دیکھ کر جادوگر کو بہت افسوس ہوا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کی منہ بولی بیٹی یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کرے گی کہ چوہے جیسے ذلیل اور ناچیز جانور سے شادی کرے لیکن جادوگر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ اس کی منہ بولی بیٹی یہ سن کر بہت خوش ہوئی کہ چوہا دنیا میں سب سے طاقت ور ہے۔

ناچار جادوگر پھر اُسے اسی روپ میں لے آیا جس میں اسے پایا تھا۔ اور اس کی شادی ایک چوہے سے کر دی۔ دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

کسی نے سچ کہا ہے صورت شکل تو بدلی جا سکتی ہے مگر اصل طبیعتیں نہیں بدلا کرتیں۔

ماسٹر ناجی

بوڑھے کی دانائی

کسی گاؤں میں ایک بوڑھا اور بڑھیا رہتے تھے۔ ایک دن بوڑھا بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے جنگل کی طرف گیا۔ جب وہ بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا تو ایک خرگوش جھاڑیوں میں سے نکلا اور اس کے قریب تیزی سے نکل گیا۔ بوڑھے نے سوچا کئی دنوں سے ہم نے گوشت نہیں کھایا کیوں نہ اس خرگوش کو پکڑ لوں۔ یہ سوچ کر بوڑھا خرگوش کے پیچھے دوڑا۔ لیکن خرگوش بہت آگے نکل گیا اور اس کے ہاتھ نہ آیا۔ خرگوش نے پیچھے کی طرف دیکھا تو بوڑھا اس سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ بوڑھا اب یہاں تک پہنچ ہی نہ سکے گا کیوں نہ ذرا آرام کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ درخت کے سائے میں سو گیا۔ خرگوش کی نیند تو مشہور ہے، تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔ بوڑھے نے خرگوش کا پیچھا جاری رکھا اور آخرکار وہاں پہنچ گیا جہاں خرگوش سو رہا تھا۔ اس نے دبے پاؤں آکر خرگوش کو پکڑ لیا اور سیدھا گھر لے آیا۔ اور بڑھیا سے کہا۔ "دیکھو میں ایک خرگوش پکڑ لایا ہوں۔ ہم نے بہت دنوں سے گوشت نہیں کھایا تھا۔ ایک بڑا سا برتن لاؤ تاکہ اس میں خرگوش کو بند کر دیں۔" بڑھیا بہت خوش ہوئی اور جھٹ سے برتن لائی اور اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ جوں ہی بوڑھے نے خرگوش کو برتن میں ڈالا۔ خرگوش نے ایک چھلانگ لگائی اور باہر نکل بھاگا۔ بڑھیا اور بوڑھا دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے۔

دوسرے دن بوڑھا بکریاں چرانے جنگل کی طرف گیا۔ وہاں اس کو پھر وہی خرگوش مل گیا۔ اب کے بوڑھے نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس کو آج نہیں چھوڑوں گا۔ آخر تجربہ کار تھا۔ خرگوش کو پکڑ کر دم لیا اور اسے گھر لے آیا۔ اب کے بوڑھے اور بڑھیا نے ایک ترکیب سوچی کہ جیسے ہی خرگوش بھاگنے کی کوشش کرے ایک طرف سے بوڑھا اس پر کلہاڑی کا وار کرے اور دوسری طرف بڑھیا ایک تیز چاقو لے کر بیٹھے اور اس پر جھپٹ پڑے۔ یہ سوچ کر خرگوش کو اس بڑے برتن میں ڈالا گیا جوں ہی بوڑھے نے اوپر سے ڈھکنا رکھنا چاہا۔ خرگوش اوپر کو اچھلا۔ سوچی ہوئی ترکیب کے مطابق ایک طرف سے خرگوش پر بوڑھے نے کلہاڑی سے وار کیا اور دوسری طرف بڑھیا نے

تیز چاقو سے اس پر حملہ بول دیا۔ لیکن وائے قسمت خرگوش تو نکل بھاگا اور کلہاڑی بڑھیا کے سر میں لگی اور تیز چاقو بوڑھے کے جسم میں پیوست ہو گیا۔

بے چارا بوڑھا اور بڑھیا گوشت کھانے کی حسرت دل میں دبائے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور خرگوش چھلانگیں لگاتا پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔

ہماری
کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دل کش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آ رہا ہے۔
اس تابناکی مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے
قیمت ۔۔ -/۴/۰
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویروں اور
خاکوں سے اس کی دل کشی میں
اور اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/۰
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
۰/۴/
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت -/۴/-
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/۰
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

معاصرین کی نظر میں

معاوضے کی درمیانی اسکیم

”یہ ایک بہت مفید کتابچہ ہے جس میں بے کھٹ لوگوں کو معاوضے کی درمیانی اسکیم کے بارے میں قیمتی معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ معاوضے کی قطعی اور آخری اسکیم کے نفاذ سے پہلے ان ضرورت مندوں کو معاوضہ دیا جائے جو اپنا کاروبار چلانے کے لئے اس کا انتظار کر رہے ہیں اس سلسلے میں حکومت جو کچھ کرنا چاہتی ہے اس کی پوری تفصیل اس کتابچے سے معلوم ہو سکتی ہے۔“ الجمعیۃ دہلی

دو آنے

پنج سالہ پلان (سوالات و جوابات)

پلاننگ کمیشن نے جو پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ زیر نظر ۲۰ صفحات پر مشتمل کتاب میں تمام اہم مسائل اردو سوال و جواب کی صورت میں بیان کردئے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے وقت اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل پلان کا نچوڑ اس کتاب میں آجائے ......“

قیمت چار آنے — ”قومی آواز“ لکھنؤ

نئے ہند کی تعمیر

”یہ توضیحی مفلٹ حکومت ہند کی وزارت اطلاعات نے شائع کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اردو خواں بھی اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ حکومت کے کارناموں اور اسکیموں سے ان کو واقف کرنا نہایت ضروری ہے۔

اس مفلٹ کی زبان نہایت سلیس اور دل نشیں ہے۔ تصویریں اور طباعت سب اعلیٰ درجہ کی ہیں۔“

قیمت آٹھ آنے — ”سیاست“ کانپور

Ahmed Ali Khan
AGENT.

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd No D—509

ہماری کتابیں
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آ رہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر کتابچے میں دیکھئے قیمت ۔/۴/-
پہلا پنج سالہ پلان
نیا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دلکش ہے۔ قیمت ۲/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
۔/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ۔/۸/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
۔/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۔/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مہدی عباس حسینی

جلد ۱۵ — نمبر ۴

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں- چھ روپے
پاکستان میں- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں- آٹھ آنے (پاک)

L 9313

بدھ نمبر

نومبر ۱۹۵۶ء

ترتیب

سرورق:- بدھ کا مجسمہ - متھرا

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

اردو ادب کی بدنصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کی محفل یارانِ کہن سے خالی ہو رہی ہے۔ ابھی وحشت کا غم تازہ تھا کہ کیفی چریاکوٹی، اعظم حسین اعظم اور عبدالسلام ندوی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا انتقال ۴۔ اکتوبر کو حرکتِ قلب بند ہونے کی بنا پر ہوا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ آپ شبلی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ آپ نے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ اسوۂ صحابہ، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، شعر الہند اور اقبالِ کامل کے علاوہ دوسری بہت سی تصانیف کی بدولت آپ کا نام علم و ادب کی دنیا میں زندہ و پائندہ رہے گا

جناب کیفی چریاکوٹی ہمہ رنگ قسم کے ادیب و شاعر تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مختلف رسائل و جرائد کے مدیر کی حیثیت سے آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء کو خناق اور ملیریا کے مرض سے جان بمقام اٹاوہ جان آفریں کے سپرد کی۔ آپ کی عمر انتقال کے وقت ۷۵ سال کی تھی۔

سید اعظم حسین اعظم ہمارے پرانے صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ یہ منشی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ برسوں سرفراز لکھنؤ کے اڈیٹر رہے۔ حال ہی میں ہفتہ وار 'وطن' کا اجراء کیا تھا۔ بڑا پاکیزہ مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ جوش نے ایک دفعہ اپنی مشہور غزل نما نظم "کہاں ہے ساقی" جہاں ہے ساقی کا مقطع پڑھا

جوشؔ کی بحث صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ رنداں جہاں ہے ساقی

اعظم صاحب نے پہلے مصرعے پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ 'بحث' کا لفظ نامناسب ہے، مفہوم الٹا ہو جاتا ہے۔ جوش نے غلطی کا اعتراف کیا اور اعظم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اصلاح بھی انھیں سے منسوب کر دی اور مصرعے کو یوں تبدیل کر دیا

جوشؔ اعظم کی صدارت میں پس و پیش نہ کر

دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحومین کی روحوں کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبر کی نعمت بخشیں

جینے کا کیا لطف یہاں اب یار گئے غمخوار گئے
جو دو چار رہے تھے وہ بھی تیر جگر کے پار گئے

آج کل دہلی

ریاست جموں و کشمیر توسیع و ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کر رہی ہے سری نگر اور لیہہ لداخ کے درمیان ایک سڑک کی تعمیر جاری ہے جو ماہ جون ۱۹۵۷ء میں اس قابل ہو جائے گی کہ اس پر جیپ گاڑی چل سکے۔ اس سڑک کی تعمیر کے لئے تین ہزار مزدور کام کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۹ء میں اس سڑک پر عام موٹر گاڑیاں چل سکیں گی۔ یہ سطح سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس لحاظ سے یہ سڑک دنیا کی سب سے اونچی سڑک ہوگی۔ رسل و رسائل کے ذرائع میں دوسری ترقی بانہال سرنگ کی تکمیل ہے۔ چنانچہ اسی ترقی و توسیع کی تصدیق پارلیمنٹ کے ۱۳ مسلمان ممبروں نے حال ہی کے ایک بیان میں کی ہے۔

ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء میں پورا ایک مہینہ جشنِ کشمیر ریاست کے مختلف مقامات پر منایا گیا سری نگر میں سیاحوں کے لئے ایک نہایت معقول ٹورسٹ ریسپشن سنٹر تعمیر ہوا ہے اور ان کے لئے سہولتیں پہلے سے دو چند ہو گئی ہیں۔ اس خوش انتظامی پر ریاست کے منتظم اعلیٰ وادیٔ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جشنِ کشمیر کی مختلف تقریبات میں جھانکیوں کا دریائی جلوس اور شب شالامار قابلِ دید تھے۔ شالامار باغ میں شب کو چراغاں اور آبِ رواں میں اس کا عکس قابلِ دید منظر تھا۔ جگہ جگہ کشمیری لوک گیت گائے جا رہے تھے۔ لوک ناچ اور بھی دل چسپ تھے۔ پنڈت گووند ولبھ پنت ہوم منسٹر حکومت ہند کا سری نگر میں شاندار استقبال کیا گیا۔ "کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے۔" اس صداقت پر اہلِ کشمیر نے ایک اور مہر ثبت کی۔

طلباء میں نظم و ضبط کی کمی بہت ہی افسوس ناک ہے۔ حال ہی میں کشمیر یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے جناب ہومی مودی سابق گورنر یوپی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی ذکر شری ہرے کرشن مہتاب نے گجرات یونیورسٹی میں اپنے ایڈریس میں کیا۔ غالباً طلباء نے بعض مقامات پر پچھلے دنوں جو غیر منظم طریقہ اختیار کیا تھا اسی کی طرف ان بزرگوں نے اشارہ کیا ہے۔ طلبا قوم کا مستقبل ہیں۔ ان کے تدبر اور فراست سے جس کی ان میں کمی نہیں ہم یہی امید رکھیں گے کہ وہ اپنے دامن پر کوئی وقتی داغ بھی نہیں آنے دیں گے اور واقعی قوم کا صحیح مستقبل بن کر دکھا دیں گے۔

ڈاکٹر ایس رادھاکرشنن

گوتم بدھ

دنیا کے کئی ملکوں میں چھٹی صدی قبل مسیح روحانی بے چینی اور ذہنی جوش و خروش کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ چین میں لاؤتزے اور کنفیوشس، یونان میں پارمی نائیڈس اور ایمپی ڈوکلس، اور ہند میں مہاویر اور بدھ اسی صدی میں پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں بہت سے معلموں اور مفکروں نے اپنے ورثۂ علم و فکر پر غور و خوض کر کے نئے نئے نکتے پیش کئے۔

بیساکھ کی پورن ماشی مہاتما بدھ کی زندگی کے تین اہم واقعات سے وابستہ ہے۔ ان کی پیدائش، ان کا گیان اور پری نروان یعنی نجات آخر اسی روز واقع ہوئی۔ بدھوں کی جنتری میں یہ سال کا مقدس ترین دن ہے۔ تھراوادا بدھ فرقے کے مطابق ۵۴۴ ق م میں بدھ کو نجات آخر حاصل ہوئی۔ اگرچہ بدھ مت کے مختلف مکاتب خیال الگ الگ تاریخیں مانتے ہیں مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ گوتم بدھ کے مہا پری نروان کی ڈھائی ہزارویں سالانہ یادگار مئی ۱۹۵۶ء کی پورن ماشی میں منائی جائے۔

بدھ کی زندگی کے خاص خاص واقعات سے ہر کہ و مہ واقف ہے۔ وہ کپل وستو کے راجہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے عیش و عشرت کی آغوش میں پرورش پائی۔ یشودھرا سے شادی کی، راہل نامی ایک بیٹا تھا اور شروع میں ایسی زندگی گزاری جس میں دنیاوی غم و آلام کا گزر تک نہ ہو سکتا تھا۔ روایت ہے کہ وہ چار مرتبہ اپنے محل سے باہر نکلے۔ پہلی بار انھیں ایک بڈھا ملا جسے دیکھ کر انھیں خیال آیا۔ میں بھی ضعیف ہو سکتا ہوں، دوسری بار ایک بیمار ملا اور بدھ نے سوچا اسی طرح بیماری مجھ پر بھی تسلط کر سکتی ہے۔ ایک لاش نظر پڑی اور ان کو احساس ہوا کہ موت مجھ کو بھی شکست دے سکتی ہے۔ آخر میں ایک راہب کا پرسکون چہرہ نظر آیا جس نے روایتی انداز سے تلاش حق کی راہ اختیار کی تھی

بدھ نے اس اعلیٰ ضمیر راہب کی مثال سامنے رکھ کر بیماری، ضعیفی اور موت سے نجات کا راستہ ڈھونڈنے کا تہیہ کر لیا۔ راہب نے ان سے کہا "میں ایک شرامن ایک سنیاسی ہوں جس نے پیدائش اور موت کے خوف سے مکتی یا نجات حاصل کرنے کے لئے گرہست جیون چھوڑ دیا ہے۔"

اس مرد بزرگ کو دیکھ کر جو دنیاوی آرام و آسائش میسر نہ ہونے کے باوجود تندرستی اور خوش دلی کی دولت سے مالا مال تھا، بدھ بہت متاثر ہوئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ مذہبی جستجو ہی انسان کے لئے کوئی قابل قدر مقصد بن سکتی ہے۔ یہی دنیا کی وقتی آزمائشوں اور گزراں مسرتوں سے بے نیاز کر سکتی ہے لہٰذا انھوں نے دنیا کو تج کر اپنی زندگی کو تلاش حق کے لئے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے گھربار، بیوی بچے کو چھوڑا، درویشانہ لباس پہنا اور جنگل کی راہ لی تاکہ گیان دھیان کی مدد سے مصیبتوں کے اسباب اور انھیں دور کرنے کے طریقے معلوم کر سکیں۔

بدھ نے چھ سال تک مذہب کے نہایت دقیق اصول اور قوانین کا مطالعہ کیا، سخت سے سخت ریاضت اور نفس کشی کی اور اس امید میں فاقے کر کر کے اپنے جسم کو گھلا ڈالا کہ شاید اذیتیں اور سختیاں اٹھا کر ہی عرفان اور نور حق حاصل ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود موت کے منہ تک پہنچ گئے، لیکن جس سچائی کی تلاش میں سرگرداں تھے اسے حاصل نہ کر سکے۔ اس پر انھوں نے ریاضت چھوڑ کر عام آدمیوں کی طرح رہنا سہنا شروع کیا۔ نرنجنا ندی کے پانی سے اپنے آپ کو پاک و صاف اور تر و تازہ کیا اور سجاتا کی نذر کردہ کھیر کھائی۔ رفتہ رفتہ جب جسم میں توانائی اور ذہن میں بالیدگی عود کر آئی تو وہ گیا میں بودھی پیڑ کے سائے میں آسن لگا کر بیٹھ گئے اور سات ہفتے تک انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ

مراقبے میں ڈوبے رہے، حتیٰ کہ ایک رات طلوعِ سحر کے قریب ان پر دفعتاً عرفان کے دروازے کھل گئے اور نورِ معرفت حاصل ہو گیا۔ اس عرفان کے بعد سے بدھ نے اپنے لئے واحد متکلم کی جگہ واحد غائب کا صیغہ استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ اپنے آپ کو "تتھاگت" کہنے لگے۔ جس کے معنی ہیں — وہ جس نے سچائی کو پا لیا ہو۔ بدھ اس سچائی کو سارے عالم میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے کہا "میں بنارس جاؤں گا اور وہاں وہ دیپ جلاؤں گا جو ساری دنیا کو منور کرے گا، میں بنارس جاؤں گا اور وہاں وہ نقارہ بجاؤں گا جو بنی نوعِ انسان کو بیدار کرے گا، میں بنارس جاؤں گا اور قانونِ شریعت تسلیم کروں گا"۔ وہ سنو! اے بھکشوؤ میں نے امرت پا لیا ہے اور اب میں ہر ایک کو امرت پانے کا طریقہ بتاؤں گا یعنی میں دھرم کی تبلیغ کروں گا۔"

اس کے بعد انھوں نے جگہ جگہ گھومنا شروع کیا اور سیکڑوں آدمیوں کو جن میں چھوٹے اور بڑے، راجا اور پرجا سبھی شامل تھے، فیض پہنچایا۔ وہ سب کے سب اس عظیم شخصیت کے صحبت سے مسرور ہو گئے۔ بدھ پینتالیس برس تک سخاوت کے عشق، تیاگ کی مسرت اور سادگی اور مساوات کی ضرورت کا سبق پڑھاتے رہے۔ بدھ نے ۸۰ سال کی عمر میں کوسی نگر کی طرف کوچ کیا جہاں انھیں پری نروان یا مسرتِ ابدی حاصل ہونی تھی۔ وہ ویشالی کے خوبصورت شہر سے رخصت ہوتے وقت اپنے شاگرد آنند کے ساتھ قریب ہی ایک پہاڑی پر تھوڑی دیر سستانے کے لئے رکے۔ انھوں نے اس خوبصورت شہر پر نگاہ ڈالی جس کے دامن میں بہت سے مندروں اور خانقاہوں کے کلس جگمگا رہے تھے۔ تب انھوں نے آنند سے کہا "کتنا رنگیں اور مالا مال ہے ہندوستان اور کتنی پیاری اور دلکش ہے حیاتِ انسانی۔ پھر انھوں نے ہیرنیاوتی ندی کے کنارے پر سال کے درختوں کے جھنڈ میں دو پیڑوں کے درمیان اپنے لئے ایک بستر تیار کرایا اور آنند کو جو شدید آہ و زاری کر رہا تھا بڑی نرمی سے یوں تسلی دی "رو مت، مایوس نہ ہو آنند، انسان کو اپنی ہر محبوب شے سے جدا ہونا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شے پیدا ہوئی ہے اور جو ناپائیدار ہے، وہ فنا نہ ہو۔ شاید تم سوچتے ہو اب ہمارا کوئی گرو نہیں رہا۔ اے آنند! ایسا ہرگز نہیں سوچنا۔ جو اصول میں نے تمھیں تعلیم کئے ہیں وہی تمھارے معلم ہیں۔" اس کے بعد بدھ نے پھر کہا "اے بھکشوؤ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ ہر شے فانی ہے اس لئے خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے لئے راہِ نجات تلاش کرو۔"

یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد ان کی روح تصوف کے تہائی تول میں ڈوب گئی اور جب وہ اس مقام پر پہنچے جہاں ہر خیال، ہر تصور ختم ہو جاتا ہے جہاں انفرادی شخصیت کا گمان تک نیست و نابود ہو جاتا ہے، تو وہ نروان یا نجاتِ کُلی کی منزل میں داخل ہو گئے۔

بدھ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک انفرادی اور دوسرا سماجی۔ عام اور جانا بوجھا تصور یہ ہے کہ وہ گیان اور دھیان میں ڈوبا ہوا کوئی عالم و عارف جوگی تھا دنیا سے کنارہ کش، اپنے خیالات میں مستغرق، اور اپنے اندرونی غور و فکر کے سرچشمے سے مسرور و فیض یاب۔ تھراوادا بودھ مت اور اشوک کے مشن سے بدھ کا یہی تصور وابستہ ہے۔ ان کی نظر میں بدھ خدا نہیں انسان ہے، نجات دہندہ نہیں گرو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو وہ ہے جس میں بدھ غمِ انسانی سے تعلق خاطر رکھتے ہیں، عام انسانوں کی زندگی میں گھل مل کر ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا چاہتے ہیں اور بہبودِ عامہ کی خاطر اپنا پیغام پھیلانا چاہتے ہیں۔ انسان دوستی کے اس مسلک کے پیشِ نظر شمالی ہند میں کشن (۷۰ء تا ۸۰۰ء) اور گپت خاندانوں (۳۲۰ء تا ۶۵۰ء) کے عہد میں بدھ کا دوسرا روایتی تصور قائم ہوا تھا جس نے ہر شخص کیلئے نجات کا نصب العین، دھرم کی لگن اور خدمتِ عامہ کی راہ دکھائی۔ بدھ کا پہلا تصور لنکا، برما اور تھائی لینڈ میں پھیلا ہوا ہے اور دوسرا نیپال، تبت، کوریا، چین اور جاپان میں پایا جاتا ہے

لیکن بدھ مت کے سبھی فرقے اس بارے میں متفق ہیں کہ اس مت کے بانی کا نام بدھ تھا جس نے بودھی پیڑ کے نیچے دھیان لگا کر گیان حاصل کیا اور اس غمناک دنیا سے پرے ابدیت کی راہ دکھائی اور یہ بتایا کہ جو لوگ راہِ نجات پر چلتے ہیں وہ بھی گیان حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی بدھ مت کی تعلیم کا جوہر ہے۔ یہی وہ رشتۂ وحدت ہے جو ہندوستان سے دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلنے والے بدھ مت کے بدلتے ہوئے نظریوں اور قوانین کو آپس میں منسلک کرتا ہے۔

دراصل مذہب کا جوہر یہی ہے کہ فطرتِ انسانی میں ایک انقلاب پیدا کیا جائے۔ دوسرے جنم کا تصور ہندو اور بدھ دھرموں کا مرکزی اصول ہے۔ انسان کی ذات وحدت نہیں بلکہ کثرت ہے۔ وہ خوابیدہ ہے، وہ بلا ارادہ و اختیار متحرک ہے، اس میں اندرونی انتشار ہے۔ اسے بیدار ہونا ہے، اپنی ذات میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنا اور آزاد و خود مختار ہونا ہے۔ یونانی اسراروں میں انسانی فطرت کی اس تبدیلی کی طرف اشارہ موجود ہے انسان کو ایک دائرہ تصور

کیا گیا ہے جو دانے کی حیثیت سے فنا ہو سکتا ہے، لیکن یہی دانہ ایک مختلف صورت یعنی پودے کے روپ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ گیہوں کے انجام کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں وہ یا تو پس کر آٹا اور روٹی بن جاتا ہے یا زمین میں بویا جاتا ہے اور پھوٹ کر پودا بن جاتا ہے اور اس طرح ایک دانے سے ہزار ہو جاتے ہیں۔ سینٹ پال نے مسیح کے دوبارہ ظہور کا حال بیان کرتے ہوئے اسی خیال کو مستعار لے کر کہا تھا "اے نادان تو جو کچھ بوتا ہے وہ مرنے کے بعد ہی زندہ ہو سکتا ہے۔" "وہ ہماری مادی شکل میں بویا جاتا ہے اور روحانی شکل میں ابھرتا ہے۔" یہ تبدیلی اس مادے کی ہی قلب ماہیت ہے۔ حیاتِ انسانی کو وجودِ انسانی کا حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ انسان خود کو نئے سانچوں میں ڈھال سکتا ہے اور دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی لانا، دوبارہ پیدا ہونا اور غفلت سے بیدار ہونا نہ صرف بدھ مذہب کا بلکہ ہر مذہب کا نصب العین ہے۔ ہم اپنی اودیا یعنی جہل و غفلت کے باعث زمان و مکان کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں جو ہمیں حماقت اور فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہے۔ دراصل جہل اور خواہش ہی وہ بنیاد ہے جس پر جہانِ رنگ و بو استادہ ہے۔ ہمیں اودیا کی سطح سے ابھر کر ودیا، معرفت اور تجلی کی منزل تک پہنچنا ہے۔ جب ہمیں ودیا یعنی مشاہدات کے ذریعے بصیرت حاصل ہو جائے گی تب ہمیں سمتا یعنی ابدی سکون بھی حاصل ہو جائے گا جسے کوئی نہ ہلا سکے گا۔ بدھ نے یہ تعلیمات دیتے وقت ویدوں کے اصولِ تحقیق کی پیروی کی ہے جو مشاہداتی علم، ذاتی تجربے اور حقیقت کے براہِ راست وجدان سے حاصل ہوتا ہے۔

بدھ مت کسی نئے خود ساختہ مذہب کی طرح نہیں شروع ہوا۔ وہ قدیم تر ہندو عقاید ہی کی ایک شاخ تھا بلکہ ایک اختلافی یا باغی فرقہ کہا جا سکتا تھا۔ گوتم بدھ ہندو دھرم کی بنیادی اخلاقیات اور مابعد الطبیعات سے متفق تھے، اگرچہ انھوں نے اس زمانے کے رواجوں کے خلاف احتجاج کیا اور ویدوں میں درج مذہبی رسومات ماننے سے انکار کر دیا۔ جب ان سے یہ رسومات انجام دینے کو کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا "تم کہتے ہو کہ میں دھرم کی خاطر وہ یگیہ کروں جو میرے خاندان میں ہوتا آیا ہے اور جس سے مرادیں بر آتی ہیں۔ لیکن میں قربانیوں کے حق میں نہیں ہوں کیوں کہ مجھے اس خوشی سے کوئی خوشی نہیں ہوتی جو دوسروں کو تکلیف دے کر حاصل کی جائے۔"

یہ سچ ہے کہ اپنشد میں بھی یگیہ اور قربانیوں کو مذہب کے روحانی پہلو سے کمتر درجے پر رکھا گیا ہے، لیکن اپنشد میں قربانیوں پر اس شدت سے حملہ نہیں کیا گیا جیسا کہ بدھ نے کیا۔ بدھ کا مقصد اولیں یہی تھا کہ مذہبی رسومات کی اصلاح کر کے مذہب کے بنیادی اصولوں کو پھر سے مرکزِ توجہ بنایا جائے۔ جو لوگ مذہب کے بنیادی ڈھانچے اور اصلی جوہر کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ضمیر کی بیدار آواز سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اوتار مانے جاتے ہیں۔ وشنو نے انسانیت کی بہبودی کی خاطر مختلف پیکروں میں جنم لیا ہے۔ بدھ کو ایک ایسا اوتار مانا گیا ہے جس نے ہندوؤں کو غلط اور خونریز رسومات سے نجات دلائی اور ان کے مذہب کو بہتیری خامیوں سے پاک کیا۔ ہم اوتار کے نظریے کی بدولت قدیم ہندو عقاید کو برقرار اور ان میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی رکھ سکتے ہیں۔ پرانوں میں بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مانا گیا ہے۔

گوتم بدھ نے ہندو مذہب کے برے اثرات دور کرنے کے لئے اسی کے ورثے کو استعمال کیا۔ وہ کچھ بنانے کے لیے آئے تھے بگاڑنے کے لئے نہیں۔ بدھ اپنے ملک کے رہنے والوں کے لئے ان کی مذہبی روایات کے ایک ممتاز ترجمان تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنا نقش اور اس ملک کی روح پر جس میں اس کے عادات و عقاید شامل ہیں اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ بدھ کی تعلیم نے دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں کی روایات کے مطابق الگ الگ امتیازی روپ دھارے، لیکن ان کی تعلیمات خود اپنے وطن میں یہاں کی تہذیب اور کلچر کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ وہ برہمنوں اور شرامانوں سے یکساں سلوک کرتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں کی روایتیں قریب آکر ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ بدھ ایک طور سے جدید ہندو دھرم کے بانی ہیں۔

کبھی کبھی انسانیت ہزاروں برس اندھیرے میں بھٹکنے کے بعد کسی عظیم شخصیت میں اپنے وجود کا مقصد پا لیتی ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد پھر اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے آہستہ رو دھارے پر چھوڑ دیتی ہے۔ بدھ ایک نئے قسم کا آزاد انسان پیدا کرنا چاہتے تھے جو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو اور خود اپنی ذات کو مشعلِ راہ (آتما دیپ) بنا کر اپنا مستقبل سنوارنے میں لگ جائے۔

بدھ کی اس انسان دوستی کے سامنے نسلی اور قومی دیواریں گر گئیں، لیکن آج دنیا میں پھر ابتری اور انتشار پایا جاتا ہے جو انسانی روح کی ابتری اور انتشار کی غمازی کرتا ہے۔ اب تاریخ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع یورپ ہے نہ ایشیا، مشرق ہے نہ مغرب، بلکہ بنی نوع انسان، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان۔ خواہ ہم پسند کریں یا نہ کریں، سیاسی تقسیم کے باوجود دنیا ایک ہے۔ ہر ایک کا نفع نقصان دوسرے کے سود و زیاں سے وابستہ ہے۔ لیکن ہم روحانی طور پر تھک چکے ہیں، ہم میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زبردست "انا" پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ایک عالمی سماج کی آرزو تک ناز شوار معلوم ہوتا ہے۔ آج ہمیں دنیا کو روحانی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے ہمارا ملک۔ بہت سی غلطیوں اور خامیوں کے باوجود ہمیشہ اسی نقطۂ نظر کا علم بردار رہا ہے۔ ممکن ہے ایک بار پھر یہی نظر ہماری رگ و پے میں جان ڈال دے اور زندگی کے مقفل دروازوں کو توڑ کر اس کے روشن دریچے کھول دے۔ اس کے لئے ہمیں روحانی آزادی کے گم شدہ نصب العین کو پھر تلاش کرنا ہوگا۔ اگر ہم امن قائم کرنا ہے تو پہلے اندرونی ہم آہنگی اور روحانی توازن پیدا کرنا ہوگا جو امن اور شانتی کے لازمی عنصر ہیں۔ چاہے سب کچھ لٹ جائے ضبطِ نفس ضرور قائم رہنا چاہیئے۔ آزاد روح کی محبت لامحدود ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک میں ابدی حقیقت کا جلوہ دیکھتی اور پہچانتی ہے اور انسانیت کے مفاد کی خاطر بخوشی اپنی قربانی دے سکتی ہے۔ اس کے دل میں غلط کاری کے علاوہ کسی شے کا خوف باقی نہیں رہتا۔ وہ موت اور وقت کی سرحدوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حیاتِ ابدی سے بے پایاں توانائی حاصل کر لیتی ہے۔

اقتباسات از پیش لفظ
"بدھ دھرم کے ڈھائی ہزار سال"

مہاتما بدھ کا پیغام

تقدس مآب کشک بکولا ہنیلا مر لدارخ

آقا بدھ نے جنم جنم میں اپنے ذہن کا تزکیہ کر کے بے شمار کار ہائے حسنہ انجام دئے۔ انھوں نے ایک بودھی ستو کے آدرش پر عمل کرتے ہوئے عالم ذی روح کی خدمت کے لئے بار بار پیکر انسانی اور دوسرے کمتر پیکروں میں جنم لیا۔ آخری بار ایک ساکیہ شہزادے کے طور پر انھوں نے اپنی مملکت کی شان و شوکت اور سامانِ تعیش کو ٹھکرا کر ایک بھکشو بننا پسند کیا۔ چناں چہ اس طرح ادراک خودی کے اعلیٰ ترین منازل طے کرتے ہوئے وہ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے بدھ یا تجلی مآب ہو گئے۔

یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ آقا بدھ کی ڈھائی ہزار دیں یادگار کے موقع پر سارے ہند میں بدھ مذہب کا زبردست احیا شروع ہو رہا ہے جس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ اس مبارک موقع کے جشن میں تقریباً سبھی فرقوں کے لوگ بڑی گرم جوشی سے شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور ضروری یہ ہے کہ ہم آقا بدھ کی تعلیمات کا مطالعہ کریں، اُن پر غور کریں اور اُن پر عمل کریں۔ یہ تعلیمات تری پٹک کے مقدس اوراق میں درج ہیں جنھیں آقا بدھ کے تین عالم شاگردوں کشیپ، آنند اور اُپالی نے بڑی کاوش سے جمع کیا تھا اور جو تبت اور کئی دوسرے ملکوں میں اب تک محفوظ ہیں۔

اوّل ہمارے لئے شیل یعنی اخلاقِ حمیدہ کے دس اصولوں کا پابند رہنا ضروری ہے۔ یعنی قتل، زنا، استحصال، جھوٹ، چغلی، فضول گوئی، سخت کلامی، لالچ، تنفر اور غلط نظریوں سے سخت پرہیز لازمی ہے۔ دوم ہمیں کرم یعنی علت و معلول کا قانون سمجھنا ہے اور اسی کی روشنی میں اپنے طور طریقوں کو درست کرنا ہے۔ سوم یہ کہ ہمارے لئے تینوں رتن یعنی بدھ، دھرم اور سنگھ کی اعلیٰ خصوصیات کی آگاہی اور ان سے اپنی عقیدت کو پختہ کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی ذات میں محبت اور ترحم کا جذبہ پیدا کریں اور بودھی ستو کے آدرش کی پیروی کریں۔ چناں چہ اگر ہم مادی اشیاء کو زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور بدھ کی تعلیمات پر عمل کرتے رہیں گے تو اپنی موجودہ زندگی میں خورسند ہوں گے اور وقت آنے پر بدھ کی طرح نجات اور تجلی حاصل کر سکیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی قوموں میں پائیدار امن و اخوت پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ بدھ کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ اس کے لئے سالک کو کسی مرشد کی ضرورت پڑتی ہے جو تری پٹک کا بخوبی ماہر ہو۔ سالک کو چاہیئے کہ وہ تری پٹک پر مختلف ہندوستانی اور تبتی کتابوں اور تفسیروں کا مطالعہ کرے۔ بدھ کی تعلیمات کے مسلسل مطالعے اور اُن پر مستقل عمل کرنے سے ہم رفتہ رفتہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ آخری نجات کی منزل تک پہنچ جائیں۔

(پروفیسر) محمد مجیب

کامل انسان

گوتم بدھ کا ذکر کہاں سے اور کس عنوان سے شروع کیا جائے، اُن کی پیدائش سے، اُن کے نروان حاصل کرنے سے، ہندوستان میں مذہب اور تہذیب کی ابتدا سے یا دین کی اس تعلیم سے جو گوتم بدھ جیسی شخصیتوں کو انسانیت کے وجود کا سبب اور مقصد مانتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کہیں سے بھی شروع کریں، اصل بات بیان نہ کی جا سکے گی کہ بدھ ہونے، نروان حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ راجہ پسینڈی کے سوال پر کہ گوتم بدھ نے جیتے جی نروان کیسے حاصل کر لیا بھکشنی کھیما نے جواب دیا تھا:

"کامل انسان (یعنی گوتم بدھ) کے وجود کا حساب مادی دنیا کے اعداد میں نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اس سے بالاتر ہے۔ .... اس کی گہرائی ایسی گہرائی ہوتی ہے جسے ناپا نہیں جا سکتا، جس کی تہ تک ہم نہیں پہنچ سکتے جیسے کہ مہا ساگر کی۔ یہ کہنے سے بات صحیح صحیح بیان نہیں ہوتی کہ کامل انسان موت کی حد کے اِس طرف (یعنی زندہ) ہوتا ہے، یا یہ کہنے سے کہ وہ موت کی حد کے اُس طرف نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ وہ موت کی حد کے اِس طرف ہے نہ اُس طرف۔"

کامل انسان اور اس کے مقام کی یہ تعریف ایسی ہے جو عقل اور تصور کو عاجز کر دیتی ہے، لیکن آدمی کا تجسس شکست کو تسلیم کرنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ بدھ مت [illegible] کے اس عقیدے کے ساتھ ساتھ کہ گوتم بدھ نے ان مسائل کے بارے میں کوئی تعلیم نہیں دی ہے کہ انسان کا کوئی جداگانہ مستقل وجود ہے یا نہیں ہے، اور کامل انسان مادی موت کے بعد زندہ رہتا ہے یا نہیں رہتا، خود گوتم بدھ کی زندگی کے حالات اور واقعات اس طرح بیان کئے جانے لگے کہ گویا وہ مادی طور پر وجود کی تمام پابندیوں اور مجبوریوں سے بری تھے۔ ممکن اور ناممکن کا فرق مٹا دیا جائے تو اس سے اُلجھن ہوتی ہے، لیکن گوتم بدھ کے حالات پڑھتے وقت ہمیں احساس ہو کہ ایک اعلیٰ حقیقت کو ناحق افسانہ بنا دیا گیا ہے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ حقیقت کو صحیح صحیح بیان کرنا بہرحال امکان سے باہر تھا۔ قرآن میں جگہ جگہ رسول اللہ کو خدا کا بندہ اور پیغمبر کہا گیا ہے، اور رسول اللہ برابر اصرار کے ساتھ فرماتے رہتے کہ وہ معمولی انسان ہیں، مگر ہم اُن تمام روایتوں کو نہ مانیں جو پیغمبر کے معمولی انسان ہونے میں شبہ پیدا کرتی ہیں تو پھر نبوت کی اصل شان چھپ جاتی ہے۔ گوتم بدھ معمولی انسان بھی تھے، لیکن ان کی تاریخی اور دینی حیثیت بیان ہی نہیں ہو سکتی اگر ہم انہیں صرف ایک معمولی انسان سمجھ کر بات شروع کریں۔

اسی مسئلے پر دوسرے طریقے سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ بدھ مت کی کتابوں میں گوتم بدھ کی تعلیم کا اثر دکھانے کے لئے ایک مقرر طریقہ، ایک فارمولا ہے جو بار بار ملتا ہے۔ گوتم بدھ سے جس کو عقیدت ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے "جیسے کسی نے ایک چیز کو جو کہ گری پڑی تھی اُٹھا کر سیدھا رکھ دیا، یا جو چھپی تھی اسے نظروں کے سامنے کر دیا، یا ایک بھولے بھٹکے کو صحیح رستہ بتا دیا، اندھیرے میں روشنی لے آیا تاکہ آنکھوں والے ہر چیز کی شکل کو دیکھ سکیں۔" انسان کو اس طرح سے بیدار اور فطرت اور حقیقت سے آگاہ کرنا دراصل اسے اپنی توفیق کا احساس دلانا ہے۔ توفیق کسی میں کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ، ہر انسان اپنی توفیق کے مطابق کامل بھی ہو سکتا ہے۔ گوتم بدھ خود کامل تھے، ان کے پیرووں میں سے کئی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی کامل ہو گئے۔ ان کو اور ان کے پیرووں کو برابر کا مرتبہ دینا صحیح نہ ہوگا، لیکن ان میں سے کسی کی بزرگی کا اندازہ الفاظ یا "مادی دنیا کے اعداد" ہی کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت نگاری حقیقت کو بیان نہیں کر سکتی۔ صرف اسے محدود اور مختصر کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ مثالوں سے کام لیتے ہیں اور مثالوں کے ذریعے حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والو

میں توفیق کی کمی ہو تو مثالیں ذہن اور دل میں روشنی پیدا کرنے کی بجائے عقل کو حیران کرنے والی داستانیں بن جاتی ہیں۔

گوتم بدھ کی زندگی کے ابتدائی دور کا جو نقشہ بدھ متی روایات میں ملتا ہے وہ ایک مثال ہے۔ انسان کی طبیعت زندگی میں استقلال چاہتی ہے، لیکن اس میں انقلاب پسندی کا میلان بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے خاندان، سماج اور سماجی قانون سب کو استقلال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ کسی نظام کو قائم رکھنا خود ایک مقصد بن جائے تو حق تلفی، بے انصافی، تشدد اور ظلم کرنا بھی لازمی سا ہو جاتا ہے، اور یہ ایک محرک ہوتا ہے ان لوگوں کے لئے جنھیں بہتر زندگی کی آرزو ہوتی ہے۔ آپ کو تاریخ اور مختلف راہبوں کی روایات میں ایسی مثالیں ملیں گی کہ ایک حادثے یا صدمے نے آدمی کی زندگی کا نقشہ بدل دیا، اور پھر اس نے اپنی توفیق کے مطابق اپنی اور اپنی دنیا کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ گویا وہ ہیں جو خارجی اثرات کے جگانے سے جگ گئے، اور ان کا مرتبہ اُن لوگوں سے بہت بلند مانا جاتا ہے جن کی نیند میں خارجی اثرات سے کچھ خلل تو پڑ سکتا ہے مگر وہ اُچاٹ نہیں ہوتی۔ گوتم بدھ کا تنبہ خارجی اثرات سے بے نیازانہ تھا۔ انھوں نے وہی سب دیکھا جو ہم سب دیکھتے ہیں، بڑھاپا، بیماری، موت، اور ان کی توفیق نے اسے گوارا نہ کیا کہ وہ چین سے زندگی گزاریں اور دکھ کے مسئلے کا حل نہ نکالیں۔

ان کا زمانہ روحانی بےچینی کا زمانہ تھا اور یہ کوئی غیرمعمولی بات نہ تھی کہ لوگ اچانک گھر بار چھوڑ کر بن باس اختیار کرلیں۔ ان میں بعض مخلص ہوتے تھے اور سچے دل سے حق کی تلاش میں نکلتے تھے۔ لیکن حق کی تلاش میں بھی آدمی تھوڑی دور جا کر رُک سکتا ہے، بہک سکتا ہے، گمراہ ہو سکتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ایسے سادھو اور سنیاسی تھے جو بہت ریاضتیں کرتے تھے، بہت کم کھاتے تھے اور وہ بھی لمبے وقفوں کے بعد، منہ، ہاتھ اور بدن کو صاف نہیں کرتے تھے، کیلوں اور کانٹوں کے آسنوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھیں زندگی کا مقصد طہارت معلوم ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اشنان کرتے رہتے تھے، کچھ ایسے خبطی بھی تھے جو چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے اور انھیں کی طرح کھانا کھاتے اور پانی پیتے تھے۔ خبطی اور سمجھ دار سب ایک طرح کا ذہنی سکون چاہتے تھے، اور اس وجہ سے فلسفیانہ بحثوں اور مناظروں کا بڑا چرچا تھا۔ گوتم بدھ کی توفیق نے انھیں فضول کوششوں اور تجربوں سے بچایا مگر انھوں نے کسی معقول بات کو سننے، کسی معقول مسلک کو آزمانے سے انکار نہیں کیا۔ روایت یہ ہے کہ انھوں نے ایسے عالموں کی پیروی کی جنھوں نے وحدت الوجود کے مسلک کو اختیار کیا تھا، مگر اس سے انھیں تسلی نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس میں عمل کی کوئی تعلیم نہیں تھی، اور اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا جو اخلاقی اعتبار سے مفید ہو۔ عمل کا موقع تپسیا میں زیادہ نظر آیا۔ گوتم بدھ نے بڑی سخت ریاضتیں کیں، لیکن اس سے بھی مقصد حاصل نہ ہوا۔ ان دونوں مسلکوں پر چلنے کی کوشش کا اثر یہ ہوا کہ ان کا ذہن اور ان کی طبیعت اس حقیقت کی حامل بننے کے لئے تیار ہو گئی جس کی انھیں جستجو تھی۔ حقیقت کا ان پر الہام ہوا۔ یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ الہام کیسے ہوتا ہے۔ بعض بدھ متی روایات ہیں جن میں معرفت کے اس لمحے کو خیر و شر کے مقابلے کی ایک رزمیہ داستان بنایا گیا ہے اور اس میں گوتم بدھ کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک مثال ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جسے بیان کرنا انسان کے امکان میں نہیں۔

اس علم نے جو اس وقت گوتم بدھ کو حاصل ہوا، انھیں کامل انسان بنا دیا۔ اس اصطلاح کا مطلب بدھ متی فلسفیوں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی تصوف میں بھی "انسانِ کامل" فلسفہ مذہب کا ایک نظریہ ہے، ایک تصور جس میں الوہیت اور انسانیت کی آمیزش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی ذات کی بدولت اس طرح کی آمیزش نہ ہو تو الوہیت اور انسانیت دونوں ظہور کے محتاج رہ جاتے ہیں۔ لیکن کامل انسان کو اس شخص کی نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جو صرف دیدار کا طلب گار ہو اور یہ مانتا ہو کہ آنکھ کی بینائی اور ذہن کی رسائی کا مدار دل کی بیداری پر ہے۔ ایسا شخص گوتم بدھ میں علم، حسن اور ان اخلاقی صفات کو تلاش کرے گا جنھوں نے ان کو کامل خیر کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اسے یہ مغالطہ نہیں ہوگا کہ اسے ایک دو مرتبہ دیکھنے سے سب کچھ نظر آ جائے گا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی بینائی گوتم بدھ کے حسن سے فروغ پائے گی، اس کا علم ان کے طریقے پر چلنے سے ترقی کرتا رہے گا اور اس کے دل پر کیفیتیں گزریں گی جنھیں اس کی زبان بیان نہ کر سکے گی، مگر جو اس کی شخصیت کی تکمیل کرتی رہیں گی۔

ایک مرتبہ گوتم بدھ نے ایک درخت کی چند پتیاں توڑیں اور اپنے چیلوں سے پوچھا کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں زیادہ پتیاں ہیں یا اس جنگل میں جو تمھارے سامنے ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ جنگل میں پتیاں زیادہ ہیں۔ گوتم بدھ نے کہا کہ میرے ہاتھ میں جو پتیاں ہیں وہ میرے علم کا وہ حصہ ہیں جو میں نے تم تک پہنچایا ہے، اور جنگل کی پتیاں میرے علم کا وہ حصہ ہیں جو میں نے تم کو

نہیں بتایا ہے، اس لئے کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ گوتم بدھ کے بیشتر پیروؤں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہوگی کہ علم کو پوشیدہ رکھنے میں بڑی مصلحت ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم اور عمل میں تناسب اور ہم آہنگی علم کو محدود کر کے قائم رکھی جائے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت صحیح عمل کے ذریعے بنتی ہے، اور جب تک پوری شخصیت کی نشوونما نہ ہو، خالص ذہنی جدوجہد ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اگر صحیح عمل کے ذریعے شخصیت کی نشوونما ہوتی رہے تو انسان علم کی پیاس بجھانے کے لئے مارا مارا نہیں پھرتا، خود علم کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ گوتم بدھ کو یقین تھا کہ ان کے زمانے میں مذہبی غور و فکر نظریات کا ایک جنگل بن گیا ہے جس میں سب بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ایسے شخص کے لئے جو کامل علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو کسی سوال کے جواب میں خاموش رہنا یا یہ کہنا کہ اس بارے میں میں نے کوئی تعلیم نہیں دی ہے ایک عجیب سی بات ہے، مگر گوتم بدھ نے برابر یہی کہا۔ دنیا فانی ہے یا غیر فانی، محدود ہے یا غیر محدود، روح اور جسم ایک وجود ہیں یا الگ الگ، جو شخص معرفت حاصل کر لیتا ہے وہ موت کے بعد زندہ رہتا ہے یا نہیں رہتا، یہ سب سوال گوتم بدھ سے کئے گئے اور ہر دفعہ انھوں نے جواب دیا کہ "یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں میں نے کوئی رائے نہیں دی ہے۔" وہ دین اور دینی علم کو منطقی اور فلسفیانہ مسائل کی چاٹ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ "بھکشوؤ، جیسے مہاساگر کے سارے پانی کا ایک مزہ ہے، یعنی نمک کا مزہ، ویسے ہی ہماری اس تعلیم اور اس تنظیم میں صرف ایک ہی مزہ ملتا ہے، اور وہ ہے نجات کا مزہ۔" جو شخص علم اور عمل کے تناسب کو اور اس یک جہتی کو دین کے لئے لازمی نہ سمجھے وہ گوتم بدھ کی عظمت کا صرف زبانی اعتراف کر سکتا ہے، جو لازمی ملنے وہ دیکھے گا کہ یہ علم معرفت کی کنجی ہے۔

تناسب صرف علم اور عمل کے درمیان نہیں بلکہ عمل اور حوصلے کے درمیان بھی ہونا چاہئے۔ گوتم بدھ نے عمل میں بیچ کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی، اور خود بھی اسی طریقے پر چلے۔

"بھکشوؤ، انتہا پسندی کی دو شکلیں ہیں، جن سے اس شخص کو بچنا چاہئے جس نے کہ نجات کی خاطر دنیا کو ترک کر دیا ہے..... (ایک تو) ایسی زندگی جس کا مقصد عیش پرستی ہو، جس میں عیش پرستی اور ہوس رانی کے سوا کچھ نہ ہو، یہ ذلیل کرتی ہے، شہوت میں ڈوبی، بیہودہ اور کمینی ہوتی ہے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا (دوسرے) ایسی زندگی جس کا مقصد نفس کو ایذا پہنچانا ہو۔ یہ تکلیف دہ، کمینی اور لاحاصل ہوتی ہے۔"

"انتہا پسندی کی ان دونوں شکلوں سے بچنے کی وجہ سے تتھاگت (یعنی خود گوتم بدھ) نے اس بیچ کے راستے کا علم حاصل کیا جو بصیرت کی طرف، دانائی کی طرف لے جاتا ہے، جس سے سکون پیدا ہوتا ہے، گیان، معرفت، نروان حاصل ہوتا ہے۔"

بیچ کے راستے پر چلنے کے مسلک کی بہت ہی دل آویز وہ نصیحت ہے جو گوتم بدھ نے اپنے ایک چیلے سون کو کی تھی۔ سون ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان تھا، اور بھکشو بننے کے بعد وہ اپنے نفس پر اس طرح قابو نہ پا سکا جیسے کہ وہ چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ پریشانی میں وہ ٹہلنے لگا، اور اتنا چلا کہ تلوے زخمی ہو گئے۔ گوتم بدھ کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے سون سے سوال کر کے سمجھایا کہ جیسے تاروں سے ٹھیک سُر اسی وقت نکلتے ہیں جب وہ نہ زیادہ ڈھیلے ہوں نہ زیادہ کسے، ایسے ہی انسان کی طبیعت اپنے جوہر اسی وقت دکھاتی ہے جب اس پر نہ جبر کیا جائے نہ اسے ڈھیل دیا جائے۔ "اس لئے اے سون، استقلال کے ساتھ جدوجہد میں ہمواری پیدا کرو، کوشش کر کے اپنی ذہنی قوتوں میں ہمواری قائم کرو۔"

اگر انسان کی فطرت میں حسن ہے تو وہ اسی طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس کے علم، اس کے عمل اور اس کے مقاصد میں ایک خاص تناسب ہو۔ یہ تناسب کسی منطقی اصول، کسی نظریے کو اپنے اوپر مسلط کرنے سے نہیں پیدا کیا جا سکتا، اس کا راز وہ خود شناسی ہے جس کا تصور ہمیں ہر مذہب اور ہر تہذیب میں ملتا ہے، لیکن جس کی جیتی جاگتی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں "کسی چیز کی فطرت ہم اس کی اس شکل کو کہتے ہیں جب وہ تکمیل پا چکی ہو۔" ارسطو کا یہ مقولہ صرف یونانیوں کا ایک نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی ترجمانی کرنے کی کوشش ہر تہذیب نے کی ہے۔ فطرت کو اس معنی میں بدھ مذہب اور اسلام نے ایک معیار مانا ہے، اور اسی وجہ سے ان میں "کامل" اور "انسان" کے تصور میں تضاد نہیں مانا گیا ہے، بلکہ دونوں تصورات کے مل کر ایک ہو جانے کو نشوونما اور عروج کا سب سے بلند مقام سمجھا گیا ہے۔

انسان اپنی فطرت کے مطابق اپنی تکمیل کی کوشش کرے تو اسے بہت سی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جہاں یہ مخالف مشخص ہوں، بات سمجھانے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی دشمنوں سے، غلط اور مضر خیالات سے، بے انصافی اور ظلم پر مبنی سماجی یا سیاسی نظام سے لڑے تو یہ دکھایا جا سکتا

ہے کہ اس نے انسانیت کی اصلاح اور تکمیل کے لئے جد وجہد کی اور اس طرح اپنے اندر اعلیٰ اوصاف بھی پیدا کئے۔ لیکن اس میں اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم جد وجہد کے لئے کسی مخالف کا ہونا لازمی سمجھیں، ہماری نظر متعلقہ کیفیتوں پر رہے اور ہم اس مغالطے میں پڑ جائیں کہ انسان کی تکمیل خارجی اثبات کا نتیجہ ممکن ہے۔ گوتم بدھ کے خلاف اُن کا چیلا اور رشتہ دار دیودت سازشیں کرتا رہا، شیطان نے انھیں ورغلانے کی کوششیں کیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا محرک ان کا اپنا ارادہ تھا، اور ان کے مخالف وہ رجحانات تھے جو انسان کو مادی زندگی کی پابندیوں، اس کی ناپائیداری، اس کے "دکھ" کو تسلیم اور برداشت کرنے پر آمادہ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے گوتم بدھ کی تعلیم میں صرف ایک پہلو ہے اور وہ اثباتی ہے، اور تردید یا نفی کی شکل یہ ہے کہ ان میلانات کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کی ترقی اور تکمیل کو روکتے ہیں۔ گوتم بدھ کی شخصیت اپنے حُسن سے ممتاز ہے، وہ ایسا چراغ نہیں ہے جس کی روشنی گرد وپیش کی تاریکی کی دست نگر ہو۔ گوتم بدھ کے معاملوں میں بھی ایسا ہی حسن ہے۔ انھوں نے ذات پات کی تقسیم کو مٹانے کی کوشش نہیں کی، مگر اسے تسلیم بھی نہیں کیا اور اس کی تعلیم دیتے رہے کہ شرافت کا معیار خاندان نہیں بلکہ عمل اور اخلاق ہیں۔ ہم کو شاید زیادہ تسلی ہوتی اگر انھوں نے ذات پات کے بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی ہوتی، لیکن ان کی نظر میں "دکھ" کا جو تصور تھا اسے دیکھتے ہوئے ان بندھنوں کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ انھیں توڑنا ایک الگ مقصد بنایا جائے۔ ایک مرتبہ وہ ویسالی گئے، اور وہاں کی بہت مشہور طوائف امبہ پالی نے ان کی اور ان کے چیلوں کی دعوت کی۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد ویسالی کے شرفاء کی ایک جماعت اُن کے پاس آئی اور اپنے یہاں ان کی دعوت کی۔ انھوں نے کہا کہ میں امبہ پالی کی دعوت قبول کر چکا ہوں، اب میں اس کے یہاں

جانے سے انکار نہیں کر سکتا۔ آخری کھانا جو انھوں نے کھایا چنڈا لوہار کے یہاں تھا۔ یہاں سوٗر کی طرح کی کوئی چیز تھی جو سڑ گئی تھی۔ اسے چکھتے ہی انھوں نے میزبان سے کہا کہ اس چیز کو صرف میں کھاؤں گا اور جو کچھ بچے اسے دفن کر دینا۔ اس طرح انھوں نے میزبان کا دل رکھ کھانے بیٹھا ہے چیلوں کو بچا لیا۔ اس چیز کے کھانے سے انھیں پیچش ہو گئی اور جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی حالت خراب ہے اور وہ جانبر نہ ہو سکیں گے تو انھوں نے اپنے خاص شاگرد آنند کو بلایا اور کہا کہ دیکھو، چنڈا سے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میری موت کا سبب وہ کھانا تھا جو میں نے اس کے یہاں کھایا اور اس سے چنڈا کو ندامت اور تکلیف ہو سکتی ہے۔ تو تم اس سے اور سب سے کہنا کہ میں نے اپنے کانوں سے بدھ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ سب سے متبرک وہ کھانا ہے جسے کھا کر بدھ دنیا سے رخصت ہوا اور بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کے یہاں یہ کھانا کھلایا جائے۔

گوتم بدھ نے اپنا معمول بیان کرتے وقت ایک مرتبہ کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے الگ جا کر بیٹھ جایا کرتا ہوں اور محبت کے اس جذبے کو جو میرے اندر ہے ساری دنیا میں پھیلاتا ہوں۔ ان کی یہ محبت خالص خیر خواہی تھی جسے کسی طرح مشتعل نہیں کیا جا سکتا، سوا اس کے کہ ہم کہیں کہ وہ ساری مخلوق میں خود شناسی اور حقیقت شناسی کی تڑپ پیدا کرنا اور اس طرح اسے کمال اور نجات کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ عقیدت مندوں نے ان کی پرستش اختیار کی اور انھیں بلند ترین مقام دے کر انھیں اپنے آپ سے دور کر دیا۔ ہمارے زمانے میں عقیدت مندوں نے ان کی تعلیمات کا مطالعہ خود اپنی اُلجھنوں کو مٹانے کے لئے کیا ہے، اور انھیں ایک عظیم الشان رہبانی مانیت کے فلسفے کا مجسمہ فرض کر لیا ہے۔ دراصل کامل انسان کے دیدار کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ ہم صرف ان چیزوں کو بیان کرتے ہیں جو ہم پر جاہلی کی ہوئی نظروں پڑتی ہیں۔

بچوں کا عجائب گھر

حکومت ہندوستان ایک منصوبہ تیار کر رہی ہے جس میں سات لاکھ روپے کے خرچ سے بچوں کے لئے ایک شاندار عجائب گھر تیار ہو رہا ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ (۱) گڑیوں کا شعبہ (۲) بچوں کی تیار کردہ تصویروں، کھلونوں اور کاریگری کے نمونوں کا شعبہ (۳) تاریخ فطرت سے متعلق شعبہ

تجویز ہے کہ اس عجائب گھر کے لئے دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے بچوں کے بنائے ہوئے کھلونے، تصویریں اور گڑیاں وغیرہ حاصل کی جائیں۔

اُمید ہے کہ عجائب گھر دوسرے پنج سالہ پلان کے دوران میں مکمل ہو جائے گا۔ سال رواں کے بجٹ میں اس کی عمارت کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے۔

رادھا کمد مکرجی

بدھ مذہب میں تعلیم اور خانقاہی تربیت

ہر مذہبی نظام اپنے لئے ایک خاص طریقۂ تعلیم کی تشکیل کرتا ہے۔ اس سے وہ اپنے پیروؤں کی تربیت کرتا ہے۔ مذہبی نظام کی مقبولیت اور ترقی کا انحصار انھیں پیروؤں پر ہوتا ہے۔ انھیں نے مذہب کی معنویت، صداقت، نظریۂ تصورِ حیات اور دستور کی زندہ مثال اور چلتا پھرتا نمونہ ہونا چاہیئے۔ بے شک یہ بات صحیح ہے کہ بودھ فلسفہ ویدانت کے فلسفے سے پیدا ہوا ہے، اور اس کا نظام تعلیم بھی برہمچاریہ کے اصولوں اور دستوروں پر قائم برہمنی نظام سے متاثر ہوا ہے۔ برہمنی نظام میں برہمچاریہ کی تعلیم استاد کے گھر ہی میں دی جاتی تھی۔ طلباء کی حیثیت استاد کے "انتے واسیوں" یعنی خاندان کے رکن کی ہوتی تھی۔ اس طرح استاد کا گھر گویا ایک مکمل اسکول تھا۔ بودھ نظام میں اس کی جگہ "وہار" نے لے لی۔ "وہار" کے اجتماعی نظام اور بہتر تنظیم میں طلبا کے لئے اجتماعی زندگی گذارنے کے زیادہ مواقع تھے۔ بودھ نظام کا مقصد تھا کہ "وہار" میں زیادہ منظم تعلیم و تربیت کی مدد سے پیروؤں یا فقیروں کا ایک ایسا حلقہ بنا لیا جائے جو تمام برائیوں سے پاک اور ہر لحاظ سے ممتاز ہو۔

نظام تعلیم

بودھ نظام تعلیم میں تعلیم کا دائرہ انھیں لوگوں تک محدود ہے جو ترک دنیا کر چکے ہیں اور اپنشد کے نظریے کے مطابق فقیری کی زندگی اپنا چکے ہوں۔ اپنشد میں کہا گیا ہے

"جو لوگ ذہین اور عقل مند ہیں انھیں اولاد کی آرزو نہیں ہوتی۔ جن کا گھر "آتما" ہے، ان کے لئے اولاد کی کیا اہمیت ہے؟ وہ بیٹوں کی آرزو ترک کر دیتے ہیں، دولت کے لئے جد و جہد کرنے اور دنیاوی بہبود کے لئے تگ و دو کرنے سے باز آجاتے ہیں اور فقیری زندگی اپنا لیتے ہیں۔"

لیکن عام طور پر برہمنی نظام میں ترک دنیا کی مختلف منزلوں میں سے زندگی کی دو آخری منزلوں یعنی پری براجک آشرم اور سنیاس کا ہی تصور ملتا ہے۔

بودھ مذہب کی تعلیم یا اس میں شریک ہونے کی پہلی منزل کو "پبجّہ" کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "آگے جانا" یا اپنی پہلی حالت سے نکل جانا"۔ اس طرح ہر ذات کے لوگوں کے لئے اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "وہ جب اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر بے گھر ہو جاتے ہیں تو ان کے پرانے نام اور حسب و نسب کا وجود اسی طرح نہیں رہتا جس طرح ندیاں سمندر میں اپنا وجود کھو دیتی ہیں"۔ برہمنی نظام میں بھی شاگرد اپنے والدین کے گھر کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن تعلیم کے لئے وہ جب استاد کے گھر میں جا کر رہ جاتا ہے تو یہ اس کا نیا گھر ہو جاتا ہے۔ تب اس کو "برہم چاری" کا لقب ملتا ہے۔ بودھ نظام میں یہ لقب "سرمنیر" کا ہے۔ فقیری کی پہلی منزل "پبجّہ" کے بعد دوسری منزل "اپ سمپدا" کی ہوتی ہے جس کے بعد فقیری کا پورا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ "اپ سمپدا" کی تکمیل کے لئے صرف ایک استاد کی تصدیق کافی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس مقصد کے لئے جمہوری طریقے پر ساری ملت یا "سنگھ" کی مجلس ضروری سمجھی جاتی تھی۔ فقیری کا درجہ پانے کے بعد بھی شاگرد دو استادوں کی نگرانی میں رہتا تھا۔ یہ استاد اچاریہ اور اپادھیائے کہلاتے تھے۔ اول الذکر استاد مذہبی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا اور مؤخر الذکر کی حیثیت ایک نگراں کی ہوتی تھی۔ اول الذکر کے اس رشتے کی مدت چھ سال اور آخر الذکر کی دس سال ہوتی تھی۔

خانقاہی زندگی

خانقاہوں کی زندگی اصولوں کی پابند ہوا کرتی تھی۔ ان اصولوں کا اطلاق

غذا اور زندگی کی دوسری ضروریات پر ہوتا تھا۔ غذا کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی تھی۔ (۱) سخت جیسے بسکٹ، روٹی، گوشت، پھل اور (۲) نرم جیسے اُبلا ہوا چاول اور ترکاری۔ مندرجہ ذیل عمدہ چیزوں کے استعمال کرنے کی بھی اجازت تھی:۔ گھی، مکھن، تیل، شہد، گُڑ، مچھلی، گوشت، دودھ اور دہی۔ مذہبی کتابوں میں مٹھائی، چاول کی روٹی، دودھ کی چیزیں جیسے دہی اور پنیر، ترکاری جیسے سیم اور خاص طور پر مزے دار شوربا، پھلوں کا رس اور پتیوں، پھولوں اور جڑی بوٹی سے بنائی گئی پینے کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے (مہا وگا ۶، ۳۴، ۲۱، ۳۵، ۱۶، ۲) تیز شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع تھا (پتی موکھا) مہمان نوازی کی ایک مشہور مثال مگدھ کے مینڈک کے بارے میں دی جاتی ہے۔ دعوت ختم ہونے کے بعد بھی وہ سنگھ کے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کے ساتھ "نمک، تیل، چاول اور خشک غذا سے لدی ہوئی گاڑیاں اور ۱۲۵۰ گوالے تھے۔ ہر گوالے کے پاس ایک گائے تھی تاکہ ہر ایک بھکشو کو تازہ دودھ پیش کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ سخت اور نرم دونوں طرح کی میٹھی چیزیں پیش کی جاتی تھیں"

(مہا وستو ۳۴، ۱۷۷)

بھکشوؤں کا لباس تین حصوں میں بٹا ہوتا تھا۔ اُسے "تِچی ور" کہتے تھے۔ تینوں حصے 'انتر وسک'، 'اُتر سنگ' اور 'سنگھیتی' کہے جاتے تھے 'انتر وسک' کمر کے گرد اندر پہننے کا کپڑا تھا اسے کسی کپڑے کے سرے سے یا ایک پٹکے سے جسے 'کایہ بندھن' کہتے تھے، باندھ لیا جاتا تھا۔ 'اُتر سنگ' ڈھیلا جامہ تھا جو کمر سے کر ٹخنے تک پیروں کے گرد لپیٹا جاتا تھا اس کا ایک سرا داہنی جانگھ سے ہوتا ہوا بائیں کندھے تک جاتا تھا اور پیٹھ پر جھولتا رہتا تھا" (چُلاوگ، ۵ × ۱۷) "سنگھیتی" کو "کمر اور پیٹھ کے گرد لپیٹا جاتا تھا اسے ایک ٹپکے سے باندھا جاتا تھا۔"

لباس کے سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ "وہار" میں کپڑے تیار کرنے کے تمام ساز و سامان مثلاً کرگھا، تلی، سوئیا اور وہ تمام چیزیں جو کرگھا چلانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں موجود رہتی تھیں۔ بھکشوؤں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنا لباس خود تیار کریں گے اور بُنائی کے آلات کی مدد سے اُسے ہمیشہ اچھی حالت میں رکھیں گے (چُلاوگ ۷-۱۱) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو بھکشو کسی دستکاری کا کام نہیں کریں گے وہ کسی بھی مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

بودھ مدرسے

بدھ اور اُن کے سنگھ کے لئے جو خاص 'وہار' قائم کئے گئے تھے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) راج گرِیہہ میں بیلُو وَن، ویٹوون اور ستیاون۔ (۲) سراوستی میں جیتون اور پوروارام (۳) ویشالی میں مہاون اور کُٹی گر (۴) کپل وستو میں نگرودھرم۔ کوسمبی میں "گھوشت رام" اور پاوا میں "چنڈا کے آم کے درختوں کے جھنڈ" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس زمانے میں یہ تمام وہار اعلیٰ تعلیم کے مرکز تھے۔

بودھ مدرسوں میں طلبا کو اُن کے خصوصی مضامین کے مطابق مندرجہ ذیل چار درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

(۱) سُتنت (۲)، ونیئے (۳) دھم (۴) چار "جھنوں" پر مشتمل مراقبے کی مشق۔

درس و تدریس کی زبان کے متعلق بُدھ نے حکم دیا۔ "اے بھکشوؤ! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک میرے پیغام کو اپنی زبان میں سیکھے۔"

اسی طرح سنسکرت یا "چھند" کو عوام کے لئے بہت مشکل سمجھا گیا اور ان کو بودھ مذہب کی تعلیم مقامی بولیوں کی وساطت سے دینی پڑی۔

(چُلاوگ، ۵، ۳۳، ۱)

تعلیم زبانی دی جاتی تھی۔ جو چیزیں پڑھائی جاتی تھیں وہ عام طور پر تحریر میں نہیں آتی تھیں اور نہ ہی دستاویزات میں قلمبند کی جاتی تھیں

سنگھ

بدھ پیدائشی جمہوریت پسند تھے۔ انھوں نے سنگھ کی تعمیر ایک جمہوری ادارے کی نہج پر کی۔ تعلیمی اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرنے کے لئے سنگھ کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں کی کارروائیوں کے قانونی جواز کی ضمانت کے لئے کچھ اصول ہوتے تھے۔ جلسے کے لئے کورم کا پورا ہونا ضروری تھا (سُمگ) کورم نہ ہونے کی صورت میں نامکمل سنگھ (ورگ کام م) کوئی قانون پاس کرتا تو اسے باطل (اکام م) قرار دے دیا جاتا تھا۔ کورم کے سلسلے میں دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک افسر پر ہوتی تھی جس کو "گن پورک" کہتے

تھے۔ اس کی حیثیت وہی تھی جو موجودہ قانون ساز انجمنوں میں "وہپ" کی ہوتی ہے۔ سنگھ کا ایک صدر ہوتا تھا جسے "ونیئے دھر" یعنی "ضابطے کا محافظ" کہتے تھے۔ ایک افسر اراکین کے لئے نشستوں کا انتظام کیا کرتا تھا اس کو "آسن پرگیہ پاک" کہتے تھے سنگھ کے سامنے جو موضوع ہوتا اسے تقریر کی صورت میں نہیں بلکہ تحریک کی باضابطہ نوٹس (گیاپتی) کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا (تھا پنیم)، یہ نوٹس تین بار پڑھا جاتا تھا (انوسسونم)۔ اس کے بعد ایک قانون کی حیثیت سے منظور کر دیا جاتا تھا۔ اسے "گیاپتی چترتھ کرم" کہتے تھے۔ سنگھ جو تجویز منظور کرتا تھا اسے سنگھ کرم یعنی سنگھ کا قانون کہتے تھے۔ قانون کی عبارت یا اسے عمل میں لانے کو "کرم وچ" کہا جاتا تھا۔ مباحثے کے بھی اصول تھے۔ مباحثے کا نتیجہ سخت اختلاف (بھنڈن) یا جھگڑا (کلہہ) یا اختلاف رائے (وِیواد) ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی مباحثے کے دوران میں بے معنی (انگیہ) تقریریں بھی ہو سکتی تھیں۔ پہلے اختلافات کو اتفاق رائے کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جب ایسا کرنا مشکل ہوتا تو سنگھ مختلف گروہوں کے رہنماؤں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دیتا تھا۔ نزاعی معاملات اس کمیٹی کو سپرد کر دئے جاتے تھے۔ کمیٹی ان معاملات پر سنجیدگی اور سکون کے ساتھ بحث کرنے کے لئے کسی تنہائی کی جگہ میں اپنا جلسہ منعقد کرتی تھی۔ کمیٹی اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ کرتی تو اسے رائے عام کے فیصلے کی طرح اسے پورے سنگھ کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت نمایندوں کی ہوتی تھی جنھیں سنگھ کی جانب سے نزاعی معاملات (ودپ سیتم) طے کرنے کا کام سونپا جاتا تھا (سم مت)۔ کمیٹی "اُدواہیکا سبھا" کہلاتی تھی۔ اس کے معنی ہیں۔ ایسی کمیٹی جو اپنے اراکین کو کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کر سکے۔ آٹھ اراکین پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک صدر تھا اور دوسرا مشیر۔ مؤخر الذکر اول الذکر کے سامنے مختلف نزاعی معاملات کو سلسلہ وار رکھتا ہے اور بیلٹ کے ذریعے سے دوسرے اراکین کو ہر معاملے پر کئے گئے فیصلے کی اطلاع دیتا ہے۔ (ادفی پیتھ تم سلاکم نکھی پی)

لیکن جب کمیٹی کسی متفقہ فیصلے پر پہونچنے میں ناکام رہتی اور سمجھوتے کے تمام طریقے اور ذرائع بے سود ثابت ہوتے تو معاملہ پورے سنگھ کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا تھا۔ تب سنگھ اکثریت کی رائے سے (بھوتیا سیکنہ) فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طریق کار کو "یدبھوتیا سیکا کریا" (اکثریت کی رائے پر عمل کرنا) کہتے تھے۔

ووٹ کو "چھند" کہتے تھے جس کے معنی آزادی کے ہیں۔ ووٹ آزادی کے ساتھ اور ٹکٹ (سلاکا) کی شکل میں دئے جاتے تھے۔ مختلف نظریوں کی نمائندگی کرنے کے خیال سے یہ ٹکٹ مختلف رنگوں کے ہوتے تھے اور لکڑی سے بنائے جاتے تھے ہر ممبر کو آزادی تھی کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق ایک خاص رنگ کا ٹکٹ منتخب کرے۔ اسے کسی اور کو نہیں دکھلانے کی تاکید کر دی جاتی تھی۔ جو افسر ووٹ لینے کا ذمہ دار ہوتا تھا اسے "سلاکا گہاپک" کہتے تھے (چلاوگ IV، ۱۴، مہاوگ II، ۲۳، ۴۶، ۶ × ۱، ۳، ۵، ۱۰) اس کا فرض تھا کہ ووٹ دینے والوں کے لئے مکمل آزادی بہم پہونچائے اور رائے دہندگی میں پوری غیر جانب داری سے کام لے۔

اعداد و شمار کی زبانی

۱۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے ۸۹ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔

۲۔ بھارت میں کچے لوہے کی پیداوار جولائی ۱۹۵۶ء میں بڑھ کر ۳۲۵۳۰۰ ٹن ہو گئی جبکہ یہی پیداوار جون ۱۹۵۶ء میں ۲۹۱۹۵۰ ٹن تھی۔

۳۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں بھارت نے ۱۱ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے کی مالیت کا ۰۸۷۷۰ ٹن کاجو دوسرے ملکوں کو بھیجا ہے۔

۴۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں چائے کی کھپت ۱۰ کروڑ ۷ لاکھ پونڈ تھی اس کے مقابلے میں ۱۹۵۴-۵۵ء میں چائے کی کھپت ۸ کروڑ ۳ لاکھ پونڈ تھی۔

۵۔ بھارت کا تمباکو ۴۳ ملکوں کو بھیجا جاتا ہے اس سے بھارت کو قریباً ۱۲ کروڑ روپے سالانہ کا غیر ملکی سکہ تبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

تنویر احمد علوی

گوتم بُدھ

ترا شباب نہ بہلا سکیں نغموں سے
کہ اس میں دی تھی جگہ تو نے سرد آہوں کو
بھلا وہ کھائے گا کیونکر فریبِ نقش و رنگ
جو سن چکا ہو غمِ زیست کی کراہوں کو

یہ موجِ آب یہ سبزہ یہ کنجِ گل یہ بساط
یہ سازِ نغمہ کہ فردوسِ گوش ہے جیسے
یہ چاندنی یہ حسیں باندیاں یہ رنگ محل
یہ رقص رہزنِ تمکینِ ہوش ہے جیسے

اسی کے سائے میں صدہا وہ غم کدے بھی ہیں
جہاں یہ رقص یہ نغمہ یہ انبساط نہیں
وہ نامراد بھی بستے ہیں جن کی قسمت میں
یہ جامِ عیش یہ موجِ مئے نشاط نہیں

دکھوں کے بوجھ سے ہے آدمی کی پشت دوتا
جنونِ جوشِ جوانی ہے رنجِ پیری ہے
یہ تیلیاں ہیں قفس کی کہ تارہائے نفس
یہ زندگی ہے کہ افسانۂ اسیری ہے

ہیں بے شمار اگر فاقہ کش تو چند نفوس
دبے ہوئے ہیں یہاں سیم و زر کے ڈھیروں میں
ادھر یہ رنج یہ کچھ دربدر کا بوجھ سے ہے
بھٹک رہے ہیں ادھر قافلے اندھیروں میں

بڑھا تو چشمۂ حیواں کی ظلمتوں کی طرف
کہ زندگی کے لئے آبِ زندگی لائے
سحر کو ڈھونڈنے نکلا سیاہ راتوں میں
کہ گمرہوں پہ ہدایت کی روشنی لائے

یہ موت و زیست یہ آواگون یہ گردشِ وقت
جو چاہو تم تو یہ زنجیر ٹوٹ سکتی ہے
ہے ترکِ دنیا میں مُکتی کا مارگ پوشیدہ
حیات مرگِ مسلسل سے چھوٹ سکتی ہے

وہ فلسفہ جو ضمیروں کو مشتعل کر دے
وہ فلسفہ نہیں فکر و نظر کا دھوکا ہے
تم اُس خدا کو زمان و مکاں میں مت ڈھونڈو
جو خود تمھارے ہی من مندروں میں بیٹھا ہے

غرورِ دولت و ثروت کو توڑنے کے لئے
خدائے دولت و ثروت فقیر بن کے رہے
ذلیل و خوار ہیں جو اُن کی لاج رکھنے کو
عزیزِ چشمِ جہاں بھی فقیر بن کے رہے

گرا کے تو نے روایات کے گھروندوں کو
نژاد و نسل کے دامِ کہن کو توڑ دیا
ہر ایک کے لئے کھولیں نجات کی راہیں
طلسمِ ذات و بت و برہمن کو توڑ دیا

فنا ہوئی ترے پیغامِ انقلاب کی رُوح
وہ زندگی کے حقائق بنے ہیں افسانے
بدل کے وقت نے پھر کچھ حسیں بتوں میں تجھے
سجائے وہی وہم و گماں کے بُت خانے

آج کل - موسیقی نمبر

اس یادگار شمارے کی چند کاپیاں باقی ہیں۔ موسیقی کے موضوع پر یہ شمارہ ایک مستقل یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہایت حسین و جمیل سرورق، درجنوں سہ رنگی اور دوسری تصاویر سے مزین اس شمارے کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی سے طلب فرمائیے۔ جو احباب ماہ اگست ۱۹۵۶ء سے آج کل کے مستقل خریدار بن جائیں گے انھیں یہ شمارہ چندے ہی میں مل سکتا ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے ہے

بشارت فاطمہ

بُدھ مت

"غالباً آپ اس بادشاہ کی کہانی جانتے ہوں گے جس نے چند اندھوں سے پوچھا تھا کہ ہاتھی کس چیز کے مشابہ ہوتا ہے؟ ایک اندھے نے اس کے کان پکڑ کر کہا "پنکھے کی طرح" دوسرے نے اس کے پاؤں پکڑے اور کہا۔ "کھمبے کی طرح" اس حکایت کا اطلاق ان مغربی افراد پر بخوبی ہو سکتا ہے جنھوں نے بدھ مت پر قلم اٹھایا ہے۔" (آرتھر ویلے)[1]

مگر بدھ مت کے سمجھنے میں مفکرین کی یہ بے راہ روی بے سبب نہیں ہے سب سے پہلے ہمیں ان دشواریوں سے واقف ہونا چاہیئے جو بدھ مت کے سمجھنے میں درپیش آتی ہیں۔ یہ دشواریاں کچھ تو زمانی ہیں اور کچھ مکانی، ساتھ ہی ساتھ خود بدھ مت کا مزاج بھی عہدِ جدید کے طالب علم کے لئے بہت پیچیدہ ہے۔ بدھ لٹریچر کا ایک جائزہ ان دشواریوں کو واضح کر دے گا جو تاریخی حیثیت سے پیش آتی ہیں۔

سب سے پہلی دشواری یہ ہے کہ بدھ لٹریچر پر تاریخِ تصنیف اور اکثر اوقات مصنف کا نام بھی نہیں ملتا۔ خود گوتم بدھ کی وفات کی تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وفات کی تاریخ عام طور پر (۴۸۳ ق۔م۔) تسلیم کی جاتی ہے مگر خود بدھ روایات کے مطابق ان کی تاریخِ وفات (۲۵۰ یا ۶۵۲ یا ۵۵۲ یا ۳۵۲ یا کبھی ۲۵۲ ق۔م) بتلائی جاتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ افسوسناک خود بدھ لٹریچر کی توقیت Chronology کی عدم موجودگی ہے۔ لانگ لوا اور سینوباس Longlois and Seignobos نے ایک جگہ تو دلچسپ بات لکھی ہے کہ ایسے مخطوطات جن کے مصنف، تاریخ اور مقامِ تصنیف نہ بتائے جا سکتے ہوں وہ (مؤرخ کے لئے) کسی کام کے نہیں۔[2]

بدھ علماء چونکہ نام و نمود سے بچتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تصانیف پر اپنا نام نہیں لکھا۔ بعض اوقات یوں ہوا کہ کئی لوگوں کی مشترک تصنیف کسی ایک ہی کے نام سے شہرت پا گئی۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے شخصیتوں کی اس گنجلک گتھی کو سلجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاہم اندازاً ان تصنیفات کی توقیت کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی عہد سے بدھ لٹریچر حسبِ ذیل شعبوں میں منقسم ہے:—

۱۔ دھرم: اس میں بدھ مت کے بنیادی اصول درج ہیں

۲۔ ونیہ: اس میں جوگیانہ تنظیم کی تفصیلات درج ہیں۔

۳۔ سوتر یا ابھیدھرم: اس میں وہ باتیں درج ہیں جو خود مہاتما بدھ نے کہی تھیں۔ ان کے مرتب کرنے والوں کے نام عام طور پر معلوم نہیں ہیں

[1] A Text Book of Historical Methods by Conglois

[2] Prof. Arthur Waley

۴۔ شاستر۔ یہ بدھ علماء کی تصنیفات ہیں جو عام طور پر ان کے نام سے مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ ستّانی پاتا سب سے قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مہاوستو اور للت وستار وغیرہ بھی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

ابتدائی عہد میں بدھ ادب کا ذخیرہ بہت کافی تھا۔ ہم تک بہت ہی بچا کھچا پہنچا ہے۔ نیز بدھ مت کی ابتدائی روایات مذہبی اصولوں کو حفظ کرنے کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی چار سو سال تک تقریباً سارا کام سینہ بسینہ اور زبانی چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کو قلمبند کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔

بدھ مذہب چونکہ دنیا بھر کے مختلف حصوں میں پھیلا اس لئے اس پر اہم جغرافیائی اثرات بھی پڑے۔ چین، جاپان، ہندوستان، برما، لنکا، جاوا، سماٹرا، منگولیا اور یورپ جہاں جہاں یہ پھیلا اس کے اصلی رنگ پر وہاں کے جغرافیے کے گہرے اثرات پڑے۔ اس طرح ہمیں بدھ مت کی کئی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ یہ تفصیلات اس وقت ہمارے موضوع سے دور ہیں۔ یہاں بدھ مت کے صرف دو ہی پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک تو اس کا تاریخی اور تدریجی ارتقاء اور دوسرے بنیادی اور مشترک تصورات۔ مشترک تصورات کے ضمن میں ہم اہم بدھ مکاتبِ خیال کا بھی ذکر کریں گے۔

بدھ مت کو سمجھنے میں تیسری اہم دشواری اس کا طرزِ استدلال ہے۔ اوّل تو یہ کہ مہاتما بدھ کے زمانے سے آج تک کے طریقۂ استدلال میں بڑی تبدیلیاں اور بڑا فرق ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ بدھ علماء نے خود کبھی بھی کسی منطق کو ملحوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیں افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات میں منطقی اصولوں کی جو پابندی نظر آتی ہے وہ بدھ ادب میں نظر نہیں آتی۔ بدھ مت کے اصولوں میں ہمیں کوئی پہلو ایسا نہیں ملتا جسے فلسفے کی زبان میں بیان کیا جا سکے۔ ڈاکٹر کونزے نے اس کی بڑی اچھی مثال دی ہے کہ:

"شاید یہ مماثلت صورتِ حال کو واضح کر دے کہ چینی زبان، چینی سمجھتے ہیں مگر اس کی کوئی گرامر نہیں ہے اور چینی زبان بغیر گرامر ہی کے پڑھائی جاتی ہے۔ بعض مغربی ماہرین لسانیات نے لاطینی اصولوں پر اس کی قواعد مرتب کرنا چاہی تھی۔ وہ خیال سود مند ثابت نہ ہو سکی۔ یہی حالت فلسفے کے اصطلاحوں کی بدھ مت کے ساتھ ہے۔" [1]

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بدھ مت میں کوئی معقولیت یا فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی معقولیت اور طرزِ استدلال مخصوص وجوہ کی بنا پر اس کے اپنے طرز کے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بدھ اصول نہایت عملی ہیں۔ بدھ مت مغربی فلسفے کی طرح مظاہر Phenomenon کے "کیوں؟ اور کیسے؟" میں نہیں جاتا۔ بدھ مت میں افکار کی اہمیت نہ تو طریقے Process کی حیثیت سے ہے نہ ہی نتیجے Product کی حیثیت سے ہے۔ وہاں فکر کو عملی افادیت کی کسوٹی پر جانچا پرکھا جاتا ہے۔ ورنہ فکر سے کچھ حاصل نہیں۔ فکر کی اس دنیا میں انسان کی حیثیت مریض کی سی ہے، بدھ مت کے اصول دوا کی ہیں اور مہاتما بدھ کی حیثیت ڈاکٹر کی سی ہے۔

بدھ نظریے کے مطابق کوئی بھی نظریہ مطلق Absolute نہیں ہو سکتا۔ ایک ہی خیال کی دو متضاد سرحدیں برحق ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ منطق میں ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں سچ ہو سکتی ہیں۔ بدھ عقیدے کے مطابق منطق کی قیود اس لئے ختم کی گئی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ روحانی آزادی — اور اس آزادی کے لئے وسیع سے وسیع تر فضا حاصل کی جا سکے۔ بدھ مت نے اس غیر منطقی مزاج میں جو ربط ہے اسے جدلیاتی Dialectic کہا جا سکتا ہے۔ اس کی مثالیں بیشتر ہیں۔ مگر یہاں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ آگے "عقل"، "مراقبہ" اور "ریاضت" کے ضمن میں یہ بات خود واضح ہو جائے گی۔

نیز یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ بدھ فلسفے کو منطق سے اتنا ربط نہیں ہے جتنا نفسیات سے ہے۔ یہ ربط اس کے شدید عملی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے فلسفے کا بیشتر حصہ مابعد الطبیعی نہیں ہے

مہاتما بدھ کی شخصیت

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ بدھ مت میں مہاتما بدھ کی شخصیت کے تین مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ پہلا انسانی مظہر "گوتم بدھ" جو غالباً ۵۶۰ تا ۴۸۰ ق م کے درمیان کا ہے مگر بدھ مت کے پیرو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ گوتم بدھ اس دنیا میں صرف ایک بار نہیں آئے، وہ مختلف روپ میں کئی بار

۱۔ Buddhism--its Essence and Development by Dr. Edward Conze

آ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس بدھ کے انسانی مظہر کی کوئی ایسی زیادہ اہمیت نہیں ہے بلکہ ان کے اس وجود کی اہمیت ہے جو ایک ماورائی مظہر ہے۔

ان کا دوسرا مظہر روحانی ہے۔ بدھ مت کے پیرو اس روپ کو تتھاگت کے نام سے منسوب کرتے ہیں یا ان کا "دھرم شریر" کہتے ہیں۔ لفظ "تتھاگت" کے معنی ٹھیک طور پر آج تک نہ معلوم کئے جا سکے۔ اس کی مختلف توجیہات ہیں۔ ایک معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ "وہ جو اس طرح آیا اور چلا گیا۔" اس سے گوتم بدھ کی بار بار آمد کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا مظہر ان کا انبساطی جسم Enjoyment body ہے۔ یعنی جس انسانی جسم میں وہ اس دنیا میں آئے تھے محض نمائشی اور ظاہری تھا۔ ان کا اصلی روپ اس جسم کے پردے میں پنہاں تھا۔ جس کو صرف ایمان اور وفا کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس جسم سے گوتم بدھ کی شخصیت ظاہر ہوتی تھی۔ اس جسم میں بتیس اہم اور اسی ذیلی نشانیاں تھیں۔ یہ نشانیاں ان کے فوق البشر Superman ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔ ان کا یہ جسم ۱۸ فٹ لمبا تھا چنانچہ ان کے بعض مجسمے اسی قامت کے ہیں۔ ان کے اس جسم سے روشنی نکلا کرتی تھی اور اس کی کرنیں اطراف کو منور رکھتی تھیں۔ یہ روشنی دن رات رہتی اور ان کے گرد ایسا نور رہتا کہ گویا ہزار سورج چمک رہے ہوں یا ہیروں کا ایک پہاڑ جگمگا رہا ہو چنانچہ ان کے اکثر مجسموں میں چہرے کے گرد نور کا ہالا بنایا گیا ہے[1]۔ چوتھی صدی عیسوی میں اس کو عیسائیوں نے اپنایا اور مسیح و مریم کی تصویروں میں چہرے کے گرد یہ ہالا بنایا۔

کیا بدھ مت کوئی مذہب ہے؟

یہ بڑا دلچسپ سوال ہے۔ اس میں بڑے اختلافات بھی ہیں۔ چونکہ بدھ مت میں کسی "خدا" کا وجود نہیں ہے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ مذہب نہیں ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مذہب کے لئے "خدا" کا تصور ضروری نہیں ہے، بغیر خدا کے تصور کے بھی مذہب کا وجود ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بدھ مت اس کی مثال ہے۔

گو بدھ مت نے خدا کے وجود سے کہیں انکار بھی نہیں کیا ہے۔ بدھ مذہب کا مقصد آفرینش کے اول و آخر کی توجیہہ پیش کرنا نہیں تھا۔ بلکہ انسانی زندگی کو آلام سے نجات دلانا تھا۔ اس لئے وہ ان مسائل میں گیا ہی نہیں جو اس کی عملی دنیا سے متعلق نہیں ہیں۔ بدھ مت میں کسی خالق کائنات کا تصور کم از کم ابتدا میں نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے یا کسی کے بھی "اَنا" کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بدھ مت کے پیرو نفی خودی کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات بدھ کا مرتبہ "برہما" سے بھی بڑھا لے جاتے ہیں۔ کیونکہ برہما میں تکبر تھا اور بدھ اس سے پاک تھا۔ کیوں کہ برہما کا کہنا ہے کہ :

"میں برہما ہوں، میں عظیم برہما ہوں، میں دیوتاؤں کا راجہ ہوں۔ مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ میں نے دنیا کو پیدا کیا ہے میں دنیا کا مقتدرِ اعلیٰ ہوں۔ میں تخلیق کر سکتا ہوں، تغیر پیدا کر سکتا ہوں، اور جنم دے سکتا ہوں۔ میں ہر چیز کا باپ ہوں۔"

بدھ مذہب اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تتھاگت اس قسم کی بچکانہ خود نمائی سے بلند تھا۔ خدا کا یہ لامحدود تصور بدھ مت کا اپنا ہے۔

بات دور نکلی جا رہی ہے۔ ہاں تو لا مذہبیت اگر ایسے خدا کے وجود سے انکار کا نام ہے جو "خالقِ کائنات" ہو تو بدھ مت یقیناً مذہب نہیں ہے۔ ایک لامذہب فلسفہ ہے۔

بدھ مذہب کا منتہا "نروان" ہے جو ایک مستقل، مستحکم، لافانی، ناقابلِ انتقال، لازماں اور ناآفریدہ کیفیت ہے جو ایک قوت ہے ایک مسرت ہے، ایک توانائی ہے۔ یہ ایک پناہ گاہ یا آسرا ہے جو اصلی حقیقت بلکہ ارفع حقیقت ہے اور یہی "اعلیٰ" ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کی جنت کی طرح "نروان" کسی دوسری دنیا میں نہیں ہے۔ بلکہ ہم اسے اسی دنیا میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح بدھ فلسفے میں شدید "ارضیت" پائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بدھ مت میں ایک محبت کرنے والے خدا کا تصور بھی ملتا ہے۔ بدھ مت کے پیرو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مذہب انھیں آفات اور بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس میں ان کی اولاد اور خود ان کی بھلائی ہے۔ خود نوشتہ کی خواہش اور اس مذہبی عقیدے میں جو تضاد ہے وہ بدھ فلسفے پر نظر رکھنے والوں کے لئے انوکھا نہیں ہے۔

بدھ مت کے پیروؤں نے غیر شعوری طور پر برہمنوں سے تریدیو تاؤں کو تسلیم کر لیا پھر رفتہ رفتہ انھوں نے جہاں تہاں بدھ کو آدی بدھ کی حیثیت دے دی جو "قادرِ مطلق" اور "دانائے کل" ہے جس نے اپنے دھیان گیان

[1] دیکھئے متھرا کا بدھ مجسمہ سرورق

سے کائنات کو پیدا کیا۔

یہ باتیں بدھ مت کے مذہب ہونے یا نہ ہونے پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

چار مقدس اصول

مہاتما بدھ نے تجلّی کے فوراً بعد بنارس میں یہ چار اصول پیش کئے تھے۔ یہ اصول بدھ مت کے ہر مکتبِ خیال میں یکساں طور پر مانے جاتے ہیں۔ ان چاروں اصولوں پر دھیان گیان کرنا ہی بودھ زندگی کا مرکزی عمل ہے۔ یہ اصول زندگی کی نہایت حقیقت کے ضامن ہیں:۔

(۱) جب کوئی چیز مسرّت انگیز ہوتی ہے تو یقیناً اس میں دوسروں کی تکلیف کا کوئی پہلو ہوگا۔

(۲) جب کوئی چیز مسرّت انگیز ہوتی ہے تو انسان اس سے مربوط ہو جاتا ہے اور اس کے کھو جانے کے خیال سے غیر مطمئن رہتا ہے۔ [1]

۳۔ جب کوئی چیز مسرّت انگیز ہوتی ہے تو ہمیں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے۔ جن سے آزار کا اندیشہ ہے، جو ناگزیر ہیں۔

(۴) مسرّت جو کسی بھی ایسی چیز سے حاصل کی جائے جو اسکندھ[2] میں شامل ہو۔ ایسی مسرّت ہماری قلبی پیاس کو بجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔

ان اصولوں پر عمل کر کے انسان لافانی ہو سکتا ہے اور "نروان" کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ان مشترک عقاید کے بعد بدھ مت کے اہم مکاتبِ فکر کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان مکاتب کے جائزے سے بدھ مت کی صحیح شکل و صورت سامنے آئے گی۔

بدھ مت کے اہم مکاتبِ فکر یہ ہیں:۔

۱۔ جوگیانہ بدھ مت	۲۔ مقبولِ عام بدھ مت
۳۔ قدیم مکتبِ عقل	۴۔ جدید مکتبِ عقل
۵۔ تنتر	۶۔ یورپی بدھ مذہب

جوگیانہ بدھ مت

خود کو مٹانا اور اسکندھ کے پھندے سے بچنا بدھ مت کا بنیادی اصول ہے۔ اس کے لئے مکمل طور پر تارک الدنیا ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ بات ہر ایک کے لئے قابلِ عمل نہیں ہے چنانچہ بدھ مت نے کسی جگہ بھی ہر ایک کو بدھ مت تسلیم کر سکنے کے قابل نہیں سمجھا ہے چنانچہ بدھ مت کے پیروؤں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک تو وہ جو کماتے کھاتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں اور اپنا گھر آباد کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ان سارے علائق سے گریز کر کے جوگیانہ زندگی اختیار کرتے ہیں۔ آخر الذکر طبقہ ہمیشہ زیادہ عزّت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ کیوں کہ جوگیانہ زندگی ہی ایک ایسا ماحول پیدا کر سکتی ہے جو روحانی ارتقاء کی ارفع ترین منازل تک پہنچنے میں سازگار ہو۔ یہ تارک الدنیا اور تنہا زندگی گزارنے والا جوگی طبقہ "سنگھ" کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کی بدھ آبادی کے تناسب سے سنگھ ایک بدھ اقلیت ہے۔ اُن کی تعداد بتدریج گھٹتی جا رہی ہے۔

سنگھ بدھ پیروؤں کا عمدہ اور منتخب طبقہ ہے۔ یہی لوگ اصل معنی میں بدھ مت کے پیرو ہیں۔ گھریلو زندگی ارفع ترین روحانی مقامات کے حصول کے لئے ناسازگار رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو مہایان نے اتنی رعایت کر دی کہ عام آدمی بھی نروان تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ جوگیانہ تنظیم کی تفصیلات ہمیں ونیہ میں ملتی ہیں۔ اس طبقے کی بنیادی خصوصیات افلاس، تجرّد اور کسی کو گزند نہ پہنچانا ہیں۔

افلاس

جوگی کی کوئی بھی شخصی جائداد نہیں ہونی چاہیئے۔ اسے صرف ایک جبہ، ایک کشکول، ایک سوئی، ایک مہروں کا ہار اور ایک اُسترا رکھنے کی اجازت ہے۔ ہر پندرہ روز بعد جوگی کو اپنا سر مُنڈوانا چاہیئے وہ ایک چھننا Filter بھی رکھ سکتا ہے تاکہ پینے کے پانی سے ننھے ننھے کیڑوں کو الگ کر سکے۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں سے تیار ہوں اور سب کے لباس گیروے رنگ میں رنگے ہوں۔ عام طور پر معتقدین جوگی کو لباس فراہم کرتے ہیں۔ نظری طور پر اس کی بھی ممانعت ہے کہ کوئی گھر یا جھونپڑا بنایا جائے۔ جوگی کی زندگی بے گھری ہونی چاہیئے۔

---

[1] قلب پہلوی زند باژد لیشب
آنتظا یہ روز می دارد ذہب (مولانا روم)

[2] فنی طور پر اسکندھ پانچ اجزاء سے مرکب ہے وہ یہ ہیں ۱۔ جسم ۲۔ احساسات ۳۔ ادراک ۴۔ جذبات اور جذباتی نتیجے ۵۔ اعمال یا مقصد

کشکول بدھ اقتدارِ اعلیٰ کی علامت ہے۔ جوگیوں کو اپنا گزارہ بھیک پر کرنا چاہیئے۔ بدھ مت کے پیرودں کے نزدیک بھیک "خودی" کو مٹانے کی بہترین صورت ہے۔ گوشت کھانا ان کے لئے جائز نہیں ہے مگر جب وہ کسی گاؤں میں جائیں اور انہیں بھیک میں گوشت ملے تو اسے بھی قبول کر لینا چاہیئے اور اسے کھانے کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک تاکید ہے کہ اگر ان کے کشکول میں کسی جذامی کا جھوٹا اگر جائے تو اسے بھی قبول کریں۔

بھیک مانگنے کا طریقہ آج کل چین، کوریا اور انام سے بالکل اٹھ گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کی مثالیں اب بھی ملتی ہیں۔ جوگیوں کو بھیک دینا عوام کارِ خیر سمجھتے ہیں۔

تجرّد

جوگیوں کو مجرد (برہم چاری) رہنا ضروری ہے۔ کیوں کہ جنسی معاملات، جذبات اور خواہشات کو ابھارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ جوگی، عورتوں کو ایک خاص نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ مہاتما بدھ اور ان کے خاص چیلے آنند کے مابین ذیل کے مکالمے سے بدھ پیرووں کا عورتوں کے ساتھ رویّہ Attitude معلوم ہو سکتا ہے:۔

آنند۔ "ہم عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟"

مہاتما:۔ "انھیں نہ دیکھو!"

آنند۔ "اگر ہمیں انھیں دیکھنا پڑے؟"

مہاتما۔ "ان سے مت بولو!"

آنند۔ "اگر ہمیں ان سے بولنا پڑے؟"

مہاتما۔ "اپنے خیالات کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھو۔"

جوگیوں کے لئے یہ بھی تاکید تھی کہ جب وہ بھیک مانگنے کے لئے کسی دروازے پر جائیں اور اگر کوئی عورت آئے تو انھیں اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ جنسی محبت روحانی ارتقاء کے لئے مہلک ہے۔ مگر بعد میں یہ قیود کم ہو گئے۔ کاواساکی لکھتے ہیں:۔

"ریاضتوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی تارک الدنیا ہو جائیں تاکہ ہم ایک معیاری بدھ پیرو بن سکیں۔ ہمارے پیشوا شوتوکو شنراں نے شادی کی تھی اور ایسی ہی زندگی گزارتے تھے جیسی کہ دنیا گزارتی ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے خاندان

ماحول اور قوم کے مروّجہ قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ اور اپنے کسی بھی عمل سے خود کو دوسروں سے ممیز نہ کریں۔"

کسی کو آزار نہ پہنچانا

کسی کو آزار پہنچانا بدھ مت کے چار بنیادی "مقدس اصولوں" کے خلاف ہے۔ بدھ مت کے پیرو کو ہر قسم کا آزار برداشت کرنا چاہیئے اور ہر ایک کا جواب خندہ پیشانی اور شکر گزاری سے دینا چاہیئے۔

اس اصول کی اہمیت پورن اور مہاتما بدھ کے اس مکالمے سے ظاہر ہو سکتی ہے:۔

بدھ۔ "سرونا پارنت کے لوگ ظالم، جفا جو اور سفّاک ہیں۔ وہ دوسروں کو تنگ کرنے، گالیاں دیتے اور ستاتے ہیں۔ اگر وہ تمھیں شرارت سے تنگ کریں، گالیاں دیں اور ستائیں اور درشت اور سخت الفاظ استعمال کریں تو تم خیال کرو گے؟"

پورن:۔ ایسی صورت میں میں یہ خیال کروں گا کہ سرونا پارنت کے لوگ حقیقتاً اچھے اور شریف ہیں کیوں کہ مجھے وہ اپنے ہاتھوں یا پتھروں سے نہیں مارتے۔"

بدھ۔ "لیکن اگر وہ تمھیں ہاتھوں یا پتھروں سے ماریں! تب تم کیا خیال کرو گے؟"

پورن "ایسی صورت میں میں یہ خیال کروں گا کہ سرونا پارنت کے لوگ حقیقتاً اچھے اور شریف ہیں کیوں کہ وہ مجھے لاٹھی یا ہتھیار سے نہیں مارتے!"

بدھ۔ "لیکن پورن! اگر وہ تمھیں لاٹھی یا ہتھیار سے ماریں! تب تم کیا خیال کرو گے؟"

پورن۔ "ایسی صورت میں میں یہی خیال کروں گا کہ وہ لوگ اچھے اور شریف ہیں! کیوں کہ وہ مجھ سے میری زندگی نہیں چھینتے۔"

بدھ۔ "پورن! اگر وہ تمھیں مار ڈالیں تب تم کیا خیال کرو گے؟"

پورن۔ "ایسی صورت میں بھی میں یہی خیال کروں گا کہ وہ لوگ اچھے اور شریف ہیں۔ کیوں کہ مجھے وہ جسم کے اس گندے جھمیلے سے بہ سہولت نجات دلاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے جوگی بھی موجود ہیں جو اپنے جسم پر شرمندہ ہیں، اس کی وجہ سے پریشان اور بیزار ہیں! وہ ہتھیاروں سے خود کو قتل کر ڈالتے ہیں، وہ زہر کھا لیتے ہیں، خود کو پھانسی پر لٹکا لیتے ہیں۔"

کو بڑا دھکا پہونچا۔ اس وقت تک کی بدھ تعلیمات قلمبند نہیں کی گئی تھیں۔ یہ تعلیمات سینہ بہ سینہ چلتی رہیں۔ اس سلسلہ میں ساری پتر کا نام لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ سب سے پہلے انھوں نے بدھ تعلیمات کو اکٹھا کرنے کی فکر کی اور قریباً بیس نسلوں تک انھیں کے فراہم کئے ہوئے سرمائے سے کام چلتا رہا۔

ساری پتر:۔ مگدھ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اپنی شکّی Sceptic طبیعت کی وجہ سے مختلف مذاہب اختیار کئے۔ مگر جب انھوں نے بدھ مت اختیار کیا تو دو ہی ہفتے کے اندر ابدی حقائق کی اُن پر تجلّی ہو گئی۔ انھوں نے نوجوان جوگیوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا تھرواد کا اور سروا ستوادین انھیں بدھ مت کا دوسرا بانی ٹھہراتے ہیں۔ ڈاکٹر کونزے لکھتے ہیں:۔ " ٹھیک جس طرح بدھ دھرم کے بادشاہ ہیں، ساری پتر اس کے سپہ سالار ہیں"[1]

قدیم مکتبِ عقل کا سارا نظام انھیں کے ہاتھوں منضبط ہوا۔

قدیم مکتبِ عقل جو کہ صرف مکتبِ عقل کے نام سے بھی موسوم ہے۔ پانچ اہم عناصر کا حامل تھا وہ یہ ہیں:۔ (۱) ایمان (۲) توانائی (۳) بیدار مغزی (۴) مرکزیت (۵) عقل

ان سب میں عقل کا ارتقاء آخری راہِ نجات ہے۔ یہاں 'عقل' کا لفظ مخصوص معنوں میں برتا گیا ہے۔ آگے اس کی تشریح کی جائے گی۔ ساری پتر کے مکتب کو قدیم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد (۱۰۰ ق م) میں ایک نیا مکتبِ عقل بھی پیدا ہوا۔ قدیم مکتبِ عقل کا مطالعہ ہم ذیل میں "مردِ کامل" "وجد" اور "عقل" کے عنوانات کے تحت کریں گے۔

مردِ کامل:۔ قدیم مکتبِ عقل کی روح کو سمجھنے کا بہترین طریقہ اس بات کا مطالعہ ہے کہ وہ کس قسم کے افراد پیدا کرنا چاہتا تھا اس میں سب سے مکمل اور معیاری Ideal فرد کون اور کیسا ہوگا؟

اس مکتب کا مردِ کامل "ارہت" کہلاتا تھا۔ لفظ 'ارہت' دو الفاظ آری (دشمن) اور ہن (مارنا) سے مرکب ہے۔ اس کا مطلب "دشمن کش ہوا" مگر یہ دشمن کون ہے؟ یہ وہی جذبات، خواہشات اور خودی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں سارے بدھ جوگی "ارہت" کہلاتے تھے۔ خود مہاتما بدھ کو بھی "ارہت" کہا گیا ہے۔ بدھ آرٹ میں ہمیں ارہتوں کی بے شمار تصویریں ملتی ہیں ارہت ظاہری طور پر سر منڈواتے تھے۔ وہ جذبات، احساسات، خواہشات، وجود اجہات اور غلط نقطہ ہائے نظر سے بالکل پاک ہوتے تھے۔ ان کا اندرون آزاد اور غیر محدود ہوتا تھا۔ انھیں خود پر پورا قابو ہوتا تھا۔ وہ غضب کے ریاضت کرنے والے ہوتے تھے آوا دانا ساتاکا نے 'ارہت' کی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

> " وہ خود پر زور لگاتا ہے۔ جدوجہد اور کوشش کرتا ہے۔ تب اس پر موت و حیات کا دائرہ اپنے پانچوں اسکندھ کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے سارے علائق سے انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ علائق اپنے ساتھ دوسرے علائق کا جھگڑا پیدا کر دیتے ہیں اور آخرکار ان کا انجام مرجھا جانا اور مر جانا ہے، بدل جانا اور مٹ جانا ہے۔ چناں چہ وہ ان ساری گندگیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور "ارہت" بن جاتا ہے۔
>
> جب کوئی شخص "ارہت" بن جاتا ہے تو وہ اس دنیا سے اپنا تعلق بالکل ہی ختم کر لیتا ہے۔ سونا اور مٹی کا ڈھیلا اس کیلئے ایک سے ہوتے ہیں۔ اس کے دماغ کے لئے آسمان اور ہتھیلی برابر ہیں۔ وہ خطروں میں بھی اسی طرح پُرسکون اور مطمئن رہتا ہے جس طرح صندل کا درخت جب کہ اس پر کلہاڑی چل رہی ہو"

"ارہت" قابلِ احترام ہوتا ہے۔ وشنو، اندر، کرشن اور دوسرے دیوتا اس کی عزت کرتے ہیں۔ مگر مہاتما بدھ کے سوا آج تک کوئی شخص بھی کامل ارہت نہیں بن سکا۔ ارہت کے مقام تک پہونچنے کے لئے مختلف روحانی مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں بدھ گھوش کی وی سدّھی مگّ نہایت اہم کتاب ہے جس میں ارہتوں کی تربیت کی تفصیلات ہیں۔

وجد:۔ بدھ طریقوں کا ایک دوسرا شعبہ بھی ہے۔ جو سمادھی کہلاتا ہے۔ اس میں فکر و توجہ کے حلقہ کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ فکر اتنی منقح ہو جاتی ہے جیسے شمع کی لَو" ایسی 'لَو' جو ہوا کے جھونکوں میں بھی سکون کی حالت میں رہتی ہو۔ یہی وجد یا سمادھی

---

[1] Buddhism : Its Essence and Development by Dr. Edward Conze

ہے۔ اس مقام پر ذہن انسانی ہر اس چیز سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو خلل پیدا کرسکے۔ اس سلسلے میں شدید ریاضتیں کرنا ہوتی ہیں۔ رواج کے مطابق حسب ذیل تین اہم ریاضتیں ہیں۔

(۱) دھیان (۲) اپرماں (۳) سدّھی

ان ریاضتوں کی اور بہت سی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان ریاضتوں سے گزر کر انسان "روحانی لطافت" "لطافت طبع" بے لوث محبت، یگانگی، سلجھی ہوئی مطمئن فکر، فکری صحت مندی، اور "ہمواری طبع" حاصل کرتا ہے۔ اس کا دماغ ایک غیر محدود خلا کا حامل ہوتا ہے۔ اس خلا کے لئے شونیتہ کا لفظ برتا جاتا ہے شونیتہ ایک عظیم خلا Great Emptiness کا نام ہے

اس سے شخصیت کی لطافت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ آدمی پانی پر چل سکتا ہے دیوار میں سے گزر سکتا ہے اور ہوا میں چل سکتا ہے "یہ عظیم خلا" ہی وہ فضا ہے جس میں عقل "پرجنا" ہو سکتی ہے۔

عقل۔ اس کے لئے سنسکرت لفظ "پرجنا" برتا جاتا ہے۔ پر جن کے معنی ٹھیک وہی نہیں ہیں جو ہم عقل کے لیتے ہیں۔ بدھ لٹریچر کے مطابق پرجنا "دھرم" پر اصولی اور تدریجی مراقبہ کا نام ہے۔ اسی مراقبہ سے متوازن عقل حاصل ہوتی ہے۔ آرو بندو لکھتے ہیں :۔

"ایک پرسکون دماغ میں یہ پرجنا ایک عقلی مادہ ہے۔ جو بالکل پرسکون ہے۔ اس قدر پرسکون کہ کوئی چیز اس میں خلل انداز نہیں ہو سکتی اگر خیال یا عمل داخل ہوتا ہے تو وہ دماغ ہی کی پیداوار نہیں ہوتا۔ بلکہ باہر سے آتا ہے اور دماغ کی فضا سے اس طرح گزر جاتا ہے جیسے بغیر ہوا کے آسمان میں سے پرندے اڑ کے نکل جاتے ہیں۔ خیال اس طرح گزر جاتا ہے کہ کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وہ (دماغ پر) اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ اگر ہزاروں تصورات یا پر ہنگامہ واقعات بھی اس فضا سے گزر جائیں تب بھی یہ پرسکون خاموشی بالکل اسی طرح باقی رہتی ہے جیسے کہ دماغ کے تانے بانے کبھی نہ منتشر ہونے والی کسی شئے سے بنائے گئے ہوں

وہ دماغ جس نے سکون کی یہ منزل حاصل کر لی ہو قوت اور شدت کے ساتھ عمل کر سکتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا بنیادی سکون برقرار ہی رہیگا۔"

اس طرح کی فکر میں مشاہدہ، فکر اور مطالعہ قدرت کو "انا" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان چیزوں کو جب ہم اپنی "انا" سے مربوط کرتے ہیں تو ہمارے خیالات شخصی ہو جاتے ہیں یہ اشیاء ہمارا جزو بن جاتی ہیں۔ ان سے ہماری دلچسپیاں وابستہ ہو جاتی ہیں اور بالآخر ان پر غور کر کے ہم دکھ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ "پرجنا" قطعاً غیر شخصی Impersonal عمل ہے ایسی فکر کامل سکون طبع کی یقیناً ضامن ہوگی۔

بدھ پیروؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر پانچ سو سال بعد بدھ اصولوں میں تبدیلیاں ہونگی۔ یہ مدت متنازع فیہ ہے۔ بعضوں کے نزدیک اس سے کم و بیش بھی ہے۔ ان تبدیلیوں کا سبب مہاتما بدھ کی بار بار آمد کا عقیدہ ہے۔ وہ خارجی اور ظاہری اسباب جنھوں نے آج تک بدھ عقائد اور اصولوں کو متاثر کیا ہے جغرافیائی، لسانی، تہذیبی، فکری اور تاریخی ہیں۔ ان عناصر کی زد میں بدھ مذہب کے رنگ و روپ نے ایک ہزار سال میں کافی تبدیلی اختیار کر لی۔ اسی فکری انقلاب کے نتیجہ میں نیا مکتب فکر پیدا ہوا۔

جدید مکتب عقل :۔ بدھ مت میں کئی مکاتب فکر رہے اور مٹ گئے ہم نے صرف اہم مکاتب فکر کا انتخاب کیا ہے۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اشوک اعظم کے عہد سے اس مکتب کی ابتدا ہوئی۔

مہادیو کے پانچ نکات اس مکتب کے آغاز میں اہمیت کے حامل ہیں انھوں نے اپنے پانچ نکات میں خود ارہتوں پر تنقید کی ہے۔ قدیم مکتب عقل کے پیرو ہین یان اور جدید مکتب کے پیرو مہایان مکتب کو اپنا مدار عمل بناتے ہیں۔ اگرچہ دونوں میں بہت اختلافات ہیں مگر آٹھویں صدی عیسوی میں آئی تسانگ یوں لکھتا ہے :۔

> "ہین یان اور مہایان کے پیرو دونوں اسی ایک وِنیہ پر عمل کرتے ہیں۔ ان پانچ اسکندھ پر یقین رکھتے ہیں اور ان چاروں "مقدس اصولوں" کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ جو بودھی ستو کی پوجا کرتے ہیں اور مہایان پڑھتے ہیں وہ مہایانی کہلاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ "ہین یانی" کہلاتے ہیں۔"

جدید مکتب عقل کو سمجھنے کے لئے ہم وہی طریقہ اختیار کریں گے جو قدیم مکتب عقل کے لئے اختیار کیا تھا یعنی کہ یہ مکتب کس قسم کے افراد پیدا کرنا چاہتا ہے؟ اس مکتب کا معیاری فرد بودھی ستو کہلاتا ہے۔ اس کے لغوی معنی قریب قریب "روشن ضمیر" کے ہوتے ہیں۔ مجازاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ "وہ جو

Basis of Yoga by Aurobindo Ghosh

مہاتما بدھ بننے جا رہا ہے" ابھیدھرم نے بودھی ستو کی ذہنیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے[1]:

" مگر کیوں ؟ جب بودھی ستو تجلّی اعلیٰ کے حاصل کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں تو وہ اس میں اتنا وقت کیوں لگاتے ہیں !! ؟

" اس لئے کہ تجلّی اعلیٰ کا حصول بہت مشکل ہے - کیونکہ "ناپیدا کنار کلپ" سے گزرنے کے لئے وسیع علم، نیکی اور بے شمار اعمالِ خیر کی ضرورت ہوتی ہے

" ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ بودھی ستو اس تجلّی کا جویا ہوتا ہے جس کا حصول اس قدر دشوار ہے - اب اگر یہی تجلّی اس کی نجات کا آخری ذریعہ ہوتی تو ایک بات تھی - مگر واقعہ ایسا نہیں ہے - تب وہ اس قدر بے پناہ مشقت کیوں اٹھاتے ہیں !! ؟

" اس لئے کہ وہ دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں - کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو آلام کے اس عظیم طوفان سے باہر گھسیٹ نکالیں

" مگر انھیں یہ کرنے سے کیا شخصی فائدہ حاصل ہوتا ہے ! ؟

دوسروں کا نفع ... ان کا اپنا نفع ہے - کیوں وہ یہی چاہتے ہیں !

" مگر اس پر یقین کون کر سکتا ہے ؟

" یہ سچ ہے کہ وہ لوگ جو رحم و ہمدردی سے محروم ہیں، جو صرف اپنا ہی بھلا سوچ سکتے ہیں وہ بودھی ستو کے ایثار و قربانی پر بمشکل یقین کر سکتے ہیں - مگر کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ کتنے ہی لوگ جو جذبۂ رحم سے محروم ہیں - دوسروں کی مصیبتوں میں اپنی مسرت حاصل کرتے ہیں ؟ حالاں کہ اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا - اسی طرح یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بودھی ستو جو جذبۂ رحم سے معمور ہوتے ہیں دوسروں کا بھلا کرنے میں مسرت حاصل کرتے ہیں حالانکہ اس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا !"

ہم ذیل میں پرجن پارامتیا سے دو اقتباس نقل کرتے ہیں - اس سے مذہبِ مہایان کا اجتماعی شعور اور اس کی انسانی قدر اور عظمت کی کافی وضاحت ہوتی ہے -

" وہ لوگ جو جوگیا نہ چکر اور پرتیک بدھ سے نسبت رکھتے ہیں - اپنی تربیت کیسے کرتے ہیں ؟ وہ سمجھتے ہیں - ہم اپنے تنہا خود کو سدھار لیں گے - اپنے تنہا خود کو سکون پہنچا لیں گے، اپنے تنہا خود کو نروان تک پہونچا لیں گے - تب وہ ریاضتیں کرتے ہیں - جو ان کی تربیت کے لئے عمدہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں اس طرح وہ خود کو سکون پہونچا لیتے ہیں اور نروان سے قریب تر کر لیتے ہیں -

" یقیناً بودھی ستو اپنی تربیت اس طرح نہیں کرتا - وہ ریاضتیں کرتا ہے تا کہ عمدہ بنیادیں حاصل ہو جائیں تا کہ "میں خود کو نروان میں پہونچا سکوں - اور پھر ساری دنیا کی مدد کرنے کے لئے میں ساری خلقت کو نروان میں پہنچاؤں لاتعداد افراد کی میں نروان کی سمت قیادت کروں گا "

اس پرجن پارامتیا میں پھر ایک جگہ یوں ذکر ہے -

" وہ کچھ کرنے والے (یعنی جو کچھ مشکل ہے) بودھی ستو ہیں - وہ عظیم افراد جو تجلّی اعلیٰ کی جستجو میں نکل پڑے ہیں - وہ صرف خود اپنی ذات کے لئے نروان نہیں چاہتے - برخلاف اس کے انھوں نے شدید دکھی انسانی دنیا کا جائزہ لیا ہے - اور پھر تجلّی اعلیٰ کی تسخیر کے آرزو مند ہیں - وہ موت و حیات کے معاملات میں ڈگمگاتے نہیں - وہ ساری دنیا کی فلاح اور بہبود کے لئے نکل پڑے ہیں - یہ نتیجہ ہے ان کی دنیا سے ہمدردی کا - انھوں نے تہیّہ کر لیا ہے ہم دنیا کے لئے ایک سائبان بن جائیں گے - ایک پناہ گاہ بن جائیں گے - دنیا کے لئے جائے سکون، آخری مقام راحت ایک نور ہدایت ایک سچے قائد اور ایک راہِ نجات بن جائیں گے "

مکتی یا نجات جدید مذہب میں "تین انکاروں" سے حاصل ہوتی ہے[1]:

ملہ اس اقتباس کی شکل مکالمہ یا زیادہ تر Soliloquy کی سی ہے -

۱ - بے حصولی (خود کو مارنا) Self Extinction

۲ - بے بیانی (دعویٰ بے) Non Assertion

۳- بے اعتمادی (سوائے عقل کے کسی پر اعتماد نہ کرنا Non Relying)

ایک چوتھا عنصر اشتیاقی ہے یعنی:-

۴- علم کل (یہ آخری درجہ ہے جس کے نتیجے میں نروان حاصل کیا جا سکتا ہے)

Omniscience

تنتر- یہ بدھ مت میں بہت بعد کا اضافہ ہے۔ اسے جادوئی بدھ مت Magical Buddhism بھی کہا جاتا ہے۔ اس مکتب میں کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ مگر ان کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر زیادہ سودمند نہیں ہے۔ اس مکتب نے مذہب اور افسوں گری میں ایک امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ اس میں بھی دو طبقے ہیں (۱) دکشن کارن (۲) وام کارن

اس مکتب نے بدھ مت میں جنسیات پرستی، بدکرداری اور جادوپرستی کے دروازے کھول دیئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مکتب کے بچے کھچے اثرات ابھی تک کسی نہ کسی حد تک بدھ مت اور ہندو مت کے بعض طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی اس کا تذکرہ صحیح وقعت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ ہوس کوشی اور نفس پرستی کو نروان تک پہونچنے کا ذریعہ سمجھتا رہا ہے۔

بدھ مت ہندوستان سے باہر:- بدھ مت نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی فروغ حاصل کیا۔ ہندوستان سے باہر چین، جاوا، سماترا اور بہت سارے ملکوں میں بدھ مت پھیلا۔ بیرون ہند بدھ مت کے تین اہم اسکول بن گئے:

(۱) زین Zen

(۲) امدمت Amidism

(۳) رین ما پا Ruyin-Ma-Pa

یورپ اور بدھ مت- یورپ نے سترھویں اور اٹھارویں صدی ہی سے ہندوستانی اور چینی بدھ مت کی چھان بین شروع کر دی تھی مگر یورپ کو سب سے پہلے بدھ مت سے آشنا کرانے والا ایک جرمن فلسفی شوپنہار Arthur Schopenhauer تھا جس نے ایک بدھ کتاب کے فارسی ترجمہ کے لاطینی ترجمے کا مطالعہ کیا تھا مگر ۱۸۱۹ء میں شوپنہار نے ایک منضبط فلسفہ[1] پیش کیا۔ اس کے فلسفہ نے براعظم یورپ پر ایک نمایاں اثر چھوڑا۔ رچرڈ ویگنر R. Wagner بدھ تعلیم سے بے حد متاثر تھا۔ البرٹ شوئٹزر Albert Schweitzer نے تو وہ زندگی ہی اختیار کر لی جس کی شوپنہار نے سفارش کی تھی۔

مغربی تجارتی کمپنیوں نے جب سے مشرق میں قدم جمانے شروع کئے اور یورپی امپیریلزم کا فروغ شروع ہوا اسی زمانے سے مغربی فلسفہ پر مشرقی فلسفہ کی پرچھائیاں پڑنے لگیں مطالعہ علوم مشرق Orientalism نے فروغ پایا۔

بدھ مت روس میں بھی پہنچا۔ وہاں اس پر کافی کام بھی ہوا۔ مگر بدھ مت کا روحانی نظام وہاں کے مادہ پرستوں کے جدلیاتی مادیت سے ٹکر نہ کھا سکا۔

۱۸۷۵ء میں مادام بلاواتسکی اور کرنل اولکاٹ نے امریکہ میں ایک Theosophical Society قائم کی۔ اس میں انسب بدھ مت پر کافی کام ہوا۔ سب سے زیادہ نمایاں کام A. P. Sinnett کا ہے۔ انھوں نے ایک نہایت جامع کتاب Esoteric Buddhism ایڈون آرنلڈ Edwin Arnold کی نظم The Light of Asia نے کتنے ہی دلوں میں بدھ مت کی محبت پیدا کر دی۔

بیسویں صدی میں بدھ مت پر یورپ اور خصوصاً انگلستان میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ اس وقت بھی وہاں Christmas Humphreys کی نگرانی میں بدھ سوسائٹی کام کر رہی ہے

یورپ میں جن لوگوں نے بدھ مت قبول کیا ان کو وہاں کا ماحول سازگار نہ رہا۔ کیونکہ وہاں جوگیانہ زندگی گذار سکنے کے مواقع بہت کم ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو لوگ بدھ مت قبول کر لیتے ہیں وہ ہندوستان یا برما چلے آتے ہیں۔

---

[1] The Philosophy of the Negation of the Will to Live

ضروری نوٹ: غیر مطبوعہ مضامین اس صورت میں واپس کئے جائیں گے اگر واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

مہاتما بدھ

اے مہاتما اوتار اے صدق و صفا کے دیوتا
اے محبت کے خدا مہر و وفا کے دیوتا

زندگی کے رُخ سے تو نے اس طرح اُٹھا نقاب
ماند ہو کر رہ گئے یہ آفتاب و ماہتاب

تیری نظروں میں بلندی شام و سحر سے دور تھیں
تیری راہیں گردشِ شمس و قمر سے دور تھیں

تیرے سر میں تھا نشۂ "الفقر فخری" کا خمار
تیرے دل پر ہو چکا تھا راز وحدت آشکار

زندگی کی تزئین کو تو نے سپرد کر دیا
ساغرِ ہستی شرابِ آگہی سے [illegible]

چل دیا دنیائے رنگ و بو کو ٹھکراتا ہوا
اختیار و جبر کی گتھی کو سلجھاتا ہوا

زندگی تجھ کو پیامِ ناز دیتی رہ گئی
بادشاہی دُور سے آواز دیتی رہ گئی

وسعتِ فکرِ جہاں بندی سے تھا تیرا خیال
تیری دنیا میں نہ ماضی تھا نہ مستقبل نہ حال

خدمتِ مخلوق تھا تیرا شعارِ زندگی
خاکساروں کو عطا کر دی [illegible] زندگی

چشمِ باطل کو حقیقت آشنا تو نے کیا
[illegible] تو نے کیا

تھی کہاں تجھ پہ یہ راجہ اور پرجا کی تمیز
تیری نظروں میں تھا ہر چھوٹا بڑا یکساں عزیز

[illegible] نالۂ بلبل سے تجھے
[illegible] کبھی [illegible] تجھے

[illegible] اک اک غم تو نے لیا
راحتیں دنیا کو بخشیں اور الم تو نے لیا

تیری ہستی پہ ابھی تک [illegible] جہاں کو ناز ہے
موت پر تیری حیاتِ جاوداں کو ناز ہے

زندگی و موت میں اک ربط پیدا کر دیا
خار و گُل میں تو نے نظم و ضبط پیدا کر دیا

تو نے انسانوں کو جود و رحم کی ترغیب دی
زندگانی کے فسانے کو نئی ترتیب دی

مبارز الدین رفعت

اجنتا کا پیغام

کبھی کبھی سوچتا ہوں، کہ [illegible] کوس پیدل گزر کر جب میں آصفیہ لائبریری کی خوب صورت اور شاندار عمارت کے اندر پہنچا تو اس کی ٹھنڈک، اس کی چھایا اور اس کی گمبھیر اور گہری خاموشی میں مجھے بے اختیار اجنتا کے غار یاد آ گئے۔ ان کی یاد نے من میں کچھ ایسی بے چینی پیدا کی کہ جس کو بہلانے کے لئے لائبریری میں چلا گیا اور ڈاکٹر غلام یزدانی کی لکھی ہوئی کتاب "اجنتا کی تصویریں" منگائی۔ اور سینکڑوں میلوں کی دوری پر بیٹھ کر بھی اجنتا کی سندرتا اور روشنی کی جوت سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے لگا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر یزدانی پرانے آثار اور خاص کر اجنتا کی تاریخ کے مانے ہوئے جانکار ہیں۔ ان کے دل موہ لینے والے بیان اور کتاب کی تصویروں نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ اور پھر میں اس دنیا میں ایسا ڈوبا کہ تن من کا بھی ہوش نہ رہا۔ میرا یہی حال تھا کہ اتنے میں ایک طرف سے بڑی نرم، بڑی نازک اور بہت ہی میٹھی آواز آئی، جیسے کوئی کچھ پوچھ رہا ہو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا: لیکن تمام لوگ چپ چاپ اپنی کتابیں پڑھنے میں لگے ہوئے تھے۔ خیال ہوا کہ یہ میرا اپنا ہی واہمہ تھا۔ پھر میں اسی سندرتا اور شانتی کی دنیا میں کھو گیا۔ پھر وہی آواز آئی۔ اب تو بڑی حیرانی ہوئی۔ یہ کسی انسان کی آواز نہ تھی، کسی ناری کی بولی نہ تھی۔ یہ تو کچھ ایسی آواز تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی سنی نہ اس کے بعد کبھی میرے سننے میں آئی۔ یہ لائبریری کی آواز تھی جو اجنتا کے غاروں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ میری دلچسپی اور بڑھی۔ من کے کان لگائے تو آصفیہ لائبریری کو یہ کہتے سنا:

" اے اجنتا کے غارو! اے سندرتا اور شانتی کے گہوارو! تمہارے پاس پردیس کے من موہ لینے والے منظر کا گیان ہے۔ جس کسی نے بھی تمہارے بنانے کے لئے یہ جگہ چنی ہے، آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ہری بھری پہاڑیاں، جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ، سریلے راگ گاتے ندی نالے، سرسبز ٹیلے، ٹپ ٹپ کر گنگنانے والے آبشار، تمہارے چاروں طرف برستی ہوئی سندرتا اور شانتی! ان سب کے بیچوں بیچ تم، تمہارے دل میں بسنے والی [illegible] اور تمہارے اندر من میں بس جانے والی سندر سندر تصویریں، یہ سب کچھ ہے مگر تم سنسان ہو، ویران ہو، اداس ہو۔ کبھی کبھار غیر ممالک سے آنے والے سیلانی کچھ دیر کے لئے تمہارے درشنوں سے اپنا من بہلاتے ہیں اور پھر ٹھنڈی آہیں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ایشور جانے تمہارے کیا بھید ہیں اگر تم اسے برا نہ مانو تو اپنی بات کہوں۔ میرے یہاں بھی روز سینکڑوں آدمی آتے اور جاتے ہیں۔ یہ کچھ میری باہر کی سندرتا ہی دیکھنے نہیں آتے۔ میرے من کے اندر جو بھید ہیں، انھیں ٹٹولنے آتے ہیں۔ اور میرے ایک دو بھید نہیں ہزاروں عالموں اور گیان کاروں نے اپنے جیون بتا بتا کر جو کچھ لکھا ہے ان سب کو میں اپنی گود میں لئے بیٹھی ہوں۔ جو دنیا اور علم کی پیاس لے کر میرے پاس آتے ہیں ان کے لئے میں اپنی چھاتی کھول دیتی ہوں۔ میری بات کا برا نہ ماننا اور اپنا من میلا نہ کرنا مگر اتنا بتانا کہ کیا تمہاری سندرتا بس باہر ہی کی ہے یا تمہارے اندر بھی کچھ ہے اور اندر کی سب سے بڑی سندرتا تو یہی ہے نا کہ ہمارا جیون منش کے کام آئے اور بھولے بھٹکوں کو ہم سیدھا راستہ دکھائیں۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اجنتا کے غاروں کی آواز آئی، کچھ گونجتی، گنگناتی، سریلی اور کچھ اداس سی۔ سینکڑوں میل دور سے آتی ہوئی آواز، کبھی مدھم کبھی اونچی۔ یہ اجنتا کی آواز تھی آواز آ رہی تھی:

" بہن، ہم میں دھرم کی نشانی ہیں اس کا تو سدا ہی پرچار رہا کہ

ندی سے اپنی معصومیت اور ذہنیت کا امید نہ ہو، بڑے سے بڑا دکھ سہو لیکن اُف نہ کرو، کڑے سے کڑا بول سنو لیکن من میلا نہ کرو۔ تمہاری ان باتوں کا بڑا مان کیا۔ اور جیسے تمہاری باتیں بھی تو ایسی کیا نرالی تھیں۔ اس لئے میں تو تمہاری باتوں سے خوش ہوئی۔ ہمیں دیکھنے کے لئے باہر کے ملکوں سے کتنے ہی لوگ آتے رہتے ہیں لیکن یہ بہت کم لوگوں کے من میں آتی ہے کہ ہم نے یہ نئی جیتی ہے۔ تمہارے من میں پیدا ہوئی ہے ہمیں تو اسی کا دکھ رہتا ہے کہ کم ہی لوگ ہمارے اندر کا بھید جاننا چاہتے ہیں۔ ہمارے باہر کی بات جیسے تم نے کہی تو ہم نے … جھلا۔ سب ہمارے اس سندیسے کی جو ہم اپنے اندر منش کے لئے رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم یہاں آنے والے بھانت بھانت کے سیلانیوں کو ہمارے اس اندر کے سندیسے سے اپنی آنکھیں بند کئے، بس ہماری کاریگری، ہماری … ہماری تصویروں پر مرتے دیکھتے ہیں تو ہمارے من … ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا ہونا نہ ہونا ایک ہی ہو اور ہمارے بنانے کے لئے جتنی … ہوئی وہ سب بیکار گئی۔

آج تم نے اتنے پیار سے … ہمارے من کی … ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ اپنا من کھول کر تمہارے آگے رکھ دیں۔ تم تو جانتے ہو کہ آج سے لگ بھگ پچیس سو برس پہلے بھارت کی دھرتی پر ایک … اتر آیا تھا۔ بھگوان گوتم بدھ کی باتوں نے لوگوں کا من ایسا موہ لیا کہ بس اتر دکھن، پورب پچھم چاروں طرف ان کی بتائی ہوئی … پھیل گئیں۔ بھگوان گوتم کے مکتی پا جانے کے کوئی … تین سو برس بعد ان کے نام کی مالا جپنے والے … اشوک مہاراج … آج … انہوں نے اپنا ڈیرا ڈالا اور پھر کوئی آٹھ سو برس تک ایک کے بعد ایک وہار اور استوپا پہاڑی کے … کاٹ کر بنائے گئے۔ بس ایک ہی لگن تھی … ان کے من میں … اور یہ لگن تھی بھگوان گوتم کے اپدیش کو امر بنانے کی، ان کے جیون … کام کو … تک پہنچانے کی۔

اور اسی لگن کے ساتھ چپ چاپ آٹھ سو برس تک کام ہوتا رہا۔ بھگوان گوتم کے نام پر اپنا سب کچھ تج دینے والے کس طرح کام کرتے اور کس طرح دھیان میں اپنا سمے لگاتے گزرتے چلے گئے۔ ہماری گنتی بڑھتی ہی گئی۔ ہمارے اندر بھگوان گوتم کی ایک سے ایک بڑھیا مورتی تراشی جاتی رہی۔ ہماری دیواروں پر ایک سے بڑھ کر ایک تصویر اترتی رہی۔ نروان کے اپدیش دئے جاتے رہے، گیان دھیان ہوتا رہا، اپدیش کتھائیں ہوتی رہیں اور دھرتی کے ہر کونے سے لوگ بھگوان گوتم کے اس اپدیش کو سننے اور اس کو اپنے من میں بٹھانے کے لئے یہاں آتے رہے۔ لیکن تم جانتے ہو زمانہ سدا ایک سا کہاں رہتا ہے۔ اچھے سے اچھے آدمی اور اچھے سے اچھے اصول کو بھی اتھل پتھل اور ادل بدل کے پھیر میں آنا ہی پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ بدھ دھرم کا نام بھارت سے مٹ گیا اور جب اس اپدیش کے ماننے والے … من سے … دھرم کی بتائی ہوئی باتیں بھی … گئیں تو پھر ہم بھی دھیرے دھیرے لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس طرح کوئی ہزار برس بیت گئے۔ ابھی پچھلے سو ڈیڑھ سو برس کی بات ہے کہ ہم کو پھر ڈھونڈ نکالا گیا۔ ہم کہیں پورے تھے، کہیں آدھے اور کہیں پوری مٹی سے اَٹے پڑے تھے۔ یہ مٹی ہٹائی گئی اور ہمیں صاف ستھرا کیا گیا۔ ہماری … بھی ٹھیک … کیا گیا۔ تب سے ہمارا دور … تک مشہور ہوا ہے اور اب تو دھرتی پر شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں ہمارا نام نہ پہنچا ہو لیکن کہاں ہمارا وہ پچھلا جنم اور کہاں ہمارا یہ نیا جنم! پچھلے جنم میں ہم پوجے جاتے تھے۔ نیا جنم پچھلے جنم کی ایک چھایا کے سوا اور کچھ نہیں۔

تم پوچھتے ہو ہم منش کے کس کام آتے تھے، تو سنو وہ بھی سن لو۔ ہمارا کام بھی وہی … تھا جو آج تم … ہو یعنی منش کو گیانی دھیانی بنانے کا کام۔ … بات کو ہمارے دھرم میں مہا پاپ ہے لیکن یہ بات بھی تو سچی ہے نا کہ علم کا بس ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے من کی پاکیزگی۔ اس سے من کی پاکیزگی کا کام ہو تو اس سے بڑھ کر اور کوئی یار اور کوئی ساتھی نہیں، لیکن تن کے لئے علم … اس سے بڑھ کر ڈسنے والا اور کوئی ناگ نہیں۔ تمہارے پاس کتابیں تو بہت ہیں مگر ان میں سے بہت سی کتابوں میں علم کو تن کے کام میں لانے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں۔ ہمارے بھگوان نے اور پھر ان کے بعد ہمارے گروؤں اور ہمارے گیانیوں نے تو علم کو بدن کے کام میں لانے کی جڑ ہی کاٹ دی تھی۔ ہماری چاردیواریوں کے اندر جو اپدیش ہوتے تھے ان میں بدن کے لئے علم سے کام لینے کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ ہر طالب پر یہ بات کھول دی جاتی تھی کہ جتنا مایا کے جنجال میں پھنستے جاؤ گے، جتنا اس فانی دنیا کی چیزوں کی ہوس میں ڈوبتے جاؤ گے اتنی ہی من کی شانتی اجڑتی جائے گی۔ بس یہی … دھیان لگا کر اس دکھ بھرے جیون سے منش کیسے چھٹکارا پائے، اس کا جیون کیسے سکھی سے سکھی بنے اور اسے کیسے مکتی اور نروان حاصل ہو۔

ہمارے پاس بھی پستکیں ہوتی تھیں لیکن یہ پستکیں تمہارے چھاپے کی کتابوں جیسی نہ تھیں اور اچھا بھی تھا کہ اس سمے چھاپے کی ان گنت کتابیں نہ تھیں۔ اب تو چھاپے کی وجہ سے لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں۔ تب لکھنے والے کم تھے اور پڑھنے والے زیادہ۔ اب تو جس کسی کے پاس قلم اور سیاہی ہوتی ہے وہ لکھتا ہے۔ اکثر بے سوچے سمجھے لکھتے ہیں اور چھاپ بھی دیتے ہیں۔ اس زمانے میں چاہے قلم ہو بھی تو ہر ایک نہ لکھتا تھا۔ وہی لکھتا تھا جسے اس کا حق حاصل تھا، جس نے برسوں اس موضوع پہ سوچ بچار کیا تھا۔ ہماری پستکیں کاغذ پہ نہیں لکھی جاتی تھیں۔ تاڑ کے پتوں پہ لوہے کی کیل سے لکھی جاتی تھیں اور انہیں ذرا سی آگ دکھائی جاتی تھی۔ پھر پتوں کو نتھی کر کے پستک بنالی جاتی تھی۔ لیکن ہماری ودّیا کے پیاسے ان پستکوں پر ہی بھروسہ کئے بیٹھے نہ رہتے تھے سارا علم اور ساری ودّیا تو بس گرو کی زبان ہی سے ملتی تھی اور ودّیا کے پیاسے بدھی میں بٹھا کر اسے اپنے من میں رچا بسا لیتے تھے اور یہ علم اور یہ ودّیا بس اُن کا حصہ بن کر رہ جاتی تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ کتاب پڑھی اور اسے بند کیا تو سارا پڑھا لکھا ہوا بھولی بسری کہانی ہوئی اور سمے سے پرے اس کی طرف پھینکنے کی لاچاری رہی۔

ہمارے بنانے والوں کا اور ہمارا بس ایک ہی بھید اور ایک ہی سندیس ہے، منش جاتی کے نام یہ سندیس کچھ ہمارا اپنا نہیں بھگوان گوتم کا سندیس ہے۔ یہ سندیس ہے منش جیون کے دکھوں کو کم سے کم کرنے اور اس کے سکھ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا۔ منش جیون کے سکھوں کا سکھ من کی شانتی ہے اور من کی شانتی بے غرض خدمت اور اپنی دُھن میں تن من دھن سے لگے رہنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ گیان دھیان بھی رہے تو یہ شانتی پکی اور اصلی ہو جاتی ہے اور نروان کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ اسی سندیس اور اسی اپدیش کو اپنے سامنے رکھ کر ہمارے بنانے والوں نے ان تھک محنت سے کام کیا، ان کے ہاتھ کام میں جٹے رہے اور ان کا من موہن کے دھیان میں گم رہا۔ اس سے اُن کا کام امر بنا اور آج بھی پوتر ہڈوں میں ایک کسک، ایک تڑپ پیدا کرنے کی شکتی اس میں باقی چلی آتی ہے یہی ہماری سب سے بڑی سندرتا ہے۔ ہمارے اندر کی سب سے بڑی سندرتا اور ہمارے باہر کی سب سے بڑی خوبصورتی!

جاوید

گوتم بدھ کا تصوّرِ غم

آغازِ کائنات سے اس سالماتی دور تک غمِ حیات انسان کے لئے سب سے بڑا اور آفاقی مرحلہ رہا ہے۔ اسی پس منظر میں مسرّت کا وہ تصور ابھرتا ہے جو زندگی اور کائنات کی تمام تر جد و جہد کا پہلا قدم اور آخری منزل ہے۔ غمِ حیات کے دو پہلو ہیں اوّل منفی دوم اثباتی۔ اس میں تخریب مضمر ہے مگر اس تخریب سے تعمیر کے پہلو بھی نکلتے ہیں۔ اس نے انسان کی بے پناہ قوتوں کو مضمحل کیا ہے اور انھیں نئی زندگی بھی دی ہے۔ یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں بھی۔ غم سے مسرّت تک پہنچنے کے لئے مذہب انسان، مفکر، فلسفی اور پیمبر کے روپ میں مختلف راہوں سے گزرا ہے اور ہر دور کا فکری شعور اس منزل تک پہنچنے کی ایک نمایاں کوشش ہے۔ یہ کوشش زندگی کے مسائل اور الجھنوں کو حل کرنے اور ایک بہتر نظامِ حیات کی تخلیق میں [illegible] ہوتی رہی جو افراد کو عارضی یا دائمی حیثیت سے غم سے نجات دے سکے۔ غم اور مسرّت کے تصوراتی اور نظریاتی اختلاف سے قطعِ نظر یہ کوشش سماجی رو اور سماجی تغیّر کے ساتھ ساتھ اثر پذیر اور تغیّر پذیر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ذہنِ انسانی کا ارتقاء غم کے مرحلوں کو عبور کرنے اور مسرّت کی منزلوں کو پانے کا ایک طویل پُر پیچ سفر ہے۔

اس طویل سفر کی ایک بہت ہی اہم منزل گوتم بدھ کا وہ درسِ آسمانی ہے جو حیات و کائنات کے مجموعی غم و اذیت کا علاج ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب انسانی درد و غم کا انتہائی پُر خلوص مطالعہ ہے اور انتہائی پُر خلوص حل بھی۔

گوتم بدھ نے غمِ حیات کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے:۔

"وجود اذیت ہے، زوال پذیری اذیت ہے، غم اذیت ہے، نالہ و بُکا اذیت ہے، درد اذیت ہے، صدمہ اذیت ہے، مایوسی اذیت ہے، ناکامیِ تمنّا اذیت ہے۔" ان کے نزدیک زندگی کرب و اذیت کی ایک مسلسل چیخ اور ایک مستقل گہری خراش ہے۔ اس راہِ ہفت خواں کا سفر ہر فرد کے لئے لازمی اور یقینی ہے مگر اس سے نجات پانے کا راستہ بھی اختیاری اور یقینی ہے۔ زندگی کے انتہائی حزن و قنوط سے انھوں نے امید اور رجائیت کے چراغ روشن کئے ہیں۔

گوتم بدھ نے غمِ حیات کا مطالعہ افراد سے کیا ہے۔ دیوتاؤں کی ایما سے محل کے اطلس و کمخواب کے حجابات سے گزر کر سدھارتھ کی نگاہوں نے ایک کہن سال ضعیف، ایک بیمار، ایک مردہ شخص اور ایک درویش کو دیکھا۔ یہ مناظر انسانی درد و غم کے مختلف رُخ اور مختلف دَور کا مرقع تھے۔ گوتم بدھ نے افراد کی بے پناہ قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے مگر ان بے پناہ قوتوں کو جسمانی امراض، پیرانہ سالی اور موت کے مہیب پنجوں میں خائف اور مجبور دیکھا ہے۔ یہ وہ ازلی و ابدی بلائیں ہیں جو ہر فرد کے لئے لازمی اور یقینی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فرد کے غم و اذیت سے کائنات کے تمام تر غم و اذیت کا ادراک کیا ہے۔ یہ وہ ادراک ہے جو گوتم بدھ کے ذہن میں محل کی الف لیلانی فضاؤں سے حیات کے گرم ریگ زاروں تک ایک مسلسل خلش اور ایک مہیب رات کی طرح چھایا رہا۔

گوتم بدھ نے حیات کے وہ مسائل نہیں لئے جو کسی دَور کے سماجی نظام کے تخریبی عناصر سے ترکیب پاتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے وہ مسائل لئے ہیں جو جسمِ انسانی سے وابستہ ہیں۔ حیات فنا پذیر ہے، عناصرِ ترکیبی زوال پذیر ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جنھیں ہمیشگی حاصل ہے۔ کسی خاص جگہ یا ماحول کی پیداوار نہیں ہیں یہ ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ چنانچہ گوتم بدھ کا پیام نہ کسی خاص دور کا پابند ہے نہ کسی خاص جگہ کا ماتحت۔ یہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ یہ پیام

کسی مخصوص سماج کا براہ راست مخصوص نظام نہیں، اگرچہ اس کا پُرخلوص عمل ایک نئے سماج کا پیش خیمہ ہے۔ یہ کائنات کے اجتماعی غم و الم کا یقینی درماں ہے۔

گوتم بدھ کے نزدیک زندگی اذیت کا سلسلہ ہے۔ یہ اذیت انسان کے احساسات، خیالات اور افعال کا نتیجہ ہے۔ بدھ کی اصطلاح میں یہ اس کے "کرموں" کا پھل ہے۔ زندگی بذاتِ خود لعنت نہیں بلکہ اسی وجہ سے لعنت ہے کہ آدمی اسے اسفل ترین شکل میں پیش کرتا ہے۔ نروان کے حصول کے بعد ہی نجات مل سکتی ہے۔

لاعلمی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ حقیقت میں اپنے نفس، اپنی خودی کے اصلی خدوخال کے نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے۔ نفس جسم اور روح سے مرکب ہے۔ اسے جسم کے پانچ عناصر اور ذہن کی مختلف حالتوں سے بھی مرکب کیا جا سکتا ہے۔ خودی ایک حال میں نہیں رہتی۔ نروان کی منزل تک یہ مستقل طور سے تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ نروان خودی کے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد اذیت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور انسان بار بار جنم لینے سے نجات پا جاتا ہے۔

اس کے برعکس خودی کے غلط تصور اور نظریے سے وابستگی زندگی کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی کی تمام لعنتیں اسی غلط تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ نفس کے غلط ادراک، تمنا اور زندہ رہنے کے شدید جذبے سے براہ راست احساسات، خیالات اور اعمال میں برائیاں سرایت کر جاتی ہیں۔ برائیوں کے صحیح اسباب کے علم سے ان کا حل بھی تلاش کیا جا سکتا ہے

گوتم بدھ نے ان تمام برائیوں سے بچنے کے لئے آٹھ اصول پیش کئے ہیں جو ایک تو انسان کو غلط راہ سے بچاتے ہیں اور دوسرے نروان کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ اصول نفس یا خودی کے اصلی خدوخال کو سنوارتے اور نکھارتے ہیں اور انسان کو زندگی اور کائنات کی مادی آلائشوں سے بچاتے ہیں۔ ان آٹھ اصولوں کے اپنانے سے وہ برائیاں جو آدمی کی سرشت میں داخل ہو جاتی ہیں، زائل ہونے لگتی ہیں اور وہ اچھائیاں رونما ہونے لگتی ہیں جو نفس کا تزکیہ کرتی ہیں یہاں تک کہ ایک منزل پہ پہونچ کر وہ روح کے پورے جلال و جمال کا ادراک کرتا ہے۔ چنانچہ گوتم بدھ اپنے ضمیر اور روح کی روشنی میں زندگی کے کرب و اذیت کا حل اس صورت میں پیش کرتے ہیں:-

۱۔ راست فہمی:- حقائق کی ماہیت اور ان کا صحیح ادراک لازمی ہے۔ فانی اور غیر فانی قدروں کا امتیاز، تشکیک اور غلط نظریات سے احتراز ضروری ہے۔ منطق اور فلسفے کی پُرپیچ راہوں سے گریز اور حقیقتوں کو پانے کی پُرخلوص کوشش اوّل و آخر مقصد ہیں۔ حیات کے سفر کی یہ پہلی منزل ہے۔

۲۔ راست ارادہ۔ منزلِ عرفان کی مکمل آگہی کے لئے وہ قوتِ ارادی ہے جس کا حصول اور تصرّف حقائق کے صحیح ادراک کے ضبط و نظم کے سہارے لازمی ہے۔ یہ دوسری منزل ہے۔

۳۔ راست گفتار۔ خودی کے ضبط و نظم کے لئے یہ پہلا قدم ہے۔ ایسے ہی الفاظ بولنا روا ہیں جو پاکیزہ، پُرخلوص اور مقدس جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ الفاظ جن کے پردے میں نفرت، کینہ اور فساد ہے، ان سے احتراز لازمی ہے، یہ تیسری منزل ہے۔

راست گفتار اور راست کردار کے مدارج بہت ہی سخت ہیں۔ لیکن ان مدارج کے طے کرنے کے بعد آدمی ان بلندیوں پہ پہنچ جاتا ہے، جہاں سے منزلِ آخر تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے اور نفس پر کامل اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ راست کردار:- وہ عمل مراد ہیں جو مقدس اور برگزیدہ ہیں۔ ایسے عمل بذاتِ خود اپنا حاصل ہیں۔ اس لئے سود و زیاں کا تصور، حاصل لاحاصل کا خیال غلط ہے۔ وہ عمل جو ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ممنوع ہیں۔ حسنِ عمل کے لئے محبت اور خلوص کا اصول بنیادی ہے۔ یہ اصول اچھے اور برے عمل کے درمیان حدیں قائم کرتا ہے۔

۵۔ راست زندگی۔ حلال روزی کمانے کا وہ طریقہ جو دیانت داری، صداقت اور خلوص پر مبنی ہے۔ بددیانتی اور گمراہی کی پُرخطر راہوں اور مرحلوں سے گریز ضروری ہے۔ یہ پانچویں منزل ہے۔

۶۔ راست جد و جہد۔ اپنے برگزیدہ مقصد اور منزل کو پانے کے لئے انسان نے تمام خلوص، محبت اور سرگرمی سے جسمانی اور روحانی قوتوں کا اپنے عمل میں تصرف کرتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد وہ سوتے جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے، غرض کہ ہر حالت میں اصولِ فطرت سے ہم آہنگ بنتا ہے۔ یہ چھٹی منزل ہے

۷۔ راست تفکر۔ ذہن کی اس حالت کا نام ہے جو بصیرت رکھتی ہے۔ خودی کے غلط اور گمراہ کن تصورات، فریب اور تمنا کے تباہ کن اثرات سے ہٹ کر آدمی حقائق کا صحیح ادراک کرتا ہے۔ وہ حقائق سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے جس طرح اپنے دوستوں سے۔ یہی نہیں کہ وہ حقیقت آشنا ہے بلکہ وہ خود ایک روشن حقیقت ہے۔ یہ ساتویں منزل ہے۔

۸۔ راستہ شعاری ذہن کی پر سکون حالت کا نام ہے۔ کرب وغم، شک وہراس ختم ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی فکر ہے نہ اندیشہ۔ بے بنیاد عقاید، خام توقعات اور اندیشہ ہائے دور دراز کا گزر نہیں۔ یہ آٹھویں منزل ہے۔

گوتم بدھ نے ان آٹھ اصولوں کی اہمیت اور افادیت ایک موقع پر یوں پیش کی ہے

" وجود اذیت کی وجہ ہے کیوں کہ زندگی، پیدائش سے موت تک، تمام عمر کے مراحل سے گزرتی ہوئی اذیتوں کا ایک مستقل سلسلہ ہے، یہ پہلی حقیقت ہے۔ وجود کی وجہ زندگی کی ہوس ہے جو حیات کے عزائم، آنکھوں کی حرص اور گوشت و پوست کی ہوس کا نتیجہ ہے اور حیات و موت کی نہ ختم ہونے والی گردش میں سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ دوسری حقیقت ہے۔ وجود کی وجہ کا خاتمہ، جینے کی ہوس کو ختم کرنے سے ہو سکتا ہے۔ جینے کی ہوس، نفس کشی سے ختم کی جا سکتی ہے، یہ تیسری حقیقت ہے اور چوتھی حقیقت آٹھ اصولوں کا مقدس راستہ ہے جو منزلِ عرفان تک رہبری کرتا ہے۔ چناں چہ اے درویشو! کرب و اذیت کی حقیقت نے ان تصورات کا مجھ پر انکشاف کیا اور فیصلے اور آگہی کے دروازے کھول دئے۔ نجات کا راستہ نہ قربانی سے مل سکتا ہے نہ اذیت پسندی سے اور نہ عبادت سے، بلکہ صرف آدمی کی خودی کی رہنمائی سے، جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ جب تک میں اس راستے سے آشنا نہ ہوا مجھے عرفان کی روشنی نہ ملی۔ لیکن مجھے اب وہ روشنی مل گئی ہے اور میری نجات یقینی ہے۔ اب میں زندگی اور موت کی گردش میں گرفتار نہ ہو سکوں گا۔ موت کا مجھ پر اب کوئی زور نہیں رہا۔"

زندگی کی اذیت، موت و حیات کے مسلسل چکر میں پڑنے اور اس سے نجات پانے کے امکانات کی کس وضاحت گوتم بدھ کے " کرم کے تصور " سے ملتی ہے۔

کرم Karma کا تصور زندگی کی قوت اور تحریک عمل کا تصرف ہے جو انسان کے خیال و عمل میں نفرت، کینہ، محبت و خلوص میں ظاہر ہوتا ہے۔ خیال و عمل فرد کی شخصیت کے اجزا و مرکب ہیں جو اپنے مزاج اور ماہیت کے اعتبار سے تخریبی یا تعمیری عناصر کی تخلیق کرتے ہیں اور آخر میں شخصیت کی انفرادی و غیر انفرادی آفاقی و غیر آفاقی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ انسان کا کردار، جسم ماحول سب ماضی کے خیال و عمل کے باہمی عمل اور ردِ عمل سے ترکیب پاتے ہیں۔

" ہمارا سارا وجود ہمارے خیال کا نتیجہ ہے۔ اس کی بنیاد ہمارے خیالات میں ہے۔ یہ ہمارے خیالات سے مرکب ہے۔ اگر ایک شخص پاکیزہ خیالات کے ساتھ بولتا ہے اور کام کرتا ہے، تو مسرت ایک ایسے سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔"

" آدمی خود برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ آدمی خود اذیت اٹھاتا ہے۔ آدمی خود برائی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ آدمی خود اپنے کو پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ پاکیزگی اور آلودگی کا تعلق آدمی کے نفس سے ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کو پاکیزہ نہیں بنا سکتا۔"

چنانچہ آدمی کے خیال و عمل اس کی آنے والی زندگی، اس زندگی کی سطح اور مزاج کے امکانات کو ترتیب دیتے ہیں۔ اچھائی یا برائی، تعمیر و تخریب کی قوتوں کا زندگی میں تصرف کر کے وہ خود سود و زیاں اور بلندی و پستی کی بنیادیں تعمیر کرتا ہے۔ کرم کا اصول، سزائیں عاید نہیں کرتا۔ یہ فردِ جرم کی مانند نہیں۔ یہ اصول زندگی کے مختلف رخ، مختلف پہلوؤں کے امکانات میں توازن قائم کرتا ہے۔ یہی اصول موت و حیات کے لئے آنے والے چکر کی خبر کرتا ہے اور نروان کی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ نروان کی منزل کی ہمارے سامنے واضح تصویر نہیں۔ کیونکہ روح کی پرواز کی یہ وہ بلندی ہے جو ذہن و خرد کی ادراک سے باہر ہے۔

گوتم بدھ کا پیام غم حیات کا ادراک ہے۔ اس کے اسباب کے علم کی بصیرت ہے۔ اور اس سے نجات پانے کا یقینی راستہ ہے۔ انھوں نے غم حیات کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ لیکن اسے حکم الٰہی یا تقدیر کا تابع نہیں بنایا۔ انھوں نے زندگی کے کرب و اذیت سے نجات پانے کے جو اساسی مدارج متعین کئے ہیں۔ وہ قابلِ فہم ہیں اور قابلِ قبول۔ ان کے اصول، تصورات اور نظریات واضح اور سادہ ہیں۔ انھوں نے ماورائی اور مابعد الطبیعاتی مسائل سے ذہنوں میں غبار اٹھنے نہیں دیا۔ اُن کے مقدس اصولوں پر زندگی گزارنے کا صلہ جنت نہیں بلکہ وہ ابدی سکون و سرخوشی ہے جو ذہنِ آدم کی فکری پرواز کی منزلِ آخر ہے۔ اس کے برعکس زندگی گذارنے کی سزا جہنم نہیں بلکہ ابدی سرخوشی کی محرومی ہے اور زندگی کے کرب و اذیت کا مستقل احساس۔ گوتم بدھ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں سال پہلے غم حیات کا بصیرت اور خلوص ادراک کیا اور اس کا حل پیش کیا

آج کل کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ جنگ آزادی نمبر سے متعلق ہوگا۔ مفصل اعلان کا انتظار کیجئے ——— (ادارہ)
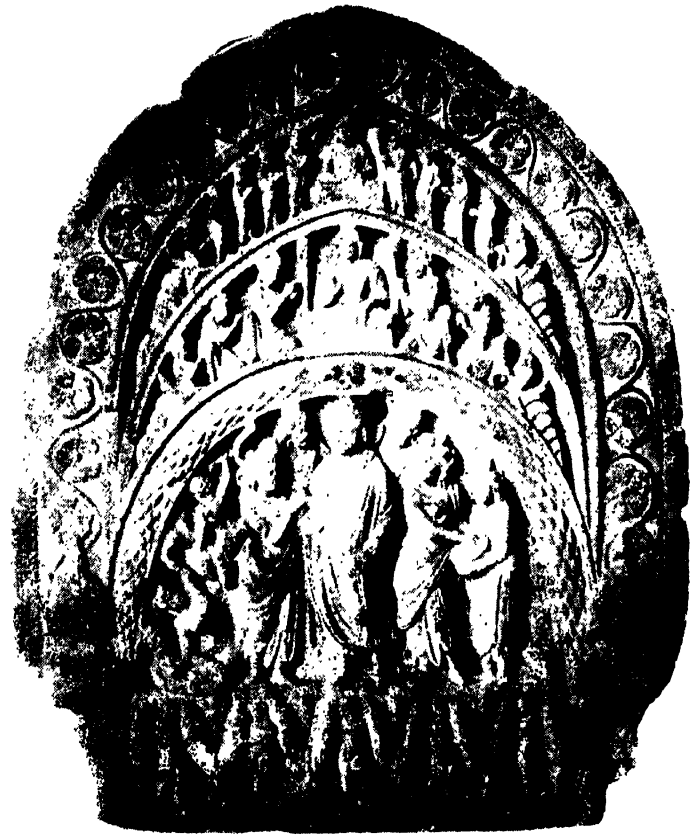
(اوپر) ناگا راجہ اپا لال کي اطاعت (گندھار اسکول)

(بائیں) بدھ کا مجسمہ - متھرا

(نیچے) ساکیہ منی (علامت درخت) کي خدمت میں وحشي جانور سانچي کا دروازہ
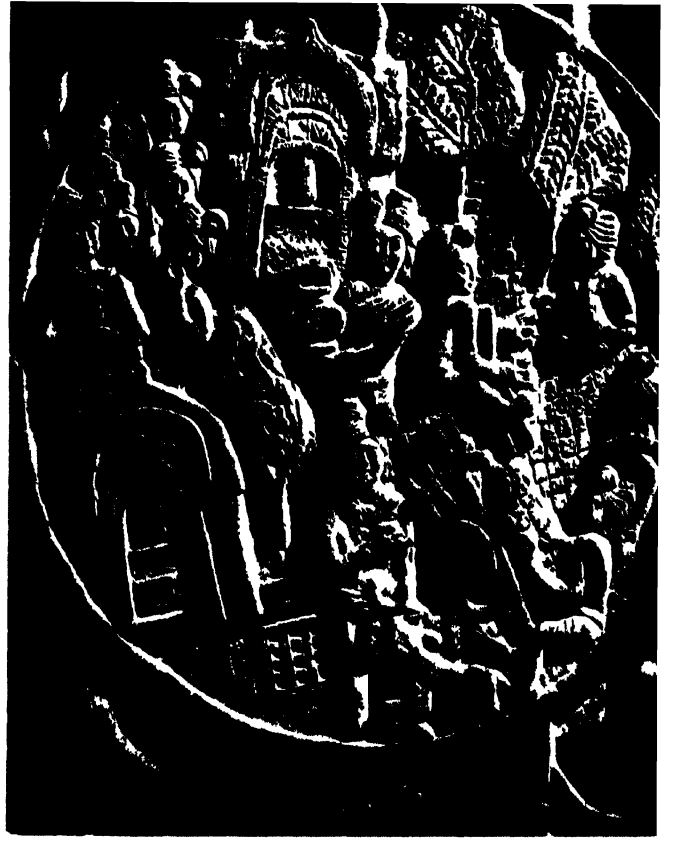
(اوپر) بدھ کا مجسمہ (گردن سے اوپر) - گندھار

(اوپر دائیں) جیتاون کی نذر - بھرہت

(دائیں) مقام عرفاں کا جلوہ (مقدس بودھی پیڑ) - سانچی
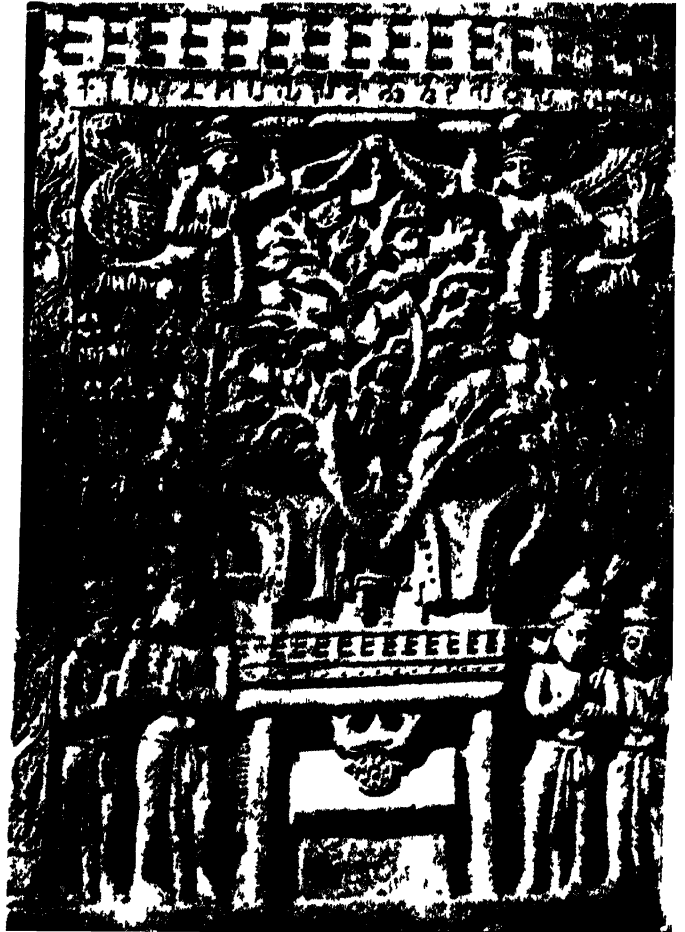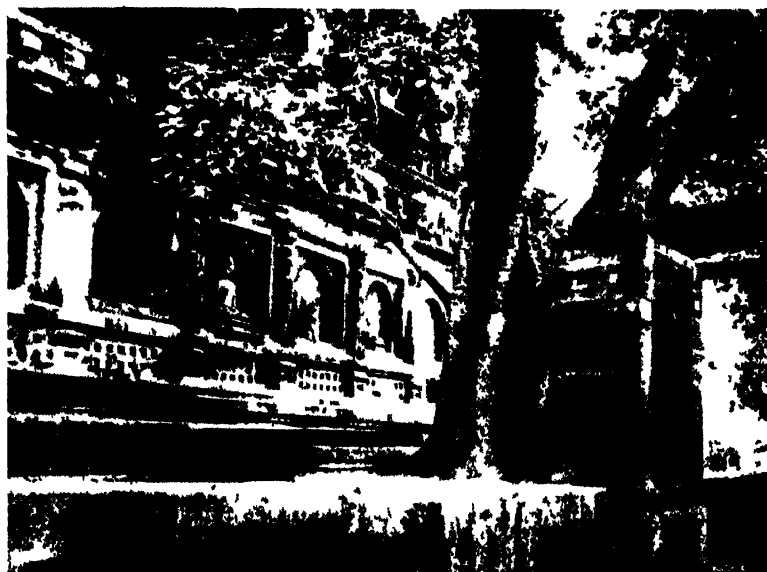
بدھ بشکل اسر جھوتي

منزل عرفاں

مقدس بوڈھي پیڑ - گیا

دھمیک اسٹوپا
سارناتھ

بودھ گیا

مہاتما بدھ کا ایک معجزہ - مست ہاتھ
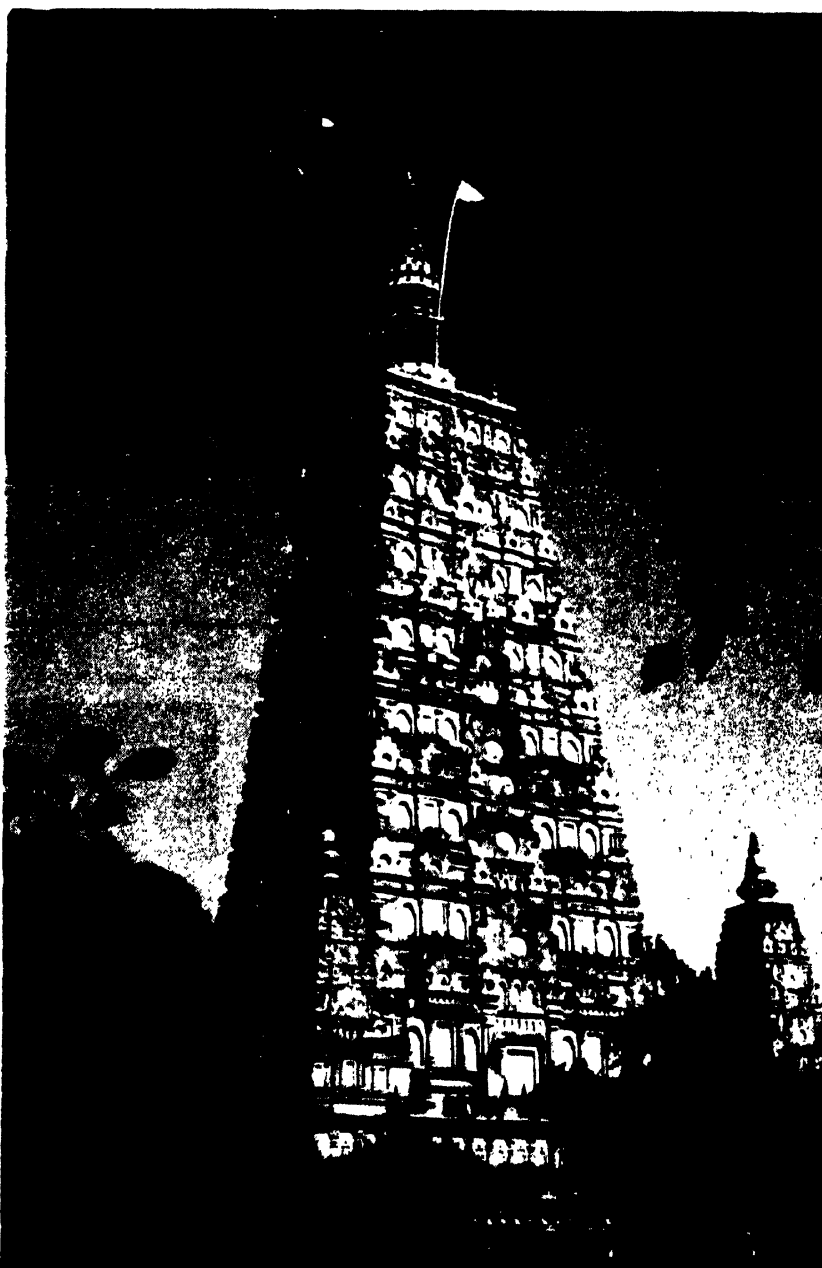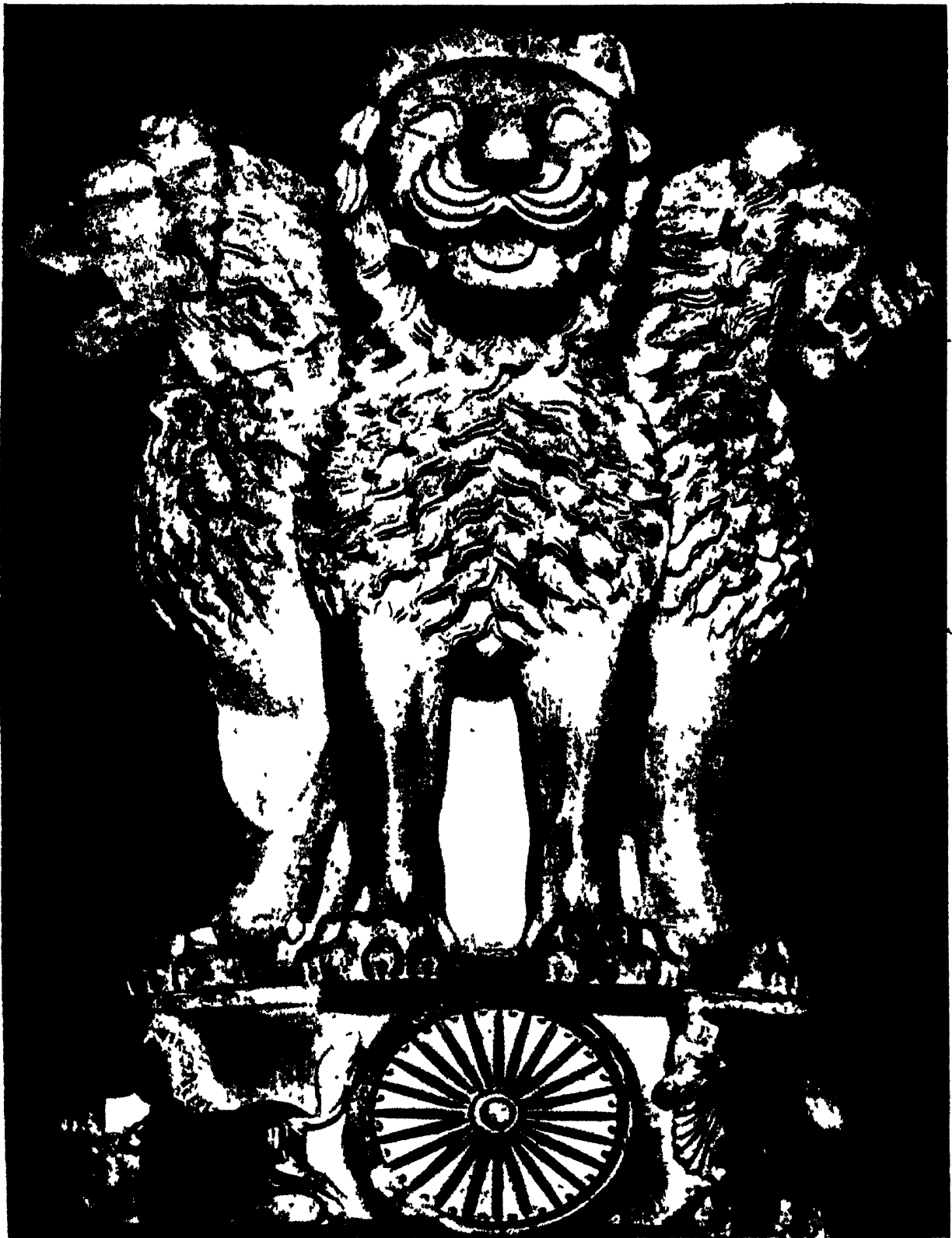
اشوک دي لاٺ - سارناٿ - (اوپري حصه)

سانچی کا استوپ

ایک دروازہ اور استوپ کا کچھ حصہ

نالندہ یونیورسٹی

يو آن چو آنگ
چيني سياح تلاش حق ۾

اوپر بائيں - اجنتا - دروازه غار
نمبر ١٩

منقش ڇت - اجنتا

راشٹرپتی
محکمہ نشرو اطلاعات کی کتاب
«بدھ دھرم کے ڈھائی ہزار سال»
قبول کر رہے ہیں

وزیر اعظم مہابودھی سوسائٹی
کو بودھ راہبوں کی استھیاں
پیش کر رہے ہیں:

میکش اکبرآبادی

بُدھ مت کا سلوک

سلوک سے وہ جسمانی اور ذہنی اعمال مراد ہیں جن کی ورزش سے کسی اعلیٰ رُوحانی منزل تک پہونچا جا سکتا ہے۔ عام طور سے صوفی اپنے ان باطنی اعمال کو سلوک کہتے ہیں۔ اصل چیز وہ منزل ہے جو انتہائی نصب العین کے طور پر معیّن کی جاتی ہے راستے کو سمجھنے سے پہلے منزل کا سمجھنا اور منزل کے معیّن کرنے میں جو نظریات کارفرما ہیں اُن کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے اجمالاً پہلے ان نظریات کا ذکر ضروری ہے جو بدھ مت کی اصل ہیں۔

بدھ مت میں سب سے اہم اور سب کی اصل زندگی سے بیزاری اور اس کا ترک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت بدھ کی فکر کی ابتدا زندگی سے بیزاری سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے ایک ہی روز میں تین ایسے منظر دیکھے کہ ان کا دل زندگی سے بیزار ہو گیا۔ ایک بڈھا جس کی کمر جھک گئی تھی اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا، ایک طاعون کا خوفناک مریض، اور ایک مردہ جس کی شکل بدل گئی تھی۔ گوتم نے سوچا یہ بڈھا دنیا میں کیوں آیا؟ بیماری کیوں آئی؟ موت کیوں آئی؟

گوتم کو یقین ہو گیا کہ دُنیا ایک عظیم دار المحن ہے لیکن اس مصیبت کی اصل اور سبب کیا ہے اور اس کا تدارک کیا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انھوں نے قدیم مذہب کا پورا سلوک طے کیا شدید ترین ریاضتیں کیں لیکن چھ سال کی مسلسل ریاضت کے بعد انھیں ناامیدی ہو گئی اور انھوں نے خود اپنی فکر سے مطلق اور نورِ اعلیٰ حاصل کر لیا۔ اس مخصوص فکر اور اس کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے:-

انحطاط اور موت کا سبب پیدائش (جنم) ہے۔ جنم لینے سے پہلے جنم اور سابقہ وجود (بھاو) پر منحصر ہے۔ بھاو اپادان سے پیدا ہوتا ہے (اپادان محبوب اشیا اور مالوف چیزوں کے استقلال کی خواہش کو کہتے ہیں) اپادان خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ خواہش کے لئے احساس اور احساس کے لئے حسّی اتصال ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر حسّی اتصال نہ ہو تو احساس نہیں ہو سکتا۔ چھ حسّی اتصال اور چھ ان کے معروض عمل کے محل ہیں اور ان کا انحصار جسم اور نفس (نام روپ) پر ہے۔ نام روپ شعور پر منحصر ہے۔ شعور کا استحکام ارادہ فعل (سنکھارہ) سے ہوتا ہے۔ ارادۂ فعل کی اصل جہالت ہے اس لئے اگر جہالت کو روک دیا جائے تو اس کے نتیجے میں یہ تدریجی دُکھ بھی ختم ہو جائے گا۔ اسے بھاو چکر یا ہستی کا چکر کہتے ہیں۔

مصیبت افعال سے پیدا ہوتی ہے جس میں نفس اپنے کو اُلجھا ہوا پاتا ہے جب جہالت فنا ہو جاتی ہے تو جہالت کے احوال اور معروضات بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان معروضات ہی کو ہم خارجی عالم کہتے ہیں اسی کے ساتھ خود وہ نفس بھی فنا ہو جاتا ہے جو اس سے تعلق رکھتا ہے۔

جہالت کیا ہے

علم کی طرح جہالت بھی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ محض علم کے تقابل سے از روئے قیاس ہم جہالت کو بیان کر سکتے ہیں۔ جہالت کے لمس سے یہ تمام وجود ظاہر ہوا ہے۔ لیکن وہ جہالت کیا ہے جس کے مٹ جانے سے الم دور ہو جاتا ہے اور نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ بدھ مت اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ وہ جہالت ہے کسی مستقل وجود کا اقرار، روح کا اعتقاد، ہستی کا اقرار اور اس قسم کے تمام اقرار۔ اس لئے ان سب کا انکار اور ترک جہالت کا ترک ہے۔

بدھ مت کی رو سے یہ سوال کرنا کہ کائنات ازلی ہے یا نہیں، جسم اور روح ایک ہیں یا علحدہ علحدہ، "نروان" ایک بی صفت ہے یا نیستی محض، کفر سمجھا گیا ہے۔ روح کے ماننے والوں، خدا کے ماننے والوں، ویدوں کے مقلدین اور اُن کو جو مظاہر یا عالم کو معلول مان کر اس کے لئے کسی علّت کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں دہریہ الٰہ

ہے وجود کہا گیا ہے

حقیقت اعلیٰ

بدھ محققین کے نزدیک دنیا اور جو کچھ ہے سب مایا اور دھوکا ہے جسے ہم کچھ ہونا یا عالم سمجھتے ہیں۔ وہ متغیر ہونے والے مظاہر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ذات یا جوہر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نہ کوئی حقیقت اعلیٰ نہ کوئی مستقل شعور ہے سب کچھ خلا ہو جاتا ہے اور دھوکا ہی دھوکا۔

جس طرح یونانی اور اسلامی فلسفیوں نے عالم کے تغیر پر غور کیا ہے اور اسے عالم کے حادث ہونے کی علت قرار دیا ہے اسی طرح بدھ محققین نے بھی عالم کے تغیر پر غور کیا ہے اور اس تغیر کو عالم کے مایا اور فریب ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ وہ اس نقطۂ نظر پر زور دیتے ہیں کہ جو کچھ بھی ایک وقت معلوم اور محسوس ہوتا ہے وہ دوسرے وقت فنا اور معدوم ہو جاتا ہے لہٰذا سب کچھ عارضی ہے۔ استقلال کا شعور ہمارے خود اپنے وجود کے تصور استقلال سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ایک فریب ہے خود ہمارا شعور ذات کسی خاص شے کے جذبات، تصورات کی پیداوار ہے نہ علت نہ معلول نہ نفس ہے نہ روح۔

مظاہر اور ان کی نمائش یا ظہور خلاف حقیقت اور ایک جادوگر کے شعبدے کی طرح ہیں جو نہیں ہیں مگر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود بدھ اور ان کی تعلیم بھی ایک خواب ایک خیال اور ایک سراب ہے۔ جب ذات کے ادراک کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو وہ ذات کا ادراک نہیں ہوتا بلکہ ان ذہنی تحریکات اور اعراض کا ادراک ہوتا ہے

بدھ مت کے اس نظریے کو ہم عدمیت سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے آثار بدھ مت کے علاوہ بھی ہندو فلسفے میں ملتے ہیں جیسے کہ یاجنولکیہ نے [illegible] کے سوال پر کہ برہما کیا ہے، جواب دیا ہے کہ آتما خاموش ہے اور اس کے بتلانے کے لئے راستہ یہ ہے "نیتی نیتی" (وہ یہ نہیں ہے وہ یہ نہیں ہے)

وجود

بدھ کے متعینوں کا خیال ہے کہ جو شے ہمارے اندر اثر پیدا کرتی ہے وہ موجود ہے اور جو اثر نہیں کرتی وہ معدوم ہے اس طرح گویا اثر کی پیدائش ہی ان کے نزدیک وجود کی تعریف ہے۔ اثر کی ہر وحدت یا اکائی دوسری وحدت سے جدا ہے اس لئے اثر مختلف وحدتوں کا ایک تسلسل ہے اور تمام اشیاء عارضی ہیں

چوں کہ بدھ کے نزدیک جوہر[1] موجود نہیں ہے اور تمام نمائش و ظہور دراصل اعراض کا ہے اس لئے بھی تو انھوں نے وجود کی تعریف ایک ایسی استعداد سے کی ہے جس سے ہم مشاہدات کے ذریعے سے واقف ہوتے ہیں اور جس کا ثبوت شکلوں اور صورتوں سے ہوتا ہے اور کبھی کہا ہے کہ وجود کسی شے کی تخلیق یا ظہور کی قابلیت ہے، اسی طرح شے کی تعریف یہ ہے کہ وہ مستقل خصوصیات کا اتصال یا اجتماع ہے اور جب نئی خصوصیات ان خصوصیات میں مجتمع ہو جاتی ہیں تو ایک جدید شے کا ظہور ہوتا ہے۔ عرض یا صفات کو یہ لوگ جوہر سے علیحدہ فرض کرتے ہیں اور جوہر کو محض دھوکا مانتے ہیں۔ ہر شے کے متعلق بدھ مذہب پہلے اقرار کرتا ہے پھر انکار، اور پھر اقرار نہ انکار۔ مثلاً اگر سوال کیا جائے کہ موت کے بعد بھی بدھ قائم رہتا ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ بدھ موت کے بعد قائم ہے اور بدھ موت کے بعد قائم نہیں ہے اور بدھ موت کے بعد نہ موجود ہے نہ معدوم۔

اپنشد اور اس کے اثر سے اس متغیر عالم میں اس عالم سے ماورا ایک غیر متغیر ذات تسلیم کی جاتی ہے جو اس عالم کی علت ہے لیکن بدھ مت مستقل وجود یا ذات یا علت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی ایسی ذات کو جو متغیر تعینات سے ورا ہے مستقل ذات نہیں کہہ سکتا۔ عالم بدلنے والے مظاہر کے سوا کچھ نہیں لہٰذا سب کچھ معدوم ہے اور اس میں الم اور دکھ ہے۔ ویدانت اور بدھ مت میں یہ اہم اور بنیادی فرق ہے۔

بدھ مذہب کے چار اصول

وہ حالت جو بدھ[1] کے درجے کو پہنچاتی ہے۔ رہبانیت کی حالت ہے ان چار حقیقتوں کی تعلیم عام لوگوں کو نہیں دی جاتی بلکہ صرف راہبوں کو دی جاتی ہے کیوں کہ ان اصول اور نتائج کو سمجھنے کے لئے بہت سے مدارج طے کرنا ضروری ہے

---

[1] جوہر سے مراد ہے مستقل بالذات یا وہ شے جو اپنے پائے جانے میں کسی دوسری شے کی محتاج نہ ہو۔ عرضیات کہتے ہیں جو اپنے پائے جانے میں دوسرے کا محتاج ہو۔

[1] بدھ سے مراد یہاں مہاتما بدھ کی مخصوص شخصیت نہیں ہے بلکہ وہ ایک انتہائی درجہ ہے جس کو گوتم بدھ نے حاصل کیا تھا اور اسی راستے پر چل کر دوسرے بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بدھ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر لی یان کہتے ہیں کہ ایک فرقے کا اعتقاد یہ ہے کہ ساکیامنی (گوتم بدھ) کے بعد ایک اور بدھ آئے گا جو نئی روشنی اور نئی قوت لائے گا اور نجات کا اس سے بھی زیادہ آسان راستہ بتائے گا۔ ڈاکٹر لی یان کی تحقیق کی رو سے بدھ کے معنی وجود کامل کے ہیں جو خدا سے بھی بڑا درجہ ہے۔ اس سے مراد وہ وجود کامل ہے جو عالم کی ابتدا اور انتہا ہے۔ اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خلائے مطلق ہے۔

للت وستر[۲۵] میں لکھا ہے :-

" اے راہبو یہ ہیں وہ چار محترم حقائق ۔ اول دنیاوی مصیبت دوسرے دنیاوی مصیبت کی جڑ۔ تیسرے دنیاوی مصیبت کا معدوم ہو جانا۔ چوتھے دنیاوی مصیبت کو معدوم کرنے کا طریقہ۔

" دنیاوی مصیبت کیا چیز ہے ؟ اصل میں پیدائش دُنیاوی مصیبت ہے ! بڑھاپا ، بیماری ، موت ، ان سے دور رہنا جن سے ہم محبت کرتے ہیں اور ان سے ملنا جن سے ہم نفرت کرتے ہیں اس کا نام دنیاوی مصیبت ہے۔ انسان کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور کوشش کے ساتھ بھی اسے نہیں پاتا۔ یہ دنیاوی مصیبت ہے ، غرض وہ چیزیں جو حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں دنیاوی مصیبت ہیں

" دنیاوی مصیبت کی جڑ کیا ہے ؟ یہ وہ خواہش ہے جو ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے وہ خواہش جو حظِ نفسانی کی شدت سے پیدا ہوتی ہے جو اس سے اور اُس سے لذت حاصل کرتی ہے یہی جڑ ہے دنیاوی مصیبت کی ، دنیاوی مصیبت کو معدوم کرنا کیا ہے : شہواتِ نفسانی کو ٹھنڈا کرنا اور اس خواہش کو معدوم کرنا جو ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے اور حظِ نفسانی کی شدت سے پیدا ہوتی ہے اور اس چیز سے لذت حاصل کرتی ہے اور پھر پیدا ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔ یہ ہے دنیاوی مصیبت کا معدوم کرنا۔

" اور وہ طریقہ کون سا ہے جس سے دنیاوی مصیبت معدوم ہو جاتی ہے ؟ یہ وہ محترم طریقہ ہے جس کے آٹھ حصے ہیں بصیرت کامل سے لے کر مراقبۂ کامل تک ، یہ ہے حقیقت اس طریقے کی جس سے دنیاوی مصیبت معدوم ہو جاتی ہے۔ اے راہبو : یہی ہیں چار محترم حقائق ۔"

(للت وستر باب[۲۶])

اگرچہ رہبانیت اور ترک ہندو فلسفے میں ایک عام اور مشترک تعلیم ہے لیکن بدھ کا فلسفہ الم سے بچنے کی کوشش اور اس کے اسباب کی دریافت سے ہی پیدا ہوا ہے اور اس کی تحقیق میں تینوں زندگیوں میں سوائے الم کے ظہورات کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے زندگی اور زندگی کے تمام لوازمات یا ترک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا سلوک اور مراقبہ سب کی روح زندگی سے بیزاری اور ترک ہے۔ اس موقع پر " ناگارجن " کی " سرسکیہ " کے چند فقروں کی نقل بے محل نہ ہوگی جنھیں پروفیسر گپتا نے " وترل " کے ترجمے کے حوالے سے نقل کیا ہے ۔

" تو جو دُنیا سے آگاہ ہے تو اٹھ دُنیاوی احوال سے بے نیاز ہو جا، مثلاً نفع نقصان، مسرت، الم، عزت، ذلت، تعریف مذمت، اس لئے کہ یہ تیرے خیالات کی چیزیں نہیں ہیں ۔"

" چار دھیان کرنے سے تم برہمن کی قسمت کا پھل پاؤ گے بشرطیکہ خواہش، فکر، خوشی، مسرت و الم کو ترک کر دو "

" مذہبی رسمیں، باطل آرا اور شکوک۔ ان سے تعلق رکھنا گویا تین بیڑیاں ہیں ۔"

" اگر تمھارے کپڑوں یا سر کو آگ لگ جائے تو اُسے بجھاتے وقت بھی خواہش کی فنا کی کوشش کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی اہم ضرورت نہیں ہے کہ خواہش کو فنا کیا جائے "

اس تمہید اور اقتباسات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ بدھ مت کا مقصد اور آخری منزل یہ ہے کہ زندگی کے دُکھوں سے نجات حاصل کی جائے جو فنائے محض ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ اور طریقہ کیا ہے ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس طریقے کا نام ہی سلوک ہے ۔

بُدھی سلوک

بدھی سلوک میں یہ تین چیزیں بہت اہم ہیں۔

بسل ۔

سمادھی۔

پرگیا ۔

بسل سے مراد ہے ضبطِ نفس یعنی انسان صحیح راہ پہ چلے اور غلط راستے سے باز رہے ۔ بسل ارادے کی صحت، ذہنی احوال کی مطابقت، ضبطِ خیال اور جسم زبان اور عمل و کردار سے کسی کو نقصان نہ پہنچانے پر مشتمل ہے بسل کی اچھی طرح مشق

[۲۵] ڈاکٹر لی بان کے بیان کے مطابق بدھ ازم پر سب سے قدیم کتاب للت وستر ہے جو نیپال میں غالباً پہلی صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی۔

اور انجام دہی سے ولایت کی دو منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں منزلوں کے نام ہیں سوتاپنہ بھاؤ اور سکدا گامی بھاؤ یعنی وہ منزل جس میں انسان سیدھے بھاؤ میں ڈالا جاتا ہے اور وہ منزل جس میں صرف ایک پیدائش اور جھیلنی پڑتی ہے سیل سے حواس کی موقوفی شروع ہو جاتی ہے اور خارجی محرکات کے اثر کو روکنے اور اُن سے پریشان نہ ہونے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیل کی مشق سمادھی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

سمادھی۔ سیل سے بلند مقام اور اعلیٰ جدوجہد کا نام ہے اس کا ترجمہ ارتکاز کیا جا سکتا ہے یعنی تمام حواس اور ذہنی احوال و افعال فکر و توجہ کو ایک نقطہ پر جمع کر لینا جسے صوفیوں کی اصطلاح میں جمعیتِ خیال یا استغراق کہتے ہیں۔ اس مقام پہ ذہنی تغیّر موقوف ہو جاتا ہے۔

پنیا سے مراد وہ فراست ہے جس سے الم، الم کا سبب، الم کی فنا اور الم کی فنا کے اسباب کا صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے۔

نجات اور اس کے لئے مراقبے (دھیان)

۱۔ ابتدائی تدبیر یہ ہے کہ پہلے ذہن کو اس طرح تربیت دینا اور یہ خیال کرنا چاہیئے کہ کھانے پینے کی خواہشات مکروہ ہیں۔ ان تکلیفوں کا خیال کرنا چاہیئے جو کھانے پینے کی تلاش میں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ غذا کے آخری مکروہ تغیّر پر غور کرنا اور نفرت پیدا کرنا چاہیئے۔

اس طریقے سے ان چیزوں سے تعلقِ خاطر ختم ہو جائے گا ایک مجبوری کی بُرائی سمجھ کر انسان یہ کام کرے گا اور منتظر رہے گا کہ کب اس سے چھٹکارا پاؤں۔

۲۔ یہ تصوّر کرے کہ ہمارے جسم کے تمام اعضا جو خاک، آگ، پانی اور ہوا سے مرکب ہیں ایک گائے کی نعش کی مانند ہیں جو قصائی کی دوکان پر ہو۔ اسے مراقبۂ جسم کہتے ہیں۔

۳۔ بدھ اور اُن کے مخصوص راہب شاگردوں کی عظمت اور نیکیوں پر بدھ دیوتاؤں[1] اور ان کے قانون کی عظمت اس کے اچھے اثرات پر، موت

[1] بدھ دیوتاؤں سے غالباً وہ برہمنی دیوتا مراد ہیں جو آخر میں برہمنی اثر سے بدھ مذہب میں شامل ہو گئے تھے ورنہ بدھ مذہب میں کوئی خاص دیوتا نہ تھے۔ ان دیوتاؤں کو بدھ مذہب نے قائم رکھا شروع میں ان کو بدھ سے نیچا درجہ دیا گیا مگر رفتہ رفتہ وہ دیوتا اپنی قدیم عظمت واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اُنھیں برہمنی مذہب میں حاصل تھی اور بدھ کی مورت بھی ایک دیوتا کی حیثیت سے ان کی پرستش میں شامل ہو گئی۔

کی نوعیت اور تمام مظاہرِ عالم کے آخری اختتام اور اُس کی نوعیت پر غور کرنا۔

یہ ابتدائی مراقبے "اپچار سمادھی" کہلاتے ہیں۔ اِن سے ترقّی کرنے کے بعد دوسرے مراقبے شروع ہوتے ہیں جو سمادھی تک پہونچاتے ہیں۔ اس منزل پر تزکیۂ نفس اور جمعیتِ خیال کی کوشش جاری رہتی ہے اور اس طرح "نیان" (آخری منزل) تک پہونچنا ممکن ہو جاتا ہے۔

اس درمیانی منزل کے ابتدائی حصّے میں رشی مرگھٹ جاتا ہے اور مردوں کے جسم کے خوفناک تغیّرات کو دیکھتا ہے وہ ان مناظر کی کراہت، ناپاکی اور خوفناک تغیّر پر نفرت کے ساتھ غور کرتا ہے پھر اسی خیال کے زیرِ اثر زندہ اجسام کو دیکھتا ہے کہ یہ بھی دراصل مردہ لاشوں ہی کی طرح ہیں اور اتنے ہی نفرت و حقارت کے قابل ہیں۔ اس کو اجسام کی ناپاکی کے ادراک کا مجاہدہ کہتے ہیں۔ اس مجاہدے سے جسم نفس سے علیحدہ ہو جاتا ہے

دھیان جمانے میں ان طریقوں سے امداد لی جاتی ہے کہ رشی ایک پُرسکون جگہ پر بیٹھتا ہے اور اپنے سانس کے آنے (پناس[1]) اور جانے (اَپناس) پر دھیان لگاتا ہے اس طرح بےشعوری اور غفلت سے سانس لینے کے بجائے وہ یہ آگاہی حاصل کرتا ہے کہ وہ جلد سانس لے رہا ہے یا آہستہ اور اس طرح وہ سانسوں کو شمار سے معیّن کرتا ہے تاکہ ذہن متعیّن ہو سکے

اس کے بعد برہم دھا ہے جو چار مراقبوں پر مشتمل ہے

۱۔ عالمگیر دوستی (۲)، عام رحم (۳)، سب کی مسرّت میں اپنی مسرّت (۴)، دوست یا دشمن کسی کو کسی پر ترجیح نہ دینا اور اُن سے بےپروائی۔ اس طرح یہ قوت بہم پہونچائی جاتی ہے کہ رشی اپنی سلامتی اور دوسروں کی سلامتی میں فرق محسوس نہ کرے اسے سب کی مصیبت دُور کرنے اور موت سے بچانے کی ایسی ہی کوشش کرنی چاہیئے جیسی کہ اپنے واسطے۔

بُغض سے سِیل فنا ہو جاتی ہے۔ رنج، ناخوشی وغیرہ تمام عوارض (دکھ) عارضی ہیں اور کھنڈوں (اعراض) کا وجود ہی نہیں ہے پس فرد کس سے پہونچے گا اس طرح دوستیِ عام تک رسائی ہو جاتی ہے

رشی کو چاہیئے کہ مٹی کے ایک بھورے گولے پر کبھی آنکھ کھول کر توجہ دے اور کبھی آنکھ بند کر کے اس کا تصوّر جمائے۔ جب تصوّر جمنے لگے تو مٹی کے گولے

[1] ایرانی صوفیہ کا "پاس انفاس" غالباً اسی کی ترقّی یافتہ صورت ہے۔

کو علیحدہ کر دے اور محض تصور کی مدد سے اس کی شبیہ کو خیال میں قائم کرے اس طرح بتدریج مراقبۂ اول (وتِنک) سے وچار تک دسترس ہو جاتی ہے اور ایک حد تک نفس میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے سُکھ کا حصول آسان ہو جاتا ہے اور خواہشات کی رغبت، نفرت، سُستی، غرور، اضطراب اور شک دفع ہو جاتے ہیں۔

اس حالت کے قائم ہو جانے کے بعد رشی کو احساس ہوتا ہے کہ یہ حالت بھی ناقص ہے اس لئے وہ دوسرے مراقبے (دوتی یم جھانم) میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے یہاں پہلے مراقبے کا "وتنک" اور "وچار" نہیں کیونکہ اس میں ایک طرح کی حرکت موجود رہتی ہے لیکن یہاں نفس پُرسکون حالت میں منتقل ہو جاتا ہے اور حرکت فنا ہو جاتی ہے

اس سے آگے کی منزل میں رشی کو اس لُطف اندوزی سے بھی قطع نظر کرنا پڑتا ہے جو اس پرسکون حالت سے حاصل ہوتی ہے یہاں وہ اشیاء کو دیکھتا ہے لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا پھر بھی آرام اور سُکھ اور اس سے لُطف اندوزی اس منزل میں باقی رہتی ہے اس لئے اگر ضروری احتیاط اور نگہداشت نہ کی جائے تو رجعت واقع ہو سکتی ہے یعنی اس مقام سے تنزل واقع ہو سکتا ہے۔

چوتھی اور آخری منزل میں دُکھ سُکھ سب فنا ہو جاتے ہیں دوستی اور دشمنی کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں، اور رشی اعلیٰ اور مطلق بے نیازی کی حالت حاصل کر لیتا ہے چت ختم ہو جاتی ہے اور فنائے کامل حاصل ہو جاتی ہے۔ اعراض پیدا ہونے موقوف ہو جاتے ہیں اور دوبارہ جنم کی تکلیف اٹھانی نہیں پڑتی اور اس طرح سارے دُکھ مطلقاً موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس حالت کو نبان کہتے ہیں۔

نبان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خالص فنا، ناقابلِ تصور اور غیر متغیر حالت ہے اس آخری حالت کو "تتھتا" بھی کہا گیا ہے جس میں رشی کا نفس فنا ہوتا ہے اسی طرح سے نروان کی بھی تعریف کی گئی ہے اور ان میں ان کا باہمی فرق سمجھنے سے معذور ہوں۔ غالباً یہ مختلف فرقوں کے مختلف اصطلاحی الفاظ ہیں جن میں سب سے معروف نروان کا لفظ ہے۔

نروان اور نجات (موکش)

جب کہ ساری خواہشات فنا ہو جاتی ہیں اور فہم و ادراک کرنے والا نفس عمل سے رُک جاتا ہے باطل اور مجازی مخلوقات پیدا ہونا موقوف ہو جاتی ہے تو اس حالت کو نروان کہتے ہیں۔ نروان نفس کی آخری فنائیت ہے اس حالت کو موت نہیں کہہ سکتے کیونکہ موت کے بعد تناسخ ہے اور نروان کے بعد تناسخ نہیں ہے اسے فنا بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ مرکب اشیا فنا ہوتی ہیں اور یہ مرکب نہیں ہے

غرض یہ کہ نروان نجات کی اعلیٰ ترین صورت ہے کیونکہ دوسرے ہندو نظامات فکر کی طرح بدھ مت میں بھی اصلی نجات زندگی کے مسلسل چکر، دوبارہ پیدائش اور زندگی کے دُکھوں سے نجات حاصل کرنا ہے بعض کے نزدیک نروان کا درجہ نجات کے بھی بعد حاصل ہوتا ہے اور اس سے بھی اعلیٰ ہے

اشوک کے بعد بڑے بڑے بودھ تاجدار

مِلندر یا مِلند۔ تقریباً ایک سو سال قبل مسیح اس صاحب علم و فہم بادشاہ کا زمانہ ہے۔ اس نے مشہور بودھ سادھو ناگ سین سے اپنے شکوک رفع کئے۔ اظہارِ تشکر کے طور پر ایک بودھ عبادت خانہ ملندر وہار کے نام سے تعمیر کیا اور ناگ سین کے حوالے کیا۔

کنشک۔ [illegible] سے [illegible] تک اس نے حکومت کی۔ مہایان مدرسۂ فکر کی ترقی اس زمانے میں ہوئی۔ اس نے کشمیر میں ایک بہت بڑی بودھ مجلس منعقد کی۔ پارسو کے کہنے پر یہ مجلس بلائی گئی۔ وسومتر اس کا صدر تھا اور اسو گھوس اس کا نائب صدر تھا۔ اس مجلس میں بودھ مت کے قوانین اور اُن پر تبصرے قلم بند اور مرتب کئے گئے۔ ہیوان چانگ نے لکھا ہے کہ اس مجلس نے اُپدیش شاستر، دنے وبھاشا شاستر، آدی دھرم وبھاشا شاستر کے ایک لاکھ اشلوک تصنیف کئے۔ کلہن نے بھی راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کنشک نے بہت سی عبادت گاہیں اور وہار تعمیر کئے البیرونی نے کنشک کے پشاور میں تعمیر کردہ کنشک مہا وہار کا ذکر کیا ہے۔

ہرش وردھن (ساتویں صدی عیسوی) یہ بہت بڑا فاتح ہوا ہے۔ چھتیس سال تک یہ جنگ و جدل میں مصروف رہا۔ سنسکرت کا مشہور شاعر بان اسی کے عہد میں ہوا ہے۔ سنسکرت کے تین ڈرامے ناگ نند، رتناولی اور پریہ درشکا خود ہرش سے منسوب ہیں یہ بڑا ہر دلعزیز بادشاہ تھا۔ اس نے بدھ عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ شو مندر بھی تعمیر کئے۔ یہاں تک کہ بعض مؤرخوں نے اسے شو کا ہی پجاری گردانا ہے لیکن زیادہ تر شہادت ایسی ملتی ہے کہ ہرش بودھ مذہب کا پیرو تھا۔

شاہین غازی پوری

خوابِ صنم

رات تاریک تھی رات ویران تھی
زندگی دم بخود اور پریشان تھی
خاک و خوں میں تھا لتھڑا ہوا آدمی
روحِ انسانیت کی پشیمان تھی
ہو رہا تھا ہر اک سمت محشر بپا
آفتِ دو جہاں اور اک ہیجان تھی

خاورِ علم و عرفاں دمکتا نہ تھا
کوئی ذرہ زمیں پہ چمکتا نہ تھا
دور نظروں سے آوارہ تھی چاندنی
اک چکورا بھی امبر کو تکتا نہ تھا
غم سے خوں ہو گیا تھا کلی کا جگر
عندلیبِ گلستاں چہکتا نہ تھا
مے گسارانِ مے خانہ بے حال تھے
دورِ مے بند تھا خم چھلکتا نہ تھا

سخت مجروح تھے لالہ و یاسمن
خون میں تر بتر تھی نگاہِ صبا

زلزلہ خیز تھیں موت کی چشمکیں
تھے نگوں سار کاخِ سرافراختہ

آتش انگیز تھا لالہ زارِ ارم
شعلۂ گل بھڑک اٹھا تھا دمبدم
شہرِ کنعاں میں کوئی یوسف نہ تھا
تھیں زلیخائیں بیگانۂ کیف و کم
کوئی شے ہی نہ تھی آذری نام کی
رازِ پنہاں ابھی تک تھا خوابِ صنم

اور ایسے میں اک بندۂ حق پسند
راہِ پُرپیچ و خم وار رہنما
دشتِ اوہام میں ایک شمعِ یقیں
تند طوفان میں ایک جلتا دیا
گلکدہ کے لئے اوس کی جل ترنگ
مضطرب غنچہ و گل کو بادِ صبا
پستیوں کو بلندی پہ لاتا ہوا
بھولے بھٹکوں کو رستہ دکھاتا ہوا

شعلہ زاروں کو گلشن بناتا ہوا
آدمیت کے پرچم کو لے کر اٹھا
اس کے ہونٹوں پہ معصوم مسکان تھی
اس کی آنکھوں میں تسنیم کی گمبھیرتا
امن اور آشتی کی تمنا لیے
وہ پیام محبت سناتا رہا
"آگ سے آگ زنہار بجھتی نہیں
تند شعلوں پہ پانی کا چھڑکاؤ دو
ہو نہیں سکتی نفرت سے نفرت فنا
نفرتوں کو محبت بھرا گھاؤ دو"

اور پھر یہ کلی مسکرانے لگی
چار سو زندگی گیت گانے لگی
سوئے منزل نیا قافلہ چل پڑا
آرزوئے طلب رنگ لانے لگی
چھٹ گئی رات کی بے کراں تیرگی
مہرِ تاباں کی محنت مہکنے لگی
زندگی جاگ اٹھی اور اجل سو گئی
جشنِ نوروزِ گیتی منانے لگی
"آگ سے آگ زنہار بجھتی نہیں
تند شعلوں پہ پانی کا چھڑکاؤ دو
ہو نہیں سکتی نفرت سے نفرت فنا
نفرتوں کو محبت بھرا گھاؤ دو"

بودھ تیرتھ استھان

۱۔ لمبنی بن — موجودہ نام رمن دئی۔ تحصیل بھگوان پور نیپال میں واقع ہے۔ یہ گوتم بدھ کی جائے پیدائش ہے۔

۲۔ بودھ گیا — شہر گیا (بہار) سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر بدھ کو عرفان حاصل ہوا۔

۳۔ سارناتھ — بنارس سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہرنوں کا باغ تھا جس میں بدھ نے اپنا پہلا وعظ کیا اور دھرم چکر پرورتن کی تعلیم دی۔

۴۔ کسی نگر — موجودہ نام کسیہ ضلع گورکھ پور۔ اتر پردیش۔ یہاں پر سال کے درختوں کے جھنڈ میں بدھ کا مہا پری نروان (نجات آخر) ہوا

۵۔ سراوستی — موجودہ نام سہیٹھ مہیٹھ، اتر پردیش میں گونڈہ اور بہرائچ کی سرحد پر۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ نے یہاں کئی معجزات دکھلائے۔

۶۔ سنکسیہ — موجودہ نام سنکیسہ یا سنفیہ بسنت پور ضلع ایٹہ اتر پردیش کہا جاتا ہے یہاں پر بدھ نے معراج حاصل کیا یعنی سورگ میں جا کر اپنی والدہ کو ابھی دھرم کی تعلیم کی اور ایک آسمانی سیڑھی کے ذریعے زمین پر واپس آ گئے۔

۷۔ راج گریہہ — موجودہ نام راج گیر ضلع پٹنہ، بہار۔ یہاں پر بدھ کے رشتے کے بھائی دیودت نے بار بار ان کی جان لینے کی کوشش کی، اور وہ ہر بار بچ گئے۔

۸۔ ویشالی — موجودہ نام راجہ بسال کا گڑھ۔ ضلع مظفر نگر، بہار۔ یہاں پر بندروں نے بدھ کو شہد نذر کی تھی۔

رتن پنڈوروی

بُدھ اور اُس کا مت

زندگی

آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے کا ہندوستان بہ لحاظ تہذیب و تمدّن عروج ارتقاء پر فائز ہو تو ہو لیکن بہ لحاظ مذہب و ملّت انحطاط کے بحرِ ذخّار میں تہ نشین تھا۔ برہمن مذہب کے متاجر سمجھے جاتے تھے۔ اور وہ بھی ایسے کہ "چار پایہ بروکتابے چند"۔ معنوی و عملی زندگی مفقود تھی۔ تزویر و ریا، ریاضت اور نمود و نمائش عرفان میں داخل تھے۔ محیّر العقول حکایات و فوق الفطرت شعبدات کے علاوہ انانیت و تمکنت، مذہب کے مدار المہام تھے۔ خود نما رہنماؤں کی علمی و عملی کائنات چند روایاتِ بے درایت کے سوا کچھ نہ تھی۔ مذہبی متاجروں کی لاف زنی ایک تارِ عنکبوت تھی جس میں خلقِ خدا مگس سادہ کار کی طرح اسیر بلا ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ بے زبان جان داروں کی خاموش فریاد ہَون سے اُٹھنے والے دھوئیں کے ساتھ عرشِ عظیم پہ پہنچتی اور پیہم کسی دادرس کی جویا رہتی تھی۔ الغرض انسانیت لرزہ براندام اور روحانیت بدنام تھی۔ چناں چہ منشی امیر احمد علوی نے اپنی کتاب "سوانح عمری گوتم بدھ" میں ولادتِ بُدھ کے وقت دنیا کی مذہبی تاریکی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

" مغربی سرحد پر کیانیوں کا اخترِ اقبال ترقّی پر ہے۔ پنجاب کو مملکتِ فارس کا ایک صوبہ بنانے کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ بابل میں بخت نصر کا جاہ و جلال نقطۂ نصف النہار پر ہے۔ یروشلم تباہ ہو چکا اور شوکتِ سلیمانی کے وارث اپنی مٹی ہوئی عظمت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ فراعنہ جو کسی وقت خدائی کے دعوے دار تھے فاتحِ بیت المقدس کی شوکت سے لرزہ براندام ہیں۔ روم ۃ الکبریٰ کا عالمِ طفلی ابھی شباب تک نہیں پہنچا۔ وہ دن دُور ہے کہ یونان کے دانش مندوں کو غلام بنائے اور دجلہ فرات پہ دُرفشِ کاویانی سے مقابل ہو۔ یونان علم و فنون میں گوئے سبقت لے گیا لیکن وہ منزلِ کمال ابھی بہت آگے ہے کہ اس کا ایک شہزادہ سلطنتِ ایران کو تباہ کرے اور شہنشاہیِ عالم کی خطرناک ہوس کا شکار ہو۔ شریعتِ زرتشت، فارس کا قومی مذہب ہے۔ آگ صرف قبلہ نہیں بلکہ معبودِ برحق ہے۔ ستارہ پرستی بابل اور اس کے مقبوضات میں رائج ہے۔ آفتاب مظہرِ قدرت نہیں بلکہ قادرِ مطلق ہے۔ روما اور یونان کا مذہب عجائب پرستی عظمت، شجاعت اور سنگین مورتوں کے سامنے سر جھکانا ہے۔ بنی اسرائیل کا مقدس شہر ویران و سنسان ہے اور ملک شام میں توحید کا چراغ جلانے والے ایک جابر حاکم کی قید میں گرفتار ہیں۔"

مصنّفِ موصوف نے دنیا کی حالت کے علاوہ ہندوستان کی حالت بھی اسی طرح لکھی ہے اور مجملاً یہ لکھا ہے کہ برہمنوں کا زور تھا قربانیاں ہوا کرتی تھیں۔ شودر اور اچھوت ذاتوں کے لئے علم کے دروازے بند تھے۔ راجہ عیّاش تھے۔

اس استبداد، انانیت، خوں ریزی، عیاشی اور مذہبی تاریکی سے متاثر ہو کر نیپال کی ترائی اور لُمبنی کے جنگل میں رحم و انصاف کا ایک دیوتا پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر آیا۔ کسی نے اُسے گوتم کے نام سے پکارا۔ کوئی بدھ (عارف باللہ) کہنے لگا۔ کہیں ساکیہ مُنی کے لقب سے ملقّب ہو کر شہرت پائی۔ لیکن خوش نصیب والد راجہ شودھودھن اور بامراد والدہ مایا دیوی نے

سدھارتھ قائم رکھا اور وہ ہستی بے عدیل اپنے آپ کو نحیف گرداننے لگی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اس مذہبی گورکھ دھندے کا جائزہ لیا اور اپنے ماحول میں ہر طرف فسق و فجور، جبر و استبداد اور افراط و تفریط کی آگ شعلہ زن پائی۔ اس نے محسوس کیا کہ دنیا ایک نہایت تنگ و تاریک رستے پر چل رہی ہے۔ مطلب پرست رہنما نئی نئی چالیں چل کر محض اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے مذہب کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں۔ اس بے دینی کے عالم میں وہ کسی ایسے صراطِ مستقیم کا جویا رہنے لگا جس پر چل کر انسان حقیقی معنوں میں شعارِ انسانیت سے متّحد ہو سکے اور اُسے سکونِ ابدی حاصل ہو۔ بیزارمندی کی، داسی دیکھ کر والدین نے اُسے سیم و زر کی زنجیروں میں جکڑا۔ دولت و ثروت کے سبز باغ دکھائے۔ یشودھرا ایسی خوبصورت بیوی اس کے پاؤں میں پہنائی اور راہل نامی ہونہار فرزند نے ہتھکڑی کا اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ قیود و بند اس طائرِ آوارہ کو پابندِ قفس نہ رکھ سکے۔ اس کی متجسّس نگاہیں ایک ضعیف العمر ناتواں، ایک بیمار خستہ جان اور ایک مردہ قالب پر پڑنے کے بعد ایک تارک الدنیا پر پڑیں۔ سانحاتِ ثلاثہ جس قدر اس کی دل بیزاری کا موجب تھے اسی قدر موخر الذکر منظر تسکینِ قلب کا مظہر تھا۔ دنیا کی نمود و بود سے متنفّر ہو کر اس نے ترکِ عظیم کا عزم باندھا اور انتیس سال کی بھرپور جوانی کو تجتا ہوا، محلاتِ شاہی و ٹھاٹ قیصری کو ٹھکراتا ہوا محض مسرتِ ابدی کی تلاش میں گھر سے چل کھڑا ہوا۔ پانچ اور زاہدوں کے ہمراہ نورِ باطن سے منوّر ہونے کے لئے پورے چھ سال ریاضتِ شاقہ میں مستغرق رہا۔ لیکن اس نفس کشی کا نتیجہ محض جسمانی نقاہت و ناتوانی تک ہی محدود رہا، چہ جائیکہ شہودِ اعلیٰ و علمِ بالا کا حصول۔ بالآخر کار اس نے نفس کشی کی مشقت چھوڑ کر بدھ گیا میں ایک پیپل کے سائے میں بیٹھ کر مراقبہ شروع کیا اور ٹھان لی کہ جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں گا نہ اٹھوں گا۔ اس اثنا میں انواع و اقسام کے وسوسے اس کے دل میں آنے لگے اور کئی روحانی رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ چنانچہ ایک رات خواب کی صورت میں شیطان نے دنیا جہان کی دولت کی پیشکش کی لیکن جب اس کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی تو اس پر باد و باراں، سنگ و خشت اور خوفناک آتشیں ہتھیاروں سے حملہ کیا لیکن یہ اپنی ضد کا پورا بات کا دھنی وہیں ڈٹا بیٹھا رہا۔ شیطان مع اپنے لشکرِ جرّار کے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ آخر ۴۹ دن کے مسلسل مراقبے کے بعد عرفان و حقیقت کے راز بر ملا عیاں ہو گئے۔ اب وہ صداقتِ حقیقی کو پا کر سدھارتھ سے بدھ (عارف باللہ) بن گیا۔ یہ کشف بیساکھ کی پورن ماشی کے دن ہوا تھا۔ اسی بنا پر سب پورن ماشیوں کو عام طور پر اور بیساکھ کی پورن ماشی کو خاص طور پر بدھ ممالک میں تیوہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

روشن ضمیر بدھ ایک عالم کو تجلیّاتِ حقیقت سے بہرہ ور کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا اور یہ صلائے عام ("حیاتِ ابدی کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا ہے۔ جو گوشِ ہوش رکھتا ہے آئے اور سنے") دیتا ہوا بنارس پہنچا۔ وہاں اسے پرانے پانچوں ساتھی اشی پتانا (پالی) یا رشی پتانا (سنسکرت) کے مرگ دنا (باغ آہوان) میں ملے۔ وہ گوتم بدھ کی باتوں پر ایمان لے آئے اور مرید ہو گئے۔ اسی مقام پر مریدوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی۔ بہ نظرِ سہولت اس نے ایک فرقۂ برادری کی بنیاد ڈالی جسے سنگھ کے نام سے موسوم کیا۔ اپنے مریدوں کو اقصائے عالم میں اپنے مت کی اشاعت کے لئے روانہ کیا اور کہا

"او بھکشوؤ! جاؤ تم اور گھومو بہتوں کے فائدے کے لئے بہتوں کی بہبود کے لئے بہ نظرِ ترحّم دیوتاؤں اور انسانوں کے فائدے اور فلاح و بہبود کے لئے۔

"او بھکشوؤ! شاندار مت کی تشہیر کرو۔ متبرک، کامل اور پاک زندگی کی تلقین کرو۔"

خود بھی جگہ جگہ گھوم کر تبلیغ کرنے لگا۔ اس نے اپنی تقریروں میں ہندو شاستروں کی کتبِ مقدسہ کی زبان (سنسکرت) استعمال نہیں کی۔ بلکہ وہ مگدھ دیش کی بولی یعنی پالی میں بولتا تھا جس میں بدھ مذہب کے سب سے قدیم نوشتے تحریر ہوئے تھے۔ یہ بولی [illegible] اس کا عقیدہ تھا کہ "ہر شخص اپنی زبان میں مت سیکھ سکتا ہے۔" ان ہی امور پر نظر کر کے بدھ ازم کو پہلا تبلیغی مذہب کہا گیا ہے۔

دمِ واپسیں تک کامل پینتالیس سال بدھ نے اپدیش دیا۔ اپنے طریقت کے قواعد کے مطابق وہ قبل از دوپہر ایک مرتبہ کھانا کھاتا تھا جو اور لوگوں کے گھروں سے بھیک مانگ کر لاتا تھا۔ بدھ نے راجاؤں، رشیوں، برہمنوں، سوداگروں، مزدوروں الغرض ہر جماعت کے مردوں اور عورتوں کو اپنا پیرو بنایا۔

اس کی تقریر سامعین کی استعداد کے مطابق عام فہم ہوتی تھی۔ مناسب مقام پر تمثیلات و استعارات کا استعمال بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ کرتا تھا۔ آخر اسی سال کی عمر میں اس کے ایک پیرو چنڈا نامی لوہار نے اسے کھانے کے ہمراہ کھمبیں کھلائیں جن میں اتفاق سے ایک کھمب زہریلی تھی جس کے کھانے سے بدھ بیمار

پڑ گیا اور یہی عارضہ ۴۸۳ ق۔م میں اس کی وفات کا موجب ہوا۔ اس پر بھی مرنے سے پہلے اپنے میزبان کی دل جوئی کے خیال سے بدھ نے کہا کہ اس کا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ اس کی نیکی ہے اس نے مجھے آخری کھانا کھلایا ہے۔

مرتے وقت گوتم بدھ نے اپنے حاضر شاگردوں کے سامنے اپنے مت کے اہم اصول بیان کئے۔ شاگردوں نے عرض کی کہ آپ کے بعد سنگھ کا خلیفہ یا امام کون ہوگا۔ فرمایا کہ "طریقت کے قواعد اور مت کی تعلیم ان کے ہادی ہوں گے۔" ایک عزیزترین شاگرد آنند نے عرض کی کہ آپ کے مرنے کے بعد کس طرح آپ کا احترام کریں۔ تو آپ نے کہا کہ:-

"مجھے کسی احترام کی حاجت نہیں۔ میرے جو شاگرد ہمیشہ میرے مت کے مطابق رہیں گے اور حصولِ کمال کے لئے سعیٔ بلیغ سے کام لیں گے وہ میری بہترین عزت کریں گے۔"

مرتے وقت ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "سب مرکب چیزیں چند روزہ ہیں اپنی نجات کے لئے لگاتار کام کئے جاؤ۔"

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بودھوں کے خیال کے مطابق نجات کے معنی ہوس اور بندھنوں سے آزاد ہونا ہے نہ کہ بقول برہمنوں کے آتما کا برہم کے ساتھ وصال یا بقول مسیح مذہب کے آسمان میں حیات جاوید۔

جو شاگرد آپ سے دور رہتے تھے ان کی تسکینِ خاطر کے لئے مہاتما بدھ کہا کرتے تھے کہ:-

"جو میرے مت کے مطابق رہتا ہے وہ میرے قریب ہے۔"

تعلیم

بدھ کی وفات کے تھوڑی ہی مدت بعد ۴۸۷ ق۔م میں اس کے شاگرد رشید کشیپ نے راج گڑھ میں بھکشوؤں کی ایک مجلس منعقد کی تاکہ کتب مقدسہ مرتب مدون ہوسکیں۔ چنانچہ آنند نے جو بدھ کا چچیرا بھائی اور پیارا شاگرد تھا کچھ سوتر جو اُسے ازبر تھے سنائے۔ اپالی حجام نے (جو قواعد ملت سے بخوبی آگاہ و ماہر تھا) ونیہ سنایا ابھی دھم اس مجلس میں نہیں سنایا گیا کیوں کہ اس میں معقولات کے رسالے تھے اس کے بعد بھی کئی مجلسیں منعقد ہوئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

دوسری مجلس۔ ۳۸۰ قبل مسیح میں وشالی ضلع مظفرپور صوبہ بہار میں ہوئی۔ اس میں کالا شوک مہاراج کی مدد سے تری پٹک مرتب کی گئی۔ اس میں سات سو بھکشو اکٹھے ہوئے۔

تیسری مجلس۔ ۲۴۰ قبل مسیح میں ایک ہزار بھکشوؤں نے مہاراجہ اشوک کی مدد سے اشوکارام (بہار) میں پٹنہ کے قریب منعقد کی اس میں تین شاستر مرتب ہوئے اور لنکا وغیرہ نو ملکوں میں بھکشوؤں کو بھیج کر دھرم کی اشاعت کی گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۲۱۳ ق۔م میں مہاراجہ اشوک کے بیٹے مہاہندر نے ۳ لاکھ بھکشوؤں کو اکٹھا کیا اور لنکا کے راجہ "وشٹ گرامنی" کی مدد سے تری پٹک کو تاڑ پتروں پر لکھوا دیا۔

چوتھی مجلس۔ مہاراجہ کنشک کے عہد میں اشوگھوش کی زیرِ صدارت انعقاد میں آئی۔ اس میں تری پٹک از سرِ نو مرتب ہوئی۔ اصل میں اس مجلس میں اتری بدھ مت (مہایان) فرقے کی بنیاد پڑی۔ بدھ کا اصلی دھرم یعنی جنوبی ہند کا فرقہ (ہین یان) ہے

(بدھ ازم مصنفہ پروفیسر رائس ڈیوڈس اور لیکچر پروفیسر لیوی ملاحظہ ہو پیرس)

گوتم بدھ نے سب سے پہلی تقریر پانچ زاہدوں کو خطاب کر کے کی تھی۔ اس کا نام تھا "دھما چکا پوتا ناستوا" ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں۔ "مت کے پہیے کو حرکت دینا" اور اصطلاحی معنی ہیں۔ "راست بازی کے بادشاہ کی بنیادی تقریر"۔ فی الحقیقت یہی تقریر بدھ مت کی بنیاد ہے۔ اس میں چار حقائقِ گرامی کا بیان ہے جن کا ذکر بدھ مت کی کتب میں اس طرح آتا ہے۔

"میں نے یوں سنا ہے کہ ایک مرتبہ بنارس میں بمقام مرگ رمنا موسوم رشی پتانا مہاتما بدھ قیام فرما تھے وہاں انھوں نے پانچوں زاہدوں کو اس طرح خطاب کیا۔

"راست گاری کے خواست گار کو دو باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ایک بات لذات و خواہشاتِ نفسانی کا پورا کرنا ہے۔ جو ذلیل، رذیل اور ہیچ ہے دوسری بات بے حد نفس کشی اور خود تعزیری ہے جو مضرت رساں اور بے سود ہے۔" مسلکِ درمیانہ جو تتھاگت نے معلوم کیا ہے ان دونوں غلط رستوں سے بچتا ہے۔ جو آنکھیں کھول دیتا ہے، بصیرت بخشتا ہے، خردمندی، مخلصی، بیداری کی راہ بتاتا ہے۔ یہ مسلکِ گرامی یا راہِ مستقیم حسب ذیل فضائلِ ہشت گانہ پر مبنی ہے۔

۱۔ رائے صحیح، ۲۔ تمنا صحیح، ۳۔ کلام صحیح، ۴۔ اعمال صحیح، ۵۔ معاش صحیح

۶۔ سعی صحیح ، ۷۔ فکر صحیح ، ۸۔ توجہ صحیح۔

ان فضائلِ ہشت گانہ کے بعد دُکھ کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے۔ پیدائش دُکھ ہے ، عارضہ دُکھ ہے ، موت دُکھ ہے ، غم دُکھ ہے ، آہ وزاری دُکھ ہے ، ناگوار کے ساتھ ملاپ دُکھ ہے ، پیاری چیزوں سے لگاؤ دُکھ ہے ، ناکام خواہش دُکھ ہے۔ دُکھ کے اسباب کی حقیقتِ گرامی یوں بیان کی گئی ہے۔

"یہ جاوِ یہ تشنگی ہے یعنی زیست کی ہوس اور اس سے لطف اُٹھانے کی خواہش جس سے پُنر جنم ہوتا ہے۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح خواہشاتِ نفسانی پوری ہوں ہوائے نفسانی کے بھڑکنے کی ہوس۔ ہوسِ زیست ، خواہ زندگی حال یا زندگی بعد میں ہو یا آرزوئے فنا یہ سب دُکھ کے پیدا کرنے والے ہیں۔

دُکھ کو زائل کرنے کا واحد طریقہ ہے ہوس کو قطعی نیست و نابود کرنا۔ اس پر فتح پانا اور اس کا فنا کرنا۔

مندرجہ بالا حقائق و اصول کی سادگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر یہ چھوٹے چھوٹے اصول اتنے بڑے مذہب اور فلسفے کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہ نظرِ غائر ان کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر اصول اپنے اندر نجات و تسکینِ حقیقی کا ایک غیر محدود جہان چھپائے بیٹھا ہے۔

مہاتما بدھ نے سائنٹفک طریق پر شخصیت کا پانچ حصوں میں تجزیہ کیا ہے۔ جسم ، احساس ، تفہیم ، تحتِ شعور اور شعور۔ اس کے بعد کتبِ مقدسہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ منفرد اور مجموعی حالت میں یہ حالتیں عارضی ہیں اور ایسی عارضی حالتوں کی ہوس کا نام شخصیت ہے جو جلد یا دیر سے دکھ پیدا کرتی ہیں۔

بُدھ کے مقالات میں دوازدہی اصول کا ذکر آیا ہے جس میں علت و معلول کا باہمی تعلق مفصل اور باقاعدہ طریق سے دکھایا گیا ہے۔ اس کو نیکا سام پادہ کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے "انحصاری ابتدا" اس کی تفصیل اس طرح ہے

۱۔ جہل کے انحصار سے ترکیب پیدا ہوتی ہے جسے سنکھار بولتے ہیں۔
۲۔ تراکیب کے انحصار سے شعور ظہور میں آتا ہے۔
۳۔ شعور کے انحصار سے روح اور قالب میں تعلق پیدا ہوتا ہے۔
۴۔ امتیاطِ روح و قالب کے انحصار سے شش شکلی عالمِ حواس جسے اندریاں کہتے ہیں پیدا ہوتا ہے۔
۵۔ شش شکلی عالمِ حواس کے انحصار سے چیزوں کے ساتھ حس پیدا ہوتی ہے۔
۶۔ حس کے انحصار سے احساس پیدا ہوتا ہے
۷۔ احساس کے انحصار سے ہوش پیدا ہوتا ہے۔
۸۔ ہوش کے انحصار سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے
۹ لگاؤ کے انحصار سے ساخت پیدا ہوتی ہے۔
۱۰۔ ساخت کے انحصار سے جنم ہوتا ہے
۱۱۔ جنم کے انحصار سے بڑھاپا ، موت ، غم ، درد ، اندوہ ، یاس پیدا ہوتی ہے
۱۲۔ اس طرح دُکھ کا سارا تودا بن جاتا ہے

اگر جہل کو کلیتہً دفع کر دیا جائے تو دکھ خود بخود معدوم ہو جاتا ہے مہاتما بدھ نے ایک جگہ خود فرمایا ہے کہ:۔

"جس طرح سمندر کا پانی ہمیشہ نمکین ہوتا ہے اُسی طرح میرے مت میں بھی ایک ہی ذائقہ ہے یعنی نجات کا ذائقہ۔ بس میں ایک ہی بات سکھاتا ہوں دُکھ اور اس سے رہائی۔"

بدھ ازم کے بنیادی اصولوں سے حسبِ ذیل تین چیزیں خاص علاقہ رکھتی ہیں ان کو پالی زبان میں تیل کھانا (یعنی تین خصوصیتیں) کہتے ہیں۔

۱۔ سب چیزیں عارضی ہیں جس کو پالی میں انیکا کہتے ہیں
۲۔ سب چیزیں غم ناک ہیں جسے دُکھ کہتے ہیں
۳ سب چیزیں بلا شخصیت کے ہیں جسے اناتا کہتے ہیں

بدھ روحِ غیر فانی سے منکر ہے۔ لیکن وہ نفس کے مدارج مثلاً جذبات ، ولولے ، خیالات ، ارادے وغیرہ سے منکر نہیں۔ وہ ایسی روح کا بھی قائل نہیں جو غیر مادی حالت میں نفس کے مدارجِ مذکورہ کے پسِ پردہ محرک ہو یا وہ جسمانی موت کے بعد کسی جگہ پرواز کرے یا وہ جنت یا دوزخ میں تا ابد رہے۔ مہاتما بدھ کا ارشاد ہے کہ زیست کا موجب محض مادی ہی نہیں بلکہ اور بھی ہے یعنی "ہوس" اور یہی چیز دُکھ کی بانی ہے۔ اگر ہشت گانہ مسلکِ گرامی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے تو یہ ہوس دوسرے جنموں کے سبب سے رفتہ رفتہ دفع ہو جاتی ہے پھر دوسرا جنم نہیں ہوتا اور وہ حالت حاصل ہو جاتی ہے جو بدھ مت کی منزلِ مراد ہے یعنی "نروان" جسے پالی زبان میں نبھان کہتے ہیں۔

جو لوگ نبھان (نروان) کا مطلب فنا ہونا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ نبھان کا لغوی ترجمہ ہے نکل جانا۔ جیسے تیل ختم ہونے پر چراغ کا بجھ جانا۔ سوال ہے کیا بجھ گیا؟ جواب ہوگا "خودی کی تین آگیں" یعنی حرص ، نفرت اور دھوکا

بدھ کی تعلیم کے مطابق یہ کیفیت دورانِ حیات میں بھی حاصل ہو سکتی ہے چناں چہ بمقام بدھ گیا بودھی درخت کے نیچے ایک رات بدھ کو خود نروان حاصل ہوا جس کے بعد ۴۵ سال وہ زندہ رہا۔ پالی زبان میں اس شخص کی موت کو جسے پہلے ہی جیتے جی نروان حاصل ہو چکا ہو، پری نروان کہتے ہیں۔

برہمنی دھرم میں نروان کے معنی آتما کا پرماتما کے ساتھ وصال ہونا ہے، جو بعد مرگ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بدھ مت میں نروان ایک کیفیت ہے جس میں پورا آنند اور پوری مخلصی ملتی ہے۔ چناں چہ نروان پا کر خود بدھ نے اپنی نسبت کہا ہے :-

"دنیا کے خورسندوں میں ایک میں ہوں"

جن کو نروان حاصل ہو جاتا ہے وہ آرہٹ (ارہت) کہلاتے ہیں جس کے معنی سنت کے ہیں چوں کہ نروان کے حصول سے سب کرموں میں خودی کی بُو تک نہیں رہتی اور خواہش ختم ہو جاتی ہے اس لئے دوسرا جنم نہیں ہوتا۔

بعض مخالف بدھ مت پر چند اعتراضات کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ چوں کہ ویدوں کے الہامی ہونے کو بدھ نے تسلیم نہیں کیا اس لئے وہ ہندو نہ رہا بلکہ اس نے ہندو دھرم کو سخت صدمہ پہنچایا۔

پروفیسر ڈیوڈس اس بارے میں یہ رائے رکھتا ہے۔

"کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ بدھ ہندو ازم کا دشمن تھا صحیح نہیں ہے۔ گوتم ہندو پیدا ہوا۔ ہندوؤں کی مانند اس نے پرورش پائی اور ہندوؤں کی طرح مرا۔ اس کا بیشتر فلسفہ ایسا نہیں ہے جو ہندوؤں کے کسی نہ کسی طریقِ فلسفہ میں نہ پایا جائے۔ اور جو اخلاق اس نے سکھایا وہ بھی قدیم و جدید کتب اخلاقی مصنفہ ہنود میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بدھ ازم ہندو دھرم کا دشمن نہیں بلکہ اس کا بچہ تھا۔ برہمنوں ہی سے بدھ نے تعلیم پائی تھی اور وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہی مذہبِ قدیم کی سب سے صحیح تعبیر کرنے والا ہے اور حق تو یہ ہے کہ وہ سب ہندوؤں سے اعظم، زیرک اور بالاتر تھا۔"

مسٹر آرتھر للی کی بھی یہی رائے ہے۔ ایڈون آرنلڈ جس نے 'لائٹ آف ایشیا' لکھی، اس کے دیباچے میں اور اپنی دوسری کتاب "انڈیا ریویزٹڈ" میں لکھتا ہے۔

"جہاں جہاں ایک مرتبہ بدھ مت کو قدم پہنچا ہے۔ اس کے اثرات مٹ نہیں سکتے۔ گویا وہ لوہے کے ساتھ پارس کا کام کرتا ہے۔"

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "بدھ مت میں یاس و ناامیدی برستی ہے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں نہ امید ہے نہ یاس۔ بلکہ یہ مت دونوں چیزوں سے کنارہ کش ہے۔ اور سکھاتا ہے کہ بیچ دونوں انتوں کے درمیان ہے۔ اس درمیانی راستے پر پہنچنے کے لئے سکونِ طبع کو بڑھانا چاہیئے۔

تیسرا اعتراض بدھ مت پر یہ ہے کہ یہ ہمت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ لوگوں کو کاہل بنا دیتا ہے۔ گویا کسی کو کچھ کام نہیں کرنا اور محض سوچ میں پڑے رہنا ہے۔

قطعِ نظر اس کے کہ گیان دھیان کٹھن ہوتا ہے۔ بدھ مت ثابت قدمی اور سرگرمی پر بار بار زور دیتا ہے جس کا ذکر اس مت کی کتبِ مقدسہ میں یوں آیا ہے :-

"لہو و لعب، کاہلی، بے اعتدالی، بے چینی سے بڑھ کر کون سی چیزیں برائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمت سے بڑھ کر کون سی شے ہے جو اتنی آسانی سے برائی کو روکتی اور نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔"

"سو برس کاہلی اور سستی میں جینے سے ایک دن سرگرمی سے کام کرنا اچھا ہے۔"

اس طرح کے ہمت افزا اور حوصلہ پرور اقوال بیشتر پائے جاتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بدھ مت کاہلی سکھاتا ہے۔

چوتھا اعتراض - "ایک اور طعن بدھ مت پر ہے کہ یہ انانیت بڑھاتا ہے۔"

بفرضِ محال اگر انانیت مان بھی لی جائے تو ان لوگوں کی انانیت سے کم درجے کی ہے جو یقین کرتے ہیں کہ اُن کی روح کو نیک کاموں سے ثوابِ ابدی ملے گا۔ بودھی لوگ یقین کرتے ہیں کہ نیکی کا ان کو شخصی صلہ نہیں ملتا بلکہ وہ نیک کاموں سے دوسرے جنم کی بہتری کے لئے تیاری کرتے ہیں جو ظہور میں آئے گا۔ حتیٰ کہ دوسرا جنم بھی محدود وقت کے لئے ہے۔

پانچواں اعتراض ۔ " بدھ مت پر ایک طعن یہ ہے کہ وہ فرقۂ اناث سے خصومت رکھتا تھا کیونکہ بدھ نے عورتوں کو سنگھ میں شامل کرنے میں تامل ظاہر کیا تھا۔ جب اپنی سوتیلی ماں پجا پتی اور اپنے خاص شاگرد آنند کی منت سماجت سے اس نے اجازت دے دی تو اُن کے لیے قواعد بھی سخت بنائے ۔"

جب ہم ہندوستان کے اُس زمانے کی حالت پر غور کریں تو بدھ کا تامل سمجھ میں آسکتا ہے۔ بدھ کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ظہور میں آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اس نے خود بہت عورتوں کے نام لئے ہیں جن کو وہ اپنے جلیل اور عالم شاگردوں میں گنتا تھا۔

تبلیغ

بدھ میں صدق دل ممیز تھا اور اُس کی محبتِ انسانی وسیع اور غیر محدود تھی۔ خواہ کتنا ہی اختلاف کسی کو بدھ کے فلسفے سے ہو اُس کی راست بازی، صاف گوئی اور دلیری کی ساری دنیا قائل ہے اس کے زمانے میں مذہبی اور فلسفی آراء کی اشاعت کے لئے کمال درجے کی رواداری اور بردا‌شت ظہور پذیر تھی۔ اس وقت تک بدھ ازم نے یہی وطیرہ قائم رکھا ہے۔ ۲۵۰۰ سال کے عرصے میں ایک متنفس پر بھی تبدیلیٔ مذہب کا جبر نہیں ہوا اور نہ مت کے پھیلانے میں ایک قطرہ خون کا بہا ہے۔ اس پر بھی بدھ مذہب تبلیغی مذہب ہے۔ وسطی ایشیا اور مشرقی ایشیا میں جلد ہی پھیل گیا مغل اور تاتار جیسی وحشی قوموں کی عادات بھی اس نے بدل دیں۔ مہاراجہ اشوک ہی کے زمانے سے یہ حکومت کا مذہب ہوگیا۔ مور یا راجاؤں نے اسے ایک عالمی مذہب کا درجہ دیا اور یہ ہندوستان کی حدود کو پھاند کر تبت، لنکا، ترکستان چین، بلوچستان، فلسطین، کوریا، جاپان، برما، سیام، کمبودیا، جاوا سماترا، جزیرہ نما ملایا اور افغانستان میں پھیلنے کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل گیا۔ چناں چہ ذیل کے تاریخی شواہد اس صداقت کا بیّن ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر بیلو کی کتاب " اقوامِ افغانستان " صفحہ ۶۵ اور ۶۷ پر مرقوم ہے کہ افغانستان میں جلال آباد کی وادی کا سابقہ نام " نن گرہ " یا نو وہارا تھا یعنی نو مندر یہاں تھے۔ پانچویں صدی میں بدھ مت کا متبرک اور بارونق مقام تھا۔ اب بھی یہاں بودھی عمارتوں کے کھنڈرات موجود ہیں۔

بلوچستان ۔ ڈاکٹر بیلو کی کتاب مذکور کے صفحہ ۲۲ پر بلوچستان میں بدھ مذہب کا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ پرانا قندھار گندھارا شہر کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر مذکور کو یہاں سے سیاہ و سبز پتھر کا ایک کاسہ ملا جو کسی اسلامی درگاہ میں پڑا تھا۔ سیتھی قوم کے حملے کے وقت جب بودھی لوگوں نے یہاں سے نقل مکان کیا وہ اس کاسہ کو چھوڑ گئے ہوں گے۔

ایران ۔ چینی سیاح ہوانگ چانگ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ایران میں اس وقت پارسی مندروں کے علاوہ تین بودھی درگاہیں جن میں کئی سو فقرا بستے ہیں موجود ہیں۔ یہاں ہین یان فرقہ کے بودھوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

فلسطین ۔ اشوک کے بھیجے ہوئے مشنری حضرت عیسیٰ سے دو صدی پہلے یہاں اخلاق کا پرچار مشرقی صوبوں میں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے عیسوی مذہب کئی امور میں بودھی تعلیم سے مشابہت رکھتا ہے۔

(الگزینڈرین ایپائر صفحہ ۱۰۴ از پروفیسر مہافی)

مصر ۔ مصر میں تارکوں اور ناہدوں کے فرقے بودھی اثر سے پیدا ہوئے۔ جو اشوک کے مبلغوں کے ذریعے سے وہاں پہنچا تھا اور جس کے مقابلے کا کوئی فرقہ اُن دنوں یورپ میں نہ تھا

(مذاہب مصر از ڈاکٹر پیٹری)

چین ۔ مسٹر بیکمین کی کتاب " تاریخ بدھ ازم " کے صفحہ ۷۷ پر مذکور ہے کہ شہنشاہ منگتی نے ۶۳ء میں خواب میں ایک سنہری مورت محل میں داخل ہوتے دیکھی۔ اس کے جوتشیوں نے کہا کہ یہ شکل ساکیہ منی کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ شہنشاہ نے سفارت بھیج کر ہندوستان سے بودھی مت کے فقرا بلوائے اور چین میں انھوں نے پرچار کیا۔ اپنے ہمراہ دو مورتیاں اور کتابیں لائے تھے ان کا ترجمہ چینی زبان میں کیا گیا۔ اس شہنشاہ کے بعد کئی بادشاہوں نے تائید کی مخالفت کی لیکن آخر چین میں بدھ دھرم مستقل قائم ہو گیا۔

کوریا۔ شہاب الدین چوہدری نے رسالہ "قانونی انڈین گیسرز" جلد ۷، ۴ کے صفحہ ۴۹ پر لکھا ہے کہ چین سے ۳۷۲ء میں کوریا میں بدھ مت پہونچا۔ مقام حیرت ہے کہ بعض چینی بدھ۔ کانفوشس لاؤتسو تینوں مذہبوں کو ایک ہی وقت مانتے ہیں اور ان میں کوئی اسرایک دوسرے کے تناقض نہیں دیکھتے۔

جاپان۔ سنہ ۲۰۳ء میں کوریا کو ایمپرس ریجنٹ جنگو کوگو نے فتح کیا۔ فاتحین بدھ دھرم کے اثر پڑنے لگے۔ کوریا سے ۵۵۲ء میں بہت سے بودھی سادھو جاپان آگئے۔ شنٹو مذہب جاپان کا قدیم مذہب تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو بدھ دھرم نے بھی پاؤں جما لئے۔ اس وقت تعلیم یافتہ جاپانی بدھ مت کے پیرو ہیں شاہی مذہب شنٹو ہے۔

برما۔ روایت ہے کہ گھوس نامی بدھ سادھو پانچویں صدی میں بدھ دھرم اس ملک میں لے گیا یہ مگدھ کا باشندہ تھا اور بدھ لٹریچر کا بڑا عالم تھا مسٹر ہیکمین اس روایت کو معتبر نہیں سمجھتے بقول اُن کے کوئی اور سادھو برما گیا تھا۔

سیلون۔ اشوک کے شہزادہ مہندر اور اس کی شہزادی سنگھ مِتری نے اس جزیرہ میں بدھ مت پھیلایا۔ الغرض کسی نہ کسی سادھو یا بھکشو کے ذریعہ سیام۔ کمبودیا۔ نیپال۔ بھوٹان سِکم۔ کشمیر میں بدھ مت پھیلا۔ حتیٰ کہ روس۔ والگا اور ڈان کی کلمک قوم بدھ کی پیرو ہوگئی۔ پانچ یونانی بادشاہ جن کے ملکوں میں مہاراجہ اشوک نے بھیجے۔ وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ سیریا کا بادشاہ اینٹی یاکس ۲۔ بطلیموس مصر کا۔
۳۔ میسڈن کا اینٹی گونس ۴۔ سائرینی کا میگس
۵۔ ایپی راس کا سکندر

مارکوپولو لکھتا ہے "کشمیر سے کئی بودھی مشنری ایشیا کے مختلف ممالک میں پرچار کے لئے گئے تھے (میڈیول ریسرچ جلد اول صفحہ ۱۷۵)

بابو نپیندر ناتھ بوس نے ایک مختصر کتاب موسوم "انڈین ٹیچرز آف بدھسٹ یونیورسٹیز" نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں چار کشمیری بودھ مشنریوں کا حال درج ہے۔ جن کے نام ہیں:۔ رتنا دجیرا۔ سورج گپت۔ ساکیا سری بھدرا پدما سمبھو۔ علاوہ ازیں کتاب میں لکھا ہے "وہ نرمانہ ذہن میں لایئے جب سڑکیں نہ تھیں۔ جغرافیہ معلوم نہ تھا۔ سواریاں تو سوائے پالکی کے اور کیا ہوں گی۔ کہیں کہیں بہلیاں میسر ہوتی ہوں گی۔ اس زمانہ میں کشمیری برہمن مگدھ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر واپس وطن کو جاتے اور وہاں سے پھر تبت جاتے۔ وہاں سنسکرت سکھاتے۔ تبتی زبان سیکھتے اور ترجمے کرتے۔ معبدگاہیں قائم کرتے دھرم کا پرچار کرتے۔ شاہی درباروں میں دخل پاتے اور ہندوستان سے باہر وحشی ملکوں میں دھرم کی خوش خبری دیتے تھے۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بودھوں کے عروج کے زمانہ میں ہندوستان میں وکرم شیلا۔ نالندا۔ جگ ڈالا اور اودنتاپوری یونیورسٹیاں بنگال اور مگدھ میں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں تبّت کے لوگ تعلیم پانے کو آتے تھے اور یہاں کے ہندی پنڈت تبت جایا کرتے تھے۔

پروفیسر فراشہ کی تحقیق ہے کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کنندہ نہ تھا یہ براعظم اُس سے بہت پہلے دریافت ہو چکا تھا چناں چہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں ذیل کے واقعات بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کئی شہروں کے نام بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً گوٹے مالا جو دراصل گوتم مالا ہے۔ سیکرو پیری یعنی ساکیا پورہ۔

۲۔ کھنڈرات سے معبدگاہوں اور مندروں کے آثار بکثرت برآمد ہوئے ہیں۔ بدھ کی بے شمار مورتیاں نکلی ہیں۔ ان میں سے بعض عجائب خانہ میں رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک مورتی گنیش کی ہے اور ایک مورتی پر نام سکودی کھدا ہوا ہے جو دراصل ساکیا منی تھا۔

۳۔ قدیم باشندگان کی نسلیں جو اس وقت تک موجود ہیں اپنے پروہتوں کو لاما کہتی ہیں۔

۴۔ اب تک روایت چلی آتی ہے کہ ایک سنت لمبا جامہ پہنے ہوئے ایک ہزار سال ہوئے یہاں آیا تھا وہ ایک اعلیٰ دھرم کا پرچار کرتا تھا اس کے بعد ایک اور سنت بھی اسی وضع کا آیا تھا۔

۵۔ چینی مورخ "ماتالنگ" نے شرح و بسط سے لکھا ہے کہ امریکہ میں بدھ مت کولمبس سے کئی صدیوں پہلے رائج تھا۔ بقول اُس کے کابل سے کوئی بدھ سیاح امریکہ آیا تھا۔ ایک تحریر بھی دریافت ہوئی ہے۔ جو چین کے شاہی خاندان میں نہایت احتیاط سے رکھی ہوئی ہے۔ یعنی کابل کا ایک بودھی گورنر شہنشاہ چین کو لکھتا ہے کہ ایک وسیع ملک دریافت ہوا ہے۔

جہاں خود گوتم گیا اور بدھ ازم کی بنیاد ڈال آیا ہے۔ جس نو دریافت شدہ ملک کا ذکر اس خط میں درج ہے وہ عین مطابق میکسیکو کے ہوتا ہے یہ خط پانچویں صدی ق م کا لکھا ہوا ہے۔

۶۔ چینی زبان میں امریکہ کا نام فوسنگ ہے۔ کابل کو چینی زبان میں کافنگ بولتے ہیں۔ ایک بودھی شخص جو کابل کا باشندہ تھا اور جس کا نام ہوئی سین تھا ۴۹۹ قبل مسیح میں چین کے رستہ سے امریکہ پہونچا۔ یہ بودھی سیاح فوسنگ سے واپس آتا ہوا شہنشاہ چین سے ملا اور بہت سے تحائف نذر کئے۔ اس واقعہ کا ذکر بھی شاہی خاندان کے دفتر میں نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے اور اس وقت تک موجود ہے۔ (مہا بودھی جرنل ۱۹۱۶ء۔ اخبار ملاپ ۲۰ جون ۱۹۳۲ء)

۷ مسٹر ایس ڈ تناب رسالہ ینگ ایسٹ میں لکھتے ہیں (ماڈرن ریویو اپریل ۱۹۲۷ء صفحہ ۴۶۸) :-

پیلنکیو میں پتھر کی مورتی ملی۔ دو شیر آگے ہیں پیچھے کے آسن پر بدھ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس کے مشابہ مجسمے ہندوستان، چین اور جاپان میں بھی ملے ہیں۔ پتھر کی ایک ویدی اور ہاتھی کا پورا سر کندہ ملا ہے۔

کاپنچی میں ایک بڑی مورتی ملی ہے۔ ایک بھکشو اپنے مخصوص لباس میں بیٹھا ہے۔

آزٹک میں ایک مورتی ہاتھی کی شکل کی ملی ہے جو گنیش سے مشابہ ہے اکسمول اور پیلنکیو وغیرہ مقامات میں دیواروں کے طاقوں میں ہندوستان چین اور جاپان کے بدھ کی مورتیوں کی نقلیں ملی ہیں۔

پیرس کے "انتھرو پولوجیکل سوسائٹی" کے عجائب خانہ میں میکسیکو سے لا کر ایک مورتی رکھی ہوئی ہے جس میں بدھ کو آلتی پالتی کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے دونوں طرف حروف کندہ ہیں۔ اکسمول کی دیواروں پر علم ہیئت کے نقشے اور مورتیں ہیں جن میں ایک اژدر بھی دکھایا گیا ہے جو چینی خیال کے مطابق سورج کو نگل جاتا ہے جس کے سبب سے گرہن لگتا ہے۔

مثلاً اوسپیلنکیو سے بے شمار مندر اور محل نکلے ہیں جو ایشیا کے مندروں کی عین نقل ہیں خصوصاً جو شمالی چین منگولیا اور جاوا میں پائے گئے ہیں ان کی اہرامی بنیادیں اور طرز عمارت بودھی طرز ساخت کی شاہد ہے۔

پیلنکیو کے ایک ستون پر x کراس کندہ ہے جو بدھ کی علامت ہے میکسیکو کے بعض حصوں میں آرائش و عمارات کی طرز بجنسہ وہی ہے۔ جو ہندوستان اور چین کی کئی عمارتوں میں موجود ہے۔

یہ انکشافات کولمبس کی دریافت سے صدیوں پہلے امریکہ میں بودھوں کا ہونا ثابت کرتے ہیں۔

ہندو سوپرمیسی ان آنیشنٹ امریکہ مطبوعہ ۱۸۸۵ء" میں لکھا ہے: "زمانہ قدیم میں آریہ لوگ امریکہ میں جاتے تھے جن کے صدہا نشانات، ہندو مذہب و عمارات و رنگ وغیرہ کے امریکہ میں موجود ہیں۔ آریہ لوگ آریہ ورت سے بسواری جہاز براہ جاوا و بالی میکسیکو۔ پیرو۔ وسط امریکہ اور جزیرہ ہائے یوکٹن کے شہروں اور ملکوں میں جایا کرتے تھے۔ آج مغربی محققین بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ امریکہ کو سب سے پہلے کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ سخت حیرت ہے کہ اگر کولمبس امریکہ کا دریافت کنندہ تھا تو قدیم ہندو تہذیب کے یہ آثار جو برآمد ہو رہے ہیں یہاں کیوں کر پہنچے۔

امریکہ کے بعد یورپ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں بدھ مت کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ناناتلکا سوتا۔ پنا۔ ہم انوسار۔ سوبھدرا قوم کے جرمن تھے جنھوں نے بھکشو بن کر یہ نام اختیار کر لئے۔

ستانند قوم کا ڈچ اور ناآنکا کا شاگرد تھا

"انندماتریا" قوم کا انگریز تھا۔ اس نے انگلستان میں ۱۹۰۸ء میں بودھی سوسائٹی قائم کی اس سوسائٹی نے ۱۹۰۹ء میں ایک سالہ بدھسٹ ریویو جاری کیا۔

"سلکارا" قوم کا اسکاچ تھا۔

پروفیسر سلون لیوی فرانسیسی تھا۔

"ڈاکٹر پال ڈبلکے" جرمن تھا۔

دورہ حاضرہ میں جبکہ دنیا کی زور دار قوم ہر زبردست، زیردست کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے۔ سائنس کی ارتقائی منازل میں پہنچ کر بعض حریص و حیا اقوام محض اپنی ایجادات و اختراعات کے جابرانہ استعمال سے دنیا کو تہ و بالا کر دینے پر تلی بیٹھی ہیں۔ بدھ اور صرف بدھ ہی کا پیغام آشتی اہل دنیا کو اخوت و یگانگی کے محرکانہ اقدام سے راہ حیات دکھا سکتا ہے اور موجودہ بہیمیت کو انسانیت و نجابت سے تبدیل کر کے ذہنیت میں ایک ارفع مقام کی خلش بھر سکتا ہے۔ مبارک ہیں بھی خواہان وطن جنھوں نے بدھ مت کی اہمیت کو محسوس کر کے بدھ کا پیغام ہر گوشہ ہوش تک پہنچانے کی مسرتیں جلیلہ وسعی جزیلہ کا عہد باندھا ہے۔

پی۔ این۔ کے بامزئی

گاندھارفن کا ارتقاء

ڈاکٹر پی۔ سی۔ باگچی نے لکھا ہے۔ "ہم دیکھ چکے ہیں کہ بودھ مذہب کی توسیع کے پہلے دور میں جنوبی مغربی علاقوں، خاص طور پر گاندھارا اور کشمیر نے سب سے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اس لئے یہ بالکل فطری ہے کہ ان دونوں ملکوں کے مبلغین وسط ایشیا اور چین میں اپنے ساتھ ہند۔ یونانی فن یعنی اس فن کے نمونے بھی لے گئے ہوں گے بودھوں کے پاکیزہ جذبات کے اظہار کا واحد ذریعہ تھا"

اگرچہ کشمیر براہ راست ہند یونانی سلطنت کے زیر اثر نہیں رہا تھا لیکن یونانی فن کے اثرات اس پر حاوی تھے۔ بہت زمانے سے اس حسین وادی کے لوگ باکمال دستکار کی حیثیت سے ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ ایسے فنکاروں کی حیثیت سے جن کی صناعانہ صلاحیت پر اُن حسین فطری مناظر کی گہری چھاپ ہے جن کی گود میں وہ سانس لیتے ہیں۔ اُن کے ملکی فلسفہ — کشمیری شیو فلسفہ — نے بھی فن کو اس کی بلند ترین منزل پر پہنچا دیا ہے جیسا کہ ابھی نوکپت نے کہا ہے "کسی فنی تخلیق میں فطرت کی آمیزش الوہیت سے اسی کی قریب ترین منزل ہے"۔

فنِ معماری میں باکمال ہونے کی بنا پر کشمیری غیر ملکی لوگوں میں "شلپی" یا معمار کے نام سے مشہور رہے ہیں۔ یونانیوں کی طرح انھوں نے فطرت کے مظاہر کو تعمیر و تزئین مجسم کیا ہے اور انھیں وہی زندگی اور شوخی عطا کی ہے جو انھوں نے اپنے بہشتی وطن میں دیکھی اور محسوس کی تھی ابتدائی دور کے ان فن کاروں کے مذہبی جوش کا اظہار مندروں اور مجسموں کی تعمیر کی صورت میں ہوا۔

قوتِ کائنات جو ہندو ستانی وحدتِ وجود کا رکن رہی ہے اس کی پوجا شیو کے نام سے کی جاتی تھی۔ کشمیر کے فن کار بت تراش کو اس سے فیضان ملتا تھا شیو جو جابر بھی تھے، شفیق بھی تھے اور سب سے زیادہ اردھناری شور تھے "بھاڑوں کی کنیا پاروتی سے مل گئے"۔ ایم گروسیٹ کہتے ہیں:۔

"اس میں بہت ہی گہری اشاریت ہے۔ ہمیں اس کے فلسفیانہ مفہوم کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے تاکہ ہم کہیں اس کی غلط تعبیر نہ کر بیٹھیں کیونکہ ہم یہاں تباہی کے دیوتا کو تخلیقی قوت سے ہم آہنگ پاتے ہیں، موت کے عمل کو تخلیقی قوت کے سرچشمے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔"

کشمیری فنِ سنگ تراشی کا یہ انوکھا اور ترقی یافتہ پہلو وسط ایشیا، تبت اور چین میں گیا جہاں بودھ مذہب کے زیر اثر اولوکیت ایشور، ادھی بدھ اور بے شمار دھیانی بدھ تخریبی اور تخلیقی — دونوں ہی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وسط ایشیا کے دور دراز کے گوشوں سے لے کر جاپان اور تبت تک میں کشمیری فن کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

چین بودھ یونانی فن سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوا ہے۔ یہ فن وہاں کشمیری اور ہندوستانی مبلغین کے ساتھ ساتھ گیا تھا۔ اب یہ بات پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اس مدرسۂ فن کی بنیاد گاندھار میں رکھی گئی۔ گاندھار فن کی ترقی میں کشمیری فن کاروں کا جو حصہ رہا ہے اُسے اس موضوع کے ماہرین ابھی منظرِ عام پر نہیں لائے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ کشمیر کے آثارِ قدیمہ کے متعلق معلومات کی ابھی بہت کم یابی ہے، لیکن ابھی حال میں ہرعان میں سرخی مائل بادامی رنگ کی مٹی کے بنے ہوئے جو کھپرے اور ٹائیل اور مٹی کے مجسموں کے جو ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں، ان سے یہ خلا بڑی حد تک پر ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں کشمیر اور گاندھار کے درمیان جو گہرے سیاسی اور تہذیبی تعلقات رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مشہور قدیم یونانی بدھ

فن کی روایت کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کا فخر بڑی حد تک کشمیر فنکاروں کو ہی حاصل رہا ہوگا۔ اس لئے اس اہم پہلو پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

جب اشوک کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو اس کا اثر ہندوستان کے شمال مغربی صوبے پر بھی پڑا۔ مرکزی قوت چونکہ بہت گھٹ چکی تھی، اس لئے شمال کی جانب سے پنجاب پر پھر حملے ہونے لگے۔ اس بار حملہ آور تہذیبی حیثیت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے یونانی باختر میں ایک آزاد ریاست قائم کر چکے تھے۔ ہندوستانی سرحد کو عبور کر کے انھوں نے گاندھارا کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ باختر کے یہ یونانی ہندوستانی سانچے میں ڈھلتے گئے۔ تبدیلی کا یہ عمل آخر کار ایک ایسے نقطے پر پہونچ گیا کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے یونانی ہندو سماج کا ایک حصہ بن گئے۔ دو قوموں کی اس آمیزش سے ہندوستانی تہذیب اور یونانی تہذیب کا غیر معمولی امتزاج عمل میں آیا جس نے گاندھارا کے مشہور مدرسۂ فن کو جنم دیا

جب کدفیس دوئم نے آخری یونانی بادشاہ ہرمیئس کو شکست دے دی تو گاندھارا بھی خانہ بدوش کشنوں کے حلقۂ اقتدار میں آگیا۔ کشنوں نے آہستہ آہستہ یونانی، پارتھیا اور شک کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو ختم کر دیا اور کنشک کے زیر اقتدار ایک بہت وسیع سلطنت قائم کر لی کنشک کے زیر اثر کشمیر نے جو سیاسی اور تہذیبی کارنامے انجام دیئے، اُن پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ گاندھارا کا فن جس پر یونانی اثرات غالب تھے، کشنوں کو بہت پسند آیا۔ کنشک کی سرپرستی میں نہ صرف اس کی بہت ترقی ہوئی بلکہ وہ ہندوستان اور وسط ایشیا میں دُور دُور تک پھیل گیا۔

اس علاقے میں یونانیوں کے پہونچنے سے بہت پہلے ہی گاندھارا و کشمیر میں گہرے سیاسی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ کلہن کی لافانی تخلیق "راج ترنگنی" کا پہلا منظر گاندھارا ہی ہے۔ آگے چل کر گاندھارا اور وہاں کے برہمنوں کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کشمیر کی فوج کے لئے گاندھارا کے نوبلن سورماؤں کی بہت مانگ تھی۔

"کشمیر میں ابھی حال تک شمال مغربی ہندوستان کے ہند یونانی، پارتھیائی اور ساہی بادشاہوں کے سکّے بہتی کثرت سے ملتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ دو صدی قبل عیسیٰ مسیح سے پہلی صدی عیسوی میں پشاور اور کابل کی ریاستوں اور کشمیر کے درمیان سیاسی تعلقات نہیں تو گہرے تجارتی تعلقات ضرور تھے"۔

(آر۔ سی۔ کاک، قدیم عمارتیں)

کہا جاتا ہے کہ کشمیر اور گاندھارا میں سب سے پہلے بودھ مذہب کی تبلیغ کرنے کا سہرا مبلغ اعظم مدھیانتک کے سر ہے جسے اشوک کے مذہبی مشیر موگلی پُت تیسا نے بھیجا تھا۔ قدیم دستاویزوں میں کشمیر کی سلطنت گاندھارا ہی کا ایک حصّہ نظر آتی ہے۔ بودھ مذہب کی کتاب میں جہاں سولہ مہاجن پدوں کی فہرست دی گئی ہے وہاں کشمیر گاندھارا کو ایک ہی جن پد مانا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک سے پہلے یہ دونوں دیش مل کر ایک سیاسی وحدت کی تکمیل کرتے تھے۔ اشوک کے عہد حکومت میں کشمیر اور گاندھارا ایک دوسرے کے اور بھی قریب آگئے۔ اشوک کی وسیع سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی ان دونوں کے تعلقات قائم رہے۔ گاندھارا باری باری سے کشمیر اور پنجاب کا حلقہ بگوش بنتا رہا۔ سمدھی مت آمیہ راجا کے کنارہ کش ہو جانے کے بعد کشمیر کے امراء نے گاندھارا سے میگھاواہن کو لاکر کشمیر کا راجہ بنایا۔ اشوک کے بعد بھی کشمیر اور گاندھارا ایک ہی سیاسی وحدت کی تکمیل کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یونانی دستاویزوں سے ملتا ہے جن میں کسپ پیرو (کشیپ پور، کشمیر) کو گاندھارا کا ایک شہر کہا گیا ہے

"ملیند پنہا" میں جس کی تخلیق سن عیسوی کی ابتدا میں ہوئی تھی دونوں ملکوں کو کشمیر۔ گندھارا کہا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں بودھ مذہب کی کتابوں کے چینی مترجموں نے سنسکرت لفظ "کشمیر" کے لئے چینی لفظ "کپین" کا استعمال کیا ہے۔ "کپین" میں کشمیر کے علاوہ گاندھارا و کپیش نگر شامل ہیں۔ مہاوسر کے ابتدائی بابوں میں سے کسی ایک باب میں دونوں ملکوں کو کشمیر۔ گاندھارا کہا گیا ہے۔ لیکن ایک دوسرے باب میں جس کا تعلق بہت بعد کے زمانے کے کسی واقعہ سے ہے فقیروں کا ذکر کرتے ہوئے اُنھیں کشمیر کا باشندہ بتایا گیا ہے اس میں بھی کوئی شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلہن نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر کشمیری راجاؤں کے حملوں کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہیں۔ ہیان چوانگ کے تحریروں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب ٹکسیلا پہونچا تھا تو یہ ملک کشمیر کے ماتحت تھا۔ راج ترنگنی کے مطالعہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وادیٔ کابل کے ساہی

حکمرانوں سے جن کا پایۂ تخت اُدھبنڈپور (موجودہ اوہنڈ) تھا، کشمیری راجاؤں کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ وادیٔ کابل کے جو کُشن حکمران بعد میں ہوئے۔ اُن کے بہت سے شاہزادوں کو لَلِتادتیہ نے اپنے یہاں پناہ دی اور اُنھیں اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا۔ کشمیر کی بعد کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری راجاؤں نے گاندھار کے ساہی حکمرانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم کئے۔ اننت دیو (۱۰۲۸ ۔ ۱۰۶۳ء) کے عہد میں ہمیں اُن کے خاندان میں ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو ساہی پُتر یا راج پُتر کے نام سے پکارے جاتے تھے اور جو کشمیر کے دربار میں اعلیٰ ترین عہدوں اور ممتاز ترین حیثیتوں کے مالک تھے۔ گاندھار میں اس سلسلۂ نسب کا آخری خود مختار حکمران تری لوچن پال تھا۔ اسے کشمیر کے راجہ سنگرام راج کی مدد کے باوجود محمود غزنوی کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھانی پڑی۔ اُس نے زندگی کا باقی حصّہ کشمیر میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے گزارا۔ چودھویں صدی عیسوی میں سکندر نے کشمیر گاندھار کو فتح کیا اور اُدھبنڈپور کی شاہزادی سے شادی کی۔ مشہور بادشاہ زین العابدین جو کشمیر کا اکبر تھا، اسی شاہزادی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ کشمیر اور گاندھار کے درمیان اتنے گہرے سیاسی اور تہذیبی تعلقات کے ہوتے ہوئے اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ گاندھار کے مدرسۂ فن نے کشمیری فنکاروں کی چابک دستی کی مدد لئے بغیر ہی ترقّی کی منزلیں طے کی ہوں گی۔ ہزاروں سال سے کشمیری صنّاع اپنے فنکار ہاتھوں سے تیار کی ہوئی خوشنما چیزوں کے لئے مشہور رہے ہیں اور آج بھی سارے ایشیا اور یورپ میں اُن کی شہرت اُسی طرح قائم ہے جہاں یہ بات سچ ہے کہ کشمیر کے قدیم مندروں کے کھنڈروں میں یونانی اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، وہاں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ گاندھار کا فن کشمیری فنِ بُت تراشی اور فنِ معماری سے ضرور متاثر ہوا ہوگا

گاندھار اور کشمیر کی عمارتوں کی تعمیر میں جو مسلے استعمال کئے گئے ہیں۔ اُن کے ناگزیر فرق کو چھوڑ کر دونوں ملکوں کی عمارتیں بالکل ایک سی ہیں۔ کشمیر کی بودھ عمارتوں کا نقشہ اور شاید اٹھان بھی قریب قریب وہی ہے جو اس زمانے کے گاندھار کی بودھ عمارتوں کا ہے۔

یونانی۔ بودھ فن کی ترقّی میں سب سے زیادہ حصّہ بودھ مذہب کی مہایان شاخ نے لیا۔ چین کے لوگوں نے اس فن کو ہاتھوں ہاتھ لیا بےشمار بودھ دیوتا اور دیویاں۔ اولوکِت ایشور، تارا، منجسری کوان یِن، میتری وغیرہ ۔۔۔ میں کشمیر اور گاندھار کے فنکاروں کو فنی تخلیقات کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا اور اُنھوں نے نہ صرف وسط ایشیا اور چین بلکہ جاپان تک کے فنون تشکل تراشی پر اپنے گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے۔

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

مندرجہ ذیل کرم فرماؤں کے مضامین شائع ہونے کی توقع ہے

خواجہ غلام السیّدین	اقبال کے پیغام کی عالمگیری
مولانا نیاز فتح پوری	انسانِ جُرم و تعزیر
راجندر سنگھ بیدی	سوانحی اور تاریخی فلمیں
علی سردار جعفری	جدید شاعری
اوپیندر ناتھ اشک (افسانہ)	پا بہ دایت کار
کوثر چاندپوری (افسانہ)	دودھ کے جھاگ

اس کے علاوہ مقتدر شعراء کی نظمیں اور غزلیں (ادارہ)

مشیر الحق مچھلی شہری آبادی

مکالماتِ گوتم بدھ

حسبِ ذیل مکالمہ Dialogue of Buddha حصۂ دوم کے ایک حصے کا ترجمہ ہے
جسے پالی زبان سے انگریزی میں T. W. Rhys Davids نے ۱۹ ویں صدی کے
آخر میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب مہاراجہ سیام کی سرپرستی میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس ترجمے
میں حاشیے پر جو نمبر پڑے ہوئے ہیں وہ اصل پالی کتاب کے ہیں۔ (مترجم)

(۲۵-۲۷) پوتھ پد۔ "اچھا حضور، یہ بتائیے کہ کیا عالم ابدی ہے؟ کیا صرف یہی صداقت ہے اور دوسرے خیالات حماقت پر مبنی ہیں؟"

گوتم بدھ "پوتھ پد، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر میں نے اظہارِ خیال نہیں کیا ہے۔"

تب پوتھ پد نے حسبِ ذیل مزید سوالات کئے۔

"۲۔ کیا دُنیا ابدی نہیں ہے؟
۳۔ کیا دنیا محدود ہے؟
۴۔ کیا دنیا غیر محدود ہے؟
۵۔ کیا روح جسم کی مانند ہے؟
۶۔ کیا روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں؟
۷۔ کیا جو شخص سچائی کو پالیتا ہے وہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہوتا ہے؟
۸۔ کیا وہ مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوتا؟
۹۔ کیا وہ مرنے کے بعد زندہ بھی ہوتا ہے اور زندہ نہیں بھی ہوتا ہے۔
۱۰۔ کیا وہ مرنے کے بعد نہ تو زندہ ہوتا ہے اور نہ زندہ نہیں ہوتا ہے؟

گوتم بدھ "اے پوتھ پد، یہ ایسے معاملات ہیں جن پر میں نے کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔"

۲۸ پوتھ پد "لیکن عالی مقام نے اس پر اظہارِ خیال کیوں نہیں کیا ہے؟"

گوتم بدھ۔ "یہ بے فائدہ سوال ہے۔ اس کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے اس سے نہ تو بنیادی نوشش اطوار پیدا ہوتی ہے اور نہ آزادیٔ رائے، نہ خواہشاتِ نفسانی سے چھٹکارا ملتا ہے اور نہ تزکیۂ نفس۔ نہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے نہ علمِ حقیقی، نہ راہِ مستقیم کے بلند مراتب کی کیفیت یا الہٰ کا پتہ چلتا ہے اور نہ نروان حاصل ہوتا ہے۔"

[۱۸۹] ۲۹ پوتھ پد۔ "پھر عالی مقام کے کیا خیالات ہیں؟"

گوتم بدھ "پوتھ پد، میں نے دُکھ کی تشریح کر دی ہے۔ میں نے دُکھ اور سُکھ دونوں کے بارے میں بتا دیا ہے اور یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ کوئی شخص دکھوں سے کس طرح چھٹکارا پا سکتا ہے۔"

۳۰۔ پوتھ پد۔ "تو عالی مقام نے اس قسم کی بات کیوں بتائی ہے؟"

گوتم بدھ۔ "اس وجہ سے پوتھ پد، کہ ایسا سوال مفید ہوتا ہے۔ اس کا تعلق دھرم سے ہوتا ہے، اس سے خوش اطواری اور آزادیٔ رائے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے خواہشِ نفسانی سے چھٹکارا اور تزکیۂ نفس

ہوتا ہے۔ اس سے اطمینان اور علم حقیقی حاصل ہوتا ہے۔ اس سے صراطِ مستقیم کے بلند مراتب کی کیفیتِ باطنہ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور نروان حاصل ہوتا ہے۔"

پوٹھ پدا۔ "ٹھیک ہے اے عالی مقام، درست ہے اے خوش وخرم، اب عالی مقام جو مناسب سمجھیں وہ کریں"

(تب عالی مقام اپنی جگہ سے اُٹھے اور وہاں سے چلے گئے)

۳۱ اور عالی مقام جونہی وہاں سے گیا بھکشو پوٹھ پد پر ہر طرف سے دوسرے بھکشوؤں نے اپنے سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ کہنے لگے۔ "یہ پوٹھ پد تو ساماں گوتم کے ہر ہر لفظ کی تائید کرنے لگتا ہے۔ "ٹھیک ہے عالی مقام، درست ہے خوش وخرم" اور ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ ساماں گوتم نے کوئی ایسا نظریہ بھی پیش کیا ہے جو ان پیدا شدہ دس مسائل سے ممتاز ہو۔"

اور وہ سب لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔

۱۹۰۔ لیکن جب انھوں نے اس طرح کی باتیں کیں تو بھکشو پوٹھ پد نے انھیں جواب دیا۔ "میں یہ نہیں دیکھتا ہوں کہ اس نے ان مسائل کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کیا ہے یا نہیں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ گوتم نے اشیا کی فطرت کے مطابق ایک ایسا مناسب اور ٹھیک طریقہ تجویز کیا ہے جس کی بنیاد کامل دھرم پر ہے۔ پھر میں کس طرح سے اس کی تائید سے انکار کر سکتا ہوں۔"

بھکشو نے مکرر کہا کہ "گوتم نے اس نظریے کو کتنی اچھی طرح پیش کیا ہے۔"

۳۲۔ پھر دو تین دنوں بعد مہاوت کا بیٹا کتّا اور بھکشو پوٹھ پد، عالی مقام کی قیام گاہ پر آئے۔ وہاں پہنچ کر مہاوت کا بیٹا کتّا عالی مقام کے سامنے جھکا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور بھکشو پوٹھ پد، عالی مقام سے پُروقار بے تکلفی اور دوستانہ طریقے سے سلام و کلام کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے عالی مقام کو بتایا کہ کس طرح دوسرے بھکشوؤں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی تھی اور اس نے ان کو کیا جواب دیا تھا۔ تب عالی مقام بولا۔

(۱۹۱) ۳۳ گوتم۔ "پوٹھ پد، وہ تمام بھکشو اندھے ہیں۔ انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ان میں صرف تمھیں ایک ایسے ہو جس کے آنکھیں ہیں۔ اے پوٹھ پد، کچھ باتوں کو تو میں واضح کر دیتا ہوں اور کچھ کو غیر واضح چھوڑ دیتا ہوں۔ تمھارے کئے ہوئے دسوں سوالات کے جوابات میں نے غیر واضح چھوڑ دئے اور اس کا سبب بھی وہی ہے جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ بنیادی بات تو وہ چار صداقتیں ہیں جن کی میں تشریح کر چکا ہوں۔"

(۱۹۲) ۳۴ "اے پوٹھ پد، کچھ برہمن اور ساماں ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ 'روح کو مرنے کے بعد ہی مکمل خوشی اور صحت حاصل ہوتی ہے۔' میں ان لوگوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ کیا ان کے خیالات ایسے ہی ہیں تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ان کے خیالات یہی ہیں، اور میں نے ان سے پوچھا کہ کیا دنیا یعنی دنیا کے باشندے، مکمل خوش ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں"

"تب میں نے ان سے پوچھا، علاوہ ازیں کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود آپ نے ایک پوری رات یا ایک دن، یا آدھی رات یا آدھا دن مکمل خوشی کی حالت میں گزارا ہے۔ اس کا بھی انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں"

"تب میں نے ان سے کہا کہ "کیا آپ کوئی ایسی ترکیب یا کوئی ایسا طریقہ جانتے ہیں جس کے ذریعے آپ ایسی حالت پیدا کر سکیں جو مکمل خوشی کی ہو" اس پر بھی ان کا جواب نفی میں تھا۔

"اور تب میں نے ان سے کہا "اچھا تو کیا آپ لوگوں نے کبھی ان دیوتاؤں کی آواز سنی ہے جو پُرمسرت دنیا میں یہ کہتے ہوئے دوبارہ پیدا ہوئے تھے کہ "نیک بنو اے آدمیو اور مکمل خوشی کی دنیا میں دوبارہ جنم کے لئے کوشش کرو" تب بھی ان کا جواب 'نہیں' تھا۔"

"پوٹھ پد اب اس سے تم کیا سمجھتے ہو کیا ان ساماؤں اور برہمنوں کی بات سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ بے بنیاد خیالات رکھتے ہیں۔"

(۱۹۳) ۳۵ " ان کی مثال تو اس آدمی کی طرح ہے جو یہ کہے کہ " میں روئے زمین کی خوبصورت ترین عورت کی بے حد تمنا رکھتا ہوں اور اس سے بے پایاں محبت کرتا ہوں۔" اور جب لوگ اس سے یہ پوچھیں کہ " اچھا دوست، یہ تو بتاؤ کہ وہ خوبصورت ترین عورت جس کی تمھیں تمنا ہے اور جس سے تم محبت کرتے ہو وہ کون ہے؟ کیا وہ کسی معزز گھرانے کی عورت ہے؟ کوئی راہبہ ہے؟ کسی تاجر خاندان سے تعلق رکھتی ہے یا کوئی اچھوت ہے؟ "

" تو وہ اس سوال کے جواب میں کہہ دے کہ " میں تو کچھ نہیں جانتا۔"

" اور تب اس سے پھر پوچھا جائے کہ " اچھا دوست —! روئے زمین کی وہ خوبصورت عورت جس کی تمھیں تمنا ہے اور جس سے تم محبت کرتے ہو، کیا تم اس کا نام جانتے ہو؟ اسے پہچانتے ہو؟ اس کے خاندان کے بارے میں تمھیں کوئی علم ہے؟ اس کے قد و قامت کے متعلق کوئی بات معلوم ہے؟ اس کا رنگ کالا ہے کہ گورا ہے یا سانولا ہے۔ وہ کسی گاؤں یا قصبہ کی رہنے والی ہے یا شہر کی ہے۔" تو وہ ان سوالوں کے جواب میں کہہ دے کہ " مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

" لوگ اس سے پھر کہیں کہ " اچھا دوست، جس کو تم جانتے نہیں ہو، جسے تم نے دیکھا نہیں ہے کیا اس کی تمھیں تمنا ہے اور تم اس سے محبت کرتے ہو۔" تو وہ کہہ دے کہ " ہاں "۔

" تو ایسے شخص کے بارے میں پوتھ پد تمھارا کیا خیال ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ شخص بے عقلی کی باتیں کرتا ہے۔"

(۱۹۴) ۳۶ - ۳۷ - " پوتھ پد، یہی حالت ان سامانوں اور برہمنوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد روح کی تکمیل ہوتی ہے اور اسے مکمل خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک دوراہے پر کھڑا ہو کر ایک بلند مکان پر چڑھنے کے لئے زینہ بنائے اور لوگ اس سے یہ کہیں کہ " دوست جس محل میں داخل ہونے کے لئے تم زینہ بنا رہے ہو کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں، شمال میں ہے یا جنوب میں۔ وہ بلند ہے یا پست، یا متوسط ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں کہے کہ " مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

" تب لوگ اس سے یہ کہیں کہ اچھا دوست تم ایک ایسے محل میں داخل ہونے کے لئے زینہ بنا رہے ہو جس کو نہ تم جانتے ہو اور نہ ہی تم نے دیکھا ہے تو وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ " ہاں "۔

" اب بتاؤ پوتھ پد، کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ بے عقلی کی باتیں کرتا ہے "

پوتھ پد۔ " یہ حقیقت ہے حضور، کہ اس قسم کی باتوں سے اس آدمی کی کوتاہ فہمی ظاہر ہوتی ہے۔"

۳۸۔ گوتم۔ " تو بس اے پوتھ پد، یہی حال ہے ان برہمنوں اور سامانوں کا، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح کو موت کے بعد مکمل حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اس وقت کی موجودہ دنیا کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کبھی ایک دن یا آدھے دن پوری طرح خوش و خرم رہے ہوں۔ اور وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس نتیجے پر ایمان لانے کا ان کے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے۔"

" پھر تم اس کے بارے میں کیا سوچتے ہو پوتھ پد، کیا ایسی حالت میں ان لوگوں کی باتوں سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ سب بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں۔"

پوتھ پد:۔ " یہی بات تو یہ ہے حضور، کہ ان کی بات بے بنیاد معلوم ہوتی ہے۔"

۳۹۔ گوتم:۔ پوتھ پد، شخصیت کے حسب ذیل تین روپ دنیا میں عام طور سے تسلیم شدہ ہیں:۔

مادی غیر مادی اور غیر صوری

مادی اشیا کی تو شکل ہوتی ہے اور وہ چار عناصر سے مل کر بنتی ہیں اور غذا پر ان کی پرورش ہوتی ہے۔ غیر مادی کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ وہ دماغ میں ہوتی ہیں اور ان کے چھوٹے بڑے تمام اجزاء مکمل ہوتے ہیں۔ تیسری غیر صوری صرف خیال کی پیداوار ہوتی ہے۔"

۲۴۴-۲۴۰ ۔ ” پوتھ پد، اب میں تمہیں ایک ایسی نصیحت کرتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو بُری عادتوں سے بچ جاؤ گے۔ اس سے مائل بہ اصلاح عادات و اطوار بڑھ جائیں گے اور گیان کی کاملیت اور اس کا جاہ و جلال دیدہ دیکھا اور محسوس کیا جا سکے گا۔ “

(۱۹۶) ” اے پوتھ پد، یہ یوں ہو سکتا ہے کہ تم سوچو کہ بُری عادتوں کو دفع کرنا چاہیئے اور مائل بہ اصلاح عادات و اطوار کو بڑھانا چاہیئے اور گیان کی کاملیت اور اس کے جاہ و جلال کو دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہو تو اسے پوتھ پد یہ صحیح فیصلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ جب یہ شرائط مکمل ہوں گی تب خوشی حاصل ہوگی، شکھ ہوگا، امن ہوگا، مکمل اعتبار اور خود اختیاری ہوگی اور انسان آرام و سکون کے ساتھ رہے گا۔ “

(۱۹۷) ۲۴۵-۲۴۴ ” اور باہر والے، اے پوتھ پد، ہم سے اس طرح پوچھ سکتے ہیں کہ ” کیوں حضور، مادی (یا ذہنی یا غیر صوری) شخصیت کی وہ کون سی کیفیت ہے جس کو دور کرنے کے لئے آپ ہمیں وہ نصیحتیں کرتے ہیں جن کے ذریعے ایک شخص ان بُری عادتوں سے نجات پا جائے گا جو کہ خصائص اس نے خود اپنے میں پیدا کئے ہیں اور کیا ان نصیحتوں سے ان کیفیات کا اضافہ ہوگا جن کا میلان طہارت کی طرف ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ خود گیان کی تمام وشکوہ اور اس کی کاملیت کو دیکھ اور محسوس کر لے۔ “

” ایسے شخص کو مجھے یہ جواب دینا ہے کہ کیوں نہیں، وہ شخصیت جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو وہی تو میرا مقصود ہے۔ “

۱۹۸ - اب تم اس سے کیا سمجھے ہو، اے پوتھ پد، کیا اس بات سے اس کی صحیح بنیاد نہیں پڑتی؟ “

پوتھ پد۔ ” سچ ہے سرکار، ایسا ہی ہے۔ “

۲۴۶ - گوتم۔ ” پوتھ پد، ایسا ہی ہے جیسے ایک آدمی ایک محل کے اوپری حصّے میں جانے کے لئے اسی محل کے نیچے حصّے میں ایک زینہ بنائے اور لوگ اس سے کہیں ” اچھا پیارے دوست، جس محل میں داخل ہونے کے لئے تم زینہ بنا رہے ہو کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں، شمال میں ہے یا جنوب میں، اونچا ہے یا نیچا یا متوسط ہے؟ “

” اور جب اس سے ایسا پوچھا جائے تو وہ کہے۔ ” واہ، وہ مکان تو یہ سامنے موجود ہے، میں تو اسی کی جڑ میں اس پر چڑھنے کے لئے زینہ بنا رہا ہوں۔ “

” اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے پوتھ پد، کیا اس بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اچھی بنیاد پر ہے۔ “

پوتھ پد۔ ” یہی بات تو یہ ہے حضور کہ اس سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ “

(۱۹۹) ۲۴۷ گوتم بدھ۔ ” تو اسی طرح پوتھ پد، مجھ سے جب اس قسم کے سوالات کئے جاتے ہیں تو میں ان کا اسی طرح جواب دیتا ہوں۔ “

یوآن چانگ

یہ چینی سیاح ہرش کے زمانے میں آیا تھا۔ وہ ہندوستان میں ۶۳۰ء سے ۶۴۴ء تک رہا۔ ہرش سے اس کی ملاقات کا جنگل نزد راج محل کے مقام پر اس وقت ہوئی جب وہ اڑیسہ کو فتح کر کے آ رہا تھا۔ وہ اسے قنوج لے گیا جہاں معزز مہمان کے اعزاز میں ایک بڑی مجلس منعقد کی گئی۔ اس مجلس میں ہرش کے باج گذار راجے اور چار ہزار عالم سادھو شامل ہوئے۔ ان میں سے ایک ہزار سادھو نالندہ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یوان چانگ کو میر مباحثت مقرر کیا گیا تھا۔ اکیس دن تک مذہبی مباحثے جاری رہے۔ اس کے بعد ہرش اپنے مہمان کو پریاگ لے گیا۔ یہاں ہرش نے جو کچھ اس کے پاس تھا دان کر دیا۔ یوآن چانگ کے توسّل سے ہندوستان اور چین کے درمیان رابطہ دوستی اور سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔

پال کنڈمشر

بُدھ اور عورت

عورت دُنیا کی عجیب ترین تخلیق ہے۔ مختلف فلسفیوں نے اسے الگ الگ شکلوں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب بھی اس کے لئے الگ الگ جگہ رکھتے ہیں۔ کچھ اسے چھوٹا اور حقیر بتاتے ہیں تو کچھ اسے اونچا اور عظیم۔ ہندو مذہب میں بھی ایک طرف عورت کو بلند مرتبہ بخشا گیا ہے اسے تمام امور کے لئے ضروری اور عظیم بتایا گیا ہے۔ تو دوسری طرف اسے روحانی ترقی کی راہ میں ایک دیوار بتایا ہے، زہر سے تشبیہ دی ہے، اسے تاریکی اور فریب کے ناموں سے منسوب کیا ہے۔ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کا معاملہ سماجی مفکرین کے سامنے ہمیشہ سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ ان میں برابری، برتری یا کمتری نے مختلف تہذیبوں میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ اسی معاملے نے کبھی کبھی انسان کو دو حصّوں میں منقسم کر دیا اور ایک کو جابر اور دوسرے کو مظلوم بنا دیا اور کبھی کبھی ان دونوں میں وہ ہم آہنگی پیدا کی کہ ترقی کی اونچی اونچی منزلیں طے ہو گئیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں عورتیں بہادری، عقلمندی، فنونِ لطیفہ اور دیگر چیزوں میں مردوں سے سبقت لے گئیں۔ روحانی معاملات میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ عورتیں کچھ عظیم شخصیتوں کے سہارے اس قدر آگے بڑھیں کہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے لافانی کر گئیں اور ان کی زندگیاں آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بن گئیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی سنتوں اور صوفیوں نے کہا ہے :-

" عورت ایک غیر معمولی اور بے مثال کشش ہے، اس سے بچو
یہ تمھیں منزلِ مقصود تک پہنچنے نہیں دے گی یہ تمھاری راہ
میں چٹان بن کر حائل ہو جائے گی۔ "

حالانکہ شاید وہ بھی جانتے تھے کہ عورت سے بچنا آسان نہیں کیونکہ اس دنیا میں ہمیں لانے والی "ماں" بھی تو آخر کار ایک عورت ہی تو ہے۔

بہت ممکن ہے کہ عورت کی جو یہ دو تصویریں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں، اُس کے یہی دو پہلو ہوں جو الگ الگ حالات اور ماحول میں اُبھرتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عورت صرف اُن لوگوں کے لئے سنگِ راہ ہو، زہر ہو، تاریکی ہو جو راہِ روحانی میں نو وارد ہوں جن میں خلوص پن ابھی کچھ نہ ہو اور جو ظاہری حُسن و جمال پر فریفتہ ہو کر گمراہ ہو جائیں اور اس کے برعکس قلبی نور سے منوّر شخصیتوں کے سامنے اس کا ظاہری جادو نہ چلتا ہو اور اس کی تابانی سے یہ ظاہری اور سطحی تاریکی بھاگ جاتی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کی زندگی میں بھی ایسے بہت مواقع آئے جبکہ حسن و جمال نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے۔ یہ اوقات ان کے امتحان کے تھے لیکن وہ ان سب پر پورے اُترے۔ امرپالی، واسودتا اور نا معلوم کتنی اور خوبصورت عورتوں کے قصّے اُن کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بہت ہی حسین تھی۔ قدرت کی تمام عنایات انہیں حاصل تھیں اور انسانی تہذیب و تمدّن کے تمام فنون کی بھی وہ ماہر تھیں اور پھر انھوں نے اپنا سب کچھ بدھ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن بدھ راہِ راست سے ڈگمگائے نہیں بلکہ انھوں نے ان کو بھی اپنے نور کے ایسے پارے بخشے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کی گرویدہ ہو گئیں اور مکمل روحانی زندگی بسر کرنے لگیں۔

گوتم بدھ نے کہیں بھی صاف صاف طور پر عورت کے متعلق کچھ نہیں کہا مگر ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے مطابق ان کے تاثرات سے جگہ جگہ عورتوں کے متعلق ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

بدھ کی زندگی کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک اصلاح کے لئے قدرت کی طرف سے مخصوص تھے۔ ان پر یہ لازم تھا کہ وہ فورحق

سے واقف ہوں اور دوسرے لوگوں کو اس سے فیض یاب کریں۔ پیدائش کے ساتویں دن اُن کی ماتا مایا دیوی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش شاہی طریقے پر ہوئی اور دنیا کی ہر ممکن سہولت انھیں بہم پہنچائی گئی مگر انھیں ان سب سے کچھ اُنس نہ تھا۔ وہاں سے دل چسپی لینے کی بجائے الگ الگ رہنا چاہتے۔ اُن کے والد نے انھیں ترکِ دنیا کے خیالات سے الگ کرنے کے لئے ایک نہایت خوبصورت لڑکی کماری گوپا سے اُن کی شادی کر دی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ جادو اُن پر ضرور اثر کرے گا اور انھیں دنیاداری میں پھنسا دے گا۔ شادی کے بعد اُن کے گھر ایک چاند کے ٹکڑے نے بھی جنم لیا۔ اس کا نام راہول رکھا گیا۔ اب راجہ کو یقین ہو گیا کہ سدھارتھ دنیاوی زنجیروں میں جکڑ لئے گئے ہیں۔ مگر سدھارتھ ایک بڑے مقصد کے لئے آئے تھے انھیں اس سے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی لئے ایک رات وہ اپنی حسین بیوی اور گلاب سے بچے کو سوتا چھوڑ کر محل سے چلے گئے اور اس سب مایا اور تاریکی کے خلاف نورِ حق کے حصول میں لگ گئے۔

انھوں نے تپ کیا اور وہ روشنی حاصل کی جس کی انھیں جستجو تھی۔ اس روشنی کی شعاعیں دور دور تک پھیلنے لگیں اور عوام اس سے فیض پانے لگے۔ اس نئی روشنی کے پھیلاؤ کو ترتیب دینے اور اسے منظم کرنے کے لئے انھوں نے ایک سنگھ (انجمن) کی بنیاد ڈالی تاکہ اس میں بھکشو داخل ہو سکیں اور ان اصولوں پر چل کر عوام کے سامنے ایک نمونہ بن سکیں اور ان کے خیالات کو دور دور پھیلا سکیں۔ اس سنگھ کے داخلے پر کسی قسم کی بندش نہ تھی، لیکن اس میں عورتوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ گوتم بدھ یہ سمجھتے تھے کہ عورتیں کم ہمت ہیں اور دنیاوی معاملات سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتیں، ان کا داخلہ اُن کے خیالات کی اشاعت میں نہ صرف حایل ہوگا بلکہ اسے ختم ہی کر دے گا۔

اس کے برعکس مہاتما بدھ کے بڑے شاگرد آنند اس خیال کے تھے کہ عورتوں کو بھی سنگھ میں شامل ہونے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ وہ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ چل سکتی ہیں اور سماجی قدروں کے انقلاب کی ہر جد و جہد میں شامل ہو کر اُسے کامیاب کر سکتی ہیں۔ آنند نے بہت کوشش کی اور بدھ سے التجا کی کہ وہ عورتوں کو بھی سنگھ میں شامل ہونے کی اجازت دے دیں۔ بھگوان بدھ نے اُن کی بات مان لی اور اجازت دے دی لیکن کہا۔

"سنو آنند! اگر عورتوں کو سنگھ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی ہوتی تو یہ دھرم بہت وقت تک قائم رہتا، ہزاروں سال سے بھی زیادہ۔ لیکن اب چوں کہ عورتوں کو سنگھ میں آنے کی اجازت دے دی گئی ہے اب یہ دھرم پانچ سو سال ہی قائم رہ سکے گا۔"

مگر بھگوان بدھ کا ڈر غلط نکلا اُن کی پیشین گوئی پوری نہ ہوئی اور گوتمی نے جو بُدھ مت کی صفِ اول کی کارکن تھیں اپنے کام سے اسے بدل دیا اور بدھ سنگھ کو ایک لمبی عمر عطا کی۔

گوتمی بھگوان بُدھ کی ماں تھیں۔ انھوں نے ہی بدھ کو پالا تھا۔ جب بھگوان بُدھ کپل وستو کے لوگوں کو نجات دلانے آئے تو گوتمی اُن کی آمد کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئیں لیکن جب انھیں فقیرانہ لباس میں دیکھا تو بہت دُکھی ہوئیں۔ اس کے باوجود انھوں نے استقلال سے کام لیا۔ جب بھگوان بُدھ برسات کے موسم میں وہاں قیام پذیر تھے تو گوتمی نے اپنے بال کٹوا دئے، جسم کو ایک معمولی کپڑے سے ڈھکا اور یا شیودھا کیہ ذات کی عورتوں کے ساتھ مہاتما بدھ کی شرن لی۔ گوتمی نے بھکشونی سنگھ (عورتوں کی انجمن) قائم کیا جو تقریباً ایک ہزار سال چلا (مرحوم پروفیسر کوسامبی کے نظریے کے مطابق بھکشونی سنگھ کا اختتام سن عیسوی کی چوتھی صدی میں ہوا)

سنگھ میں بہت دل چسپی کے ساتھ عورتیں شامل ہوئیں بھکشونی بنیں، انھوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا کے گوشے گوشے تک بھگوان بدھ کے اُپدیش کو احسن طریقے سے پہنچایا۔ اس طرح عورتوں نے سنگھ میں شمولیت کی اجازت کے لئے اپنے آپ کو قطعاً اہل ثابت کر دیا اور بدھ کے پیغام کو دائمی بنانے کی پوری کوششیں کیں۔

بُدھ کے زمانے میں پردے کا رواج نہ تھا لیکن انھوں نے ایک بار عورتوں کے بارے میں اتنا ہی کہا کہ عورتیں اپنی زندگی کو سادہ اور پاک بنائیں۔ بھگوان بدھ نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنا آخری کھانا ایک باعزت شریف اور پاک طوائف امرپالی کے یہاں کھایا۔

ایک بار آنند سے بات کرتے ہوئے انھوں نے آنند کے سوالات کے اس طرح جواب دئے۔ ان جوابات سے عورتوں کے متعلق ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

"بھگوان! ہم عورتوں کی طرف کس قسم کا رُخ اختیار کریں۔

"آنند! تم اُن کی طرف دیکھو ہی نہیں۔"

"لیکن اگر وہ ہماری طرف دیکھیں تو ہم کیا کریں؟"

"تو تم چپ رہو۔"

"اور اگر وہ ہم سے بولیں تو ہم کیا کریں؟"

"تو تم ہوشیار رہو۔"

ایک اور واقعہ جس سے عورتوں کے متعلق اُن کی رائے پر روشنی پڑتی ہے اناتھ پنڈک نام کے ایک سیٹھ کے ساتھ گزرا۔ ان کے لڑکے کی بیوی بہت ہی مغرور تھی اور اپنی خوبصورتی کے غرور میں اپنی ساس، سسر اور کسی دوسرے رشتہ دار کا کوئی ادب یا پاس نہیں رکھتی تھی۔ سیٹھ نے اپنی اس پریشانی کا ذکر بھگوان بدھ سے کیا۔ بھگوان بدھ ایک دن اس کے یہاں کھانا کھانے گئے اور موقع پاکر نہایت حلیمی سے اس کی بہو سے بولے:-

"بیٹی تم جانتی ہو اس دنیا میں سات قسم کی بیویاں ہوتی ہیں۔"

بہو نے پوچھا:- "مہاراج کون کون سی؟"

بدھ بولے۔ "پہلی قسم کی بیویاں "گھاتک" کہلاتی ہیں۔ اُن کا برتاؤ ٹھیک قاتل کا سا ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں روز نئے آشنا کی تلاش کرتی ہیں اور اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرتی ہیں۔"

"دوسرے قسم کی عورتیں چور ہوتی ہیں وہ اپنے مزے اور اپنی ضروریات کو ہی سب سے برتر سمجھتی ہیں اور انھیں برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں ایسی عورتیں خودغرض ہوتی ہیں اور اپنی تمام کارروائیوں کا مرکز وہ خود ہوتی ہیں انھیں اپنے خاوند سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور انھیں اپنے سکھ اور چین ہی سے غرض رہتی ہے۔"

"تیسری قسم کی بیوی کا اپنے شوہر کے ساتھ آقا کا سا برتاؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو نوکر سمجھتی ہے۔"

"چوتھی قسم کی عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی تمام ضرورتوں کو سمجھتی اور پورا کرتی ہیں۔"

"پانچویں قسم کی عورتیں اپنے شوہر سے بہن کا سا برتاؤ کرتی ہیں اس سے پاک اور سچی محبت رکھتی ہیں اور شرم اور پریم کا مجسمہ ہوتی ہیں۔"

"چھٹی قسم کی بیویاں اپنے خاوند کو دوست سمجھتی ہیں اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کی عزت کرتی ہیں اور اس کے دکھ درد میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔"

"ساتویں قسم کی عورتیں اپنے آپ کو خاوند کا غلام سمجھتی ہیں اور اس کی ہر خدمت بجا لاتی ہیں وہ اپنا سب کچھ اپنے شوہر پر قربان کر دیتی ہیں اور اس کی سیوا اپنا دھرم سمجھتی ہیں بھگوان بدھ نے یہ سب بتلانے کے بعد پوچھا۔ "بتاؤ بہو تم کیسی بیوی بننا چاہتی ہو۔"

مغرور حسینہ بھگوان کے چمکتے نور کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ ان کے اُپدیش کے سامنے اس کا غرور پانی پانی ہو گیا اور اس نے ان کے پاؤں پر اپنا سر جھکا دیا۔

بھگوان بدھ نے کہا۔ "من صاف رکھو ڈرو مت۔"

اُس مجسمۂ حسن نے کہا۔ "بھگوان آج تک میں اندھیرے میں تھی اب آپ نے مجھے راستہ دکھا دیا ہے مجھے ساتویں قسم کی بیوی بننا پسند ہے میں وہی بنوں گی اور گھر والوں کی خدمت ہی میں نروان (نجات) پاؤں گی۔"

بھگوان بدھ نے اُسے اشیرواد دیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ سے گوتم بدھ کے نفسیاتی مطالعے اور معاملات سلجھانے کے انوکھے ڈھنگ کا پتہ چلتا ہے۔

ریئر ایڈمیرل رام داس کٹاری

ریئر ایڈمیرل رام داس کٹاری نے ۲۲ اکتوبر کو فلوٹیلا کے پہلے ہندوستانی فلیگ آفیسر کا چارج لے لیا۔ موصوف کو اس امتیاز کا فخر حاصل ہے کہ وہ تعلیمی زندگی میں ہمیشہ اوّل رہے اور اپنے پیشے کے مشاغل میں بھی اول ہی رہے ہیں۔ آپ کے چند امتیازات حسب ذیل ہیں:- وہ ایڈمیرل بننے والے پہلے ہندوستانی ہیں۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جس نے بحریہ کے کمانڈر انچیف کی قائم مقامی کی تھی۔ اگست ۱۹۵۴ء میں [illegible]

عابد سہیل

گوتم بدھ کا فلسفۂ اخلاقیات

ہندوستان کی زندگی، ثقافت اور علم و ادب کی طرح فلسفہ سے بھی یورپ نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے۔ ہندوستان کے فلسفہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں یورپ کے مفکروں نے ہمیشہ جانبداری سے کام لیا ہے۔ پروفیسر فرینک تھلی تاریخ فلسفہ میں رقمطراز ہیں۔

> "تاریخ فلسفہ میں تمام ممالک کے فلسفہ کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ لیکن تمام ممالک کے لوگوں نے باقاعدہ مدارسِ فکر کو جنم نہیں دیا اور چند ہی ممالک ایسے ہیں جن کے فلسفہ کی باقاعدہ تاریخ ملتی ہے۔ چینیوں، ہندوؤں اور عراقیوں کی پروازِ فکر چند توہماتی کہانیوں اور چند اخلاقیاتی ضوابط تک محدود ہے اس کے علاوہ انھوں نے کوئی باقاعدہ نظامِ فکر نہیں پیش کیا۔"

یہ الزام کس قدر غلط اور جہالت پر مبنی ہے اس کا اندازہ صرف ہندوستان کے فلسفہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان نے فلسفہ کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن کو کوئی بھی فلسفے کا طالبعلم نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں بدھ ازم اور جین ازم ایسے مبسوط نظامِ فلسفہ اس وقت بھی موجود تھے جب یورپ میں فلسفہ نے آنکھ کھولی تھی۔ اپنشدوں کی تاریخِ تحریر کے بارے میں اختلاف ضرور ہے لیکن خود یورپ کے علما نے ان کو چار ہزار سال قدیم تک بتایا ہے اس سلسلے میں جیکوبی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے مدارسِ فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ناستک اور آستک۔ "آستک اسکول" وہ کہلاتے ہیں جو اپنے فلسفہ کا جواز اپنشدوں پر رکھتے ہیں ان میں سانکھ، میمانسا اور ویدانت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ناستک اسکول وہ ہیں جو اپنے فلسفے کی بنیاد اپنشدوں پر نہیں رکھتے ہیں ویسے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ناستک اسکول اپنشدوں کے اثرات سے بالکل آزاد رہے ہیں لیکن پھر بھی ان میں اپنشدوں کے اثرات مقابلتاً کم ملتے ہیں۔ ان میں جین اور بدھ واد خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کے فلسفے کا تعلق یہاں کی زندگی سے نہایت گہرا رہا ہے۔ یورپ کے برخلاف ہندوستان میں مختلف مدارسِ فکر کی ترویج و ترقی متوازی طور پر اور ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ ایک ہی وقت میں نیائے بدھ واد اور دوسرے مدارس نے فروغ پایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں فلسفہ چند اصولوں، باریک بینیوں اور ذاتیات پر منحصر نہیں تھا بلکہ راست بازی اور پاک زندگی اور سچائی کے حصول کا دوسرا نام تھا۔ یہاں کے فلاسفہ کے قول و فعل میں فرق نہیں پایا جاتا۔ گوتم بدھ نے جو پیغام دیا خود بھی اس پر عمل کیا۔ اس طرح یہاں کے فلسفہ اور زندگی میں ایک گہرا اور اٹوٹ تعلق ملتا ہے۔

آج سے دو ہزار سال قبل پانچ سو سڑسٹھ ۵۶۷ قبل مسیح میں کپل وستو کے قریب لمبنی نامی مقام پر گوتم بدھ کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت اس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے سات ہی روز بعد ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اسے سوتیلی ماں نے پالا پوسا۔ اس کی پیدائش کے وقت ہی نجومیوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر دنیا کے عیش و آرام کو تج کر فقیرانہ زندگی گذارے گا۔

اسی خیال کے تحت اس کی شادی کم سنی ہی میں یشودھرا نامی ایک لڑکی سے کر دی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام راہل رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اس کو لڑکے کی پیدائش کی خبر ملی وہ غور و فکر کی دنیا میں مستغرق تھا۔ یہ خبر سن کر اس نے کہا "یہ ایک اور بندھن

ہے جیسے توڑتا ہے" چنانچہ اس نے محل کی آرام دہ زندگی کو چھوڑ کر راہب بن جانے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں سچائی کی جستجو کرنے والوں کا یہ دستور تھا کہ وہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی گذارتے اور اپنے جسم کو طرح طرح کی اذیت اور ایذا پہونچاتے۔ فلسفہ سے مایوسی کے بعد بدھ نے اب یہ راستہ اختیار کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ پانچ شاگرد تھے۔ گوتم نے اپنے ان شاگردوں کے ساتھ اذیت کوشی شروع کر دی اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ ضرور سچائی کے حصول میں کامیاب ہوگا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے جسم کو طرح طرح کی تکالیف دیں۔ وہ روز بروز کمزور ہوتا گیا اور ایک رات تو مہاتما بدھ کی حالت نہایت خراب ہو گئی۔ اس حالت میں بھی اگر سچائی اور حقیقت خود کو اس پر منکشف کر دیتی تو شاید وہ اذیت کوشی جاری رکھتا لیکن روح کا سکون میسّر آنا تو دُور کی بات وہ تو اس سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتا جا رہا تھا۔ عیش و آرام، دولت و حشمت کی بے مائگی سے وہ پہلے ہی بدظن ہو چکا تھا علم و دانش نے اس سلسلہ میں اس کی ذرا بھی رہنمائی نہ کی اور اذیت کوشی نے روح کے سکون اور سچائی کو اس سے اور بھی دُور کر دیا۔

حقیقت کا وہ متلاشی ہو۔ راستے کی ان دقتوں سے مایوس ہونے والا کب تھا۔ اس نے تو سچائی کو پانے کا پکّا ارادہ کر لیا تھا اور اس کے لئے اس نے ایک نیا طریقہ آزمایا۔ مشرق کی جانب منہ کر کے وہ ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اُس نے اعلان کر دیا "میں اس درخت کے نیچے سے اس وقت تک نہ ہلوں گا جب تک کہ مجھے حقیقت اور سچائی کا علم نہیں ہو جائے گا" اور جو بندہ یابندہ کی مصداق حقیقت نے خود کو اس پر منکشف کر ہی دیا۔ ایک ایسے وقت جب کہ ذہن کسی مسئلہ کے حل میں بُری طرح محو ہوتا ہے۔ حقیقت دھیرے دھیرے خود کو منکشف کرتی ہے اور ذہن ان کامیابیوں سے بے خبر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پھر یکلخت ایک ہی لمحہ میں مجاز کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حقیقت سچائی اور اصلیت سامنے کھڑی ہوئی مسکراتی ہیں۔ ایسے ہی محویت کے ایک عالم میں سچائی، حقیقت اور دوستی نے خود کو اس کے سامنے عریاں کر دیا۔ اس انکشافِ حقیقت کی وجہ سے اس درخت کا نام بودھی تندا The Tree of Intelligence پڑا۔ اس کی اس کامیابی کے بعد ہی اس کے شاگردوں کا حلقہ بڑھتا گیا۔ اس کے وہ شاگرد جنھوں نے اس کی ترک اذیت کوشی پر ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر اس سے آملے۔ گوتم بدھ کا پیغام سارے ہندوستان میں اس کونے سے اُس کونے تک پھیل گیا۔ اس کے تجربات نے اسے چار ایسے اصول فراہم کئے جو پر اس کے فلسفہ اخلاق کی بنیاد پڑی۔ یہ چار اصول حسب ذیل ہیں:-

(۱) زندگی میں دُکھ اور مصائب ہیں (۲) لاعلمی ان مصائب کی بنیاد ہے (۳) ان مصائب اور دُکھوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے (۴) سچے علم اور حقیقت کے حصول سے ان سے نجات ممکن ہے۔

دُکھ اور مصائب سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اسباب ہیں اور جن چیزوں کے سبب اور وجوہ موجود ہیں۔ ان وجوہ کو ختم کرنے سے وہ چیزیں بھی ختم ہو سکتی ہیں پہلا اصول یہ کہتا ہے کہ یہ ساری زندگی، اور اس سے ہمارا لگاؤ مصائب کے علاوہ اور کچھ نہیں بیماری، بڑھاپا اور حد یہ ہے کہ پیدائش تک دُکھ ہی کے مظہر ہیں۔ اس دُنیا میں رہ کر خواہشات سے نجات حاصل کئے بغیر مسرت اور حقیقت کی جستجو لایعنی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گوتم بدھ پر یاسیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اس لئے کہ اس نے اس سے نجات کا بھی طریقہ بتایا ہے

دوسرے اصُول کے مطابق ان مصائب اور دُکھوں کی وجہ لاعلمی اور جہالت ہے۔ حقیقت سے لاعلمی ہی ان مصائب کو دعوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہماری آرزوئیں اور خواہشات ختم ہو جائیں تو پھر ہم کو نہ کسی چیز کی تمنّا ہو گی اور نہ اس کے عدم حصول کا غم

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتا (میرؔ)

ہمارے مقصود کا وجود غیر مستقل، وقتی اور لمحاتی ہے اور اس کی یہ غیر مستقل کیفیت ہی ان مصائب اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ اس لمحاتی کیفیت اور اصولِ وجودِ منحصر Principle of Dependent Origination کا تعلق نہایت گہرا اور قریبی ہے۔ گوتم بدھ کے خیال میں بڑھاپے اور موت کا انحصار پیدائش پر، پیدائش کا انحصار

گذشتہ زندگی پر، گذشتہ زندگی کا انحصار تعلق یا لگاؤ پر، اور تعلق یا لگاؤ کا انحصار مس حس پر اور مس حس کا تعلق دماغ اور جسم پر، دماغ اور جسم کا انحصار شعور پر، شعور کا انحصار رحجان پر، اور رحجان کا انحصار جہالت اور لاعلمی پر ہے۔ اگر اس لاعلمی کو روکا جا سکے یا اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے تو رحجان اور اگر رحجان زیر نگیں ہو جائے تو جسم اور دماغ پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اس طرح بڑھاپے موت، دُنیا کے تمام مصائب اموت و زیست کے مستقل چکر سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے تیسرے اصول کے مطابق ان مصائب سے نجات ممکن ہے اور چوتھا اصول یہ بتاتا ہے کہ ان سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ یحج علم اور بصیرت میں مضمر ہے۔ مہاتما بدھ کے فلسفہ اخلاقیات کو سمجھنے کے لئے ان دونوں اصولوں کی مکمل توضیح ضروری ہے ہندوستان کے تمام فلاسفہ نے ایک مستقل، ہمیشہ قائم رہنے والی اور دائمی 'ذات' 'میں' یا 'ایگو' Ego کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے۔ برخلاف اس کے گوتم بدھ کے فلسفہ نے اس 'ذات' کے وجود کی صاف اور بدیہی الفاظ میں تردید کی ہے۔ دراصل ایک مستقل ذات کا تصوّر ہی ہماری خواہشات کو جنم دیتا ہے۔ اگر 'ذات مستقل' Self کا کوئی وجود ہی نہیں تو پھر 'میں تو' کا جھگڑا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ چارواک کے علاوہ ہندوستان کے تمام فلاسفہ نے کرم کے اصول کو بلا کسی حیل و حجت کے تسلیم کر لیا ہے۔ کرم کے اصول کے مطابق انسان کے افعال اس کی موجودہ اور آنے والی زندگی کی تشکیل اور تعین کرتے ہیں۔ گوتم بدھ نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیلات دوسرے فلاسفہ سے قدرے مختلف اور قابل غور ہیں۔ دوسرے مدارس فکر کے مطابق ہمارے تمام افعال زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے قضایا کا اثر اچھا اور بُرے قضایا کا اثر بُرا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے گوتم بدھ نے قضایا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عفیف اور غیر عفیف۔ عفیف افعال وہ ہیں جو انسان کی زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں ڈالتے۔ زندگی کی تشکیل اور تعین میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا اور یہ افعال سچائی کے اُن چار اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ غیر عفیف افعال وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی تشکیل اور تعین کرتے ہیں۔ عفیف اور غیر عفیف کا یہ فرق نہایت باریک ہے اور بدھ کے فلسفہ اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے غیر عفیف افعال یقینی طور پر بُرے ہی نہیں ہوتے۔ یہ افعال اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ غیر عفیف افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غیر عفیف افعال نیک اور غیر عفیف افعال بد۔ غیر عفیف افعال نیک وہ ہیں جو ہم جذبات یا خواہشات کے زیر اثر، یا ان کے غلام ہو کر نہیں کرتے ان افعال سے موت اور زندگی کے چکر (بھاؤ چکر) سے نجات حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے برخلاف اس کے غیر عفیف افعال بد وہ ہوتے ہیں جو ہم اپنے جذبات اور خواہشات سے مغلوب ہو کر انجام دیتے ہیں۔ یہ افعال اس زندگی سے ہمارا جذباتی لگاؤ زیادہ گہرا اور پختہ کر دیتے ہیں یہ افعال نروان کے حصول کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔

گوتم بدھ نے موت اور زندگی کے چکر اور خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ راست انتظامی Right Discipline انہماک Concentration اور دانائی Wisdom بتایا ہے۔ راست انتظامی کو سنسکرت میں سیلا کہتے ہیں۔ سیلا پر عمل کرنے سے ہماری تمام خواہشات رحجانات اور لگاؤ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ سیلا ایک ابتدائی اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہماک یا سمادھی میں انسان تمام دل پسند اور دل پذیر چیزوں کی طرف سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ خورد و نوش کی اشیا کی طرف اس کی کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہتی اپنی خواہشات کو وہ دوسروں کی خواہشات کے برابر ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان کو دوسروں کی خواہشات پر قربان بھی کر دیتا ہے۔ دوسروں کے بُرے افعال بھی اُسے بدظن نہیں کرتے اور وہ سچائی کے ان چاروں اصولوں کے تحت زندگی گذارتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ افعال جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کسی قسم کے اثرات نہیں چھوڑتے لیکن موت اور زندگی کا چکر اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ قدیم غیر عفیف افعال کے نتائج پُورے نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد ہی نروان حاصل ہو جاتا ہے۔

ڈھائی ہزار سال قبل گوتم بدھ نے انسانیت کو جو پیغام دیا تھا آج بھی اس پر عمل کر کے ہم اس دنیا کو جنّت نظیر بنا سکتے ہیں۔ اپنی خوشی کو دوسرے کی خوشیوں پر قربان کر دینا اور خود غرضی سے اجتناب ایسی صالح اقدار ہیں جن پر بڑی حد تک ہمارے سماجی روابط کا دار و مدار ہے۔ ہندوستان نے ہمیشہ امن، آشتی اور بے غرض خدمت کا پیغام دیا ہے۔ گوتم بدھ کا پیغام ہندوستان کے اس عام رحجان کی نمائندہ مثال ہے۔

موسیقی نمبر کے باب میں

ڈاکٹر سید محمود وزیر امورِ خارجہ حکومت ہند

آپ نے موسیقی پر اس قدر پُر از معلومات اور دیدہ زیب نمبر نکالا ہے کہ آپ کی کاوش و کفیتش اور حسنِ ترتیب کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

میری دانست میں اتنا مکمل اور اتنا خوبصورت موسیقی نمبر اُردو ادب میں اب تک شائع نہیں ہوا تھا جیسا فرکے بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی اور سازندوں کے مضامین تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

راگ اور راگنیوں کے تصویری خاکے عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپ اور معلومات کا ماخذ ہوں گے۔

میری طرف سے اتنے اچھے خاص نمبر کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

نواب سید رضا علی خاں بہادر نواب آف رام پور

'آج کل' کا موسیقی نمبر موصول ہوا۔ اس کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت اچھا نمبر نکالا ہے۔ بلاشبہ یہ موسیقی کے شیدائیوں میں مقبول ہوگا۔ میں شکرگزار ہوں کہ اس نمبر میں آپ نے میرا مضمون بھی شائع کیا۔

مولانا نیاز فتح پوری

آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر نکالنا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیب مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے یہ خصوصی نمبر نکال کر موسیقی کے متعلق اتنی مفید معلومات فراہم کر دی ہیں کہ آج ان کی بنیاد پر اچھا خاصا تحقیقی کام بھی کیا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اُردو ہند

'آج کل' کا موسیقی نمبر ایک کارنامہ ہے۔ اُردو ادب میں فنِ موسیقی کے متعلق عام فہم انداز میں ایسے اچھے مضامین اور ممتاز موسیقاروں کے متعلق ایسی معلومات مشکل سے کہیں اور یکجا ہوئی ہوں گی۔ خسرو کے متعلق مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ اس معیاری اور جامع نمبر پر آپ' تمام اردو داں طبقے کے شکریے کے مستحق ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر اور بھی مسرت ہے کہ 'آج کل' آپ کی ادارت میں اور بھی دلکش ہوتا جاتا ہے۔

شوکت تھانوی

'آج کل' کا موسیقی نمبر ایک رسالے کا خاص نمبر نہیں بلکہ ایک فن پر ایک مستقل سرمایہ ہے۔ اس دور میں جب کہ علوم و فنون پر مستند کتابیں مفقود ہیں' آپ نے آج کل کے اس نمبر کو ہر کتب خانے کے لئے ایک نادر نسخہ دے دیا ہے۔

ممتاز حسین

مجھے یاد نہیں کہ اُردو کے کسی ادبی رسالے نے اب تک کوئی موسیقی نمبر بھی نکالا ہے۔ اس کی اوّلیت کا سہرا بھی آپ کے رسالے کے سر جاتا ہے۔

انڈین پی' ای' ایس (انگریزی)

رسالہ 'آج کل' دلّی نے اب کے سال اپنا سالنامہ یعنی اگست ۱۹۵۶ء کا شمارہ بطور موسیقی نمبر پیش کیا ہے جو ایک نہایت ہی کامیاب اور کارآمد

کوشش ہے۔ اس نمبر میں ہندوستانی موسیقی کے مختلف گھرانوں اور مایہ ناز موسیقاروں کے بارے میں مستند مضامین شامل ہیں۔ بیشتر مضامین خود ماہرین موسیقی کے ہیں اور اس لئے علمیت اور بصیرت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں علاوہ ازیں موسیقی کے متعلق قدیم مصوری کے بہترین نمونے اور موجودہ مشہور فن کاروں میں سے تقریباً سبھی کی تصویریں بھی اس شمارے کی دیدہ زیبی کو دوبالا کرتی ہیں۔ غرض کہ ۹۰ صفحوں میں فن موسیقی سے متعلق اتنا مواد مہیا کر دیا گیا ہے جو عوام و خواص دونوں ہی کے ذوق کی تسکین کے لئے کافی ہے۔

تمکین کاظمی

موسیقی نمبر دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں وہم و گمان تک نہ تھا کہ ایسا نفیس، ایسا عظیم الشان، اتنا ٹھوس اور اس قدر دلچسپ موسیقی نمبر مرتب ہو سکتا ہے۔ آپ نے کمال ہی کر دیا۔ اس مبارک نمبر کی جس قدر داد دوں کم ہے اُردو میں اتنا مواد آج تک مرتب نہیں ہوا تھا۔

جوہر قریشی چیف ایڈیٹر نیا بھوپال

میں موسیقی کے علم اس کے نشیب و فراز اور اس کی تاریخ سے قطعی نابلد تھا لیکن آپ کے موسیقی نمبر کے مطالعہ کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ موسیقی کے بارے میں اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور جاننے لگا ہوں۔ اس سے زیادہ کامیابی آپ کی کاوشوں کی اور بھلا کیا ہو سکتی ہے۔

روزنامہ 'ملاپ' حیدرآباد دکن

'آج کل' سرکاری پرچہ ہے مگر شروع سے ہی اس کے عام پرچے دوسرے عام پرچوں سے اور اس کے خاص نمبر دوسرے پرچوں کے خاص نمبروں سے بہتر پائے گئے ہیں۔ اس کی ادارت قابل ہاتھوں میں رہی ہے۔ ادبی بحث مباحثے عام معلوماتی، تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی مضامین نہایت اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ 'آج کل' اپنے رنگ کا ایک خاص پرچہ ہے جو ادب و علم اور شعر و شاعری کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی بھی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بہت سے خاص نمبر ہماری نظروں سے گزرے ہیں مگر اس وقت جو نمبر زیر تبصرہ ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ایڈیٹر نے اس دشوار وادی میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ موسیقی ایک ایسا فن ہے جسے سمجھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کے لئے ماہر فن ہونا لازمی ہے۔ عام قسم کے گیت گا لینا، آواز کے زیر و بم سے عام آدمیوں سے خراج تحسین حاصل کر لینا اور بات ہے مگر موسیقی کی گہرائیوں میں اُتر کر اس پر ہر لحاظ سے قابل تعریف نمبر مرتب کرنا اور بات ہے۔ قابل ایڈیٹر 'آج کل' کو مضامین کی فراہمی اور مواد کے ڈھونڈنے میں جو دقت پیش آئی ہو گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ممکن ہے فلک موسیقی پر پرواز کرنے والے اس نمبر کو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع نہ پائیں مگر توازن قائم ہے اور ایک عام آدمی بھی اس کے مطالعہ سے نہ صرف فن موسیقی کی تاریخ سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کر سکتا ہے بلکہ فن موسیقی سے بھی کافی سوجھ بوجھ پیدا کر کے فن کاروں میں تو نہیں 'فن دانوں' میں ضرور قدم رکھ سکتا ہے۔

سیاست حیدرآباد دکن

گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلی کیشنز ڈویژن کی جانب سے شائع ہونے والے رسالہ 'آج کل' نے اپنا خصوصی موسیقی نمبر نکالا ہے جو محض ایک رسالے کا خصوصی نمبر نہیں بلکہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ موسیقی نمبر بلا شبہ اردو ادب میں موسیقی سے متعلق ادب کی کمی کو بڑی حد تک دور کرے گا۔ اس شمارے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں موسیقی پر پہلی مرتبہ ایک معیاری چیز شائع ہوئی ہے۔

لکھنے والوں میں جہاں ہندوستان کے مشہور اور ممتاز موسیقار ہیں وہیں اردو کے ادیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نواب صاحب رام پور ہز ہائی نس سید محمد رضا علی خاں نے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔

ایڈیٹر آج کل نے توازن قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مضامین معلومات آفریں ہیں۔ 'فن موسیقی اور اس کے کچھ بڑے فن کار'، 'مجھے اب تک یاد ہے'، 'تان سین'، 'فن موسیقی کے عظیم استاد جنہیں میں نے سنا' اور ایسے ہی دیگر مضامین اُن لوگوں کے لئے جو فن سے ناواقف ہیں دلچسپی کا موجب ہیں۔

مدیران 'آج کل' قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے موسیقی پر ایک معیاری خاص نمبر نکالا ہے۔

KEEPING BALANCE DURING PREGNANCY

• حاملہ کو یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ اُسے دو زندگیوں کی پرورش کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی خوراک غذائیت سے پُر ہونی چاہئے۔

آجکل ناکافی غذائیت کی خرابی عام ہے سنکارا اس خرابی کو دُور کرتا ہے اور دورانِ حمل میں خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ جسم کو توانا اور صحت مند رکھتا ہے۔

"سنکارا" ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سنکارا

تمام خاندان کیلئے ایک ٹانک

قیمت بڑی بوتل ۷ روپے۔ ادھا ۳ روپے ۱۲ ر

•

ہمدرد دواخانہ (وقف)، دہلی۔

Hamdard
DAWAKHANA (TRUST) DELHI

کام کرنے کی قوّت
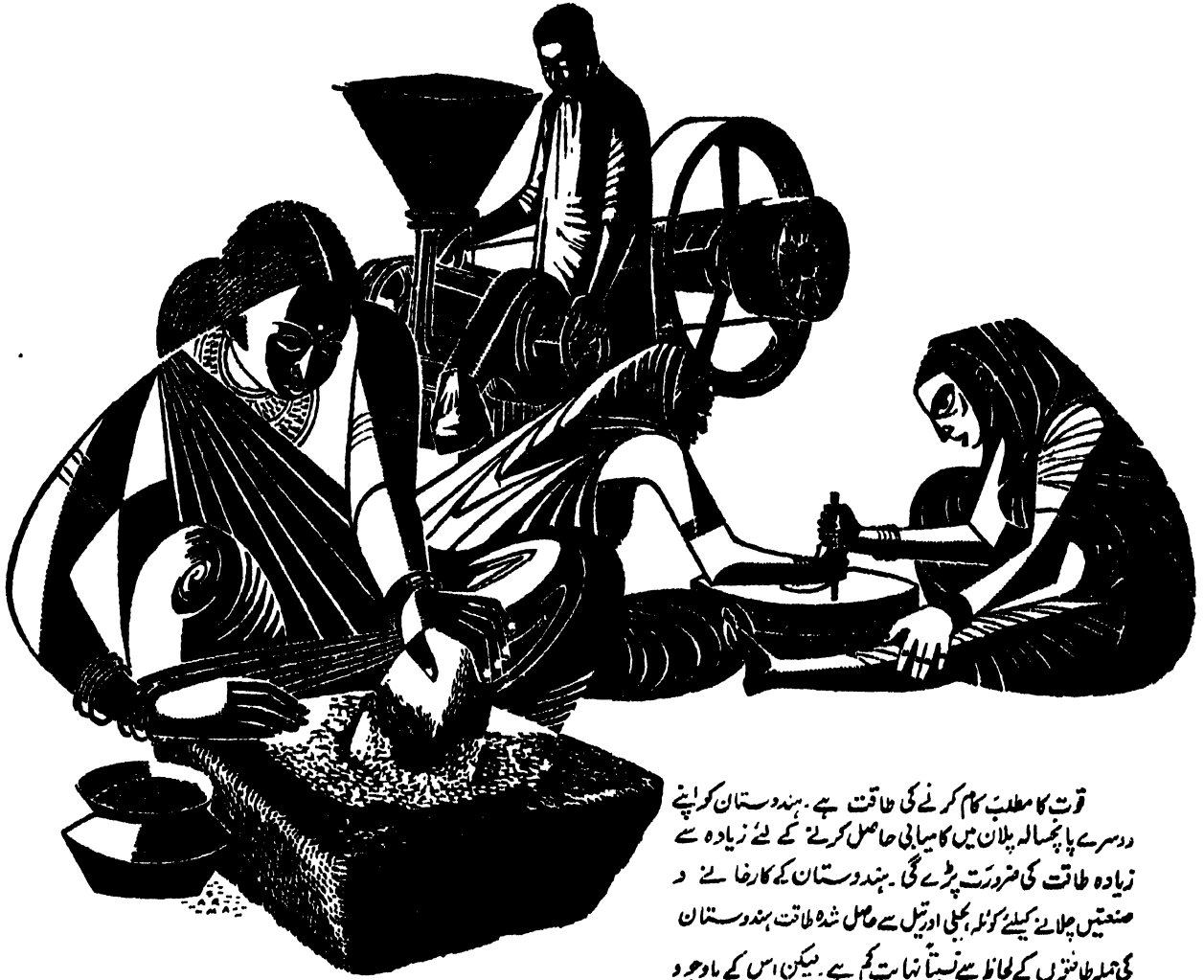
قوت کا مطلب کام کرنے کی طاقت ہے۔ ہندوستان کو اپنے دوسرے پانچسالہ پلان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ طاقت کی ضرورت پڑے گی۔ ہندوستان کے کارخانے و صنعتیں چلانے کیلئے کوئلہ، بجلی اور تیل سے حاصل شدہ طاقت ہندوستان کی جملہ طاقتوں کے لحاظ سے نسبتاً نہایت کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ طاقت ہندوستان کی زندگی کے روایتی طریقوں اور ملک کے دُور دراز دیہاتوں کی زندگی پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔

یہ کارخانے و صنعتیں چلانے والی طاقت کی امداد میں تیل کا حصہ ۱۹۴۸ء کی بہ نسبت ۱۰۰ فیصدی زیادہ ہوگیا ہے۔ تیل حسبِ ضرورت کام آنے والا طاقت کا ایک ذریعہ ہے۔ دراصل تیل طاقت کی ایک مجتمع ٹھوس شکل ہے۔ جو آسانی سے ہر جگہ منتقل ہو سکتی ہے تیل سے پیدا ہونے والی ان طاقتوں کو ملک کے ہر حصے میں باقاعدگی کے ساتھ سستے داموں کافی مقدار میں پہنچانے کے لئے تقسیم کرنے والے عملہ کو قائم کرنا اور اس کو وسیع کرنا ہمارا کام ہے۔

برما شیل... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان بنایا ہے وہ ایک بہت زیادہ صفحات پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم موضوع بیان کر دئے گئے ہیں

قیمت ۴ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارنمایاں میں حصّہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیر تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے ہاں کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے

بزنس مینیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے 'لکھنے' والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd No. D—509

اسٹار کمپنی
بکسیلرس و نیوز ایجنٹ
م ج. مارکٹ حیدرآباد دکن

آجکل

۳۱۳۲/۱ ۵۹
آجکل
رسائل
A۳۶

آجکل

جون سنہ ۱۹۵۶ء

سادہ آٹھ آنے

ہماری
کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دل کش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آرہا ہے۔
اس تابناک مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے
قیمت ۔ ۔/۴/
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویروں اور
خاکوں سے اس کی دل کشی میں
اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے
-/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت -/۴/-
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے۔
-/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

9992

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ —— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں آٹھ آنے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

جون ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب آج کل

بچوں کا آج کل

سرورق:- مالابار کے ساحل پر ماہی گیری
(عمل - بجے - بھٹاچارجی)

سکندر علی وجد

غزل

غمِ زندگی گوارا تری مستیٔ نظر سے

مری رفعتِ تخیّل ہے شکستِ بال و پر سے

یہ نشاطِ تیز گامی ہے کمالِ شادکامی

مجھے منزلوں سے مطلب نہ غبارِ رہگذر سے

وہ مقام ہیکدہ ہیں وہ جہاں جہاں رکے ہیں

ہیں قدم قدم پہ گلشن وہ گزر گئے جدھر سے

یہ نگاہِ شرم آگیں یہ شکارِ شیر و شاہیں

یہی راز پوچھنا ہے ترے حسنِ کارگر سے

کہیں موسمِ بہاراں کہیں زندگی غزلخواں

ترے حسن کی بدولت مرے شعر کے اثر سے

نہ کلامِ نشتر افشاں نہ سلامِ تیغِ عریاں

دلِ وجد ہے پریشاں ترے حرفِ بے خطر سے

مختار الدین احمد

راجا رام موہن رائے کا ایک اُردو رقعہ

(گارساں دتاسی کے نام)

اُردو ادب کے محسن اور مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دُتاسی سے اُردو ادب کا کون طالب علم واقف نہیں۔ ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور "تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی" ہے جو دو بار چھپی اور اب نہایت کم یاب ہے۔ ان کی ایک اور کم یاب تصنیف اُردو زبان کے قواعد سے متعلق ہے جو پیرس سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی زبان بھی فرانسیسی ہے، جس میں اُردو زبان کے قواعد اُردو مثالوں کے ساتھ درج ہیں۔ اس کے دوسرے حصے میں اُردو اور ہندی کے کچھ خطوط اور رقعات فرانسیسی ترجمے اور حواشی کے ساتھ مندرج ہیں۔ یہ حصہ ضمیمے کے طور پر پیرس ہی سے ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اُردو کے ۱۸ خطوط اور رقعات ہیں جن میں سب سے قدیم خط ۱۸۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، جب مرزا غالب کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس مجموعے سے رام موہن رائے کا لکھا ہوا ایک رقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے دتاسی کو انگلستان سے لکھا تھا۔

رام موہن رائے شاہِ دہلی اکبر ثانی کے سفیر اور وکیل بن کر انگلستان آئے تھے۔ یہاں انھوں نے اپنے دورانِ قیام میں بہتوں کو متاثر کیا۔ اس کے ثبوت میں وہ مضامین اور کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ان کے متعلق یہاں لکھی گئیں۔

مشہور فرانسیسی رسالے "ایشیاٹک جرنل" بابت ۱۸۳۳ء جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ میں ان پر ایک پُر معلومات مضمون شائع ہوا۔ اسی سال M. Sandford Arnot نے جو دورانِ قیامِ انگلستان میں رام موہن رائے کے سکرٹری تھے۔ ان کے حالات میں ایک مضمون Athenaeum (اکتوبر ۱۸۳۳ء) میں شائع کیا۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ مضمون نگار کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

Rev. Lant Carpenter نے ان کی بہت اچھی سوانح عمری لندن سے ۱۸۳۳ء میں شائع کی، ایک سال کے بعد ان کی بیٹی مس کارپنٹر نے اس مواد کو استعمال کیا اور کچھ نئی معلومات حاصل کیں اور ایک بہت دلچسپ کتاب Last Days in England of the Raja Ram Mohan Roy کے نام سے ۱۸۳۲ء میں شائع کی۔ یہ کتاب بہت اہم ہے اور ان کے زمانۂ قیامِ انگلستان پر اس سے بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

خود اس اُردو رقعے کے مکتوب الیہ گارساں دتاسی نے رام موہن رائے کا تفصیلی ترجمہ اپنی تاریخ ادبیات جلد دوم صفحات ۵۴۸ - ۵۵۲ (اشاعت دوم) میں لکھا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔

اب رقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

جنابِ فضیلت مآب! زاد مجدہم وشرفہم

رقعۂ مبارک پہنچا و بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ قادر علی الاطلاق آپ کو اس یادآوری کے ساتھ سلامت رکھے، تین مہینے سے بندہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عن قریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا، اور آپ کی توجہ سے جناب شیزی صاحب کی ملاقات حاصل کرے گا۔ آپکے وعدۂ مراعات سے بندۂ کمتر ممنون ہوا و ادائے شکر تہِ دل سے کرتا ہے۔

زیادہ حدِ ادب

خادمکم و ممنونکم

رام موہن

حرر فی التاریخ یکم اگست سنہ ۱۸۳۱ء

جنابِ شفقت فرمائے گرامی قدر فاربس صاحب کے حوالے کیا گیا۔

اب اس رقعے سے متعلق بعض امور عرض کئے جاتے ہیں ۔

۱ ۔ دتاسی نے جو رقعہ رام موہن رائے کو لکھا تھا، اُس کا پتا نہیں، رام موہن رائے نے جواب اُردو میں دیا ہے، اس لئے قریب بہ یقین ہے کہ دتاسی کا گمشدہ رقعہ بھی اُردو ہی میں ہوگا۔ دتاسی اُردو لکھنے میں بند نہ تھا۔ اس کا لکھا ہوا ایک اُردو خط میری نظر سے گذرا ہے جو اُس نے سرسید کو لکھا تھا۔

۲ ۔ "پہنچا" کا املا رام موہن رائے کے یہاں "پونچھا" ہے۔

۳ ۔ جناب شیزی M. Chezy کا پتا نہ چل سکا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ظاہرا کوئی فرانسیسی اہلِ علم معلوم ہوتے ہیں جو اس زمانے میں پیرس میں مقیم تھے۔

۴ ۔ M. Forbes ایک انگریز مستشرق تھے، جنھوں نے "قصۂ حاتم طائی" کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ انگلستان سے پیرس جا رہے ہوں گے اس لئے رام موہن رائے نے یہ خط ان کے حوالے کیا۔

۵ ۔ خط کے لفافے پر یہ پتا درج ہے۔

جنابِ فضیلت مآب جامع علوم عربی و ہندی مولوی گارسین دتاسی زاد مجدہم۔

دارالسلطنتہ پاریس ۔ فرانس

(پیرس ۱۵۔ فروری ۱۹۵۵ء)

"عکسی زیارت" سے متعلق

سید مرتضٰی حسین صاحب بلگرامی کا ایک مضمون بعنوان "عکسی زیارت" رسالہ ہذا کی اشاعت فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے جس کے آغاز میں سید صاحب موصوف نے محض سید بندہ رضا صاحب رضوی بلگرامی کی تحریر کے حوالے سے سید کمال الدین صاحب رضوی کو فاتح بلگرام قرار دیا ہے لیکن دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں فرمایا جو اہالی بلگرام معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

سید بندہ رضا صاحب رضوی بلگرامی ہمیشہ بلگرام سے دور ملازمت پر رہے، آپ نے نہ کوئی تاریخ بلگرام لکھی اور نہ اس موضوع پر کوئی مطبوعہ تحریر چھوڑی۔ مرحوم کی کسی یادداشت میں اگر اس قسم کی کوئی تحریر موجود بھی ہو تو وہ ایسے اہم تاریخی سوال کا ثبوت کیوں کر ہو سکتی ہے۔

اس موقعے پر میں جناب سید مرتضٰی حسین صاحب رضوی بلگرامی کے پردادا مرحوم جناب میر نوازش علی صاحب بلگرامی رضوی مرحوم کی تالیف کتاب "تذکرۃ الکرام تاریخ اسلام بلگرام" سے صرف ایک پیرا اقتباس کر کے ذیل میں پیش کرتا ہوں، جو انکشافِ تحقیق کے لئے کافی ہے۔

"القصہ جدِ اعلائی مجموع قضاتِ عثمانیہ قاضی محمد یوسف گازرونی ہمرکاب لشکر ظفر پیکر سلطان محمود غازی غزنوی در قنوج آمدہ۔ سلطان قنوج را مفتوح ساختہ بعد نظم و نسق آں محال فوجے بسر کردگی و سرداری او بایں روئے گنگ جہت تسخیر قصبۂ سری نگر کہ الحال بلگرام مشہور است فرستادہ۔ راجہ سری فرار شدہ و پرگنہ بلگرام یعنی پرگنۂ سری نگر بے مقابلہ و مقاتلہ مفتوح شدہ نزہت شعار اسلام گردیدہ و بجائے نالہ ناقوس بانگ اللہ اکبر بلند شدہ۔ سلطان محمود غازی غزنوی قاضی محمد یوسف عثمانی گازرونی را کہ ہمرکاب لشکر ظفر پیکر بود بحلیۂ علم و فضل آراستہ و پیراستہ منصب جلیل القدر قضائی سری نگر عطا فرمودہ و فرمانِ قضا بنام نامیش مرقوم شدہ و بشوکت تمام بر مسند قضائی سری نگر اجلاس دادہ حاکم سری نگر خواندہ از آں دور و عہد خدمت قضائے بلگرام ظہراً بعد ظہر و نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ در فرزندان قاضی محمد یوسف عثمانی است کسے دیگر از شرفائے شہر یا غیر محال بلگرام نہ شد۔"

ناظرینِ کرام میں کسی صاحب کو مذکورہ اقتباس کے بعد قاضی محمد یوسف گازرونی کے فاتح بلگرام ہونے میں کوئی شبہ باقی رہ جائے تو وہ ایک ہزار سالہ پُرانی اصلی دستاویزات ملاحظہ فرما سکتے ہیں جو میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔

شریف الحسن بلگرامی ۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ

شوکت سبزواری

کیفی کی وصیّت

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اردو دنیا میں اپنے علمی، ادبی اور لسانی کارناموں کی وجہ سے ایسی بے مثال شہرت کے مالک ہیں کہ ملک کا بچّہ بچّہ اُنھیں جانتا ہے اور دل سے ان کی قدر کرتا ہے۔ وہ یادگار زمانہ لوگوں میں سے تھے، جو اپنی زندگیاں علمی کارناموں کے لئے وقف کر دینے کے بعد اپنے ہر اُس سانس کو سمجھتے ہیں کہ رائگاں گیا جو علم و ادب کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ پنڈت کیفی صحیح معنی میں علم و ادب کی دیوی کے پجاری تھے۔ انھوں نے وفادار پرستار کی طرح اپنی ساری عمر اُردو کی پُوجا کرتے اور اس کی مالا جپتے بسر کر دی۔

کیفی کو اردو زبان سے بے پناہ محبّت تھی۔ ان کی یہ محبّت بے خودی اور والہانہ شیفتگی کی حدوں سے گزر کر از خود رفتگی اور دیوانگی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اُردو کے لئے جیئے اور پڑھے دھڑتے سے جیئے۔ ابھی حال میں ان کی اٹھاسی ویں سال گرہ منائی گئی تھی۔ انھوں نے ہندوستان میں اُردو کی شمع روشن رکھی۔ اُردو کی لگن نے انھیں ضعف و پیری کے عالم میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ ہندوستان کی انجمن ترقیِ اردو کے جوان سال کارکنوں سے بڑھ کر سرگرم کارکن تھے۔ اُردو کی خدمت میں وہ "پاؤں پہیہ اور سر گاڑی" بنے رہے۔ کبھی دہلی سے علی گڈھ جاتے اور کبھی علی گڈھ سے دہلی۔

مئی ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ اور آخری بار میں دہلی میں ان سے ملا، وہ علی پور روڈ پر لالہ سریرام مصنّف خم خانۂ جاوید کی شاندار کوٹھی کے ایک حصّے میں مقیم تھے۔ یہ ملاقات پنڈت جی سے اس وصیّت کے سلسلے میں ہوئی تھی جس کا ذکر میں اس فرصت میں کرنا چاہتا ہوں۔ پنڈت جی اس وقت اپنی عمر کے چھیاسی ویں سال میں تھے۔ ان کے چہرے پر جھرّیوں کی یہ کیفیت تھی جیسے ایک چُوسا ہوا آم جس کی گٹھلی نکال کر پہلے ہی پھینک دی گئی ہو۔ بھویں جھک کر اور لٹک کر پپوٹوں پر آ گئی تھیں اور پپوٹے آنکھوں کو پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ انسان کیا تھے بس ٹپنا اور حریرہ تھے۔ لیکن اس پر بھی ان کا شوقِ مطالعہ دیکھئے کہ وہ ایک کرسی پر سنبھلے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر کتابوں، رسالوں، بڑے بڑے دفتروں اور کاغذوں کا ایک انبار تھا اور وہ پاکستان کے ماہ نامے "ماہِ نو" سے کوئی مضمون ایک رجسٹر میں اُتار رہے تھے۔ اللہ اللہ! یہ عمر اور تحصیلِ علم کا یہ شوق، اور اس کے لیے اتنی مشقّت اور دل سوزی! یہ دیکھو لئے کہ مہینہ مئی کا تھا، جب دہلی میں بَلا کی گرمی پڑتی ہے، اور سخت لُو چلتی ہے۔ میں نے رسالہ اُٹھا کر دیکھنا چاہا کہ وہ کون سا مضمون ہے جسے وہ اپنے رجسٹر میں محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر پرچہ میرے ہاتھ میں سے لے لیا "بھئی! یہ تو آپ ہی کا پرچہ ہے۔ دیکھتے رہیئے گا!"

کیفی صاحب کے پاس میں نے دو بالکل نئی چیزیں دیکھیں۔ کئی بڑے بڑے رجسٹر تھے جن میں اُنھوں نے مختلف عنوانوں کے ماتحت اچھے اور پسندیدہ مضامین اپنے ہاتھ سے نقل کر رکھے تھے۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو اسی قسم کا ایک رجسٹر ان کے سامنے تھا جس میں وہ ایک مضمون نقل کر رہے تھے۔ دوسرے انھوں نے اتنے ہی سائز کے ایک رجسٹر میں اپنے احباب، رفقاء اور اعزّہ کے خطوط ایک صفحے پر نقل کر لئے تھے۔ دوسرے صفحے پر ان کے بالمقابل اصل خطوط چسپاں تھے۔ اس رجسٹر کے اوپر جلی حرفوں میں "خطوطِ مشاہیر" لکھا ہوا تھا۔ خطوط کا یہ مجموعہ انھیں بہت عزیز تھا۔ اس میں اُن کے بے شمار دوستوں، رفیقوں اور شاگردوں کی یادیں اور باتیں دفن تھیں، اس میں انھوں نے ان کی آوازوں کو بند کر رکھا تھا جس طرح ریکارڈ میں نغمہ کار کی صدا بندی کی جاتی ہے۔ ان کے یہ رفیق قریب قریب سبھی اردو کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ اپنے اس مجموعے میں سے کیفی صاحب نے

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ایک مکتوب اور اس کا جواب اس طرح پڑھ کر مجھے سنایا جیسے کوئی رکارڈ بجا کر نغمہ سناتا ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ پنڈت کیفی اُردو کے لئے جیئے اور شاید اسی لئے انھوں نے تنی طویل عمر پائی۔ اب اگر میں کہوں کہ وہ مرنے کے بعد بھی اُردو کے لئے زندہ ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھئے گا۔ اُردو کی خدمت کے لئے اتنی عمر پا کر بھی انھیں یہ خیال پریشان رکھتا تھا ؎

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بَلا میرے بعد

ان کے بعد اُردو کا کیا حشر ہوگا؟ ان کی اردو کتابیں جو چھپ گئی ہیں اور زندہ ہیں دوبارہ کیسے چھپیں گی اور کس صورت میں چھپیں گی اور انھیں کس طرح زندہ رکھا جائے گا؟ اور جو نہیں چھپی ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اردو کی موجودہ کساد بازاری کو دیکھ کر وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا یہ قیمتی سرمایہ جسے انھوں نے ساری عمر خونِ جگر کھا کر پیدا کیا ہے، دستبردِ زمانہ کی نذر نہ ہو جائے۔ وہ ایک حوصلہ مند شخص کی تلاش میں تھے جو ان کی ادبی کاوشوں کو زمانے کی چیرہ دستیوں سے بچائے۔ اُن کے پُر بہار گلشن کی آبیاری کرے جسے انھوں نے اپنے خونِ دل سے سینچا تھا۔ لیکن انھیں کوئی ایسا شخص نہ ملا۔ اوّل اوّل ان کی نظرِ انتخاب مالک رام صاحب پر پڑی لیکن وہ بقول ان کے "حد سے سوا غالب زدہ نکلے"۔ آخر اُن کی نظریں میری طرف اٹھیں، انھیں کیا پتہ تھا کہ مالک رام کی طرح میں بھی اسی "بت ہزار شیوہ" کی اداؤں کا مارا ہوا ہوں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو شاید وہ یہ غلط انتخاب نہ کرتے۔

بہرحال جنوری ۱۹۵۳ء میں اُنھوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ میری شاعری اور نثر نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں کیا اور میری رائے کیا لیکن مجھے امر کیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے کسی قدر تفصیل سے اپنی رائے ان کی نظم و نثر کے متعلق لکھ کر بھیج دی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں بے چین ہوں۔ ذرا لکھئے کہ آپ جیسے کہنہ مشق ادیب اور شاعرِ شیوا بیان کو مجھ جیسے بے سواد کی اپنی شاعری اور نثاری کے بارے میں رائے لینے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط مجھے لکھا اس کی میری نگاہ میں بڑی اہمیت ہے۔ اُردو ادب کے شیدائیوں اور کیفی صاحب کے مدّاحوں کی آگاہی کے لئے میں اسے شائع کر رہا ہوں۔ اس سے کیفی صاحب کے قدردانوں کو علم ہوگا کہ مرحوم اپنی اردو تصانیف کے بقا و احیا کے لئے کیا چاہتے تھے۔ میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی آخری خواہش کو ان کے قدردانوں تک، جو ہندوستان میں بھی ہیں اور پاکستان میں بھی، انہی کے لفظوں میں پہنچائے دیتا ہوں۔ میں ان کی وصیّت پوری نہ کر سکا۔ ان کے وصی بننے کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ یہ میری بدقسمتی ہے میں اس کا ماتم کرنے کی بجائے ان کی آخری وصیت دوسروں تک پہنچا دوں۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔ ان کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

۱۰۔ علی پور روڈ۔ سول لائنز۔ دہلی
مورخہ ۱۱۔ فروری ۱۹۵۳ء

مشفق میرے!

آپ کا چھبیس جنوری کا مودّت نامہ مل گیا تھا — مگر میں اس تاریخ کے بہت پہلے سے بیمار رہا معمولی شکایت کے دورے کے علاوہ ایک نئی شکایت یہ ہو گئی تھی کہ کئی دن تک ناک اور منہ سے خون بہتا رہا۔ غالب کو تو یک قطرۂ خون کے باندازِ چکیدن سرنگوں ہونے کی شکایت تھی۔ یہاں ڈاکٹر کو یہ حیرت ہوئی کہ خون نہ پھیپھڑے سے آتا ہے نہ کسی شریان میں درز پڑی ہے۔ خیر جو کچھ تھا رفع ہو گیا اور میں ایک ہفتے کے لئے تبدیل آب و ہوا کے واسطے شہر کے قریب ہی ایک عزیز کے یہاں چلا گیا۔ اب واپس آیا ہوں۔ طبیعت معمول پر ہے۔

بھائی اس استفسار کی وجہ ایک خود غرضی تھی، جس کی تشریح یہ ہے۔ میرا چھیاسی واں سال گزر رہا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے وجع مفاصل، دل اور سانس کی بیماریوں کا شکار رہوں۔ مجھے اُمیّد نہیں کہ ایک سال سے زیادہ مرگِ مسلسل کی سزا بھگت سکوں۔ اس لئے میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے جاننے والے ہنسیں گے کہ کیفیؔ کا وصیت کرنا چہ معنی دارد۔ وہ اس دنیا میں نہ ایک اینٹ کا مالک ہے، نہ کوئی بینک اس کی گراں مایہ باقی فاضل کا امانت دار ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے اپنی تصانیف اور مسودات کی فکر ہے، اور اسی سلسلے میں ایک وصیّت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اب سے پہلے کوئی آدمی ایسا نظر نہ آیا جس کو

میں اپنا ادبی وصی قرار دیتا۔ پہلے میری نظر مسٹر مالک رام پر گئی، مگر وہ قدسے سوا غالبؔ زدہ نکلے۔۔۔۔ ملازمت کی وجہ سے وہ رہتے بھی ہندوستان سے باہر ہیں۔ ماحول بھی ان کا اس کام سے موافق نہیں۔ آپ بھی ہندوستان میں نہیں پاکستان میں رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اُردو ادب اور زبان کا تعلق ہے ہندوستان اور پاکستان کو میں دو ملک نہیں سمجھتا۔ آپ کا زیرِ جواب خط دیکھ کر مجھے جرأت ہوئی کہ آپ سے دریافت کروں کہ کیا آپ اس ذمہ داری کو جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، لینے کو تیار ہیں۔ اسی غرض سے وہ استفسارات تھے جن کے جواب آپ نے مہربانی سے خاصی تفصیل میں دیئے ہیں۔ آپ کا جواب آنے پر میں وصیّت کا انتظام کروں گا۔

اگر آپ نے یہ ذمّہ داری منظور کرلی تو میں ایک مفصّل نوٹ آپ کو بھیج دوں گا۔

چند موٹی موٹی باتیں یہ ہیں کہ "واردات" میں سے کئی چیزیں نکال کر الگ کتابی شکل میں شائع کرنی چاہئیں۔ مثلاً "مثنوی آئینۂ ہند"۔ "ترکیب بند" "شوکتِ ہند" وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک مجموعہ متفرق مثنویوں کا اور ایک قومی نظموں کا "واردات" میں سے نکال کر علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے۔ دو مثنویاں پہلے سے الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک "پریم ترنگنی" اور دوسری "جگ بیتی"۔ پھر مقالے اور خطبے ہیں، جن کی نوعیت زیادہ تر اُردو ادب اور زبان سے متعلق ہے۔ کچھ غیر فرقہ وارانہ سیاسی اور سوشل معاملات پر بھی محتوی ہیں۔ افسانچے یعنی شارٹ اسٹوری بھی بہت سی ہیں۔ ایک مجموعہ ان کا چھپ بھی چکا ہے۔ پھر ناول ہیں۔ ڈرامے اور ریڈیو کی تقریریں ہیں۔ غرض مختصر یہ کہ سب کچھ خرافات میرے قلم سے نکلی ہے۔ دو تین کتابوں کے سوا میری تمام مطبوعہ تصانیف کی دو دو چار چار کاپیاں میرے پاس موجود ہیں۔

میرا ناول "نہتّا رانا" کیا آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

میرا ارادہ ہے کہ وصیّت میں کچھ پیسے اس مجوزہ ادبی خدمت کی انجام دہی کے لیئے نامزد کر جاؤں، اگر آپ کا جواب اثبات میں آیا تو جس سبیل سے آپ فرمائیں گے اپنی تصانیف مطبوعہ کی ایک ایک کاپی آپ کو بھیج دی جائے گی۔ واردات۔ کیفیہ اور منشورات تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔

خط بہت لمبا ہوگیا۔ معاف کیجیۓ۔

عندلیب صاحب کو سلام کے ساتھ کہیئے کہ ایک ہفتے میں "خادر" کے لیئے کچھ بھیجوں گا۔"

اخلاص کیش کیفیؔ

اس داستان کا آخری حصّہ بھی سن لیجیۓ۔ میں ایک ضرورت سے میرٹھ گیا تو کیفی صاحب سے ملنے دہلی پہنچا۔ اس کا ذکر میں سطورِ بالا میں کر چکا ہوں۔ کیفی صاحب نے، جیسا کہ اپنے خط میں لکھا ہے، اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ ساتھ ہی مطبوعہ مضامین کے تراشے بھی دیئے، اور فرمایا، انھیں ترتیب دے کر ایک مقدمہ لکھ دو۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) انھیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ میں یہ بیش بہا خزانہ لے کر فرحاں و شاداں ڈھاکے پہنچا، اور یہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ میں منتشر مضامین کو ترتیب دے کر مقدمہ لکھتا۔ کیفی صاحب کو عجلت تھی۔ اس لیئے انھوں نے مضامین واپس طلب کر لیئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ جب مجھے موقع ملے گا مقدمہ لکھ کر میں ان کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ ستم ہائے روزگار نے ادھر مجھے سر اُٹھانے کی فرصت نہ بخشی، اُدھر داعیِ اجل نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ تقاضا کریں۔ میرے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ ادھورا اور نامکمل رہا۔

ان کو دیکھو وہ نظر آیا کیۓ ہر ایک میں!
مجھ کو دیکھو دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا

(مصحفی اورنگ آبادی)

کون وہ آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے
شب کو اک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں

(〃)

غمِ جہاں کہ بلا ہوگیا ہے سب کے لیۓ
مرے سپرد کرو اُس کو ایک شب کے لیۓ

(سراج الدین ظفرؔ)

(ماہِ نو)

عرش ملسیانی

ٹیسو کا بن

مارچ ۱۹۵۶ء کے آخری دنوں میں دہلی سے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ریل کا طویل سفر جانکاہ بن جاتا اگر راستے میں ٹیسو۔ دلی بہاریں نظر نہ آتیں۔ میلوں تک جنگلوں اور پہاڑیوں کا منظر بہار افروز تھا۔ ٹیسو کے کھلے ہوئے سُرخ سُرخ پھولوں اور پھر ان کی فراوانی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔ ع "گلشن کو کس نے آگ لگا دی بہار میں"۔ ریل ہی میں یہ نظم ہو گئی۔ ۲۳ مارچ کو حیدر آباد ریڈیو سے نشر ہوئی۔ انھیں کے شکریے سے آج کل میں شائع کی جا رہی ہے۔ (عرش)

شاخوں پہ دمکتے ہوئے ٹیسو کی بہاریں
یا سُرخ لبادوں میں ہیں حوروں کی قطاریں

بہ نُور میں ڈوبے ہوئے اشجار کے جِھل مِل
اِک جشنِ بہاراں ہے کہ جنگل میں ہے منگل

پہنے ہوئے اشجار ہیں پوشاک زری کی
یا فوج اُتر آئی ہے اک لال پری کی

لپکا ہوا کوندا ہے ہر اک شاخ کا جوبن
بجلی نے درختوں پہ بنائے ہیں نشیمن

انوار کے یہ سُرخ عساکر سرِ کہسار
جنّت سے تو آئے نہیں کرتے ہوئے یلغار

اِک پیرہنِ سُرخ زِ سر تا بقدم ہے
فطرت کی سُہاگن ہے کہ اک حورِ اِرَم ہے

جنگل کو بہاروں نے ہے اک آگ لگائی
اے حُسن کے سیلاب دُہائی ہے دُہائی

اللہ رے یہ سُرخی افسانۂ فطرت
لبریزِ مئے سُرخ ہے پیمانۂ فطرت

جھونکے پہ ہوا کے ہے گماں ساغرِ مُل کا
دیتا ہے ہر اک برگ جواب آتشِ گُل کا

ٹیسو کا یہ بن جلوہ گہِ نورِ جہاں[1] ہے
راتوں کو یہاں دن کے اُجالے کا سماں ہے

---

[1] جناب مرحوم کا یہ شعر پیشِ نظر تھا ؎ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہنے کو یہ آرام گہِ نورِ جہاں ہے

کچھ دور سرِ کوہ وہ ٹھہرا ہوا لاوا
یا اُشترِ خاکی پہ ہے اک سُرخ کجاوہ

میدان میں پہنے ہوئے یا کیسری بانا
جُوہر کے لئے نکلے ہیں چتّوڑ کے رانا

یا ڈھونڈ کے شہروں سے بہت دُور بسیرا
بھکشو ہیں سرِ کوہ جمائے ہوئے ڈیرا

جس شاخ کو دیکھو وہی پھولوں کی چھڑی ہے
انوار کی اک دھار ہے جو پھوٹ پڑی ہے

لعلیں لبِ فطرت پہ ہنسی آئی ہوئی ہے
بُوٹوں نے سنگاروں کی قسم کھائی ہوئی ہے

سیندُور چھڑکتی ہوئی اٹھتی ہے جوانی
یا ہے کسی مہجور کی خوں نابہ فشانی

لالی یہ شفق کی ہے کہ خونِ شہدا کی
یا دستِ بہاراں پہ ہے سُرخی یہ حنا کی

فطرت کا رُخِ سادہ مسرّت سے ہے لال آج
اُڑتے ہیں فضاؤں میں عبیر اور گلال آج

قدرت کی یہ ہولی یہ سماں یاد رہے گا
عشرت کدۂ حُسنِ جواں یاد رہے گا

شاخوں کے فضا میں ہیں پھریرے بھی نشاں بھی
پریاں ہیں سرِ دوش لئے تخت رواں بھی

پھولوں کے دہکتے ہوئے رخسار تو دیکھو
جلووں کی ذرا گرمئ بازار تو دیکھو

طالب کے لئے حاصلِ یک مُشت یہی ہے
آتشکدۂ حضرتِ زرتشت یہی ہے

گو وادئ ایمن سے یہ بن دُور بہت ہیں
مُوسےٰ کو بلاؤ کہ یہاں طُور بہت ہیں

ہے شہرِ بدخشاں تو بہت دُور یہاں سے
یہ لعلِ گراں آئے ہیں لے عرش کہاں سے

غلام احمد فرقت

خانۂ انوری

گھنٹی بجی اور میں نے زینے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ "کون"؟
ایک لمبے تڑنگے صاحب بولے۔ "حضت! معاف کیجئے گا۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ اس وقت کیا بجا ہے؟

میں نے جل کر کہا۔ "قبلہ! یہ کوئی انکوائری آفس تو ہے نہیں جو آپ اس وقت اتنی رات گئے وقت دریافت فرما رہے ہیں۔ بولے بات یہ ہے کہ گلی میں سارے کنواڑ بند تھے۔ اتفاق سے آپ ہی کے یہاں زینے پر بجلی جل رہی تھی اور کنواڑ بھی کھلے تھے۔ سوچا کہ جس گھر میں بجلی ہو گی وہاں گھڑی کا ہونا بھی لازمی ہے اسی لئے میں نے آپ کو زحمت دی۔ دوسری بات یہ کہ میں پرسوں باہر سے نمائش دیکھنے آیا تھا اور اب نمائش دیکھ کر مجھے آج ہی شب کی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ میں نے کہا۔ صحیح وقت معلوم کرتا چلوں کہیں گاڑی چھوٹ وٹ نہ جائے"۔

میں نے جل کر کہا۔ ۱۱ بجے ہیں۔ اور یہ کہہ کر غصے میں اندر سے دروازے میں کنڈی لگا دی اور احتیاطاً دوبارہ کنڈی کو کھینچ تان کر دیکھ لیا کہ کہیں کھلی تو نہیں رہ گئی۔ جو رات بھر لوگوں کو وقت بتاتے بتاتے بہتر سیدھے ہو جائیں۔ گھر میں سوائے میرے کوئی نہ تھا کیونکہ بیوی بچے وطن گئے ہوئے تھے۔

زینے سے اپنی میز تک آتے ہوئے میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ نہ جانے دیس بدیس کہاں کہاں کے مُردے نمائش دیکھنے کے بہانے اس قبرستان میں دفن ہونے آئے ہیں۔ خدا غارت کرے اس مصیبت کو جس نے شہر والوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں ..... آئے تھے احمق داس .... اس وقت گیارہ بجے شب کو وقت پوچھنے۔ یہ کہہ کر میں نے شام کی ڈاک دیکھنا شروع کی جو ابھی میز پر اسی طرح بند رکھی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک نیلا لفافہ کھولا جس کا مضمون یہ تھا۔

"کہو! آج کل تو بڑے چکلس آ رہے ہوں گے۔ خوب خوب نمائش لگواتے ہو بدولت مع ایک عدد دوست کے سویرے کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں۔ گھر ہی پر ملئے گا۔ ورنہ تالا والا توڑ کر گھر کا سامان نمائش میں جا کر بیچ لوں گا"

لطیف مخلص

یہ ہمارے ایک بے تکلف دوست لطیف کا خط ہے۔ اس خط کے نیچے ایک کارڈ تھا جس کا مضمون تھا۔

مکرمی تسلیم۔ یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو دلّی میں مکان مل گیا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نمائش جاؤں تو کہاں رکوں۔ بہرحال یہ پریشانی دور ہو گئی۔ انشا اللہ آئندہ ہفتے معہ بچوں کے دو روز کے لئے آپ کو زحمت دوں گا۔

نیاز کیش۔ افضال

تیسرا خط ایک بند چھ پیسے والا لفافہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس کا مضمون یہ تھا۔

"عزیزی سلمہٗ دعاہا۔ میرے دوستوں میں دو صاحبان دلّی نمائش دیکھنے آ رہے ہیں۔ تمہارے یہاں قیام کریں گے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ مکان خالی ہے۔ آپ کسی ہوٹل ووٹل میں رہنے کا انتظام نہ کیجئے گا۔ وہیں ٹھہر جائیے گا۔ آپ کو کھانے پینے کی بھی تکلیف نہ ہو گی۔ یہ لوگ صرف چار روز رہیں گے۔ ان میں ایک صاحب کا نام ابوالحسن اور دوسرے کا محمود علی ہے۔ باقی حالات بدستور ہیں"۔ یہ خط ہمارے حقیقی ماموں کا تھا۔

چوتھا کارڈ پڑھنے میں ہم پس و پیش کر رہے تھے کہ پڑھیں یا نہ پڑھیں کیونکہ پچھلے تین خطوط پڑھنے کے بعد ہم کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کل ہندوستان سے ملک کے اندر اور باہر جتنی ڈاک نکلتی ہے وہ صرف نمائش ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اور ایک ڈاک ہی پر کیا موقوف

ہے۔ ہندوستان سے باہر آنے جانے والے ہر قسم کے جہاز اگر نمائش ہی
کے مسافر اور سامان ڈھونے میں لگے ہوں تو بھی تعجب نہ کرنا چاہیئے۔
یہی حال باربرداری کے جانوروں اور گاڑیوں کا ہوگا اور گدھے جیسا
حقیر جانور تک اس نمائش کی زد سے نہ بچا ہوگا کیونکہ ایک روز قبل
ہم نے ایک موٹر رکشا والے کو کہتے سنا تھا کہ غازی آباد سے جب
کوئی سواری نہ ملی تو دھوبیوں نے اپنے اپنے گدھوں کی زینیں کس کر
نمائش کے مزے لوٹنا شروع کر دیئے۔ مگر اس کے باوجود ہم نے جی کڑا
کرکے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوتھا خط پڑھنا شروع کر دیا۔
اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"بھابھی جان کی والدہ آگرے سے مع بچوں کے ۲۰ تاریخ ۸ ½ بجے
شب کی گاڑی سے دلی پہنچ رہی ہیں۔ اسٹیشن پر ان کو ریسیو کر لینا ورنہ
ان کو مکان کے ملنے میں زحمت ہوگی۔" تمہارا

بھائی صاحب

ہم نے اس خط کو پڑھ کر رکھا ہی تھا کہ تابڑ توڑ دو مرتبہ زینے
کی کال بیل بجی۔ اس مرتبہ بجائے زینے تک جانے اور کنواڑ کھولنے کے ہم
نے اوپری برآمدے سے جھانک کر دیکھا تو پانچ صاحبان سوٹڈ بوٹڈ کاندھوں پر
چیسٹر ڈالے ہمارے دروازے کے مقابل بیچ سڑک پر کھڑے تھے ہم نے
اوپری کمرے کا ایک کنواڑ جو کھلا تھا آہستہ سے بند کر دیا۔ اتنے میں پھر
گھنٹی بجی۔ اس پر ہم نے آواز بدل کر اور کرخت لہجے میں ڈپٹ کر پوچھا۔
"کون گھنٹی بجا رہا ہے؟ بند کر بدمعاش" ہماری اس آواز پر چند سیکنڈ
کے بعد اس طرح کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک آواز۔ اماں چلو بھی۔ یہ مکان نہیں ہے اس میں سرحدی پٹھان
قسم کی کوئی چیز رہتی ہے تم نے آواز سے اندازہ نہیں کیا۔ ایسی
آواز بھلا کسی مہذب انسان کی ہو سکتی ہے۔

دوسری آواز۔ واقعی کوئی نہایت بگڑے دل قسم کا خان معلوم ہوتا ہے

تیسری آواز۔ مگر جو ہمیں ڈپٹ کر آواز آئی تھی "فرنڈس" کہہ کر پوچھ
تو لیا ہوتا کہ وہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔

چوتھی آواز۔ اماں! جو صاحب بولے تھے وہ دم سے تو بات کر رہے
تھے۔ اگر اس کے بعد ایک گھنٹی اور بجاتے تو غالباً ہم لوگوں
میں سے کسی صاحب کی خیریت نہ ہوتی مارتے مارتے ہم سب کو نمائش میں
رکھنے کے قابل بنا دیتا۔

ان پانچوں میں سے ایک کچھ میرا اُدھورا نام لے کر کہہ رہا تھا کہ
بھائی ہم لوگ تو صورت آشنا بھی نہیں ہیں صرف ایک خط کے سہارے
آئے ہیں وہ بھی ایک زٹیئے کا ہے جس کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔
عجب نہیں جو صرف صورت آشنا ہی رہا ہو اور محض ہم لوگوں پر رعب جمانے
کے لئے لکھ دیا ہو کیونکہ خط کا مضمون "مکرمی تسلیم" سے شروع ہوتا تھا
اسی سے تم ان کی بے تکلفی کا اندازہ کر لو۔

دوسری آواز۔ بس بہتر ہے کہ یہاں سے بھاگ چلو ورنہ اوپر سے
اینٹیں آنے ہی والی ہیں۔ آواز سے آدمی بے حد جھلایا ہوا اور
بگڑے دل کا معلوم ہوتا تھا۔

تیسری آواز۔ ابے ایک بار محض تپانے ہی کے لئے گھنٹی بجا دے۔ مگر
پہلے سب لوگ چھجے کے نیچے ہو جاؤ تاکہ اگر پتھر وتھر آئیں تو سب
لوگ بچے رہیں۔ اس کے بعد جب پھر گھنٹی بجی تو ہم نے مکان کے
چھجے سے دو تین اینٹیں اٹھا کر وسط سڑک پر پوری قوت سے جو
پھینکیں تو قہقہوں کی آواز کے ساتھ آواز آئی۔ لیجئے اب جام
شہادت نوش فرمائیے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ کیوں مرنے کا بندوبست
کر رہے ہو۔ مغل ڈھیلوں سے وہ کام لیتے ہیں جو انگریز توپوں
سے لیتا تھا۔ چنانچہ سرحد پر ہمیشہ انگریزوں کو مغلوں نے ڈھیلے
مار کر بھگایا اور کبھی اپنے علاقے میں انھیں گھسنے نہ دیا۔

چوتھی آواز۔ قبلہ۔ بیربل کو جب اکبر نے سرحد فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا
تو ان کی ہلاکت بھی ایک مغلئے کے ڈھیلے ہی سے واقع ہوئی تھی

پہلی آواز۔ مگر استاد! اب تو چھجے سے باہر ایک قدم نکلنا خطرے
سے خالی نہیں ہے۔

دوسری آواز۔ اور وہ منحوس خط کہاں ہے جو لے کر چلے تھے۔

تیسری آواز۔ وہ تو بکس میں بھول آئے۔

اس کے بعد ایک آواز یہ کہتی سنائی دی۔ چلو رات کی رات
اسٹیشن پر ان ہی چیسٹروں میں دبک رہیں۔ نمائش میں بالکل مزہ نہیں
آیا کل ہی سویرے آگرے چل دو۔

اس کے بعد وہ چھجے کے نیچے سے یا علی کہتے اور نعرہ مار کر چلاتے ہوئے گزرے ۔ بھائیو ۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے جاؤ ڈھیلا ویلا تو نہیں آ رہا ہے مگر جب تک ان کے جوتوں کی چاپیں ہم کو سُنائی دیتی رہیں ہم ایسا محسوس کرتے رہے کہ وہ پانچوں ہمارے سینے پر جوتے پہنے چل رہے ہیں ۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ہم نے کمرے کی لائٹ آن کی اور اپنے اوپر آیۃ الکرسی دم کی ۔ مگر بیٹھتے ہی پھر گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں پانچوں پھر رستہ بھول کر ادھر سے نہ گزریں اور گھنٹی بجانا شروع کر دیں ۔ لہٰذا ہم نے اٹھ کر فوراً ہی لائٹ گل کر دی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے اور لحاف کو پوری طرح اپنی پیٹھ اور ٹانگوں کے نیچے دبا لیا تاکہ اگر کہیں کمند لگا کر کسی ترکیب سے یہ لوگ اوپر چڑھ آئیں اور لحاف کے اندر زبردستی گھسنے کی کوشش کریں تو ہم محفوظ رہیں کیونکہ ہم ان کو بغیر بستر کے دیکھ چکے تھے ۔ اس کے بعد ہم سوچتے رہے کہ اگر ایسے لوگوں کا سلسلۂ آمد و رفت جاری رہا جن کی صورت تک سے ہم واقف نہیں اور جن کو ہمارے بعض ستم ظریف دوست تفننِ طبع کی خاطر ہماری جان پر اکناف عالم سے لڑھکا رہے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے ۔ کوئی ڈیڑھ بجے شب تک ہم کو نیند نہیں آئی اور ہم نمائش کو دانت پیس پیس کر گالیاں دیتے دیتے سو گئے ۔

رات ہم نے ایک نہایت ہی بھیانک خواب دیکھا ۔ ہم نے دیکھا کہ جیسے نمائش میں جان پڑ گئی ہے اور ساری نمائش اسٹالوں اور مشینوں سمیت ہمارے سینے پر سوار ہو کر کہہ رہی ہے ۔

"کیوں بے ! تو ہی ہے جو بیٹھے بیٹھے ہم جیسی بین الاقوامی شہرت والیوں کو بُرا بھلا کہتا ہے ۔ گھونٹ دوں تیرا گلا" ۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کانپتے ہوئے کہا "یہ ہماری پہلی خطا ہے بس اس مرتبہ اپنے سارے اسٹالوں کے صدقے میں ہمیں معاف کر دیجیے" ۔ ہماری آنکھ پہلے تو کھلی کی کھلی رہ گئی اور ہم کو کمرے کی ہر چیز گلا گھونٹتی دکھائی دی ۔ مگر بعد میں جب ہم نے اپنے ہوش و حواس اکٹھا کر لیے تو ہم اٹھ کر بستر پہ بیٹھ گئے مگر خواب کا بھیانک تصوّر اس وقت تک ہمارے دماغ پر مسلّط رہا جس وقت تک کہ ہم نے سورج کی روشنی کو صحن میں پھیلتے نہ دیکھ لیا" ۔

اس کے بعد نہا دھو کر ہم نے چائے کا پانی انگیٹھی پر رکھا اور بازار سے کچھ پھل اور مٹھائیاں لا کر میز پر ناشتہ چنا اور اپنے دوست لطیف کا جنھوں نے سویرے کی گاڑی سے ہم کو اپنے آنے کی اطلاع دی تھی انتظار کرنے لگے ۔ آٹھ بجے ، نو بجے اور سوا نو بج گئے مگر جب وہ نہ آئے تو یہ خیال کر کے کہ شاید گاڑی لیٹ ہو گئی ہے ہم نے اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کے ہمراہ بجائے ایک کے دو تین صاحبان اور ہوں ۔ کئی پیالیاں میز پر چن کر اسی رعایت سے مٹھائیاں اور پھل رکھ کر میز کو ایک تولیے سے ڈھانک دیا ۔ اور دوسری میز پر خود ناشتہ کر کے کالج روانہ ہو گئے ۔ چلتے وقت ہم نے ایک دلچسپ پرچہ لکھ کر میز پر رکھ دیا تاکہ اُسے پڑھ کر ہمارے دوست لطف اندوز ہوں ۔ خط کا مضمون یہ تھا ۔

اے ناہنجار ، نابکار ، مجرور ، مقہور ، مستور ، مغرور کہیں کے ۔ دیکھ ساڑھے نو بجے تک تیرا انتظار کرتے کرتے صاحب کالج جا رہا ہے ۔ تیرے لیے ناشتہ تیار رکھا ہے ۔ اسے زہر مار کر کے اور اپنی بھابھی کے فرائض انجام دے کر برتن قاعدے سے دھو کر پورے نظم و ضبط کے ساتھ الماری میں رکھ دینا اگر اسی طرح برتن پڑے ملے تو سمجھ لینا کہ پچھلے ماہوار جاڑے کی جڑا دل اور پھٹا پرانا جو تجھ کو ماہ بماہ ملتا ہے بند ۔ نہ جانے تو کس موت کی گھوڑی پر بیٹھ کر چلا کہ ساڑھے نو بجے تک گدھے کے سر کے سینگ بنا رہا ۔ صاحب تجھ سے بہت ناراض ہے ۔ ۴ بجے کالج سے واپسی پر ملاقات ہوگی ۔ تیرا "صاحب" ۔

چلتے وقت ہم نے دروازے میں قفل لگا کر کنجی نیچے ہوٹل والے کو دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے مہمان اگر آئیں تو یہ کنجی ان کو دے دینا اور کہہ دینا کہ وہ آپ لوگوں کا انتظار کرتے کرتے کالج چلے گئے ۔

چار بجے کالج ختم کر کے جب ہم واپس آئے تو ہوٹل والے نے خوش خبری سنائی کہ آپ کے جاتے ہی آپ کے مہمان آئے تھے ۔ وہ لوگ نمائش دیکھنے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ شب میں واپسی ہوگی ۔ ہم نے ہوٹل والے سے کنجی لے کر جلدی سے دروازہ کھولا اور مسرت میں سرشار زینہ طے کر کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صحن میں پانچ بستر بند کھلے پڑے ہیں ۔ دو چار جوتے ایک دوسرے سے بغل گیر اِدھر اُدھر پڑے قریب رکھے ہیں ۔ ایک جھبیا میں کچھ تیل کی باسی پوریاں رکھی ہیں جن پر دو تین کوّے بیٹھے طبع آزمائی کر رہے ہیں ۔ اندر کمرے میں آ کر دیکھا تو پلنگوں پر نہایت نفیس بستر لگے تھے ۔ سرہانے سوٹ کیس کرالے تکیے رکھے

تھے اور پائنتی نہایت قیمتی کمبلوں کی ایک دیوار تھی۔ اندر والے چھوٹے کمرے میں پلنگ پر سفید کڑھی ہوئی چادر اور اس پر ریشمی لحاف رکھا تھا۔ جن کھونٹیوں پر ہم اپنے تولیے ٹانگ کر گئے تھے ان پر نئے نفیس قسم کے تولیے ٹنگے تھے اور جن کھونٹیوں پر ہمارے کوٹ ٹنگے تھے ان کی جگہ تین سویٹر اور قیمتی شال ٹنگی تھی۔ ہم کو پہلے اپنے بستر اور کوٹوں کی فکر ہوئی کہ وہ ان چیزوں سے بھاگ کر کہاں پناہ گزیں ہیں۔ بڑی تلاش کے بعد ہمارا بستر تو پیچھے پرنٹرک کی جانب اپنے پاؤں لٹکائے خودکشی پر آمادہ ملا۔ اور اسی پر ہمارے تولیے اور کوٹ بھی سوار تھے اور مرگ انبوہ جشنے دارد کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ میز جس پر ہم نہایت اہتمام سے ناشتہ چن گئے تھے اس پر کیتلی قلابازی کھائے پڑی تھی اور دو پیالیاں سربسجود تھیں ایک پیالی میں کچھ ملے جلے بسکٹ زندگی سے بیزار ہو کر اپنے کو گھلائے ڈال رہے تھے۔ میز پوش پر آدھے سے زیادہ چائے انڈی پڑی تھی۔ البتہ طشتریوں کو جن میں رس گلے اور بالائی تھی اس طرح صاف کیا گیا تھا کہ جیسے بھٹی پر چڑھا دی گئی ہوں۔ کیلے کے کچھ چھلکے ایک لوٹے میں فن شناوری کی مشق کرتے ملے اور کچھ اس طرح اچھال دئے گئے تھے کہ بعض نے گملے کے مونگروں پر سکونت اختیار کر لی تھی اور کچھ کو میز پر اطمینان کی سانس لینے کا موقع مل گیا تھا۔ جو پرچہ ہم میز پر لکھ کر رکھ گئے تھے۔ وہ گرم گرم چائے سے غسل لینے کے بعد بھی اپنی تر دامنی پر خجل تھا۔ اپنے دوست کی اس "خوش سلیقگی" کو دیکھ کر ہم نے کہا آنے دو مردود کو۔ یہ ساری حرکتیں اس نے ہمارے اس رقعے کے جواب میں کی ہیں جو ہم میز پر اس کے نام لکھ کر چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ ہم لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی دس ساڑھے دس بجے ہوں گے کہ ہم کو زینے پر زور زور سے پیر پڑنے کی چاپیں سنائی دیں اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کچھ مادر زاد دیہاتی زینے پر چرودے جوتے پہن کر چڑھ رہے ہیں۔ ہم نے نمائش کے متعلق ایک مضمون لکھنے کے لئے عنوان قائم ہی کیا تھا کہ ایک ساتھ چار "سلام علیکم" کی آوازیں اس طرح سنائی دیں جیسے کسی نے "سلام علیکم" کا تیل میں ڈبا ہوا کوڑا ہماری ننگی پیٹھ پر رسید کر دیا ہو۔ دل میں آیا کہ جوابی حملے میں ہم بھی کہیں کہ آپ خود سلام علیکم مگر وہ ساری صورتیں ہمارے لئے اجنبی تھیں۔ ان آنے والوں میں دو صاحبان پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور دو صاحبان کرسیوں پر رونق افروز ہو گئے اور قبل اس کے کہ ہم ان سے ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل کریں ایک صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ذرا میرے بکس سے پیجامہ تو نکالنا۔ دوسرے صاحب ہم سے بولے "صاحب! نمائش دیکھ آئے" "خوب ہے" ہم نے مری ہوئی آواز میں کہا "اچھا"۔

بولے۔ بڑی بھیڑ ہے۔ ایک پر ایک لدا پڑ رہا ہے۔

ہم نے کہا "ہاں"

تیسرا۔ صاحب! جامع مسجد بھی خوب بنی ہے۔

ہم۔ جی ہاں

پہلا۔ یہ تو قطب الدین کی بنوائی ہوئی ہے نا۔ قبل اس کے کہ ہم بولیں۔

دوسرا۔ نہیں میاں۔ اس سے پہلے کے کسی مسلمان بادشاہ نے بنوائی تھی۔

ہم۔ اچھا

پہلا۔ جامع مسجد پر بھی بڑا مجمع رہتا ہے۔

ہم۔ جی ہاں

دوسرا۔ (چوتھے سے مخاطب ہو کر) جمیا ذرا ہماری چپل ادھر تو پھینکیو تو

پہلا۔ (موزے اتارتے ہوئے) موزے بھی پھٹ گئے۔ کل دوسرے خریدیں گے۔

تیسرا۔ (ہم سے مخاطب ہو کر) آپ کو نمائش کیسی لگی۔

ہم۔ اچھی۔ مگر ہم گئے نہیں۔

دوسرا۔ صاحب ضرور دیکھئے۔ پرسوں آپ ہمارے ساتھ چلئے گا۔

ہم۔ بہت اچھا۔

تیسرا۔ (پلنگ کے قریب سے اپنے چپل اٹھاتے ہوئے) آپ کا ہیٹر بھی خوب ہے"

ہم۔ جی ہاں

پہلا۔ یہ آپ نے یہیں خریدا ہوگا۔

ہم۔ جی ہاں

دوسرا۔ اس کا تار بدلوا دیجئے گا۔ ابھی جب ہم لوگوں نے سویرے چائے گرم کی تو اس کا سارا تار جل گیا (ہیٹر اٹھا کر ہم کو دکھاتے ہوئے) یہ دیکھئے اس کی کیل تک مسالے میں چپک گئی ہے۔ اس کا بھی بدلوا دیجئے۔

ہم - بہت بہتر

دوسرا - (اپنے ساتھی سے) بھائی دیکھو - یہ کہہ کر وہ بڑے پلنگ پر تو ہم اور تم سو رہیں اور چھوٹے دو پلنگوں میں سے ایک پر تم دونوں سو رہو - ایک پر (ہماری طرف مخاطب ہو کر) آپ سو رہیں گے -

ہم - نہیں میں اندر فرش ہی پر سو رہوں گا -

پہلا - واہ صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے - یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اندر ایک پلنگ پر بستر بچھانے لگے اور ہم اس خوطے میں پڑ گئے کہ یہ ہیں کون لوگ - کہاں سے آئے ہیں - اور ان کو ہمارا نام اور مکان کا پتہ کس نے بتایا - اتنے میں ایک صاحب پھر آ کر ہماری کرسی کے مقابل بیٹھ گئے اور بولے - صاحب! یہاں مرچ بہت کھایا جاتا ہے ابھی ہوٹل میں ہم لوگوں نے جو کھانا کھایا تو عجیب حالت ہو گئی - تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی دل چاہتا تھا کہ کوئی شکر یا برف کا کٹورا ہو تو پھانک پڑیں -

دوسرے صاحب - (تیسرے صاحب سے مخاطب ہو کر) اچھا ہوا ہوٹل میں نہیں رکے اور آپ کا مکان بھی بالکل اتفاق سے نظر پڑ گیا

ہم نے کہا - یہ کیسے ؟

بولے - جب ہم کانپور سے چلے تو مومن صاحب نے بتایا کہ آپ سے ضرور ملتے آنا - ہم لوگوں نے آپ کی کتابیں پڑھی تھیں اس لئے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا - چنانچہ آپ کے مکان کے سامنے سے ہمارا تانگہ گزر رہا تھا کہ عین آپ کے مکان کے دروازے کے سامنے گھوڑے کا پیر پھسل گیا - ہم لوگ تانگے سے کود پڑے اور گھوڑے کو اٹھانے میں لگ گئے - اتنے میں پیچھے مڑ کر جو دیکھتے ہیں تو آپ کے دروازے پر آپ کا لیٹر بکس دکھائی پڑا مگر دروازے میں قفل لگا تھا لیکن ہم لیٹر بکس پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ کے مکان کے نیچے جو ہوٹل والا ہے - اس نے ہم کو آپ کے مکان کی کنجی دیتے ہوئے کہا کہ وہ آپ کا انتظار کرتے کرتے کالج چلے گئے - چنانچہ ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ضرور مومن صاحب نے آپ کو لکھ دیا ہے آپ کے اخلاق کی تعریف انھوں نے پہلے کر دی تھی اس لئے یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا آپ کے دوکان دار نے ہم لوگوں کے بستر بھی زینے پر لے جا کر رکھ دیئے - یہ بیان سن کر ہم کو خیال آیا کہ کانپور میں ایک مشاعرے میں ہم چار سال ہوئے جب گئے تھے اور وہاں اس نام کے ایک صاحب نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی تھی ان ہی صاحب نے غالباً ہم پر یہ نوازش فرمائی ہے - یہ لوگ چار روز رکے چنانچہ ان کے جاتے ہی ہم نے اپنا لیٹر بکس نکال کر پہلے اسے کچلا پھر مکان کی کال بل نکال کر اس کو زمین پر تین چار مرتبہ پٹکا اور قسم کھائی کہ اب سے لیٹر بکس استعمال کرنے والے پر لعنت -

---

پسماندہ جاتیوں کی بہبود کا کام

پہلے پنجسالہ منصوبے کی مدت میں پسماندہ جاتیوں کی بہبود کے کام کی کئی اسکیمیں تیار کی گئی ہیں - ان لوگوں کو متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے سماجی اور اقتصادی حالات کے سدھار کے لئے خاص امداد کی ضرورت ہے - اچھوت جاتیوں، پسماندہ قبائل اور دیگر پچھڑے ہوئے طبقوں کے کام کے لئے اور ان کی خصوصی ضروریات کے مدنظر پہلے منصوبے میں ۳۹ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی - اس میں ۱۹ کروڑ روپے ریاستی حکومتوں کو امدادی گرانٹ دینے کے لئے مخصوص کیا گیا تھا - پسماندہ قبائل اور پسماندہ علاقوں کی بہبود و ترقی پر پندرہ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا اور چار کروڑ روپیہ چھوت چھات کے خاتمہ اور سابق جرائم پیشہ قبیلوں اور دیگر پسماندہ جماعتوں کی بہبود پر خرچ ہوا -

دوسرے منصوبے میں چھوت چھات کے خاتمے، پسماندہ جماعتوں کو کھیتی باڑی کے کاموں پر مائل کر کے اور منافع بخش ہنروں اور دستکاریوں کی تربیت اور ان کی اقتصادی حالات کو سدھارنے پر زور دیا جائے گا - پچھلے چند برسوں میں ان جماعتوں کے لئے تعلیم کی سہولتوں کو کافی توسیع دی گئی ہے - ان کو وظیفے، گرانٹ اور گزارہ الاؤنس وغیرہ سے مالی امداد بھی دی گئی ہے - ان پروگراموں کو آئندہ بھی پوری اہمیت ملتی رہے گی -

دوسرے منصوبے کے عرصہ میں ان لوگوں کے لئے مکانات مہیا کرنے کی خاص اسکیمیں جاری کی جائیں گی -

عبدالحی خاں سیوراوی

شعر یا ترنم

(ادارہ اس موضوع پر موافق و مخالف خیالات کے اظہار کی دعوت دیتا ہے)

مشاعروں کی واہ واہ اور داد و تحسین کے فلک شگاف نعروں کی فضا میں جب فہم و شعور کی پذیرائی ہوتی ہے تو علم و ادب کے طالب علم کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، شاعر کا ترنم اچھا تھا یا شعر میں خوبی ہی ایسی تھی کہ مجمع واہ واہ کے سیلاب کی زد میں آگیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ادھر چند دنوں سے کچھ شدت اختیار کرگیا ہے، اور اب اردو کے نیم ذمہ دار حلقوں میں بھی کانا پھوسی ہو رہی ہے کہ غزل اور نظم کو راگ اور لہجے کی اس بدعت سے کیوں کر آزاد کیا جا سکتا ہے جہاں روح شاعری شاعر کی خوش گلوئی کے بوجھ کے نیچے دب جاتی ہے، جہاں مضمون لفافے کی رنگینیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور مشاعرے جو عہد قدیم سے اب تک عوام اور شاعری میں براہ راست تعلق پیدا کرتے تھے کیوں کر عوام کو صحیح ذوق اور شائستہ مذاق عطا کرکے ان میں پاکیزہ تہذیب پیدا کر سکتے ہیں۔

ہر شعر کے الفاظ کے گل بوٹوں سے نظر ہٹائیے، اوزان اور قواعد کی میزان پر شعر کو تولئے تو ہر شعر میں ایک آہنگ، یا نغمہ ملے گا۔ یہ آہنگ اور نغمہ در اصل شاعری کی جان ہیں۔ الفاظ کے پیچھے جو موسیقی یا راگ ہوتا ہے وہ بجائے خود شاعری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ ہونا چاہیئے کہ یہاں یہ نغمگی اور موسیقیت بے جان نہیں۔ یہاں اوزان کے خانوں میں الفاظ کو فٹ کرکے بے نشلنے کی بند وق نہیں چھوڑ دی گئی ہے، یہاں کچھ اور ہے جس کا مقصد کسی خاص خیال کی ترجمانی، کسی مخصوص جذبے کی ادائی یا کسی دلکش منظر کی تصویر کشی ہے۔ صرف سازو بربط کے معیار پر اترنے والے علم موسیقی کی گت یا نثر نہیں، یہاں زندگی اور زندگی سے متعلق انسانی تجربات بھی ہیں۔ چنانچہ علم شاعری کی عالمی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسانی تہذیب جب رقص و موسیقی کی منزل سے آگے بڑھی تو قدم کے تال اور بانسری کی تان میں انسانی دل و دماغ کے پیدا کئے ہوئے وہ الفاظ بھی شامل ہو گئے جن کا مقصد انسانی عادات و خصائل سے متعلق کسی جذبے یا احساس کی ترجمانی تھا۔ شاعری کا یہ ارتقاء، عام ارتقائی مراحل کی طرح اپنی منزل اول کی خصوصیات سے یک سر بے نیاز نہیں ہو گئی۔ یعنی اس ترقی پذیر لفظ، رقص و آہنگ میں بانسری کی تان پھر بھی محفوظ رہ گئی، شاعری صرف الفاظ کا مجموعہ نہ بنی بلکہ حسن ترکیب اور بیان و اسلوب کے اعتبار سے موسیقی سے ہم آہنگ رہی، اور پھر دھیرے دھیرے ہم اس منزل پر پہونچے جہاں بہ موسیقیت ہی گمراہی بار ہو گئی۔ الفاظ کی حرکت پر سے اوزان کی حکومتوں کا رعب جاتا رہا، اور دنیا کے بعض بلکہ تقریباً سبھی حصوں سے آزاد شاعری کا مطالبہ ہونے لگا، گویا اس منزل پر ہم راگ راگنی بھول گئے۔ موسیقی اور نغمہ جان شاعری نہ بن سکے اور انسانی تہذیب کے تقاضوں نے شاعری کو انسان کی سماعت کے لئے صرف الفاظ کا مجموعہ بنا دیا جو بلند نیپال کے کوہستانوں سے گذرتا ہوا نثر کے میدانوں تک جا پہونچا۔ بہر حال یہ انجام وہی ہوا جو اس کا تاریخی انجام تھا۔ لیکن اس آزاد شاعری میں بھی بالکل نثریت نہیں ہے، خیال اور مشاہدہ کا عکس بھی ہے، انداز اور تجربے کا دخل بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کے وہ مخصوص خصائل بھی ہیں جسے شعرا اور شاعری کی زبان میں رمزیت اور اشاریت کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ موسیقی مرچکی، نغمگی جاتی رہی، لیکن مذاق شاعری اس صنف میں بھی برقرار رہا ـــــ۔ غرض یہ ہے ایک مختصر جائزہ شعر و نغمہ کی تاریخی ہم آہنگی کا۔

اردو شاعری وزن و آہنگ سے یکسر آزاد نہیں ہو سکی ہے، اب سے دو چار برس پہلے ملک کے نوجوان حلقوں میں آزاد شاعری یا بلینک ورس کا رجحان زیادہ تھا۔ یہ رجحان اس دور کا ہے جب غزلوں کی بایکاٹ بھی

سے اجتناب ہمارے نقادوں کے نزدیک اُردو شاعری کے تحفظ و بقا کا واحد حل تھا۔ لیکن حالات بدل گئے ہیں، وہ شعراء جو بلینک ورس کی صاف شفاف لہروں سے کھیلتے رہے غزل کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ مجنوں، احتشام اور دوسرے معتبر ناقدینِ غزل کی گیرائی اور وسعت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک غزل کے امکانات ہیں، اور غزل اُن عوامی احساسات کے بار کی متحمل ہو سکتی ہے، جسے اب تک صرف نظم یا آزاد شاعری کے دوش پر سوار کیا جاتا رہا۔ غرض کہ غزل ہم سے قریب ہو رہی ہے۔ اور ظاہر ہے مینائے غزل کی ہر ہر بوند سے تغزل کا امرت رس ٹپکے گا۔ یعنی غزل اپنے تمام تر اوزان اور قواعد کی زرہ بکتر کے ساتھ صف آرا ہوگی۔ اس میں موسیقی بھی ہوگی، وہ لغمہ یا آہنگ بھی ہوگا جسے ترنم کی قالین پر بایں ہمہ خوش خرامی و خوش گامی آگے بڑھنا ہوگا۔ لیکن غزل بنانے والے غزل گو شاعر کو اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ غزل کو ان تمام کیلوں کانٹوں سے کسنا ہوگا جن کی مضبوطی سے قبائے غزل کا دامن تار تار نہ ہو۔ یہی نہیں ہمارے شعراء کو "اشاریت" کی وہ قندیل روشن کرنی ہوگی جس کی ہر کرن غور و فکر کے آئینوں سے منعکس ہو کر زندگی کی قوسِ قزح بنائے گی، اور غزل کے اس لاؤشکر میں ترنم اور نغمے کی دل آویزی بہر حال ہوگی۔ ہم اپنی شاعری کے ان امکانات کی فضا میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

ترنم ہمارے حلق سے لگا ہوا ہے۔ یہ وہ احساس ہے جس کو ہماری فطرت اور انسانی اعضاء و افعال کے ساتھ منسلک اعصاب ہرگز بھلا نہیں سکتے۔ ترنم کی گدگدی ہمارے نوجوان، بوڑھے اور بچے کے دل میں وہ کیفیتیں پیدا کرتی ہے جسے ہم کچھ دیر کے لئے بے حد پسند کرتے ہیں، ہم کیف و نغمہ کی بلند ترین منزلوں سے گزر کر ایک ایسی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں گم ہو جانا زیادہ پسند کرتے ہیں اور واپس لوٹنا بار گزرتا ہے۔ لیکن ہم کو جب بھی اپنے سر کو جنبش دینے کا موقع ملتا ہے ہم ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے گم شدہ اعصاب کو ڈھونڈھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ منزل ایک تخئیلی جنت تھی جہاں کی ترنم ریزیوں میں ہمارا دل اٹکا ہوا تھا یا وہ دنیا ایک طلسماتی ارض کی تھی جس میں ہر جگہ یکساں کیفیتیں طاری تھیں۔ غرض جب ہم اُس عارضی دنیا سے گزر رہتے ہیں تو اپنی زندگی یاد آتی ہے، زندگی جو میدانِ حشر کی طرح شور و شر، چیخ اور پکار، آہ و کرب، بے چینی اور ہیجان سے بھری ہوئی ہے۔ ہم کو اپنا وزن خود محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہمارے اعصاب ہم کو صحیح پوزیشن Equilibrium کا پتہ دیتے ہیں اور ہم کو فطری طور پر ترنم کے اُس فریبِ تخئیل سے پیچھا چھڑانا پڑتا ہے۔ اب خالی شدہ رہ جاتا ہے، دو مصرعوں کا ایک شعر یا چند الفاظ کا ایک مجموعہ۔ یہ مصرعے اور الفاظ کے اس قسم کے مجموعے اچھے بھلے ہوتے ہیں یا بُرے ہوتے ہیں، اس کی تمیز اب ہوتی ہے جب کہ ترنم کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور شاعر کی آواز کے پیچھے اس کا شعر ہمارے شعور سے داد و تحسین کی فریاد کرتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ترنم کی ڈگڈگی بجا کر مداری شاعر اپنے فن کا تماشا دکھا گیا اور ہم اُس کا پیچھا کرتے رہ گئے۔

ترنم کے بھی کئی درجے ہیں۔ ترنم کا سلسلہ گدھے کے بول سے مشہور گانے والی طوائفوں اور فلمی پریوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ترنم کے اس سیلِ عرض البلاد میں ہمارے مشاعروں کے شاعر کو کس حد تک پہونچنا ہے۔ یہ غور طلب امر ہے۔ اس پر سوچنے سے پہلے ہم کو یہ بتانا پڑے گا کہ ہمارے شاعر کے پیشِ نظر شعر ہے یا ترنم۔ مذاقِ شاعری ہے یا ذوقِ نغمہ۔ محبتِ فن ہے یا خواہشِ نمود۔ اس کے جواب میں کوئی ایک فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ ترنم پر جان دینے والے زیادہ تر شعراء کے جذبات نام و نمود کے بھنور میں مبتلا ہیں۔ عوامی اسٹیج پر بیٹھنے کی سرفرازی کا جذبہ اُن کے ذوقِ شاعری کو ترنم کے پہیوں پہ آگے ڈھکیل رہا ہے۔ وہ "شاعرِ رنگیں نوا" بننے کی دُھن میں پوچ اور پست اشعار پر خوش گلوئی کی ساری صلاحیتوں کو صرف کرتے ہیں۔ کچھ کی تعداد ایسی ہے جو ترنم سے زیادہ شعر پر توجہ دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شعر کو ترنم انداز میں پڑھنا، اچھی شراب کو مٹی کے پیالوں کی بجائے شیشے کے سبو میں پینے کی مانند ہے۔ ان کے یہاں ترنم شاعری کی صلاحیتِ عظمیٰ نہیں بلکہ اضافی صلاحیت ہے۔ مگر ان شعراء کی تعداد بے حد کم ہے جو شعر تو کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ لیکن پیرانہ سالی یا ترنم سے ناواقفیت کی بنا پر مصرعے توڑ توڑ کر یا زبان کی لکنت پر قربان ہو کر مجمع میں شعر پڑھتے ہیں۔ مختصراً شعراء کی تین جماعتیں ہیں مترنم نیم مترنم اور غیر مترنم۔ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی

وہ خاموش ہے" کے قول کے مطابق ہر وہ شاعر جو جتنا ہی زیادہ مترنم ہے وہ اتنا ہی کم شاعر ہے (استثنیات کی ہر جگہ گنجائش ہے)، اور کوئی ضروری نہیں کہ یہ تقسیم بھی تمام شعراء کی طول طویل قطار میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے نزدیک ترنم کی اہمیت زیادہ ہے۔ گویا ان کا مقصد شاعری نہیں، ترنم کے بل بوتے پر مجمع پر اپنا رنگ جما لینا مقصود ہے۔ اس قسم کے شاعر اور ان کی شاعری کا شاعرے کے پنڈال سے باہر کوئی وجود نہیں، اور بادی النظر شاعرے کہیں زیادہ مشاطر ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مشاعروں اور پبلک اسٹیجوں پر شاعر کو کون سا لہجہ اختیار کرنا چاہیئے، ترنم کی کس روایت کو زندہ کرنا چاہیئے۔ گذشتہ کے بول سے فلمستان تک کے سلسلے میں کس سے نسبت قائم کرنا چاہیئے تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا شاعر وہ لہجہ اختیار کرے جو آواز کے اعتدال پر مبنی ہو۔ جو فلمی گانوں کی نقالی سے بری ہو جو تقریباً وہی یا اُس سے کم و بیش گنگناہٹ، وہی نغمگی اور وہی لہجہ ہو جو شعر کہتے وقت شاعر نے اختیار کیا تھا، اُس کے اشعار میں ترنم کی آویزش دودھ میں شکر کی مقدار سی ہو اور شاعر پاکیزگی اور صفائی کے ساتھ اپنے اشعار کو عوام میں پیش کر سکے۔

ادھر چار یا پانچ برسوں میں مجھے متعدد مقامات پر کئی مشاعروں میں حاضر ہونے کا موقع میسر آیا۔ ایک غیر شاعر یا عام پبلک کی حیثیت سے مجھے عوام کے احساسات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان لوگوں کے تبصرے بھی سننا چاہا جو وہ نہیں جانتے، جو محفل مشاعرہ میں اسی کیفیت ترنم کی تلاش میں آتے ہیں جیسے ہم فلمی تصویر گھروں میں تلاش کرتے ہیں۔ میں نے یہ اندازہ کیا ہمارے شعراء کی یہ ترنم ریزی شعر فہمی اور شعر گوئی کے مذاق کو تباہ کر رہی ہے، اور آزادی ہند کے بعد تو بہتیرے سر پھروں نے اس تیزی کے ساتھ شاعر ہونے اور مشاعروں کے دعوت نامے پانے کا اعزاز حاصل کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کونسا جادو کا درخت اُگ آیا جو اشعار کے پھول اُگل رہا ہے۔ آج کل شاعری وہ شئے لطیف نہیں رہی جس کے لئے احساس، خلوص اور سوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج تو شاعری کی صرف دو منزلیں ہیں، میٹرک کے درجے کے بعد اُس نے کسی چلتے ہوئے شاعر کی دو چار غزلیں حفظ کیں اور پھر قافیوں کے کرتب یوں نت کئے۔ بس حلق کا طبلہ پھینکا اور دوسرے ہی لمحے میں شعر لہرانے لگا۔ یہ شعر نہیں ہماری بدذاتی کا وہ سانپ ہے جس کے پھن لہراتے ہیں، اور جو ہماری تہذیب کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

کسانوں کی قومی کونشن کے ۹۳ ڈیلیگیٹوں کا دورہ

بھارت کے کسانوں کی دوسری کونشن کا اجلاس حال ہی میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کونشن میں بھارت کی قریباً تمام ریاستوں سے آئے ہوئے ۹۳ ڈیلیگیٹوں کو لے کر ایک اسپیشل ریل گاڑی کوروکشیتر پہنچی۔ ان میں ۲۵ عورتیں بھی شامل تھیں۔

کمیونٹی پروجیکٹس ایڈمنسٹریشن کے زیر اہتمام ان لوگوں کو خاص طور پر کمیونٹی پروجیکٹ دکھانے کے لئے کوروکشیتر لے جایا گیا تاکہ ان کا پنجاب کے کسانوں سے ملاپ کرایا جائے۔ مہمانوں میں بہت سے کرشی پنڈت اور فصلوں کے ریاستی مقابلوں میں انعام حاصل کرنے والے لوگ شامل تھے۔

اس ملاقات کی غرض وغایت یہ تھی کہ ملک بھر کے کسانوں کے ان نمائندوں، مقامی کسانوں اور کمیونٹی پروجیکٹ عملہ کے مابین مشترکہ مسائل پر تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے تجربات کا تبادلہ کر کے متعلقہ مسائل پر ملک بھر کے وسیع مفاد کے نظریے سے غور وخوض کیا جائے۔

کوروکشیتر میں ایک مجلس مباحثہ منعقد کی گئی جس میں بہت سے مہمانوں اور مقامی کسانوں نے حصہ لیا۔ بہت سے مقررین نے ایک امر پر اتفاق رائے ظاہر کیا کہ وہ اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کمیونٹی پروجیکٹ تحریک نے اُن کی طرزِ زندگی اور کام کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔

اس دن کا پروگرام گروپ ناچ اور فلم شو دکھانے کے بعد ختم ہوا۔ بھارت کی زندگی کے کچھ اور ترقیات کے مختلف پہلوؤں پر دستاویزی فلمیں دکھائی گئیں۔

اختر علی تلہری

غزل

پھر تری بزمِ طرب میں ہے غزل خواں کوئی
چھیڑنے بیٹھا ہے پھر تارِ رگِ جاں کوئی

ملتفت پھر ہے اِدھر برق بہ داماں کوئی
پھر ہے تکمیلِ طلب کا رِ نمایاں کوئی

دیکھ بے باک نگاہوں سے نہ گلشن کی بہار
نکہت و رنگ کے پردے میں ہے رقصاں کوئی

رنگ بھرنے کو نیا طُور کے افسانے میں
پھر چلا ہے طرفِ منزلِ جاناں کوئی

میں نے دیکھی ہے ترے دامنِ رنگیں کی بہار
کیا سمائے مری آنکھوں میں گلستاں کوئی

دامنِ دل میں چھپائے ہوئے لاکھوں ارماں
آ رہا ہے طرفِ عالمِ امکاں کوئی

پھر گناہوں پہ مرے قہر کی نظریں ڈالے
پہلے بدلے تو سہی فطرتِ انساں کوئی

گلشنِ دہر کا سب رنگ اُڑا جاتا ہے
اب حقیقت کو کرے اور نہ عُریاں کوئی

برقِ جلوہ کو ذرا رُخصتِ بے باکی دو
ہے کہیں طاقتِ دیدار پہ نازاں کوئی

رنگ و بوئے دہر کے سب کھینچ لئے ہیں دل میں
اب تو زنداں نہیں میرے لئے زنداں کوئی

ایک جلوہ ہے مگر ذوقِ نظر ایک نہیں
کوئی گلچیں تماشا ہے تو حیراں کوئی

ہم نفس آج ہے کیوں لب پہ ترے نوحۂ غم
لُٹ گیا عینِ بہاراں میں گلستاں کوئی

دیر و کعبہ نہ سہی محفلِ رنداں ہی سہی
کاش مل جائے کہیں دہر میں انساں کوئی

اب یہ ہے بخت کی شوخی کہ عطا کی شوخی
گُل بداماں ہے کوئی خاک بداماں کوئی

ہاں میں سمجھا کہ بہارِ چمن آرا کیا ہے
ہے گل و لالہ کی دنیا میں فروزاں کوئی

حسنِ پُر عشوہ کی یہ شوخ ادائی اختر
برق کی راہ سے ہے سلسلہ جنباں کوئی

مبارز الدین رفعت

دکن کی نادر صنعت پارچہ بافی

ہمرو، مشروع اور کمخواب

ہندوستان میں پارچہ بافی کی صنعت کب سے شروع ہوئی یہ تو ٹھیک طور پر بتایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اتنا قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنعت ہندوستان میں بہت ہی قدیم زمانوں سے چلی آ رہی ہے۔ اس کے بہت سے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کی بے نظیر ماہرانہ کاری گری کے ارتقائی مدارج کی کڑیاں ہمیں موہنجوداڑو کی مہروں، سانچی اور متھرا کی مورتیوں اور اجنتا کی دیواری تصویروں میں ملتی ہیں۔ حالیہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ فراعنۂ مصر کے مقبروں میں رنگین کپڑوں کے جو ٹکڑے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ آج سے پندرہ سو سال پہلے ہندوستان میں بنائے گئے تھے۔ اجنتا کی دیواری تصویروں میں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں بنی ہیں۔ ہمیں مختلف وضع قطع اور مختلف ڈیزائینوں کے کپڑے پہنے عورت اور مرد دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصویروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس زمانے میں کپڑے بننے کی تکنیک اور ڈیزائن بنانے کی صلاحیتیں کتنے اونچے درجے پر پہنچ چکی تھیں۔ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے ہیوں تسانگ سے لے کر اس ملک کے کتنے ہی سیاحوں کے لئے موجب حیرت بنے رہے۔ میگاس تھنیز حضرت عیسےٰ سے کوئی تین سو سال پہلے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ یہاں کے راجے مہاراجے ایسے کپڑے پہنتے تھے جن پر خالص سونے کا کام کیا ہوتا تھا، اور ان میں قیمتی ہیرے جواہرات ٹکے ہوتے تھے۔

لیکن اس قدیم صنعت پارچہ بافی کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ صرف سولھویں صدی عیسوی سے ہمیں ہندوستانی کپڑوں اور پوشاکوں کے نمونے ملتے ہیں۔ کپڑے کے یہ نمونے بڑے ہی خوبصورت اور دلکش ہیں اور مغلوں کی نفاست پسندی اور ان کے اعلےٰ جمالیاتی ذوق کے شاہد عادل ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے ہندوستانی پارچہ بافی کی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں کپڑوں کی کئی قسمیں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہاں دیہاتیوں کے اپنے خاص کپڑے تھے جن کے ڈیزائن اور رنگ بندھے ہوئے تھے۔ کچھ خاص ذاتیں تھیں جو مخصوص رنگ اور مخصوص ڈیزائن ہی استعمال کیا کرتی تھیں۔ پھر شادی بیاہ اور موت مٹی کی رسمیں تھیں جن میں رسوم خاص قسم کے لباس کی طالب تھیں۔ خوشی کے موقعوں پر خالص ریشم اور سونے چاندی میں بنا ہوا کپڑا ہندو عورت اور مرد سب ہی پہنتے تھے۔ لیکن ایسا کپڑا پہننا شرع کی رو سے مسلمان مردوں کے لئے ناجائز تھا۔ وہ ملے جلے ریشم اور سوت کا کپڑا پہنتے تھے اور اسی تجدید نے ہمرو اور مشروع جیسے کپڑوں کی صنعت کی بنیاد رکھی۔ اس کے سوا شاہانہ درباروں کی روایات تھیں جن میں ریشم کے ساتھ سونے چاندی کے تاروں میں بنے ہوئے کپڑے پہنے جاتے تھے اور ان ہی روایات نے کمخواب جیسے دلربا کپڑے کی صنعت کو فروغ دیا۔

ہمرو، مشروع اور کمخواب دکن کی دستی صنعت پارچہ بافی کی مشہور پیداوار ہیں اور اورنگ آباد اور اس کا نواحی شہر پیٹھن دونوں قدیم زمانوں سے اپنی ان صنعتوں کے لئے مشہور چلے آ رہے ہیں۔

مشروع

مسلمان مردوں کے لئے شرع کی رو سے خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں۔ ہاں ملے جلے ریشم اور سوت کا کپڑا وہ پہن سکتے ہیں۔ اس تجدید کا ایک دلچسپ نتیجہ مشروع (لغوی معنی ہیں شرع کی رو سے جائز) اور ہمرو جیسے کپڑوں کی صنعت ہے۔ مشروع ملے جلے سوت اور ریشم کا کپڑا ہے۔ اس میں اطلس جیسی چمک تو نہیں ہوتی لیکن یہ چمک دار چھینٹ سے مشابہ دکھائی دیتا

ہے ۔ بُننے جانے کے بعد مشروع کو ریٹھے اور میٹھے پیو سے دھویا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کپڑے میں ایک طرح کی چمک پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کو اصلی چمک ایک اور چیز کے ذریعے دی جاتی ہے جو "کنڈی" یا کلف کہلاتی ہے ۔ یہ کلف خریداری طے ہو جانے کے بعد ہی دیا جاتا ہے ۔ ضلع اورنگ آباد کے اور دو مقامات دیجاپور اور پیٹھن میں بھی مشروع تیار ہوتا ہے ۔ کسی زمانے میں اورنگ آباد کے پُر تکلف مشروع ہندوستان بھر میں شہرت رکھتے تھے ۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر مسلمان مرد ان کی شیروانی اچکنے اور دوسرے لباس بنا کر پہنتے اور یہ کپڑا عورتوں کے پاجاموں وغیرہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ۔

مشینی کپڑوں کے قبول عام کے بعد مشروع کی مانگ بتدریج گھٹنے لگی تو اس کے بننے والوں نے بھی گرتے ہوئے بازار کا ساتھ دینے کے لئے نقلی ریشم استعمال کرنا شروع کیا ۔ اب خالص ریشم اور سوت کے بُنے ہوئے مشروع شاذ و نادر ہی بنتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ اب بھی مشروع بننے والوں کی مہارت اور صناعی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے لیکن مانگ نہ ہونے سے اس صنعت کا حال بہت بُرا ہے ۔ آج کل لوگ ایسی چیزوں پر جو خاص خاص موقعوں پر ہی استعمال کی جا سکیں اپنا کافی روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں ۔ تاہم اب بھی یہ صنعت تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہے اگر لوگ اس پر تھوڑی سی توجہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں ۔ تقریباً ایک سو سال سے سسکتی ہوئی اس صنعت میں نئی جان ڈالی جا سکتی ہے اگر اس کے استعمال کے ڈھنگ اور نئی نئی تدبیریں سوچی جائیں ۔

ہمرو

ہمرو اورنگ آباد کی ایک خوبصورت اور نازک پارچہ بافی کی صنعت ہے ۔ یہ کپڑا بھی ہاتھ سے بنا جاتا ہے اور کئی لحاظ سے مشروع سے ملتا جلتا ہے ۔ یہ سوت اور ریشم ملا کر بنا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں جن میں کبھی کشمیری شالوں کی نقالی بھی ہوتی ہے ۔ کبھی اسے ریشم اور اون کا حاشیہ بھی دیا جاتا ہے ۔ اس کے ایک تھان کو تین آدمی دو مہینوں میں بن لیتے ہیں ۔ کسی زمانے میں اس کپڑے کے تانے بانے میں سوت استعمال کیا جاتا تھا اور اس کے اوپر کے بیل بوٹے ریشم کے دھاگے سے بنائے جاتے تھے ۔ لیکن آج کل اس کپڑے کی تزئین اور آرائش کے لئے بیشتر نقلی ریشم ہی استعمال کیا جاتا ہے ۔ یہ نقلی ریشم عام طور پر انگلستان، اطالیہ، فرانس اور جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے ۔

مشروع اور ہمرو جن اشیا سے بنا جاتا ہے ان کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ کپڑے بہت زیادہ پائیدار ہوتے ہیں اور انھیں اچھی طرح دھویا جا سکتا ہے ۔ ہمرو کی بنت کافی گنجان ہوتی ہے ۔ اس کی بنیاد سوت ہوتی ہے اور اس کے بیچ بیچ میں ریشم ملا کر اس پر ہلکے گہرے رنگوں میں خوبصورت ڈیزائن بنائے جاتے ہیں ۔ ان میں بعض کی بنت ململ کی طرح نفیس ہوتی ہے ۔ کسی زمانے میں اس کپڑے کے نقاب، ٹوپیاں، دلہن کے ملبوس اور ساڑھیاں بھی بنائی جاتی تھیں ۔ موجودہ طرز ملبوس کے لحاظ سے اس کپڑے سے کئی کام لئے جا سکتے ہیں ۔ خواتین کے شام کے کوٹ بلاوز اور پاجاموں کے لئے اس سے اچھا کپڑا ملنا مشکل ہے ۔ پاجاموں اور لہنگوں وغیرہ کے سوا اس کے تکیوں کے غلاف اور بستر کی چادریں بھی بنائی جا سکتی ہیں ۔ ہلکے رنگ کے ہمرو کی شیروانی بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے ۔ ہمرو ہلکے گہرے کئی رنگوں میں بنایا جاتا ہے اور اس کے اوپر بنے ہوئے گل بوٹے نہ تو تانا بانا دے کر بنت کے اندر ہی بنائے جاتے ہیں ۔ اس کے ڈیزائنوں کی ترتیب، ان کے دائروں اور ان کی دھاریوں کا تانا چڑھاؤ، ان کے رنگوں کا تناسب اور ان کے دھاگوں کی پیچ در پیچ بنت، یہ سب چیزیں مل کر ان کپڑوں کو عجیب دلکشی بخشتی ہیں ۔ اس کپڑے کی بنت کافی گھنی ہونے پر بھی یہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہوتا ۔ اس کے ایک مربع گز کپڑے کا وزن تین سے لے کر پانچ اونس سے زیادہ نہیں دیکھا گیا ۔ اس کپڑے کے ایک مربع انچ کے اندر دھاگے کی دو سو اسی جوڑیاں ایک عام بات ہے ۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہمرو کی صنعت کو کچھ فروغ حاصل ہوا ہے اور اس کے بیل بوٹوں میں نئی جدتیں پیدا کی گئی ہیں ۔ اب تو اس کے قیمتی صوفوں اور کرسیوں کے گدوں کے غلاف بنائے جا رہے ہیں ۔ اس کپڑے کے سوتی پس منظر میں بنی ہوئی بوٹیاں، دھاریاں اور خوبصورت گل کاری کمروں کے فرش فروش اور پردوں وغیرہ کے لئے نہایت درجہ موزوں ثابت ہوتی ہے ۔ اگر اس کپڑے کے پردوں اور فرش وغیرہ سے کمروں کو سجایا جائے تو ان کی زیبائش دیکھنے کے لائق ہوتی ہے ۔

مشروع کی طرح ہمرو کی صنعت کے بُرے دن بھی بس اسی وقت سے شروع ہوئے جب سے کہ بھڑکیلے مشینی کپڑوں نے رواج عام پایا۔ پھر تو فیشن بھی بدلے اور ان کپڑوں کے بننے والوں کی سرپرستی بھی ختم ہوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہئے تھا کہ بس دو چار ہی راچھوں پر کام ہوتا تھا۔ یہ افسوسناک حالت دیکھ کر ریاست حیدرآباد دکن کے محکمۂ صنعت و حرفت نے اس کی امداد کے لئے اپنا دست کرم بڑھایا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ محکمہ اس صنعت کی ترقی میں کوشاں ہے اور اس کی امداد سے یہ صنعت اب بڑی حد تک سنبھل گئی ہے۔ مقامی کارخانوں میں جو ہمرو تیار ہوتا ہے اسے گھریلو صنعتوں کی فروخت کا شعبہ خرید لیتا ہے اور ہند اور ہند سے باہر ان کی فروخت کا انتظام کرتا ہے۔ اس محکمہ کے فنی مشوروں سے اب جو ہمرو تیار ہو رہا ہے اس کے ڈیزائنوں اور ان کی بناوٹ میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اس کپڑے کے سوت کے لئے جو رنگ استعمال ہوتے ہیں وہ بالکل پکے ہوتے ہیں اور یہ محکمہ صرف پکے رنگوں کا سوت ہی کپڑا بننے والوں کو فراہم کر رہا ہے۔ اب یہی محکمہ ہمرو کے مختلف ڈیزائنوں کا ایک البم شائع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ہمرو بننے والوں کی ایک کوآپریٹو سوسائٹی بھی قائم کر دی گئی ہے اور اس سوسائٹی نے بڑے پیمانے پر اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس صنعت کی ترقی کے لئے حکومت ہند نے سات ہزار ایک سو بارہ روپے کی امداد کے سوا چوبیس ہزار نو سو روپے بھی بطور قرض دئے ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ حکومت ہند نے ضروری آلات و اوزار خریدنے کے لئے مزید پانچ ہزار روپے کا عطیہ دینا بھی منظور کیا ہے۔ ہماری عوامی حکومت کی یہ نظرِ توجہ ہندوستان کی اس قابل فخر صنعت کے لئے ایک فال نیک ہے۔

کمخواب

کمخواب ایک اعلیٰ درجے کا کپڑا ہے۔ زری کے کام کا یہ کپڑا جس میں سونے اور چاندی کے تار استعمال کئے جاتے ہیں۔ اورنگ آباد اور پٹن میں بنا جاتا ہے۔ اگر زری کا کام خالص ریشم پر ہو تو اسے "امرو" کہا جاتا ہے اور ریشم کے ساتھ اس میں سونے کے تار استعمال کئے جائیں تو یہی کمخواب کہلاتا ہے۔ زری کا یہ کام ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کا ایک اعجاز ہے۔

ہندوستان میں زری کے کپڑے اور مہین ململ بننے کا فن منو کے شاستر سے بھی پرانا ہے۔ یہاں کی پرانی سے پرانی مورتیوں میں دیوی دیوتاؤں اور راجے مہاراجوں کو زرتار کپڑوں اور مہین ترین ململ میں ملبوس دکھایا گیا ہے۔ اجنتا کی تصویروں میں عورتوں کے زرتار کپڑوں کا رنگ نیلا ہے جو اب بھی ایک مقبول عام رنگ ہے۔ ہندوستانی کپڑوں اور دریوں کی رنگین دھاریوں اور گل کاریوں کی مدد سے تزئین و آرائش سے قدیم شاید ہی کوئی اور روایتی تزئین ملے۔ کمخواب یا ریشمی زرتار کپڑوں میں کئی اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ آشوریہ اور مصر نے نفیس پارچہ بافی غالباً ہندوستان ہی سے سیکھی۔ قدیم ترین زمانوں میں ہندوستان، مصر، کلدانیہ، آشوریہ، بابل اور فنیقیہ میں سوت میں سونے چاندی کے تار ملا کر کپڑے بننے کا رواج عام تھا۔ پہلے تو سونے چاندی کے چپٹے پتر دھاریوں اور پٹّوں کے لئے دئے جاتے تھے۔ پھر اس کے مہین تار بنا کر انھیں کپڑے کے اندر ہی بنا جانے لگا۔ اس کے استعمال کے قدیم ترین طریقے اب بھی پورے ہندوستان کے طول و عرض میں مستعمل ہیں۔

کمخواب کا استعمال ریشم سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ خیال ہے قدیم دنیا میں اس صنعت کو سب سے زیادہ فروغ بابل، نائنوا اور اسکندریہ میں ہوا۔ اور اس کے دیسی ڈیزائن اور فنی طریقے اختیار کئے گئے جن کی ایجاد کا فخر اہل ہند کو حاصل تھا۔ اہل ہند کو یہ طریقے اور یہ ڈیزائن رامائن اور مہابھارت کی تصنیف سے بھی پہلے سے معلوم تھے اور منو شاستر کی تدوین کے وقت ان کا فنی شعور اپنے پورے عروج پر تھا۔

رنگین ریشمی پارچہ بافی کی صنعت اصل میں بہت ہی قدیم زمانوں میں چین سے ہندوستان آئی۔ اس دیس میں مسلمان آئے تو ان کے ذوق جمال نے ریشمی کپڑوں کے ڈیزائنوں کو بھی خوب متاثر کیا۔ مسلمانوں کے بعد اہل مغرب ہند آنے جانے لگے تو اطالیہ کے بعض ڈیزائنوں کا اثر اس صنعت نے قبول کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی پارچہ بافی کی تاریخ میں کشیدہ کاری کی شکلیں قدیم زمانے سے غیر مبدل و معین چلی آتی ہیں۔ لیکن زرتار کپڑوں کے بعض ڈیزائنوں میں سولھویں صدی کے اطالوی ڈیزائنوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ قدیم زمانوں میں زرتار کپڑوں کی بڑی زبردست مانگ پردوں اور مندروں کے نقابوں کے لئے تھی۔ کتنے

ہیں اصل میں یہ صنعت مصر، ہندوستان، بابل اور فنیقیہ کی ان عورتوں کی یادگار ہے جو ایسے نقاب استعمال کیا کرتی تھیں۔

کہتے ہیں ہمرو، مشروع اور کمخواب کی صنعتوں نے اورنگ آباد اور اس کے نواحی علاقوں میں احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں کے عہد میں اپنے قدم جمائے۔ ان صنعتوں کے موروثی پارچہ باف ۱۰۰۰ھ میں گجرات سے یہاں آئے تھے جہاں ان کے اسلاف قدیم ترین زمانوں سے گجرات کے راجاؤں اور سلطانوں کی سرپرستی میں اپنی صنعت کو جلا دیتے چلے آ رہے تھے۔

پیٹھن اور اورنگ آباد میں جو کمخواب بنا جاتا تھا کسی زمانے میں اس کی شہرت پورے ملک میں تھی اور اس کے نہایت بیش قیمت تھان یہاں تیار ہوتے تھے۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے پانچویں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۶۰۳ء کے لگ بھگ ایران کے صفوی بادشاہوں کا ایک سفیر گولکنڈہ آیا اور سنہ ۱۶۰۶ء تک قطب شاہی دربار میں مقیم رہا۔ جب یہ سفیر اپنے ملک کو واپس جانے لگا تو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کے ہاتھ شاہ ایران کے لیے بیش قیمت تحفے روانہ کیے۔ ان تحفوں میں کمخواب کا ایک تھان بھی تھا۔ اس تھان کو بننے کے لیے پیٹھن کے کمخواب بننے والے تمام راچھے پانچ سال تک مصروف رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دربار کا ملک الشعرا فیضی دکن آیا اور یہاں سے جو عرضداشت اس نے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بھیجی ان میں دکن کی صنعت پارچہ بافی کی تعریف میں یہاں تک لکھا گیا کہ "صنعت پارچہ بافی در پیٹھن بے بدل است" مارکوپولو نے اپنے سفرنامے میں دکن کی صنعت پارچہ بافی کی بڑی مدح سرائی کی ہے اور سونے چاندی کے زرتار کپڑوں کی نفاست کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان کی بنت اتنی مہین اور نفیس ہوتی ہے کہ مکڑے کے جالے سے ان کا اچھی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دنیا کے کسی بھی ملک کے شاہ اور ملکہ ان کپڑوں کو پہننا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے"۔

شہنشاہ اورنگ زیب دکن میں کوئی بیس سال تک قیام پذیر رہے شہنشاہ اور ان کے امرا کے اتنے طویل قیام دکن نے پارچہ بافی کی ان صنعتوں کو اور بھی فروغ بخشا۔ شہنشاہ اورنگ زیب ہندوستان کے تخت پر کوئی پچاس سال تک رونق افروز رہے، لیکن ان کے ذاتی زہد و تقویٰ نے ان صنعتوں کی دلآویزی کو بالکل ہی متاثر نہیں کیا۔ مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر سترھویں صدی کے نصف آخر میں مغل دربار میں حاضر تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے جلوس کے جشن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: "شہنشاہ کے جلوس کے جشن کے لیے زرکار سرخ مخمل کے شامیانے کھڑے کیے گئے ہیں۔ زرکار مخمل کے یہ شامیانے اتنے زیادہ وزنی ہیں کہ انھیں تھامنے کے لیے جہازوں کے مستولوں جیسے زبردست کھمبے دئے گئے ہیں"۔

کمخواب اورنگ آباد اور پیٹھن کی دستی صنعت پارچہ بافی کی نفیس ترین پیداوار ہے۔ پیٹھن اصل میں دکن کے قدیم حکمران خاندان ساتواہن راجاؤں کی قدیم راجدھانی ہے۔ اس کا پرانا نام "پرانسٹھانہ" تھا۔ یہ دکن کے قدیم ترین شہروں میں گنا جاتا ہے اور قدیم یونانی مؤرخوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شہر اورنگ آباد سے کوئی تیس میل جنوب میں دریائے گوداوری کے کنارے آباد ہے۔ یہاں جو کمخواب ریشم میں بُنا جاتا ہے اس پر طرح طرح کی گل کاری کی جاتی ہے۔ اس کے سنہرے حاشیے پر اتنا بڑھیا کام ہوتا ہے کہ کپڑے کی قیمت اصل ریشم سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ کمخواب بننا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے خصوصی مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس کے حاشیے اور پلّو اس طرح بنے جاتے ہیں کہ اس کپڑے کے دونوں رُخ یکساں نفیس ہوتے ہیں اور ان میں اُلٹا سیدھا نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض کی بنت ململ کی طرح نہایت مہین اور نفیس ہوتی ہے۔ ان کپڑوں کے نقاب، سر کے لباس، شادی کی پوشاکیں اور ساڑھیاں بنتی ہیں۔ کاریگری اور رنگوں کے لحاظ سے اس کپڑے کی کئی قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک قسم چاند تارا کہلاتی ہے، ایک دھوپ چھاؤں، ایک بلبل چشم اور ایک مرغولہ وغیرہ وغیرہ۔

کمخواب ایک بیش قیمت کپڑا ہے۔ اب بھی اس کا ایک چھوٹا سا تھان ایک ایک ہزار روپے سے بھی زیادہ قیمت کا ہوتا ہے۔ کمخواب کے تھان عام طور پر طول میں تین گز اور عرض میں ایک گز کے ہوتے ہیں۔ قیمتی تھان صرف خصوصی آرڈر پر ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ عموماً ان کے تھانوں کی قیمت دو سو سے کر پانچ سو روپے تک ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ کپڑا گھروں کی نچلی منزلوں میں بنا جاتا ہے۔ دو مرد اور ایک لڑکا مل کر اس کا تھان تقریباً دو مہینوں کے اندر بن لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے تانے بانے میں سُوت بھی ملایا جاتا ہے اور ایسی صورت

ہیں اس کی لاگت کم ہو جاتی ہے۔ خالص سونے چاندی کی زرکاری کم ہی ہوتی ہے۔ اور عام طور پر اس میں کچھ اور دھاتیں ملا دی جاتی ہیں اور گل کاری میں بھی ریشم کی جگہ سوت کے دھاگوں کو مختلف رنگ دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں امیر امراء اور رجے مہاراجے اور خوش حال لوگ اس کپڑے کے بڑے سرپرست تھے۔ لیکن اب تو صرف شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی یہ کپڑے خریدے جاتے ہیں اور وہ بھی آرڈر دینے پر تیار کئے جاتے ہیں۔ مردوں کے لئے اس کی شیروانی اور صدری بنتی ہے۔ عورتیں اسے قدیم مغل طرز کے پاجاموں، صدریوں اور ساڑھیوں کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

پٹن میں ریشمی ساڑھیوں کے نہایت خوبصورت زریں پلو بھی تیار ہوتے ہیں۔ ان پر نہایت نفیس گل کاری ہوتی ہے اور طرح طرح کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ ساڑھیوں کے یہ نہایت درجہ خوبصورت زرکار پلو اب میز پوش، ہینڈ بیگ اور شام کے لباسوں کے لئے بھی استعمال کئے جا رہے ہیں اور ان کی بنی ہوئی یہ چیزیں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

عام سرپرستی سے محروم ہو کر پچھلے کئی سالوں سے اس صنعت کا انحطاط بڑھتا ہی جاتا تھا۔ ہمرو کی طرح کمخواب کی صنعت کو تباہی سے بچانے کے لئے ریاست حیدر آباد کے محکمہ صنعت و حرفت نے مختلف کوششیں کی ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس صنعت کو کواپریٹو کی بنیاد پر چلانے کے لئے حکومت ہند نے دو ہزار روپے بطور عطیہ دئے ہیں اور سولہ ہزار ایک سو روپے کی رقم اس کے اراکین کو بطور قرض دی ہے۔ اب پٹن کے زری بننے والے بافندوں کی ایک کواپریٹو سوسائٹی بن گئی ہے اور ان کا ایک مرکزی کارخانہ قائم ہو گیا ہے۔ اس طرح پٹن کی اس اعلیٰ صنعت کے بافندوں کو جو بڑی حد تک بے کار بیٹھے تھے اچھا روزگار فراہم ہو گیا ہے۔

ہمرو مشروع اور کمخواب کے ڈیزائن

ہمرو ہو کہ مشروع یا کمخواب ان تمام کپڑوں کے روائتی ڈیزائنوں کی خصوصیت ہندسی شکلیں ہیں۔ دھاریاں، دائرے، چرخانے وغیرہ گل کاری میں عام طور پر بوٹی بہت ہوتی ہے۔ ان ڈیزائنوں پر ایرانی اثر غالب نظر آتا ہے۔ کبھی گل کاری "شجر حیات" کی صورت میں بھی کی جاتی ہے اور پھول پتے بڑے دلکش انداز میں بنائے جاتے ہیں۔ کپڑوں پر یہ گل کاری مغلوں کا عطیہ ہے ایران کے دلکش فنون لطیفہ کی روایات سے متاثر مغلوں نے اپنے درباروں کے ذریعے اس ملک کے فنون لطیفہ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ کہیں کہیں ان کپڑوں کے ڈیزائنوں میں ہمیں بیرونی ملکوں کے ڈیزائن بھی مل جاتے ہیں بے شک ان کا خیال باہر سے لیا گیا ہے لیکن انھیں کچھ اس طرح برتا گیا ہے کہ یہ خیال ہندوستانی قالب میں ڈھل کر رہ گئے ہیں۔ کمخواب کے پلوؤں کے ڈیزائنوں میں کبھی مچھلیوں کی قطاریں بھی بنائی جاتی ہیں۔ کبھی مور اور راج ہنسوں کے جوڑے بنائے جاتے ہیں۔ ان کے سوا اور بھی پرندوں کی شکلیں ان میں جگہ پاتی ہیں۔ اب کچھ دنوں سے اجنتا کی خوبصورت دیواری تصویروں کی گل کاری کی نقل بھی ان میں دکھائی دینے لگی ہے۔ ان کپڑوں پر یہ دلکش گل کاری اور بھی زیادہ دلفریب دکھائی دیتی ہے۔

ان صنعتوں کی زبوں حالی اور ہمارا فرض

انتہائی نفاست اور اعلیٰ درجے کی فن کاری کے ساتھ پارچہ بافی کی صنعت میں ہندوستانی صنّاع قدیم ترین زمانوں ہی سے ماہر چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے دور دیسوں میں بڑی چاہت کے ساتھ خریدے جاتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب آیا اور مشین کی پیدا کی ہوئی آسانیوں نے صنعتی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تو ہماری یہ گھریلو صنعت بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی پچھلی صدی کی ابتداء میں جب یورپی ملکوں نے اپنے ملکوں کا مشینی مال ہندوستان میں پھیلانا شروع کیا تو ہندوستان کی اور بہت سی صنعتوں کی طرح ہندوستانی دستی پارچہ بافی کی صنعت پر بھی نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بازار میں جدھر جاؤ قیمتی سے قیمتی اور ہلکے سے ہلکے سبھی کپڑے مشین ہی کے بنے ہوئے ملنے لگے۔ ہمارے غریب بافندے مشین کے لائے ہوئے اس سیلاب کے سامنے کیا ٹھہر سکتے۔ ان کی حالت روز بروز زبوں سے زبوں تر ہوتی گئی اور بتدریج ان صنعتوں کا انحطاط مکمل سے مکمل تر ہوتا گیا۔

پچھلے پچاس سال ہندوستانی دستی پارچہ بافی کی تاریخ میں بڑے صبر آزما دن تھے۔ سستے کپڑوں کی روز افزوں مانگ نے بیرونی ملکوں کے کپڑوں کے لئے یہاں بڑا اچھا مارکٹ فراہم کر دیا تھا۔ ان کپڑوں کے عامیہ ڈیزائنوں نے ہندوستانی خریداروں میں بھڑکیلے کپڑے خریدنے کی بدمذاقی کا بیج بو دیا اور ہندوستانی صنّاعوں میں یورپ، امریکہ اور جاپان کے عامیانہ

اور بھڑکیلے کپڑوں کی نقّالی کا شوق پیدا کیا - یہ سچ ہے کہ پچھلے چند سالوں میں ان گھریلو صنعتوں کو مستحکم کرنے کی کوششیں ضرور ہوئی ہیں - لیکن اب بھی ہمارے عوام کی نظریں ان صنعتوں کی سدا بہار خوبیوں کی طرف سے بند ہی ہیں - یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بیرونی ملکوں میں جب کبھی صنعتی نمائشوں کے ذریعے ان کپڑوں کو ان ملکوں کے عوام سے روشناس کرایا گیا - ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور ہندوستان سے کہیں زیادہ یہ کپڑے اب بیرونی ملکوں میں فروخت ہو رہے ہیں - یہ واقعہ ہے کہ اب ہمارے فیشن اتنے بدل گئے ہیں اور ہمارے بازاروں میں سستے اور نمائشی کپڑوں کی وہ بہتات ہے اور ہمارے مذاق اس درجہ بگڑ گئے ہیں کہ ان خوبصورت اور دلکش کپڑوں کے لئے ہندوستان میں عام بازار حاصل کرنا مشکل ہی ہے - مشروع، ہمرو اور کمخواب کی صنعتیں ہمارا قومی ورثہ ہیں - یہ صنعتیں آج تک صرف اس لئے زندہ رہیں کہ ہمارے راجے مہاراجے اور امیر امراء ان کے بڑے قدردان اور سرپرست رہے - اب آزاد ہند میں راجے، مہاراجے اور امیر امراء نہ ہوں گے - اس عمومیت اور جمہوریت کے دور میں عوام ہی پر اپنی قومی روایتوں کو زندہ رکھنے کا فرض عائد ہوتا ہے - اگر ہم ان نیم جاں صنعتوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا قومی فریضہ جان کر ان صنعتوں کی امداد پر کمربستہ ہونا پڑے گا - یہ صنعتیں سرمایہ مانگتی ہیں - انھیں نئے ڈیزائنوں کی ضرورت ہے اور ان کی نکاسی کے لئے ملکی اور بیرونی منڈیوں کی حاجت ہے ان صنعتوں کو ایسے لوگوں کی تنظیم اور ہدایت کی ضرورت ہے جو رنگوں اور شکلوں کا وجدانی ذوق رکھتے ہیں - یہ لوگ غریب ہیں، مفلس ہیں - درماندہ ہیں - لیکن انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے اعلیٰ درجہ کی صنّاعی اور فنون لطیفہ کی نزاکتیں ورثے میں پائی ہیں - انھوں نے اپنے فن کو اب تک بے میل اور خالص رکھا - انھوں نے ان کپڑوں میں نمائشی بھڑک پیدا کر کے یا ان کے بھچھورے اور عامیانہ ڈیزائن بنا بنا کر بد مذاقی نہیں پھیلائی اور اس طرح عظیم الشّان فن کی تذلیل اور توہین نہیں کی ہے -

ہندوستانی موسیقی نمبر

آج کل کا ماہ اگست کا شمارہ ہندوستانی موسیقی نمبر ہوگا

یہ شمارہ سہ رنگی اور دوسری تصویروں کے ۱۶- اور مضامین کے ۱۱۲ صفحوں پر مشتمل ہوگا - ہندوستان کے مقتدر ماہرانِ موسیقی کے سوانح اور موسیقی کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ مضامین شاملِ اشاعت ہوں گے -

قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی - یہ شمارہ خریداروں کو سالانہ چندے ہی میں ملے گا

آج ہی سے خریدار بن جائیے تاکہ یہ شمارہ آپ کو عام شماروں کی قیمت پر مل جائے - آج کل کا سالانہ چندہ صرف ۶ روپے ہے -

ایجنٹ حضرات اپنی فالتو ضروریات کا آرڈر ابھی بھیج دیں - بعد میں ممکن ہے تعمیل نہ ہو سکے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹری ایٹ دہلی

مصلح الدین احمد اسیر

لسان الحق شاہ تراب کاکوروی رح

لکھنؤ میں میر تقی و سودا گہر ہائے آبدار بکھیر رہے تھے، دلّی میں خواجہ میر درد نغمہ طراز تھے، میر حسن بھی لکھنؤ پہنچ چکے تھے، حضرت مرزا جان جاناں عالم حیات میں تشریف فرما تھے، مصحفی ابھی دلّی ہی میں فروکش تھے، اُردو شاعری لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم ناز رکھ چکی تھی، بارھویں صدی پوری ہونے میں اُنیس سال کا قلیل عرصہ باقی تھا کہ اُردو کے مردم خیز قصبہ کاکوری میں حضرت شاہ محمد کاظم قلندر رح کے دولت خانے میں فرزند دلبند کی مبارک بادیاں دی جا رہی تھیں۔ کون جانتا تھا کہ یہ فرزند سعید کیا ہوگا مگر حقیقت میں نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا کہ یہ بیک وقت عالم، صوفی، فقیہہ، درویش، مؤرخ اور شاعر بے بدل اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہوگا اور اس کی خاکِ قدم زمانے کی آنکھوں میں توتیا بن کر رہے گی۔

تراب علی نام، تراب تخلص، بانی تکیہ شریفہ کاکوری شاہ محمد کاظم قلندر کے صاحبزادہ، علوی نسب، مخدوم نظام الدین قاری عرف شاہ بھیکہ کاکوروی کی اولاد اور رعیان وہ شرفاء قصبہ میں سے تھے۔ شریعت، طریقت اور حقیقت کے جامع، علوم ظاہری، باطنی سے آراستہ و پیراستہ، بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق' کے مصداق۔ فقر و درویشی میں اسلاف کے قدم بہ قدم شعر و سخن ادب و تاریخ و فقہ میں عالم و فاضل غرضکہ ایامِ طفولیت ہی سے 'ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات' ان کے ناصیہ مبارک سے ہویدا تھے۔

مُلّا قدرت اللہ بلگرامی، مولوی معین الدین بنگالی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا حمید الدین محدّث کاکوروی سے سبق لئے، قاضی القضات نجم الدین علی خاں بہادر سے عروض اور مولوی فضل اللہ ساکن نیوتنی سے فقہ پڑھی۔ والد ماجد نے صاحبزادے کا رجحان تقویٰ و پرہیزگاری کی جانب دیکھ کر تعلیم و تربیت کے لئے اپنے زیر سایہ رکھا، مسائل فقہ پر عبور ہو جانے کے بعد کتب تصوّف پڑھائیں، بارہ سال کی عمر سے اذکار کی مشق کرائی، پندرہ سال کی عمر میں تلقین و ارشاد کے مراتب حاصل کر چکے تھے، وصال کے بعد منظفرالدولہ بخشی الممالک ابوالبرکات خاں کی نواسی دختر شیخ محمد عوض جیکلہ دار سے عقد نکاح ہوا

شاعری جذبات نگاری یا وارداتِ قلبی کو قلمبند کرنے کا نام ہے، احساسات و ادراک کو موزوں پیرایہ میں پیش کرنے کی صلاحیت جو فطرتاً اپنے ساتھ لایا ہو وہی روح نغمہ بن کر دنیا پر چھا سکتا ہے۔ قال اگر حال کی تصویر پیش کر سکے تو وہی تیر سامع میں پیوست ہو جاتا ہے اور سامع کا دل لوٹ پوٹ ہو کر اس کی روح کو عالمِ بالا کی جانب صعود کرنے پر مائل کرتا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں وجد حال کہتے ہیں، حضرۃ کی شاعری اردو ہو کہ فارسی یا ہندی سرتاپا تاثیر اور سوز میں ڈوبی ہوئی ہے، وارداتِ قلبی کی گوناگوں موجیں اس میں لہریں مارتی ہیں احساسات و ادراکات اور جذبات نگاری کا مرقع ہے کیونکہ ایک عارف کا نقدِ حال ہے جو کلام موزوں کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا گیا ہے تشبیہات کی برجستگی، جذبات کی مصوری، معاملہ بندی کی لطافت، واقعہ نگاری کا کمال قابل صد ستائش ہے۔ زبان پُرانی ہو چکی ہے۔ بعض محاورے اب متروک ہیں تاہم بیشتر حصۂ کلام اس قدر سا اثر سے لبریز ہے کہ سننے والوں کے دل لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

آپ کا کلام اردو، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں ہے مگر زائد حصّہ اُردو میں ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ نے کسی کو نہ اپنا کلام دکھایا اور نہ اصلاح لی اور عجیب تر یہ کہ ایک شعر بھی آپ نے تکیہ شریف پہ بیٹھ کر کبھی نظم نہیں فرمایا۔ بلکہ قاعدہ یہ تھا کہ جب قصبے تشریف لے جاتے تو آنے جانے میں دو غزلیں کہہ لیا کرتے اور تکیہ شریف پر آ کر اپنے مرید مخلص و حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر کے پوتے جناب مولوی عبدالباسط صاحب کو سنا دیا کرتے، اور وہ فوراً لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ کہنا صحیح طور پر مشکل ہے کہ پہلا شعر آپ نے فارسی میں کہا یا اُردو میں، مادری زبان اُردو تھی اس لئے فطرتاً پہلا شعر اردو ہی میں موزوں ہوا ہوگا۔ تاہم وہ، وہ زمانہ تھا جبکہ شرفاً اردو زبان میں خط و کتابت کو معیوب سمجھتے تھے اور

گفتگو بھی زیادہ تر فارسی میں کرتے تھے اس لئے اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت کی شاعری کا آغاز فارسی ہی سے ہوا ہو، اس خیال کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ آپ کا پہلا تخلص ہشید تھا جو بعد کو تراب قرار پایا۔ اردو کی کسی غزل میں ہشید کا نام نہیں مگر کلیاتِ فارسی میں اس کی شہادت موجود ہے۔

مگذار کہ حسبِ عالم آمد
ایں بیت کہ گفتۂ ہشید است

فارسی شاعری پر اس وقت تبصرہ کرنا منظور نہیں۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مثنوی اصل المعارف کی زبان نہایت سلیس ہے اور مضامین دقیق کو عام فہم بنا کر پیش کیا ہے۔

نیست در دیدہ دیکر جز یکے جو   مختلف باشند گوا ندر وجود
فرق در صورت ز زید ست و بکر   در حقیقت نیست فرقے معتبر
دیدہ و خالد جملہ وہم و خیال   حضرتِ حق است ظاہر ذوالجلال

اس مسئلہ کو زبانِ شریعت میں یوں ادا فرمایا ہے۔

بحر در صورت ز موج خود جدا ست   در حقیقت لیک عینِ موج ہاست
غیر محض از موج را گوئی خطاست   عین صرف ار گوئی ایں ہم نارواست
چونکہ با دریاست قائم موجہا   گر جدا از وے شود گردد فنا
ہم چنیں جملہ جہاں را با خدا   نسبتے عین و دوئی ہست اے گدا
پس بظاہر غیر میں گو خلق را   در حقیقت دان مے عین خدا

حضرت کی اردو شاعری کی ابتدا ۱۲۱۱ھ سے پیشتر ہو چکی تھی۔ کلیات گلہائے رنگیں و بوقلمونیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری تین دوروں میں منقسم ہے۔ اوّل سے غلبۂ عشق مجاز کا پتہ چلتا ہے، دوسرے میں مجاز و حقیقت دونوں کی آمیزش معلوم ہوتی ہے اور تیسرا سراسر حقائق و معارف سے لبریز نظر آتا ہے۔ پہلا دور تیس سال رہا اور مثنوی "عاشق صنم" کا بیشتر حصہ اسی زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ مثنوی عاشق صنم پر قلم اٹھانے کے لئے ایک علیحدہ گنجائش نکالنے کی ضرورت ہے، اس لئے اس کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں اس وقت محض اردو شاعری پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

آپ کے دیوان اردو میں دیوان حافظ کی طرح فال بھی دیکھی جاتی ہے۔ کلیاتِ فارسی آپ کا سہ بارہ مطبع سرکاری رام پور میں طبع ہوا۔ اس میں علاوہ دیوان کے مثنوی اصل المعارف و ترجیع بند و مخمس کریما بھی شامل ہے۔ اور کلیاتِ اردو سات آٹھ مرتبہ مطبع نول کشور میں طبع ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کلیات مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں علاوہ دیوان کے مثنوی عاشق و صنم و شجراتِ منظوم اور ٹھمریاں بھی ہیں۔ محمد رضا صبر کاکوروی جو شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے، قطعۂ تاریخ میں لکھتے ہیں ؎

بشر کا قول نہیں یہ کلام قدسی ہے   کسی نے ایسے اثر کی زبان کہاں پائی

اور منشی مقصود احمد نیلق نے جو خود ایک باکمال شاعر تھے اور اساتذۂ فن میں شمار کئے جاتے تھے، تحریر کیا ہے ؎

حق سے راز دنیا زہے ان میں   صوفیوں میں عجب کتاب ہے یہ
گویا دیوان خواجہ حافظ کا   ریختہ میں رقم جواب ہے یہ

آپ کے کلام کے مطالعے سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ آپ کی غزلیں حافظ کی غزل کی طرح بہت ہی مرتب ہوتی تھیں۔ ایک غزل ایک ہی کیفیت کی حامل، ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے یعنی آپ کی غزل کا ہر ہر شعر موتی کی لڑی کی طرح پرویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح ہر ہر شعر جدا جدا کیفیات کا ترجمان نہیں ہے کہ وصل کا حال کہتے کہتے فراق کا رونا رونے لگیں۔ آپ نے اگر کبھی وصل کی کیفیت قلم بند فرمائی ہے تو غزل اُسی کیفیت سے لبریز نظر آتی ہے، اور اگر کہیں فراق و ہجر کے جذبات پر قلم اُٹھایا ہے تو غزل کا ہر ہر شعر فراق ہی کا قصہ بیان کر رہا ہے، اور دراصل جذبات نگاری اسی کا نام ہے بھی، کیونکہ ایک وقت میں ایک شاعر ایک ہی قسم کے جذبات کا علمبردار ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ہجر اور وصل دونوں متضاد کیفیتیں دل میں پائی جائیں، اور شاعر اس کی ترجمانی کر سکے۔

آپ کی شاعری اصلاحی، حقائق و معارف سے لبریز کیفیات دلی کی علمبردار اور آپ کے مسلک کی آئینہ دار ہے۔ ذیل میں چند اردو اشعار پیشکش کئے جاتے ہیں ؎

عاشقی کا ن نامرادی ہے   عشق دکانِ نامرادی ہے
کون اس راہ میں قدم رکھے   یہ تو میدانِ نامرادی ہے

عشق و عاشقی کے متعلق صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ نامرادی کی کان اور دکان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس نامرادی کے میدان سے الگ ہی رہو۔

لیکن اگر قدم رکھ چکے ہو تو سب کچھ ہیچ کر اور تیغ کر نامرادی کے میدان میں آ جاؤ، اور ہوا و ہوس کے دام سے رہائی حاصل کرو ۔

اس کی بے الفتی و استغنا　　ساز و سامانِ نامرادی ہے

اور اس نامرادی کے ساز و سامان کے حصول کے لئے اُس کی بے الفتی و استغنا سے استفادہ کرو، وہی تم کو اس نعمتِ گراں بہا سے مالا مال کر سکتی ہے ۔

اور سے حکم ہے کہ مانگ مراد　　ہم سے فرمانِ نامرادی ہے

یہاں تو یہ حال ہے کہ غیر جس نے کہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں چکھی ہے، اُس سے اس فرمائش کی جاتی ہے کہ مرادیں مانگو ہم پوری کریں گے، اور ہم جو اُن کی محبت میں سراپا آرزو و مراد بنے ہوئے ہیں ہمارے لئے یہی حکم ہے کہ تیرے لئے نامرادی ہی خوب ہے ۔

ہاتھ اُٹھائیں نہ کیوں دعا سے ہم　　وہ تو خواہانِ نامرادی ہے

اور جب وہی (معشوق) خود نامرادی پسند کرتا ہے تو ہم دعا مانگ کر کیا کریں، اب تو دعا سے دست کشی ہی اولیٰ ہے ۔

نامرادی کی بھی طلب نہ رہے　　یہی پایانِ نامرادی ہے

اور نامرادی کی انتہا کیا ہے؟ یہ نہیں کہ نامرادی کی تکلیف دل سے مٹ جائے بلکہ نامرادی کی انتہا دراصل یہ ہے کہ خود نامرادی کے حصول کی طلب بھی دل سے جاتی رہے ۔

اہلِ فقر و غنا ہیں جو اُن پر　　نت نئی شانِ نامرادی ہے

جو اپنے آپ کو مٹائے ہوئے ہیں، جو نامرادی کو بھی ٹھوکر مارے ہوئے ہیں انھیں کے پاس نامرادی نئے نئے لباس میں اور مختلف صورتوں میں متشکل ہو کر آن بان کے ساتھ آیا کرتی ہے اور وہ اُس سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

ہے عجب ان دنوں تراب کا حال　　دست و دامانِ نامرادی ہے

جیسے کہ ان دنوں تراب کا حال ہے کہ اس کا اوڑھنا بچھونا نامرادی ہی نامرادی ہے ۔

نشاں اس کا کسی سے کیا بیاں ہو　　وہی پا وے نشاں جو بے نشاں ہو

کیا اچھی تعلیم ہے، مطلب یہ ہے کہ اُس بے نشان کے حصول کے لئے خود ہی بے نام و نشان ہو جاؤ، جب جا کر کہیں اُس کا پتہ لگ سکے گا، ورنہ محال ہے کہ اُس کا نشان حروف و صورت کی شکل میں پیش کیا جا سکے، اُس کی ترجمانی کے لئے لغات گونگے ہیں۔ وہ صرف حاصل کیا جا سکتا ہے بیان میں نہیں آ سکتا ۔

منزّہ وہ تو ہے کون و مکاں سے　　مکاں اُس کا کہاں جو لا مکاں ہو

کیونکہ وہ مقامیت و مکانیت سے پاکیزہ تر ہے اور جب وہ لامکاں ہی ٹھہرا تو اس کا مکاں کہاں پاؤ گے، لامکاں کی سیر کرو اور اس کی یافت سے دم نقد خوش وقت و شاد کام ہو ۔

کوئی جاگہ نہیں ہے، اس سے خالی　　زمیں ہو، عرش ہو، یا آسماں ہو

سوا اس کے نہیں کوئی جہاں میں　　تلاش اس کی کرو یا رو جہاں ہو

ڈھونڈھنے والے کے لئے کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ موجود نہ ہو۔ زمین، عرش، آسمان، جہاں دیکھو وہی وہ ہے، مشرق سے مغرب تک، اور شمال سے جنوب تک سوا اس کے اور کون ہے۔ وہی تو موجودات عالم کی رُوح ہے۔ اے دوستو! جہاں کہیں بھی تم ہو اُسی کی دُھن میں رہو، اُسی کی یاد و بود کرو، اُسی کی جستجو میں اپنی جانِ عزیز قرباں کرو۔ اور کسی صورت سے اُس کا شہود حاصل کرو ۔

ٹھکانا اس کا میں کیوں کر بتاؤں　　خدا جانے وہ ہرجائی کہاں ہو

تم اگر مجھ سے اس کا کوئی خاص ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانا ہو تو بتایا جائے۔ ذرّہ ذرّہ میں وہی جاری و ساری ہے۔ عرش سے فرش تک اسی کی ضیا ہا بیاں ہیں۔ ایسے ہرجائی کے متعلق کوئی مقام کیوں کر مختص کیا جا سکتا ہے ۔

تراب اُستاد سے معلوم کر لو　　طریقِ معرفت گر قدرداں ہو

اے تراب بہتر صورت یہ ہے، اگر تم واقعی اس کی معرفت، اس کی شناخت اس کی تلاش حاصل کرنے کے درپے ہو تو جان و مال کھپاؤ، اور اپنے استاد اپنے رہبر اپنے ہادی اپنے پیر و مرشد کی امداد و فیضان سے اُس کو ڈھونڈھ نکالو کہ یہی سب سے سیدھا راستہ ہے، بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں حکمت کی دو قسمیں ہیں نظری و عملی، نظری سے تو صرف حکمت کے حقائق پر روشنی پڑتی ہے اور اُس کے متعلق جو معلومات ذہن نشین ہوتے ہیں، اب اگر کوئی شخص اِس سے زیادہ کے حصول کا متمنی ہے تو وہ عملاً اس کی آزمائش کرتا ہے۔ اُس میں در آتا ہے، اس کا تجربہ کرتا ہے، اور تجربہ کے بعد نتیجہ اخذ کرتا ہے، اور وہی انسان قابل تعریف

بھی سمجھا جاتا ہے جو خود عملی ہو اور اس ترکیب کے ساتھ ارباب حکمت کو پیش کرے اگر وہ چاہیں تو اس پر عمل پیرا ہوں اور نتیجہ برآمد کرکے تہ کی کوڑی نکال لائیں۔

حضرت لسان الحق کی شاعری محض زبانی جمع وخرچ نہیں ہے بلکہ نظری کے ساتھ ساتھ عملی ہے۔ تلاشِ حق کے رموز و نکات بیان فرماتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس کا سیدھا راستہ اور اُس راستے پر چلنے اور حصول مقصد کا عملی راز بھی سمجھا دیتے ہیں اور شاعری کا یہی مقصد بھی ہے کہ وہ جس قوم کی زبان میں ہے اُس قوم کی اصلاح کرے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری قوم اس درجہ گم کردہ راہ ہے کہ اس کو اپنا مقصدِ حیات ہی یاد نہیں رہا وتر حصولِ مقصد تو در کنار۔ اُس کے لئے صرف یہی ایک شعر شمع راہ ہے ؎

ترابؔ استاد سے معلوم کر لو طریقِ معرفت گر قدر داں ہو

مگر رونا تو اس کا ہے کہ کوئی قدر داں ہی نہیں ہے۔

اس وقت میں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے وہ بہت بسیط ہے۔ اور اس سے زیادہ وسعت کا طلب گار، اس لئے میں اب حضرت لسان الحق کی چند غزلوں کو ہدیہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اُن کی شرح خود ناظرین کی سمجھ بعقل اور ادراک پر چھوڑتا ہوں ؎

پہلا دَور

یہاں تک بڑھی ناتوانی ہماری کہ دوبھر ہوئی زندگانی ہماری
لگا وار اس پر کہا اُس صنم سے رہے گی صدا یہ نشانی ہماری
جیئے اب تلک ہم جدائی میں اُس کی اجل دیکھنا سخت جانی ہماری
ترابؔ اس کا احوال کس سے کہیں میں ہوئی عاشقی اک کہانی ہماری

عزیزو ناحق اس کی دوستی کی مجھ پہ تہمت ہے! نہ صحبت ہے نہ ملت ہی فقط صاحب سلامت ہے
نہ پوچھو اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں دلربائی کی حیا ہے ناز ہے غمزہ ہے عشوہ ہی نزاکت ہے
اگر اس وقت یاں آوے تو کچھ اور ہی تماشا ہو لب دریا ہے گل ہے جام مُل ہی بزم عشرت ہے
کہے کیا عاشقِ شیدا کہ حاصل عشق کا ہی کیا قلق ہے درد ہے، غم ہے، فضیحت ہی ملامت ہے
ترابؔ اک بار کیا سو بار پوچھے کوئی کہدوں میں صنم سے مجھکو اُلفت ہی تعلق ہے محبت ہے

جس کی تصویر دل میں چھائی ہے ہم سے آنکھ اُس نے کیوں چرائی ہے
ہجر میں کیجئے کہاں تک صبر نہیں اب طاقت جدائی ہے
کون خوبوں سے آشنا ہوئے کچھ نہیں اُن کی آشنائی ہے
پہلے ہے لطف و پیار آخرکار ستم و جور و بے وفائی ہے
مجھ کو دیوانہ کرکے کہتا ہے تو نے یہ شکل کیا بنائی ہے
لے گیا دل ترابؔ کا وہ شوخ شاہ کاظم تری دہائی ہے

اُس دن سے پھر کبھی نہ ہماری پلک لگی آنکھوں میں جب سے یار کی پیاری جھلک لگی
یا رب وہ کیا بشر تھا کہ جس کی مثال میں شکل پری نہ صورتِ حور و ملک لگی
زنار باندھ لے ابھی تسبیح ڈالے توڑ زاہد اگر تو دیکھے وہ صورت تلک لگی
پھرتا ہے گرد اس کے میری طرح رات دن تیری بھی آنکھ یار سے کیا اے فلک لگی
دب جائیے ترابؔ تو بکتا ہے عشق میں اُس بت سے لو رہے دم آخر تلک لگی

شاعری کا دوسرا دور

جب مسندِ تلقین و ارشاد پر متمکن ہوئے تو حضرت کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا، اب تصوف کی چاشنی تیز ہوئی اور کلام میں جوش و خروش پیدا ہوا ؎

مری عاشقی کا مچا ہے شور کوئی دیکھیے میرے جنوں کا زور
جو اُجاڑ جنگل تھا قیس کا اُسے جا کے میں نے بسا دیا

حق تعالیٰ عشق اپنا دے تو بہتر ہے ترابؔ حُسن صوری کچھ نہیں اُس سے تو جی بالکل اُٹھا

مصحفیؔ ہنوز زندہ تھے، آتشؔ کی شہرت کا آغاز تھا ؎

آتشؔ کی غزل دیکھی سُنا سوزؔ کا واسوخت تجھ سا میں ترابؔ ایک نہ دیکھا نہ سنا گرم

جوش و خروش میں سوداؔ ضرب المثل تھے، اور میر دردؔ صوفیانہ شاعری کے پیغمبر خیال کئے جاتے تھے ؎

ہمدم ترابؔ کا ہے اُلفت میں دردؔ و بیدلؔ ہجراں میں سوزؔ و حسرتؔ وحشت میں یار سوداؔ

حضرت کی زبان اب بھی ابتدائی دور کی سی تھی، بندش نسبتاً صاف ہے عشق مجاز ہے اور حقیقت بھی فلسفہ اخلاق ہے اور داستانِ محبت بھی۔ دیوان کا بیشتر حصہ اسی دور میں مرتب ہوا۔ ہندی ٹھمریاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ کلام میں اس قدر شیرینی پیدا ہو گئی تھی کہ استاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرہ "ریاض الفصحا" میں جس کا سال اختتام

۱۲۳۳ھ نے حضرت کو فصحا میں شمار کیا اور آپ کی ذہانت اور طبع رسا کی داد دی۔

"شاہ تراب علی تراب تخلص پسر شاہ محمد کاظم قلندر ساکنہ کاکوری طبع رسا و ذہن ذکا دارد، از انتخاب اشعار اوست"

صورت میں حقیقت جسے مشہود ہے یارو — اپنا تو وہی ہادی و معبود ہے یارو
رہتا ہے تراب اس کے ہی کوچے میں ہمیشہ — اس کی تو وہی منزل مقصود ہے یارو

رسیلی آنکھ تیری گرچہ قتل عام کرتی ہے — مگر یہ شوخ چتون اور ہی کچھ کام کرتی ہے
محبت سے میں ہوں ناچار گو اس نے کہا سو کیا — تراب الفت تری مجھ کو بہت بدنام کرتی ہے

شوخی و رندی تری یہ کب تلک بس کر تراب — اب تو دن پیری کے آئے نوجوانی ہو چکی
پھرا انا الحق ہی نکلتا ہی مرے منہ سے تراب — جس گھڑی اپنی خودی میں گزر جاتا ہوں

اس غزل میں اپنی گزری ہوئی کہانی ہے اور اس کا انجام

دل کو میرے عشق کی جس دن سے بیماری ہوئی — ایک پل جی کو نہیں کل زندگی بھاری ہوئی
پھنس گیا زلفوں میں ایسا چھوٹنا مشکل پڑا — ہائے اس جنجال میں بے ڈھب گرفتاری ہوئی
دین و ایمان عقل و عرفان عشق میں سب کام ہوا — زہد و تقوی کب ہا کافر سے جب یاری ہوئی
فی الحقیقت کچھ نہیں یارو کسی کا اختیار — بندۂ مجبور کو کہنے کو مختاری ہوئی
یارو تم کیا کہتے ہو ہم کو نہیں معلوم کیا — عاشقی میں جو ہماری ذلت و خواری ہوئی
کیا نکل سکتا تراب اس نوجوان کے دام سے — لی خبر پیروں نے مرشد کی مددگاری ہوئی

میں حقیقت میں نہیں صورت پرست — دیکھتا ہوں سب کہیں حق کا جمال
اس بت کی محبت کا اگر بھید کہوں میں — سکتے میں مسلمان ہو حیران ہو کافر

اس وقت لکھنؤ میں ضلع جگت کا بازار گرم تھا۔ حضرت نے بھی اسی رنگ میں جوش طبعی کے جوہر دکھائے ہیں۔

اس نے دل کو مرے پتنگ کیا — عشق بازی میں خوب چنگ کیا
خط کو میرے بنا کے کاغذ باد — پیٹا پھاڑا نہ کچھ درنگ کیا
کس کے بل سے وہ ہو گیا چنچل — کس نے شہ دیکے گولہ ڈھنگ کیا
ڈور اس کی لگی ہے اور کہیں! — ناحق الجھا کے ہم کو تنگ کیا
ابھی اک ڈھیل دوں تو کٹ جائے — مجھ سے کیا پھوٹ کے ساز جنگ کیا
اس سے کھینچے عبث اڑن گھائی — عاشقی نے جسے اکنگ کیا!
وہ تو سادہ دکھاوا لگا تھا — ہم نے مانجھے سے اس پہ رنگ کیا
چاندتارا سا بنا دیا جس کو — اس نے پھر ہم سے یہ ترنگ کیا
وہ ہوا خواہ ہے تراب اپنا — بڑھتی ہو اس کی جس کے سنگ کیا

عارف اس کو کہئے جو اپنے تئیں پہچان لے
ہر جگہ اپنی حقیقت کا تماشائی رہے

دلا سراپا سرو رہو جا نکل کے ظلمت سے نور ہو جا!
خدا کے نشہ میں چور ہو جا رہے گا مست شراب کبتک
مجھے تو آتی ہے اس پہ رقت کہ عشقبازی ہے اس کی غفلت
وہ دام صورت میں فی الحقیقت پھنسا رہے گا تراب کبتک

ہشیار میکدے میں نہ پایا کسی کو آہ — بیخود کوئی نظر نہ پڑا خانقاہ میں

مے وحدت سے کوئی اک لبالب مجھ کو ساغر دے — میں صدقے اس کے ہو جاؤں جو متوالا مجھے کر دے
پلا ساقی مجھے وہ مے جو ذوق بیخودی بخشے — رگ و ریشہ میں میرے کیفیت منصور کی بھر دے
تو شیخ جام کر مجھ کو قسم ہے پیر مغ تجھ کو — سقاہم ربہم پڑھ کے شراب اک مرے دھر دے
ملامت عشقبازی کی اٹھائے کون شیخی میں — تراب اس کام کا تو ہے کہ ہر کا لے وہ سر مردے

تیسرا دور

مسئلہ وحدت الوجود حضرت کا حال تھا۔ آخری دور کی غزلیں سرتاپا حقائق و معارف کی تعلیم ہیں۔ توحید کی تلقین ہے یا فلسفہ اخلاق، بے ثباتی روزگار کا اظہار ہے یا انقلاب عالم کی روداد، تجلیات کی بوقلمونی کا انکشاف ہے یا تصفیۂ قلب و ترک تعلقات کا ارشاد۔

شاہ نیاز احمد بریلوی ان کے ہم مشرب تھے، مگر ان کے کلام میں عشق مجاز کمیاب ہے۔ خواجہ میر درد کے دیوان میں مجاز کا اس قدر غلبہ ہے کہ حقائق و معارف کے موتی تلاش کرنے سے دستیاب ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور صفائی بندش کے اعتبار سے بیشک میر درد کا مرتبہ اردو کے صوفیانہ شاعروں میں اول ہے لیکن حقائق تصوف کے بیان اور آمیزش مجاز کے لحاظ سے شاہ تراب کا دیوان "جس کا اول نہیں وہ ثانی"۔

اس دور کی چند غزلیں اور اشعار پیش ہیں ؎

وحدت الوجود

مجھے یار سے اب یہی گفتگو ہے — جو تو ہے سو میں ہوں جو میں ہوں سو تو ہے
مجھ سے سب مانگتے ہیں اپنی مراد — سب کا مقصود و مدعا ہوں میں
ہوں بری وہم و فہم سے تیری — کیا بتاؤں تراب کیا ہوں میں
مراد ار الخلافت آسمان کبریائی ہے — جہاں کا میں جہانباں ہوں جہان کبریائی ہے
زمیں سے تابہ فلک بلکہ او عرش تلک — جو دیکھتا ہوں تو سارا وجود ہے اپنا!

تصفیۂ قلب

دن کو خراب آرزوئے نفس نے کیا! — دل صاف وہ ہے جس میں کوئی آرزو نہ ہو
نفس کی اصلاح کر پہلے ریاضت سے تراب — بے شکستِ نفسِ امّارہ ظفر ملتی نہیں

بے ثباتی روزگار

کچھ نہیں اعتبار دنیا کا — ہیچ ہے کاروبارِ دنیا کا
چاہیئے سب کو آخرت کا غم — غم نہ ہو زینہارِ دنیا کا
چشمِ عبرت سے ہم نے دیکھا خوب — اس جہاں کا عجیب عالم ہے
پھول ہنستا ہے اور کلی ہے چپ — منہ پہ دو دو تُوں کے روتی شبنم ہے
کس سے کہیئے تراب اس کا بھید — اس حقیقت سے کون محرم ہے

تسلیم و رضا

تراب اپنی تدبیر سے باز آ — برائے خدا تن بہ تقدیر ہو
کوہ مل جائے بندگوں کے تصرف سے تراب — گر وہ بے حکمِ خدا چاہے تو پتّہ نہ ہلے

فلسفۂ اخلاق

جو یہاں بوئے گا تخم اس کا وہاں پائے گا پھل — وہ جہاں دار الجزا ہے یہ جہاں دار العمل

شستشو ظاہر کی اے زاہد بہت کرتا ہے کیوں
جامۂ دل کو بداخلاقی سے دھونا چاہیئے

آدمیت جس میں ہو کہتے ہیں اس کو آدمی — اس کو حیواں کہئے جو اخلاقِ انساں چھوڑ دے
طینتِ انساں کی خاکساری ہے — جو تکبر کرے وہ ناری ہے

تجلیات

موسیٰ نے جسے جلوہ نما طور سے دیکھا — کالبرق اُسے میں نے بھی کل دور سے دیکھا
بے خبر ہو کے دیکھ تماشائے دل تراب — کیا کیفیت ہے کیا یہ تجلّیِ نور ہے
بجلی چمکے تو ابھی آنکھ جھپک جاتی ہے — بھر نظر کس نے بھلا صورتِ جاناں دیکھی

واقعات

۱۲۳۹ھ میں شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کا انتقال ہوا، فرانس کی لیڈیاں معصاحبت میں رہتی تھیں اور یورپ کے خط تراش رفیق تھے۔ پیرس کا فیشن پسندِ خاطر تھا ؎

جس شاہ کے نوکر تھے بہت گورے فرنگی — وہ گور میں تنہا ہے نہ کوئی ساتھی دنگی
دن میں جو بدلتا تھا کئی طرح کی پوشاک — افسوس ہے لاش اسکی پڑی خاک میں ننگی

جو ڈھونڈھے تھا خیمہ کے لئے وسعتِ میداں
کیا سخت عذاب اُس پہ ہوئی گور کی تنگی!

خاک میں گل گئے آتی ہے کفن سے بدبو — سیج پر پھولوں کی سوتے تھے جو نت عطر لگے
کیا ہی آغوشِ لحد میں ہیں بُری حالت سے — جو بہت ناز سے تھے گود میں دائی کی پلے

آمد و رفت سے ارواح کے کیا کہیئے تراب
کس طرح آئے کہاں جاتے ہیں کیا کر کے چلے

۱۲۵۶ھ میں امیر دوست محمد خاں والئی کابل پر انگریزوں نے چڑھائی کی۔

جس کا اقبال ہو تنزل پر — وہ چڑھے لے کے فوج کابل پر

غزلیات

آدم کو ملک کہتے تھے کیا خاک بنے گا — سمجھے نہ کہ سرتا قدم ادراک بنے گا
مٹی خاک سمجھو اُن کی کسی نے نہ یہ سمجھا — آدم دمِ حق سے نفسِ پاک بنے گا
ہوئے گا کوئی دم میں یہ مسجودِ ملائک — ہے خاک نشیں حاکمِ افلاک بنے گا
اولاد سے ہوگا اُسی کے وہ پیمبر — جو صلِّ علیٰ صاحبِ لولاک بنے گا
رہ شاد تراب اپنی حقیقت کو سمجھ کر — صورت کے لئے کاہے کو غمناک بنے گا

خدا نے حسن کو خوبی دی وہ برقع منہ پہ ڈالے ہیں
کمال اپنا چھپائیں کیوں نہ جو اللہ والے ہیں

تو اربابِ ملامت کی صلاحیت سے کیا واقف
بغل میں حسن کی شیشے اور ہاتھوں میں پیالے ہیں

تو کیا جانے کسے مجذوب کہتے ہیں کسے مجنوں
کہاں اندھے کو سوجھے ہے یہ گورے ہیں یہ کالے ہیں

ولی کو جز ولی ہرگز نہیں پہچانتا کوئی
جو بندے خاص ہیں حق کے وہ دنیا سے نرالے ہیں

ہزاروں اولیا مکتوم و صدہا اہلِ خدمت ہیں
اُنہیں سے خیر و برکت ہے وہی دنیا سنبھالے ہیں

تراب ان سے کہاں اظہار ہو کشف و کرامت کا
ہمیشہ جن کو حق سے اپنی گم نامی کئے لالے ہیں

مجھے یار سے اب یہی گفتگو ہے — جو تو ہے سو میں ہوں جو میں ہوں سو تو ہے
مئے عشق میں کیا مزا ہے نہ پوچھو — عجب بیخودی ہے عجب ہائے و ہُو ہے
جہاں تک نظر جائے دیکھو اسی کو — جہاں میں وہی جلوہ گر چار سُو ہے
نہ سمجھے کوئی یار سے غیر مجھ کو — کہ صورت میں میری وہی ہو بہو ہے
تراب اُس نے دل میں ترے گھر بنایا — تو کس کے لئے دربدر کو بکو ہے

خدا کی شکل پر آدم بنا ہے   یہ آدم کیا عجب عالم بنا ہے

دل اس کا ہے مثال لوح محفوظ   اسی کی نقل جام جم بنا ہے

کہیں موسیٰ کہیں فرعونؔ ہاماںؔ   کہیں عیسیٰ کہیں مریم بنا ہے

کہیں ناہدکسی عابد کہیں رند   کہیں شبلی کہیں آدہم بنا ہے

کہیں ہنستا کہیں روتا کہیں چپ   کہیں شادی کہیں ماتم بنا ہے

کہیں حکمت کہیں دارو کہیں درد   کہیں زخمی کہیں مرہم بنا ہے

کہیں ذرہ کہیں خورشید غرہ   کہیں قطرہ کہیں قلزم[1] بنا ہے

ترابؔ اس کو کسی دم بھولئے مت   کہ وہ ہر دم ترا ہمدم بنا ہے

جو بندہ سیم و زر کا ہو امیروں کے قدم پکڑے
جسے شاہوں سے ملنا ہو وزیروں کے قدم پکڑے
جو شاہد بازی و صورت پرستی کا رکھے مشرب
بتانِ سادہ رو و دلپذیروں کے قدم پکڑے
جو کوئی چاہے صحبت میں کسی کی اُن کی صیقل ہو
تو اہلِ باطن و روشن ضمیروں کے قدم پکڑے
جسے توحید فقر و نیستی کا ہو مزہ یکسر!
ترابؔ ایسے مجا شاہی فقیروں کے قدم پکڑے

کوئی ایسی ذات کو کیا کہے جو نہ فرد ہے نہ وحید ہے!
صفت اس کی ہو وے کسی سے کیا جو نہ دید ہے نہ شنید ہے
اُسے محض مطلق مت کہو کہ مقید آپ ہوا ہے وہ!
وہی ایک ہے کہ بنا ہے دو نہ وہ مخفی ہے نہ پدید ہے
وہی کعبہ ہے وہی دیر ہے، وہی قدر شر وہی خیر ہے
نہ وہ عین ہے نہ وہ غیر ہے نہ مراد ہے نہ مرید ہے
کرے کون میری رقم پہ صاد مجھے کون دے یہ سخن کی داد
نہ تو شبلیؒ ہے نہ جنیدؒ ہے نہ نظامؒ ہے نہ فریدؒ ہے
بہ نگاہِ کاظمؒ رہنما، بطفیل باسطؒ مقتدا
ہے وہی شہود تراب کا کہ قلندروں کی جو دید ہے

سایۂ درگاہ کاظمؒ ہم کو کیا کم ہے ترابؔ   دربدر ہم کیوں پھریں ظلِ ہما کے واسطے

فارسی

نہ باشد از تو خالی ہیچ بزم و منزل و خانہ   ز تست آبادئ عالم جہاں بہ تست ویرانہ

توئی ساقی توئی شاہد توئی بادہ و پیمانہ   توئی رند خراباتی توئی ہم بزم میخانہ

مسلماں بندۂ رویت برہمن بستۂ مویت   توئی در کعبہ و مسجد توئی در دیر و بتخانہ

ترابؔ از ما بمعنی گر بہ بینی جملہ عالم را   ہمہ با ہم یگانہ رند یک کس نیست بیگانہ

سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا حال ہے۔ کیوں نہ ہو، پھر آخر ایک قلندر کا کا حال ہے، کیا اچھا درس ہے، کیا عمدہ حکمت ہے۔ خدا آپ کے طفیل سے ہم کو آپ کو، سب کو اس راستہ پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے، کہ بے توفیق ایزدی ایک قدم اُٹھانا بھی محال ہے۔

حق یہ ہے کہ کہاں آپ کی شاعری اور کہاں یہ خاک نشین۔ آپ کی شاعری کی تعریف و توصیف میری زبان سے بالکل ویسی ہے جیسا کہ آفتاب کو چراغ دکھانا، یا چھوٹا منہ بڑی بات۔ مگر تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس دونوں ستم ہیں جہاں سخن شناس مہر بر لب ہوں تو ایک ناشناس ہی کو قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ خدا میری اس جرأت رندانہ کو معاف فرمائے۔ ورنہ دراصل بقول خود حضرت لسان الحقؒ

کرے کون میری رقم پہ صاد مجھے کون دے یہ سخن کی داد
نہ تو شبلیؒ ہے نہ جنیدؒ ہے نہ نظامؒ ہے نہ فریدؒ ہے

دراصل ایسی ہی بزرگ ہستیاں آپ کی شاعری پر داد دینے کی مستحق تھیں۔

آخر زمانۂ حیات میں غلبۂ روحانیت نے جسم اطہر کو نحیف و زار کر دیا تھا، بلا اعانت کروٹ لینا دشوار تھا۔ دو سو رکعتیں نفل کی روزانہ پڑھنا اس ضعیفی میں بھی معمول تھا۔ اور تہجد سے اشراق، مغرب سے عشاء تک بہ جلسۂ واحد ذکر و فکر کی مشغولی قضا نہ ہوتی تھی۔

ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ میں جب کہ سن شریف ۸۹ سال کا تھا حسب دستور اپنے والد ماجد کے عرس میں صدارت کے فرائض ادا کئے۔ مگر اس کے بعد سے "می خرام تا نہایات الوصال" کے اشارے ہونے لگے۔ ۲۔ جمادی الاول کو فالج نے حملہ کیا اور ۸۔ جمادی الاول کو شب کے وقت قید تعلق ہستی سے آزاد ہو گئے۔

پیش ازیں آشوب و خونریزی مجو   پیش ازیں از شمس تبریزی مگو

---

[1] قلزم بفتحہ ثالث ہے نہ کہ بضم

شعر و سخن

غزل — شفیق جونپوری

غمِ محبوب ہاں کونین کی دولت کا حاصل دے
جو ساری عمر تڑپاتی رہے بھی بیتابیٔ دل دے

الٰہی کچھ نہ مجھے تو بس یہ سودے کا دینا ہے
کہ ہر انسان کے پہلو میں انسانیت کا دل دے

تری بخشش ہوئی دشواریوں پر ناز کرتا ہوں
سوا تیرے کسی سے بھی نہ حل ہو ایسی مشکل دے

بگولے بھی ہوں باد تند بھی خارِ مغیلاں بھی
جو ویرانہ ہی دینا ہے تو دیوانوں کے قابل دے

یہ کہہ کر شمع ساری رات تنہائی پہ روئی ہے
کہ یا رب دشمنی دی ہے تو پروانوں کی محفل دے

حبابِ الجھا ناہے موجوں میں تو کشتی دے نہ ساحل دے
وہ ہمت دے کہ ٹکراؤں ہر اک گرداب طوفاں سے

صبا کیا پائے گی تو اور اس کو منتشر کر کے
جو دودِ شمعِ محفل خود پیامِ مرگِ محفل دے

بچھڑنا قافلے سے اور شمعِ راہ کا بجھنا
خدا دشمن کو بھی یہ غم نہ اے یارانِ منزل دے

زمانے سے اٹھی جاتی ہے اب رسمِ وفا داری
ہماری سرفروشی کو دعا بازوئے قاتل دے

تجھے آئینہ گر آئینہ خانہ بخش دے سارا
مگر اللہ صورت بھی تو آئینے کے قابل دے

شفیقؔ اکثر یہ کہتا ہے دعائے صبح گاہی میں
مجھے روتی ہوئی آنکھیں مجھے ٹوٹا ہوا دل دے

غزل — قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی

پہنچے ہیں نہ پہنچیں گے وہ منزلِ جاناں تک
پروازِ نظر جن کی ہے مشکل و آساں تک

سرمایۂ غم تیرا محفوظ رہا پھر بھی
یوں تو غمِ دنیا نے لوٹا حدِ امکاں تک

ہر پھول کی خوشبو کو احساس نے لوٹا ہے
دل کاش پہنچ سکتا اسرارِ بہاراں تک

ہر طرح کا غم یوں تو دنیا میں میسر ہے
آخر کبھی پہنچے گا؟ انساں، غمِ انساں تک

ساحل پہ نہ بیٹھیں گے مایوسِ عمل ہو کر
ہم اپنے سفینے کو لے جائیں گے طوفاں تک

کیا ہوش پرستوں کی محفل میں رکیں قاسمؔ
ہم، رازِ حقیقت تک۔ وہ خوابِ پریشاں تک

غزل — شفا گوالیاری

اس انقلابِ نظارہ کا بھی جواب نہیں
کہ اُن کے جلووں کو میری نظر کی تاب نہیں

ہے آئینہ بھی حسیں، عکسِ آئینہ بھی حسیں
مری نگاہ، ترے حُسن کا جواب نہیں

زمانہ چونک اٹھا ہے غمِ زمانہ سے
مرے خیال سے اب کوئی محوِ خواب نہیں

غمِ حیات نے راہِ حیات چمکا دی
ہمارے کون سے آنسو میں آفتاب نہیں

ذرا سمجھ کے انھیں دیکھ دیکھنے والے
حجاب جس کو سمجھتا ہے تو حجاب نہیں

حجابِ حُسن کی نیرنگیاں کوئی دیکھے
کہ دھوپ پھیل رہی ہے اور آفتاب نہیں

غمِ جہاں سے شفاؔ لاکھ ربط ہے لیکن
غمِ حبیب سے بھی دل کو اجتناب نہیں

غزل — امر چند قیس

زبان دل کی نہ دل ہی زبان کا ہے رفیق
کہاں سے سیکھ لیا آپ نے ریا کا طریق؟

جنوں پہ کھل گئے ہستی کے عقدہائے دقیق
خرد کو خواب میں بھی ہو سکی نہ یہ توفیق

زبانِ زہد ابھی تک ہے نابلد جن سے
ٹپکتے ہیں لبِ ساغر سے وہ رموزِ عمیق

اگرچہ وعظ کے دریا بہا دئے اس نے
مگر نہ کی مرے ساقی نے شیخ کی تصدیق

کھلے بھی رازِ حقیقت تو کیا کھلے ہم پر
مذاقِ شستہ میسر نہ دیدۂ تحقیق

ہمیں ہیں وہ جو رہے بے نیازِ دیر و حرم
نہ برہمن میں ہے دم خم نہ شیخ کو توفیق

نگاہِ پیرِ خرابات ہے کلید اس کی
طلسم بندیٔ بیم و رجا ہے قیسؔ! دقیق

غزل — متین نیازی

وہ لمحہ جو اسیرِ غم نہیں ہے
رموزِ عشق کا محرم نہیں ہے

تبسم کر رہا ہے ترجمانی
کلی پروردۂ شبنم نہیں ہے

مآلِ خندۂ گُل ہے نظر میں
بہار بے خزاں کا غم نہیں ہے

غمِ انساں کو سینے سے لگا لو
یہ خدمت بندگی سے کم نہیں ہے

شکستِ غنچۂ تازہ ہے شاہد
نشاطِ غم، خوشی سے کم نہیں ہے

زمیں کی رونقیں ہیں اس کے دم سے
عبث یہ گردشِ پیہم نہیں ہے

خلش ہر غم کی ہے عمرِ رواں تک
مسرت کوئی مستحکم نہیں ہے

متینؔ انجامِ الفت دیکھئے گا!
ابھی چشمِ کرم برہم نہیں ہے

پرکاش پنڈت

ایک ایکٹ
ایک منظر

پھلے پر دہلا

کردار

۱- جیوتشی ۲- جیوتشی کا چیلا
۳- ایک عورت ۴- ایک مرد

[پردہ اُٹھنے پر۔ توندیلے جیوتشی صاحب چوکی پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ سر گھٹا ہوا ہے اور گلے میں جنیو ہے۔ ان کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مارے چیلا بیٹھا کٹوری ہاتھ میں لئے اُن کے ماتھے پر چندن کا تلک لگا رہا ہے۔

جیوتشی :- لمبا — ذرا اور لمبا تلک لگاؤ رامانند ---- ہوں، لگا دیا ؟

چیلا :- جی گورو جی۔

(کٹوری زمین پر رکھ دیتا ہے)

جیوتشی : گورو جی کی ایسی تیسی۔ صبح سے چھ بار تلک لگوا چکا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سُوج گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی بول گئی اور سالا ایک گاہک نہیں آیا رامانند!

چیلا :- جی گورو جی!

جیوتشی :- پھر وہی۔ سچ سچ بتاؤ تم مجھے گورو جی کہتے ہو یا گالی دیتے ہو؟ پچاس بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ گورو جی مجھے صرف گاہک کے سامنے کہا کرو۔

چیلا - جی گورو جی!

جیوتشی - پھر وہی گورو جی! تمہاری کھوپڑی میں کوئی بات بیٹھتی کیوں نہیں رامانند! یہاں بیٹھے گورو جی گورو جی رٹ رہے ہو۔ اتنا تم سے نہیں ہوتا کہ کہیں گھر بار سے کوئی گاہک پکڑ لاؤ۔ کاروبار کی اگر یہی حالت رہی تو میں تو مروں گا ہی میرے ساتھ تمہارا سالا گورو جی بھی نکل جائے گا۔

چیلا - میں کہاں سے پکڑ لاؤں گاہک کو؟

جیوتشی - جہنم سے۔

چیلا - گاہک لانا میرا کام نہیں۔

جیوتشی - اور کیا تمہارا کام صرف میرے ماتھے پر تلک لگانا ہے اور اسی کام کے لئے میں تمہیں پورے کاروبار پر پچیس فی صدی کمیشن دیتا ہوں ؟

چیلا - میں اور بھی پچاس کام کرتا ہوں۔

جیوتشی - اور کام ؟ تلک لگانے اور گورو جی گورو جی رٹنے کے علاوہ حضور اور کون سا گُل کھلاتے ہیں ؟

چیلا - بیٹھک میں جھاڑو دیتا ہوں۔ دن میں دس بار آپ کے نام کا بورڈ صاف کرتا ہوں۔ گاہکوں کے سامنے آپ کے پاؤں دباتا ہوں . . . .

جیوتشی - ان کے علاوہ - — میرا مطلب ہے ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے علاوہ حضور کون سا تیر مارتے ہیں ؟

چیلا آپ کے گھر کا سودا لاتا ہوں، آپ کے پون درجن بچّے کھلاتا ہوں۔ آپ کے کپڑے . . . .

جیوتشی - اچھّا، اب تم گستاخی بھی کرنے لگے۔ میرے سامنے لمبی لمبی بولتے تمہیں شرم نہیں آتی ؟

چیلا - آپ نے ہی کہا تھا۔

جیوتشی - میں نے! یہ میں نے تم سے کہا تھا کہ یوں میری گردن میں ہاتھ دو۔ میرے منہ آؤ، میری بے عزّتی کرو — رامانند!

چیلا - جی گورو جی۔

جیوتشی - گورو جی گئے بھاڑ میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یوں کب تک کام چلے گا ؟

چیلا - میں کیا بتاؤں ؟

جیوتشی - پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔ لوگوں کا جیوتش پر سے ایمان اُٹھ گیا ہے۔ یا کلیُگ آ گیا ہے کہ سب کے سب سیدھے پڑ رہے ہیں۔

چیلا ۔ لوگ عقل مند ہو گئے ہیں شاید۔

جیوتشی ۔ (بھڑک کر) ناممکن! لوگ عقل مند ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم لوگوں کی موجودگی میں چوہے عقل مند ہو سکتے ہیں، چھپکلیاں عقل مند ہو سکتی ہیں لیکن لوگ وہی گدھے کے گدھے رہیں گے۔ تم نے ٹیکنو والی یا مسٹ کانفرنس کی رپورٹ نہیں پڑھی؟

چیلا ۔ آپ نے سنائی تھی۔

جیوتشی ۔ تو پھر کیسے کہہ سکتے ہو کہ لوگ عقل مند ہو گئے ہیں۔ رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے کہ پوری دنیا میں غریبی بڑھ رہی ہے اور جوں جوں لوگوں کی غریبی بڑھے گی لوگ بے وقوف ہوتے جائیں گے اور جوں جوں لوگ بے وقوف ہوتے جائیں گے جیوتشیوں کا ستارہ چمکتا چلا جائے گا۔

چیلا ۔ ہو سکتا ہے۔

جیوتشی ۔ بس ہو ہی سکتا ہے! رام نند! کسی دن سے تو پھوٹے منہ سے کہہ دو کہ یہ ہوگا یا تم یہ کر سکتے ہو۔

چیلا ۔ میں کیا نہیں کر سکتا؟

جیوتشی ۔ کوئی گاہک لا سکتے ہو؟

چیلا ۔ گاہک لانا میرا کام نہیں

جیوتشی ۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ تمہارا کام تو صرف میری جیب پہ ڈاکہ ڈالنا ہے یہ کیوں بھولتے ہو رام نند! کہ میں تمہیں کمیشن دیتا ہوں۔

چیلا ۔ تو اس سے کیا ہوا؟

جیوتشی ۔ اچھا تو اس سے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ اس سے یہ ہوا نارد منی جی کہ کمیشن لینے سے آپ کمیشن ایجنٹ ہو گئے اور کمیشن ایجنٹ صرف ماتھے پہ تلک لگانے کا کمیشن نہیں لیا کرتے انہیں کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

چیلا ۔ بتائیے کون سا کام کروں؟

جیوتشی ۔ سر پھوڑ دو میرا۔ لاٹھی مار کے میری ٹانگیں توڑ دو — یہ کام کرو!

چیلا ۔ آپ تو بے کار میں خفا ہو رہے ہیں

جیوتشی ۔ خفا نہیں ہوں گا تو کیا مارے خوشی کے ناچوں گاؤں گا گھر میں دال دلیے کا سامان نہیں اور تم بیٹھے باتیں بنا رہے ہو کہیں سے ......

(اسٹیج کے دائیں ونگ کی طرف دیکھ کر — سادہ دارانہ لہجے میں) رام نند!

چیلا ۔ جی گورو جی!

جیوتشی ۔ (آنکھ سے دائیں ونگ کی طرف اشارہ کر کے) وہ کون آ رہا ہے؟ — وہ عورت میرا خیال ہے اسی طرف آ رہی ہے۔

چیلا ۔ جی گورو جی (جھٹ گورو جی کے پاؤں دبانے لگتا ہے)

جیوتشی ۔ (رٹنے لگتا ہے) نمو نارائن ، اوم نمو نارائن۔

(چیلا گورو جی کے پاؤں دبا رہا ہوتا ہے اور گورو جی، نمو نارائن، نمو نارائن رٹ رہے ہوتے ہیں کہ ایک عورت دائیں ونگ سے داخل ہوتی ہے)

عورت ۔ پرنام مہاراج!

جیوتشی ۔ اشیرباد۔ بیٹھو

(عورت زمین پہ بیٹھ جاتی ہے)

جیوتشی ۔ بیٹی! تم کچھ پریشان نظر آتی ہو — تمہارا ماتھا بتا رہا ہے، بڑا ظلم ہوا ہے تم پر۔ تمہاری یہ حالت کسی مرد کے کارن ہوئی ہے۔

عورت ۔ ہاں مہاراج! آپ نے بالکل ٹھیک جانا۔

جیوتشی ۔ اوم نمو نارائن!

عورت ۔ ایک ہفتہ پہلے ان کی چٹھی آئی تھی مہاراج کہ وہ آ رہے ہیں۔ ہفتہ بھر ان کا انتظار کرتی رہی مگر نہیں آئے۔ کوئی اُپائے[1] بتائیے مہاراج! وہ دو مہینے کی چھٹی پہ گھر آ رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

جیوتشی ۔ بڑا کٹھن کام کرتے ہیں تمہارے پتی، ایسا تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔

عورت ۔ جی مہاراج ۔ وہ فوج میں حوالدار ہیں ۔ دو مہینے کی چھٹی دو سال کے بعد......

جیوتشی ۔ نمو نارائن، اوم نمو نارائن! بیٹھے رام نند۔

چیلا ۔ (اور بھی زور سے پاؤں دباتے ہوئے) جی گورو جی

جیوتشی ۔ اس ابلا ناری[2] پر اتیاچار[3] ہو رہا ہے۔

چیلا ۔ تو گورو جی، کوئی ودھی[4] بتائیے نا ۔ آپ تو سب کے دکھ ہرتا ہیں

جیوتشی ۔ اس کا پتی نہیں آئے گا۔ وہ کسی دوسری ناری کے پھندے میں پھنس گیا ہے۔

---

[1] ترکیب [2] بے چاری عورت [3] ظلم
[4] علاج

عورت۔ نہیں مہاراج، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا مت ہونے دیجئے مہاراج۔ بھگوان کے لئے ایسا مت ہونے دیجئے۔ نہیں تو میں برباد ہو جاؤں گی، میں کہیں کی نہ رہوں گی مہاراج!

جیوتشی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے دیوی۔ ہونے والی بات اوشیہ[1] ہوگی۔

چیلا۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں گرودیو۔ اس پر دیا کیجئے۔ کوئی اُپائے بتا دیجئے۔ مجھ سے ان کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

عورت۔ ہاں مہاراج! بھگوان کے لئے کوئی اُپائے بتلایئے۔ ان پر ضرور کسی ڈائن نے جادو کر دیا ہے۔ پہلے تو وہ ایسے نہیں تھے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا مجھ سے۔

جیوتشی۔ اس میں دھن لگے گا دیوی اور دھن میرے وچار[2] میں تمہارے پاس نہیں ہے۔

عورت۔ (بے چینی سے) جو بھی لگے گا میں دوں گی۔ میں اپنا گھر بیچ دوں گی مہاراج اپنے سوامی کو اس کلموہی، کلنکی سے بچانے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دوں گی مہاراج!

جیوتشی بیٹے لالانند!

چیلا۔ جی گرودیو۔

جیوتشی۔ تمہارا کیا وچار ہے۔ اس دکھیا ناری کے کلیان کے لئے اکیاون رُپے مارتنڈ پاٹھ پر خرچ کروانے چاہئیں یا نہیں؟

عورت۔ میں اکیاون روپے دوں گی۔ میں ابھی اکیاون روپے آپ کو لا دوں گی مہاراج میرا گھر یہاں سے دور نہیں۔ آپ میرے سوامی کو بچا لیجئے۔ بھگوان کے لئے مجھ ابھاگن پر دیا کیجئے۔

جیوتشی۔ تو جاؤ۔ لے آؤ۔ لیکن سنو، کاغذ کا دھن نہیں ہونا چاہئے۔ اس سے مارتنڈ پاٹھ میں دکشنا[3] پڑے گا۔ کھرے سکے کے رُپے ہونے چاہئیں۔

عورت۔ جو آگیا مہاراج

چیلا۔ ماتا جی آپ چاہیں تو نوٹ ہی لے آیئے۔ مجھ سے آپ کی جو بھی سیوا ہوگی میں کروں گا .... مجھ سے آپ کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

عورت۔ ابھی لاتی ہوں۔ میں ابھی اکیاون رُپے لاتی ہوں مہاراج۔

جیوتشی۔ چرنجیو[4] رہو۔ تمہارا سہاگ بنا رہے۔ اوم نارائن، اوم نارائن

(عورت جاتی ہے۔ دونوں تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں۔ پھر)

جیوتشی۔ (ہنستے ہوئے) لالانند! یوں پیسہ آتا ہے لالانند۔ تم واقعی اپنا کام خوب کرنے لگے ہو۔ کافی مہارت ہو گئی ہے تمہیں۔ ہم تم سے خوش ہوئے۔

چیلا۔ شکریہ گرودیو

جیوتشی۔ پھر وہی گرودیو!

چیلا۔ بات یہ ہے گرودیو کہ آج مجھے پیسے کی بڑی ضرورت ہے۔

جیوتشی ملے گا۔ ضرور پیسہ ملے گا۔

چیلا۔ مجھے پچیس روپوں کی ضرورت ہے گرودیو۔

جیوتشی۔ (چونک کر) پچیس! پچیس کس حساب سے؟ تمہارا کمیشن بارہ روپے بارہ آنے بنتا ہے وہ تمہیں مل جائے گا۔

چیلا۔ نہیں مجھے پچیس روپے چاہئیں۔ مجھے سخت ضرورت ہے۔

جیوتشی۔ لیکن کس حساب سے؟

چیلا۔ کسی بھی حساب سے! چار روز سے مجھے ایک پیسہ نہیں ملا۔

جیوتشی اس میں سب تمہارا قصور ہے۔

چیلا۔ میرا کیا قصور ہے؟

جیوتشی۔ تم گاہک نہیں لاتے۔ یہ بھی میں ہوں کہ خود آئے ہوئے گاہکوں کا کمیشن تمہیں دیتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ کیں اپنے ایجنٹوں کو کبھی اس طرح کمیشن دیتے ہیں؟ انشورنس کمپنیاں دیتی ہیں؟

چیلا۔ ان کی بات دوسری ہے۔

جیوتشی۔ ان کی بات دوسری ہے تو جناب والا میری بات تیسری ہے۔ میرا پیشہ ان سے کم معزز نہیں۔

چیلا۔ آپ کا پیشہ ـــ آپ کا پیشہ تو ٹھگ بازی کا ہے۔

جیوتشی۔ خاموش۔ گستاخ، نمک حرام! جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ پچیس نہیں تم پورے اکیاون لے جانا اور میری جان چھوڑنا۔ مجھے تم ایسے دغاباز ساتھی کی ضرورت نہیں۔

چیلا۔ دغاباز میں ہوں یا آپ جو معصوم اور مجبور لوگوں کو ٹھگ کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔

جیوتشی۔ میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ۔ خاموش ہو جاؤ لالانند!

(دائیں دگ کی طرف دیکھ کر راز دارانہ لہجے میں، خاموش ہو جاؤ۔ گاہک

---

[1] ضرور [2] خیال [3] فعل [4] لمبی عمر ہو تمہاری

آرہا ہے۔

(جیوتشی جی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ چیلا ان کے پاؤں دبانے لگتا ہے۔ اتنے میں دائیں ونگ سے ایک مرد داخل ہوتا ہے)

مرد۔ (کھانس کر) کیوں جناب! گوسوامی پٹو سدھو شاستری یہیں رہتے ہیں!

چیلا۔ جی ہاں مہاشے (جیوتشی جی کی طرف اشارہ کرکے) گوسوامی جی آپ ہی ہیں دھیان میں مگن ہیں اس سمے — گورو دیو آنکھیں کھولیئے — آنکھیں کھولیئے گورو دیو!

مرد۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک عورت یہاں آئی تھی نا!

چیلا۔ ہاں مہاشے۔ بڑی دکھیا تھی بے چاری

مرد۔ اس نے آپ کے لئے اکیاون رُپے بھجوائے ہیں۔

جیوتشی (آنکھیں بند ہیں مگر چونک کر) کون؟ کون آیا ہے بیٹے رلا منند؟

چیلا۔ آنکھیں کھولیئے گورو دیو! گورو دیو آنکھیں کھولیئے۔

جیوتشی۔ یہ سجن کون ہیں رلا منند؟

چیلا۔ ابھی ابھی جو ماتا جی آئی تھیں — جن کے کلیان کا آپ نے وعدہ کیا تھا انھوں نے اکیاون رُپے بھجوائے ہیں۔

جیوتشی۔ رکھ لو۔ لیکن دھن جیب میں رکھنے کے بعد مجھے ہاتھ مت لگانا رلا منند۔ دھن نامی وستو مجھ سے ہمیشہ دُور رکھا کرو۔

مرد بڑے سنیاسی دھرماتما ہیں آپ تو۔

چیلا۔ (تیس طرف نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) ہر سمے گیان دھیان میں مگن رہتے ہیں گورو دیو۔ موہ مایا تو چھو تک نہیں گئی۔

مرد۔ اس عورت کو کیا بتایا تھا آپ نے؟

چیلا۔ بڑی دُکھی تھی بے چاری۔ بے چاری کا پتی کسی پرائی ناری کے پنجے میں پھنس گیا ہے رو رو کر بے چاری نے اپنا بُرا حال کر لیا۔ تب گورو دیو نے...

مرد۔ اچھا تو وہ یہاں رونے بھی آئی تھی؟

چیلا۔ آپ جانیئے مہاشے! بھارتیہ ناری کا سب کچھ پرمیشور پرماتما، ایشور، بھگوان اس کا پتی ہوتا ہے۔ اور اگر پتی ہی اس کا ہتیا لاحل آئے۔ بدمعاش، لچا لفنگا اور فریبی ہو جائے تو...

مرد۔ منہ سنبھال کر بات کیجئے۔

چیلا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مہاشے؟

جیوتشی۔ رلا منند! یہ سجن کیا کہہ رہے ہیں؟

مرد۔ یہ سجن یہ کہہ رہے ہیں لیکا بھگت جی کہ یہ سجن ابھی آپ کا اور آپ کے اس چیلے چانٹے کا سارے چانٹوں سے حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

جیوتشی۔ (چونک کر آنکھیں کھول دیتا ہے) نمو نارائن! اوم نمو نارائن (رٹتا چلا جاتا ہے)

مرد۔ یہ سوانگ بنا کر بھولی بھالی عورتوں کو ٹھگتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ سیدھی طرح جیب کاٹنے کا دھندا کیوں نہیں کرتے آپ لوگ...

چیلا۔ وہ تو بڑی دکھیا تھی مہاشے! اس کا پتی...

مرد۔ اس کا پتی چھٹی پر آنے والا تھا!

چیلا۔ ہاں مہاشے!

مرد۔ لیکن کسی دوسری عورت کے پنجے میں پھنس گیا۔

چیلا۔ بالکل ٹھیک! یہی بات ہوئی ہے مہاشے، گورو دیو نے...

مرد۔ تمہارے گورو دیو کی ایسی تیسی...

(نمو نارائن کی رٹ تیز ہو جاتی ہے)

مرد۔ اس کا پتی دوسری عورت کے پنجے میں پھنس گیا تھا تو یہ تمہارا باپ کہاں سے آ گیا۔

جیوتشی۔ (گھبرا کر اور نمو نارائن کی رٹ چھوڑ کر) باپ! تو آپ ہی اس عورت کے...

مرد۔ عورت نہیں ابلا ناری کہیئے۔ میں ہی اس ابلا ناری کا بدمعاش، لچا، لفنگا، فریبی ہوں اور آپ کو حوالات میں بند کرانے آیا ہوں۔

جیوتشی۔ (بُری طرح گھبرا کر) حوالات!

چیلا۔ کھشما! کھشما شریمان کھشما!

جیوتشی۔ غضب ہو گیا — ہے بھگوان بالکل غضب ہو گیا۔

مرد۔ غضب ابھی کہاں ہوا ہے دھرماتما جی۔ غضب تو اب ہوگا جب تم دونوں دھوکہ دہی کے الزام میں حوالات کی ہوا کھاؤ گے۔

جیوتشی، چیلا۔ (یک زبان ہو کر) کھشما مہاشے! شریمان جی کھشما!

مرد۔ اُٹھیئے، چلیئے میرے ساتھ۔

جیوتشی۔ آپ کے ساتھ!

---

[1] چیز [2] معافی

چیلا — آپ کے ساتھ حوالات میں چلیں؟

مرد — حوالات سے پہلے میرے گھر چلئے اور چل کر اس ابلا ناری کو بتا دیجئے کہ آپ جیوتشی نہیں ٹھگ ہیں، اٹھائی گیرے ہیں۔

جیوتشی — چلئے، ابھی چلئے مسٹر یمان! ہم ابھی جاکر — رامانند!

چیلا — جی گورو جی

جیوتشی — بہت برے گورو جی کی۔ ستیاناس ہو تمھارا! تم نے ہی گورو جی گورو جی کر کے میرا بیڑا غرق کیا ہے۔ خیر! تمھاری حجامت میں آکر کروں گا۔ ابھی ذرا میرے ساتھ تم شریمان جی کے گھر چلو۔

چیلا — میں تیار ہوں گورو جی۔

جیوتشی — چلنے کے لئے تیار ہو؟

چیلا — چلنے کے لئے بھی تیار ہوں گورو جی اور واپس آکر اپنی حجامت کروانے اور آپ کی حجامت کرنے کے لئے بھی۔

[دونوں اُٹھتے ہیں
پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

رُباعیاتِ عمر خیّام کا انگریزی ترجمہ

..... لندن سے ایک رسالہ "سیٹر ڈے ریویو" نکلتا تھا۔ اُس کے ایڈیٹر نے رُباعیاتِ عمر خیّام کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ خریدا۔ اس کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اس نے روسیٹی سے ذکر کیا۔ روسیٹی نے مشہور شاعر سوئن برن اور کارلائل سے بات کی، چنانچہ اگلے روز روسیٹی، سوئن برن اور کارلائل تینوں نے برنارڈ کوئیرچ کی دکان پر جاکر رباعیات خریدیں۔ کوئیرچ نے جب دیکھا کہ قدر دانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو اس نے جھٹ کتاب کی قیمت ایک پنس سے بڑھا کر دو پنس کر دی۔

۱۸۶۸ء میں برنارڈ کوئیرچ نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور قیمت ۷ شلنگ مقرر کی۔ فٹز جیرلڈ اتنی گراں قیمت کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتاب ہرگز اس قابل نہیں کہ لوگ اتنے زیادہ دام خرچ کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے، سرورق پر اس مرتبہ بھی مترجم کا نام نہیں تھا۔ تاہم لندن میں آہستہ آہستہ مترجم کی پُر اسرار شخصیت پر سے پردے اُٹھنے لگے۔ اسی دوران میں رُباعیات کا چرچا امریکہ میں بھی پھیل گیا تھا اور وہاں بعض رسائل میں عمر خیّام کی شاعری پر مقالے بھی چھپنے لگے تھے۔ چنانچہ امریکہ میں رباعیات کی دھڑا دھڑ مانگ ہوئی تو برنارڈ کوئیرچ کو دو نئے ایڈیشن طبع کرانا پڑے۔ فٹز جیرلڈ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مقبولیت کو اپنی ہنرمندی کا ثبوت سمجھنے کی بجائے امریکی لوگوں کی عجوبہ پسندی پر محمول کرتا تھا۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان کے بعض رسائل نے پہلی بار رُباعیات کو قابلِ توجہ سمجھ کر اُن پر تبصرہ کیا۔ کارلائل پہلا شخص تھا جس نے مترجم کی شخصیت کا صحیح پتہ چلانے میں کامیابی حاصل کی۔ رسکن نے رباعیات کا مطالعہ کرنے کے بعد فٹز جیرلڈ کو جو خط لکھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:۔

"خدا کے لئے عمر خیّام کی اور نظموں کا بھی ترجمہ کیجئے۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک رُباعیات سے بہتر شاعری نہ کہیں دیکھی نہ پڑھی۔ اس میدان میں اپنا قلم ہرگز مت روکئے۔"

۱۹۳۶ء میں برنارڈ کوئیرچ نے رباعیات کا وہ نسخہ جو ایک زمانے میں سوئن برن کے مطالعہ میں رہ چکا تھا اور جس کے ایک صفحے پر سوئن برن کے ہاتھ کی تحریر بھی تھی ۹ ہزار ڈالر میں فروخت کیا۔ دوسرا نسخہ جو کسی زمانے میں ولیم موریس کی ملکیت تھی، ایک شخص نے ساڑھے چار ہزار ڈالر میں خریدا

فٹز جیرلڈ کا انتقال جون ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں رباعیات کی روز افزوں مقبولیت دیکھ لی تھی۔ امریکہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی تک فٹز جیرلڈ کے ترجمے نے عمر خیّام کی شہرت پھیلا دی تھی۔ لیکن رباعیات کو جو عروج فٹز جیرلڈ کے مرنے کے بعد حاصل ہوا اُس کا تصور تو اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی نہ ہوگا۔ آب زر سے لکھے ہوئے نسخے بادشاہوں کو تحفے کے طور پر پیش ہونے لگے۔ چاہنے والوں نے اپنی معشوقاؤں کو رباعیات کا ہدیۂ محبت نذر کیا۔ سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی گرج کے اندر بھی رباعیات کو سینے سے لگائے رکھا۔ اکثر نوجوانوں نے رباعیات سے متاثر ہو کر خودکشی کر لی۔ پولیس جب تفتیش کے لئے پہنچی تو لاش کے قریب جام و مینا کے ٹکڑے پڑے ہوتے اور ایک طرف رُباعیات کا نسخہ کھلا ہوتا تھا ....

(اقتباس از ادبی دنیا)

عاشق حسین بٹالوی

محمد بشیر الحق دسنوی

حضرت اکبر داناپوری کی چند تضمینیں

سید شاہ محمد اکبر ابو العلائی داناپوری خلف سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی (۱۲۹۸ھ - ۱۲۳۱ھ) بہ مقام داناپور محلہ شاہ ٹولی ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد بزرگوار کے وصال کے بعد خانقاہ داناپور کے سجادہ پر بیٹھے۔ آپ کو حضرت وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا۔ حضرت اکبر نے ۱۳۲۷ھ میں انتقال کیا۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ نثر میں پچیس تیس کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں جس میں اشرف التواریخ کی تین جلدیں بہت مشہور اور مقبول ہیں مگر اب کم یاب ہیں نظم میں دو دیوان ہیں۔ تجلیات عشق مطبوعہ ۱۳۱۴ھ اور جذبات اکبر مطبوعہ ۱۳۲۹ھ

تضمین

ہے بحث کس کو کشف و کرامت میں آپ کی
اکبر تم اپنے وقت کے ابدال ہی سہی
لیکن یہ بیت آپ نے شاید نہیں سُنی
بیرونِ گور لافِ کرامت چہ می زنی
ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

ایضاً

بنتے باز وں کے سے نکلے ہیں یہ سب کشف و شہود
آدمی وہ ہے جو ہو تابع حکم معبود
زور و زر ذات سے انسان کے نہیں ہے مقصود
شرفِ نفس بجود است و کرامت بہ سجود
ہر کہ این ہر دو ندارد عدمش بہ ز وجود

ایضاً

اکیلے گھر میں پڑے رہتے ہیں جئے کہ مرے
نہیں ہے اتنا بھی کوئی کہ ہاتھ دل پہ دھرے
ہمارے حال کی اس کو خبر یہ کون کرے
نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
کسے ز بیکسیِ ما نمی برد خبرے

ایضاً

کفن کے واسطے کافی ہے دامن صحرا
بجائے شمع جلے گا یہ داغِ دل اپنا
ہماری قبر پہ کیا کام چادرِ گل کا
بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزارِ مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

ایضاً

زمیں بچرخ رسد ایں چہ ہرزہ گفتار است
کہ نار جلوہ کند ہمچو نور دشوار است
محقق است دریں مسئلہ چہ تکرار است
میانِ ما و سگِ یار فرق بسیار است
چرا کہ من سگ او ہستم او سگِ یار است

شری پادجوشی

مراٹھی زبان میں خطوط نویسی

اگر ادب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُردو کو چھوڑکر بھارت کی دوسری کسی زبان میں ادبی خطوط لکھنے اور انھیں شایع کرنے کا رواج اتنے بڑے پیمانے پر شاید ہی ہوگا۔ خطوط نویسی کو اُردو نے ایک فن کے طور پر فروغ دیا ہے۔ اس لئے اُس میں خطوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے ویسا ذخیرہ دوسری زبانوں میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ کم از کم مراٹھی زبان میں تو ادبی لحاظ سے اعلیٰ درجے کے خطوط کے مجموعے ابھی تک نہیں کے برابر تھے۔ مگر گذشتہ چند سال میں کچھ اچھی نوعیت کے دلچسپ خطوں کے مجموعے شایع ہوئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مراٹھی میں خطوط شایع ہی نہیں ہوئے، ایسی بات نہیں ہے۔ مراٹھی زبان میں کئی افسانے، ناول، مضمون، سفرنامے خطوں کی صورت میں پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن ان خطوں کو صحیح معنی میں خط نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو اوپر سے پہنی ہوئی ایک پوشاک ہے۔ اُس کی روح الگ ہی ہوتی ہے۔ خطوط کی صورت میں بڑے اچھے ناول مراٹھی میں اب تک شایع ہو چکے ہیں جن میں مرحوم وامن ملہار جوشی کا ناول، آندرکالے اور رمرلا بھولے، بہت مشہور رہے۔ کئی سفرنامے بھی خطوں کی صورت میں مراٹھی میں ملتے ہیں۔ جن میں مرحوم نرسنگھ چنتامن کیلکر کے 'ولایت پی باتی پتریں' (ولایت کے مراسلات) اور شری شری پاد رام چندر ٹلکیکر کی کتاب 'مسلمانی ملکھا تیل مشاپھری' (مسلم ممالک کا سفر) مشہور ہیں۔ مگر ان کو ادبی خطوط کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔

خطوں کے کچھ مجموعے مراٹھی میں ایسے بھی موجود ہیں جو دراصل کسی دوسری زبان میں لکھے گئے تھے، مگر جن کے ترجمے مراٹھی میں شایع ہوئے ہیں، مثلاً مرحوم بپن چندر پال کے ولایت کے خطوط، مرحوم اربند گھوش کے اپنی بیوی کے نام لکھے ہوئے خطوط، شری ساورکر کے انڈمان سے لکھے ہوئے خطوں کا مجموعہ 'انڈمان چیا اندھیری تون' (انڈمان کی کال کوٹھری سے) گاندھی جی کے خطوط کا مجموعہ 'منگل پربھات'، سوامی وویکانند کے خطوط وغیرہ۔ ان میں سے گاندھی جی کے خطوں کا ایک مجموعہ ہے۔ 'پرساد دیکھنا'۔ اس کا مراٹھی میں بہت چرچا ہوا، اور گاندھی جی کے مخالفین نے اُس کی آڑ میں گاندھی، گاندھی واد اور گاندھی وادی سب پر بُری طرح اور گندے طریقے سے حملہ کیا اور کیچڑ اُچھالا۔ اس کے مرتب آچاریہ کاکا کالیلکر نے اُس کے دیباچے میں لکھا تھا کہ "سچے خطوط سماجی زندگی کی ایک اہم دستاویز ہوتے ہیں۔ اُن کی طرف ادب کی نظر کے عوض ذمہ دار سماجی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اُن کے پڑھنے سے صرف ادبی ذوق کو پورا کرنے کا خیال نہ رکھ کر اپنی زندگی کو پاک، بلند اور شاندار بنانے کی کوشش ہمیں کرنی چاہیئے۔"

اسی قسم کا اور ایک مجموعہ مراٹھی میں شایع ہوا ہے جس کا نام ہے۔ 'پترویوہار' (خط وکتابت) یہ مجموعہ مرحوم نرسنگھ چنتامن کیلکر کی آپ بیتی 'گت گوشٹی' (گذری ہوئی باتیں) کے ضمیمے کے طور پر شایع ہوا ہے۔ اس میں ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک کی شری کیلکر جی کی خط وکتابت کو شامل کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، لارڈ ونشلینڈ، شوکت علی، عبدالقیوم خاں، لالہ لاجپت رائے وغیرہ دیش کے نامی گرامی لیڈروں کے تقریباً ایک ہزار سے بھی زیادہ خط اور ان میں سے چند خطوں کے کیلکر جی کی طرف سے لکھے گئے جواب اس میں شامل ہیں۔ یہ ساری لکھا پڑھی اصل میں انگریزی میں ہوئی تھی، چنانچہ اس کا مراٹھی ترجمہ اس میں دیا گیا ہے۔ پچھلے پچاس برس کی بھارت کی تاریخ لکھنے والوں کو اس مجموعے سے بہت کچھ مسالہ مل سکےگا۔

اصلی مراٹھی خطوں کے چند مجموعے زبان اور خیال کے لحاظ سے

بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ بھارت کے مشہور مورخ شری گووند راؤ سر دیسائی کے صاحب زادے مرحوم ڈاکٹر شیام کانت کے دو سو خطوں کا ایک مجموعہ "شیام کانتا چی پتریں" (شیام کانت کے خطوط) کے نام سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سورگیہ رویندر ناتھ ٹاگور کا ایک بنگالی خط بھی خود انھیں کی لکھاوٹ میں چھپا ہے۔ اس مجموعے کا آخری خط مرحوم شیام کانت کا ہے، جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند گھنٹے پہلے سوئٹزرلینڈ سے اپنے والد کے نام لکھا تھا، بہت ہی دردناک ہے۔ ایسا آدمی شاید ہی ملے گا جس کی آنکھیں وہ خط پڑھتے وقت نہ بھر آئی ہوں۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ مجموعہ پوری طرح گھریلو اور ذاتی ڈھنگ کا ہے مگر پھر بھی اُس سے اُس زمانے کی سیاسی اور سماجی حالت کا پتہ اچھی طرح چلتا ہے۔ یورپ کی حالت کا کچھ اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔

تقریباً چھ سال پہلے شری کاکا صاحب کالیلکر کے خطوط کا ایک مجموعہ "سپریم وندے ماترم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں کرناٹک اور مہاراشٹر کے ایک بڑے کارکن شری پنڈلیک جی کاتگڑے کے نام شری کاکا کالیلکر جی کے لکھے ہوئے خط شائع ہوئے ہیں۔ اس میں عوام کی دلچسپی کے سوالوں کا ذکر بہت کم ہے۔ زیادہ تر خطوط ذاتی معاملوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر اس مجموعے کا کالیلکر جی نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ بہت قیمتی ہے۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں۔

"ادب کی خدمت کے طور پر کچھ لوگ خطوں کی شکل میں مضمون، سفرنامے یا کہانیاں لکھتے ہیں۔ یہ خط اصلی نہیں بلکہ اوپر سے پہنی ہوئی پوشاک ہوتی ہے۔ ان کی بھی اپنی ایک اہمیت اور شان ہوتی ہے۔ لیکن اصل خط تو دلکش بات چیت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ ایسے خطوں میں تاریخی دستاویز کی اہمیت اور ادبی مزہ نہیں ہوتا۔ اُن میں زندگی کے معاملوں کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر لکھنے والا اچھا ادیب ہو تو ایسے خطوں میں کبھی کبھی ادبی جواہر پارے اور شاعرانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ مگر وہ سب قدرتاً آ جاتا ہے۔"

مراٹھی کے مشہور و مقبولِ عام مصنف مرحوم سانے گروجی کا خط لکھنے کا ڈھنگ بڑا دلچسپ اور دلکش ہوتا تھا۔ مہاراشٹر کے کئی جوانوں کے پاس اُن کے خطوط ملیں گے۔ اپنے خطوں میں مناظرِ قدرت کی ہو بہو تصویریں کھینچنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے ہفتہ وار اخبار "سادھنا" میں اُن کے جو خط شائع ہوئے تھے وہ اب "سُندر پتریں" (بڑھیا خطوط) کے عنوان سے تین حصّوں میں چھپ گئے ہیں، اور ان کے کئی ایڈیشن نکلتے جا رہے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مراٹھی ناظرین نے اُن کو کتنا پسند کیا ہے۔

اگست ۱۹۵۰ء میں مراٹھی میں "جیون دکیشا" نام کا ایک مجموعۂ خطوط شائع ہوا ہے۔ یہ صحیح معنی میں مراٹھی خطوں کا مجموعہ ہے۔ کیوں کہ اس میں خالص مراٹھی زبان کا ہی استعمال ہوا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک نامور ماہرِ تعلیم اور وردھا کے مہلا آشرم کے سابق پرنسپل مرحوم نانا آٹھولے نے اپنے ایک طالب علم شری یادو جوشی اور ایک طالبہ شانتا جو گدیو کو تقریباً بیس سال پہلے جو خط لکھے تھے اُن کا یہ مجموعہ ہے۔ بیس سال کا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی یہ خطوط اتنے تازہ معلوم ہوتے ہیں گویا ابھی ابھی لکھے گئے ہیں۔ ان خطوں میں طالب علموں کی زندگی کے غالباً سبھی پہلوؤں پر ایک ماہرِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان کی کسی زبان میں اس قسم کے خطوں کا مجموعہ موجود نہیں ہے۔ پھر اس میں یہ خصوصیت ہے کہ جب یہ خط لکھے گئے تھے تب لکھنے والے اور پانے والوں کو یہ قطعی خیال نہیں تھا کہ کسی روز یہ خطوط کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوں گے۔ چنانچہ ان میں ایسی سادگی صفائی اور بے ساختگی آئی ہے کہ پڑھنے والا ان میں محو ہو جاتا ہے اور اُس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا وہ خط خود اس کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں۔ مہاراشٹر کے نوجوانوں نے اس مجموعے کا بڑا اچھا استقبال کیا ہے۔

آج کل مراٹھی میں خط لکھنے والوں میں سب سے مشہور و مقبول ہیں آچاریہ دادا دھرما دھکاری، جو وردھا سے نکلنے والے ہندی "سرودیہ" ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اسی طرح پرجا سماج وادی پارٹی کے سابق جنرل سکریٹری اور آج کل گوا کے قید خانے میں دس سال کی سزا کاٹنے والے شری نانا صاحب گورے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شری دادا دھرما دھکاری کے خطوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، جن کے نام ہیں: "آپلیا گزا جیاچی گھرن" (ہمارے لوگ) "ایکی بنا ما سنیہاچے جھرے" (پیار کے جھرنے) اور "انتریں چے اُمالے" (جذبات دل)

ان میں سے پہلی کتاب میں جو خطوط آئے ہیں وہ شری دھرما دھکاری نے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام اُس وقت لکھے تھے جب وہ بھارت کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی میں رہتے تھے ۔ ان خطوں میں اُس زمانے کی اتنی چھوٹی موٹی باتوں کا ذکر آیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک مکمل تصویر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ "پیار کے جھرنے" میں شری دھرما دھکاری جی کے ایسے خطوط شامل ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً الگ الگ لوگوں کو لکھے تھے ۔ اس میں زندگی سے تعلق رکھنے والے تقریباً سبھی مضمون آ گئے ہیں ۔ اُن کو پڑھتے وقت ناظرین کا دل کبھی کھلکھلا کر ہنس اُٹھتا ہے اور کبھی یکایک مایوس ہو جاتا ہے ۔ اُن کے خطوں کا تیسرا مجموعہ "جذباتِ دل" میں وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنی منہ بولی بیٹی کماری و ملا ٹھکار کو لکھے ہیں ۔ اس میں لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے سبھی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے ۔ عورتوں کے سوالوں کے بارے میں شری دھرما دھکاری کے خیالات بڑے انقلابی ہیں ۔ اتنے بنیادی اور انقلابی خیالات یورپ کے ترقی پسندوں میں بھی نہیں ملتے ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے ۔

شری نا ۔ گ ۔ عرف نانا صاحب گورے نے بڑے اچھے خط اپنی بیٹی کے نام لکھے ہیں ۔ شری گورے صاحب کا طرزِ تحریر بڑا دلکش ہے ۔ وہ تصویریں بھی بڑی اچھی بناتے ہیں جس سے اُن کے خطوں میں ایک زندگی آ جاتی ہے ۔ پارٹی کے کام کے لئے اُن کو دیش بھر میں گھومنا پڑتا ہے ۔ وہاں سے وہ خط لکھتے رہتے ہیں ۔ اس لئے اُن میں نئی معلومات ہوتی ہیں ۔ ان کے خط پڑھتے وقت ہم کو بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ان خطوں کی یاد آ جاتی ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی اندرا کے نام برسوں پہلے لکھے تھے اور جو "باپ کے خط بیٹی کے نام" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں ۔ مناظرِ فطرت اور الگ الگ شخصیتوں کے بارے میں بھی اِن میں بہت ذکر آیا ہے ۔

ادھر چند ماہ پہلے مراٹھی کے ایک مشہور و نامور مصنف شری گوپی ناتھ تلولکر کے بھی خط بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "نوَیگ" میں "ناناچے پتریں" (نانا کے خطوط) کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں ۔ مگر اُن میں وہ رنگینی و دلچسپی کہاں جو سانے گورو جی، دادا دھرما دھکاری اور نانا صاحب گورے کے خطوں میں پائی جاتی ہے ۔ پھر بھی اُن کے خطوں میں قسم قسم کے مضمون آ جاتے ہیں جس سے خطوں کی شکل میں نفسِ مضمون کی حیثیت سے اُن کی اہمیت ضرور ہے ۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل مراٹھی میں خطوط لکھنے اور شائع کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اور لوگوں میں بھی خط پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ہے ۔ مگر ابھی ایسے خطوط مراٹھی میں نہیں آئے ہیں جیسے غالب اور امیر مینائی نے اُردو میں لکھے تھے ۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مراٹھی میں بھی ویسے خطوط آئندہ شائع ہو جائیں گے ۔

فولاد کے نئے کارخانے

دوسرے پنجسالہ منصوبے میں دو اور فولاد کے کارخانے وجود میں آئیں گے ۔ ان دونوں کارخانوں کو اشیائے ضروری پہنچانے اور وہاں سے لانے کی بھی تمام تر ذمہ داری دکھن پوربی ریلوے پر ہوگی ۔ ان میں سے ایک کارخانہ روڑکیلا (اڑیسہ) میں اور دوسرا بھیلائی (مدھیہ پردیش) میں قائم کیا جائے گا ۔

روڑکیلا اور بھیلائی دونوں دکھن پوربی ریلوے کی ہاوڑہ ۔ ناگپور مین لائن پر واقع ہیں ۔ روڑکیلا کلکتے سے ۲۵۷ میل کے فاصلے پر اور بھیلائی ۵۰۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ فولاد کے ان کارخانوں کے لئے جگہ کا انتخاب حکومت نے ماہرین کی رائے کے بعد کیا ہے جنھوں نے اس انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خام اشیا خصوصاً خام لوہا، چونا اور کوئلہ ان کارخانوں سے قریب تر مقامات پر فراہم ہو سکیں ۔

روڑکیلا کے لئے خام لوہا زیادہ تر نالدہ اور دوماروسے آئے گا ۔ اس مقصد کے لئے روڑکیلا سے دومارو تک چالیس میل لمبی ایک برانچ لائن تعمیر کی جا رہی ہے ۔ بھیلائی کے فولاد کے کارخانے میں لوہے کی سپلائی ڈلی راجہرا سے ہوگی اور اس کے لئے ۵۰ میل لمبی ایک برانچ لائن تعمیر کی جا رہی ہے ۔

محمد مصلح الدین احمد

انڈونیشیا میں شادی کے مراسم

انڈونیشیا اور ہندوستان میں نہ صرف گہرے سیاسی و معاشی تعلقات قائم ہیں بلکہ ثقافتی رشتہ اس قدر مستحکم ہے کہ اس کی مثالیں زندگی کے ہر شعبے میں ملتی ہیں۔ ان دونوں ممالک میں باوجود جغرافیائی دوری کے تاریخی قربت اور ثقافتی یگانگی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کے عوام رسوم کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصاً ان ممالک میں شادی کے مراسم قابل دید اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں شادی کا مقصد دنیا کے ہر ملک میں وہی ہے لیکن مراسم جدا ہیں۔ ایک ملک کے مراسم دوسرے سے نہیں ملتے۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک وہ باشندے ہیں جو سب سے پہلے آباد ہوئے۔ دوسرے جغرافیائی حالات اور تیسرے دیگر اقوام سے ربط۔ اسی وجہ سے ان تین عناصر کا انڈونیشیائی رسوم پر خاص اثر پڑا۔ چونکہ انڈونیشیا مجمع الجزائر ہے اس لئے اس کے مختلف علاقوں کے رسم و رواج میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ ان رسوم کا تعلق بڑی حد تک ہندو دور سے رہا ہے۔ انڈونیشیائی شادی اور دیگر رسم و رواج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ علاقے جہاں ہندو مت غالب تھا وہاں کے عوام پر اس کا اثر ہوا لیکن یہاں کے ہندو مراسم میں خود اختلاف ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جہاں مسلمانوں کا اثر تھا۔ ان علاقوں میں اسلامی مراسم قدیم رسوم کے ساتھ انجام دئے جاتے ہیں۔ تیسرا حصہ وہ ہے جو دور واقع ہونے کے باعث ان دونوں اثرات سے محفوظ تھا لیکن بعد میں اس پر عیسائی اثر غالب آیا جس کے باعث مغربی رواج کا اثر ہوا۔ ملک میں معاشی و سیاسی انقلابات کے باعث قدیم رسوم ختم ہوتی جا رہی ہیں

شادی کے مراسم کے ادا کرنے میں قابل برداشت جبر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا دلچسپ پہلو نمایاں ہوتا ہے اور یہ مراسم اس ملک کی تاریخی روایات مذہبی اثرات اور عوامی رجحانات کا مظہر ہوتے ہیں۔ ان مراسم میں زمانے کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے انڈونیشیا میں شادی کے رسم و رواج بھی جدید اثرات کے تحت بدل گئے ہیں۔ چونکہ انڈونیشیا میں سب سے پہلے ہندو آباد ہوئے اور بعد میں اسلام پھیلا اس لئے وہاں کے رسم و رواج خصوصاً شادی کے مراسم میں ان دونوں قوموں کی رسوم کی حسین امتزاج ملتا ہے۔ فرد کی زندگی میں شادی اہم ترین واقعہ ہوتی ہے لیکن لوگوں کا تو کہنا یہ ہے کہ شادی حقیقی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔

زمانۂ قدیم میں ہندوستان کی طرح انڈونیشیا میں شادی کا کل اختیار والدین کو تھا لیکن اب زمانے کی تبدیلی اور نئی نسل کے جدید رجحانات کے پیش نظر والدین رسمی فرائض انجام دیتے ہیں۔ رفیق حیات کے انتخاب کا معاملہ بالکل دولہا اور دلھن کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سول میرج کے عام ہونے کے باعث رسوم کم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب مغربی اثر کے باعث ہے۔

انڈونیشیا میں شادی کے موقع پر جو رسوم انجام دی جاتی ہیں بہت دلچسپ ہیں۔ جب لڑکے کی عمر اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے تو والدین اس کے لئے موزوں لڑکی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جوں ہی پتہ چلے کسی معتبر آدمی کو لڑکی کے والدین سے بات چیت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یہ درمیانی فرد رازدارانہ طور پر لڑکی کے والدین کا ردعمل معلوم کر لیتا ہے۔ اگر جواب اثبات میں ملے تو طے کیا جاتا ہے کہ لڑکے کے والدین لڑکی کے مکان پر کس دن آئیں تاکہ لڑکی کو دیکھ سکیں۔

مقررہ دن لڑکے کے والدین دولھا اور چند معمر رشتہ دار (جن کا کام شادیاں کروانا ہوتا ہے) لڑکی کے گھر رسمی طور پر جاتے ہیں۔ لڑکی کے گھر پر اس وقت جو تماشہ ہوتا ہے وہ عجیب اور قابل دید ہوتا ہے جو

ہندوستان میں بھی رائج نہیں۔ انڈونیشیا میں مکانات کے عموماً دو حصّے ہوتے ہیں۔ اگلا حصّہ دیوان خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور پچھلے حصّے میں زنانخانہ رہتا ہے۔ دولھا کے گھر سے جو قافلہ آتا ہے وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دیوان خانے میں مردوں کو بٹھایا جاتا ہے اور خواتین گھر کے اندرونی حصے میں چلی جاتی ہیں۔ اب احتیاط یہ کی جاتی ہے کہ دولھا والے اپنی آمد کے مقصد کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد جو کسی نہ کسی کی شادی سے متعلق ہوتی ہیں اپنا مُدّعا خاص الفاظ و خاص طرز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں درمیان کے لوگ زیادہ حصّہ لیتے ہیں۔ لیکن انڈونیشیا میں دونوں طرف سے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ اس پارٹی کی آمد کا مقصد محض دوستانہ ہے۔ یہاں ایک تیدیر ہے کہ دولھا والوں کی تواضع صرف خاص چیزوں مثلاً "چائے، کافی، سگریٹ اور سریھ سے کی جاتی ہے۔ اس موقع پر کوئی دوسری چیز نہیں رکھی جا سکتی۔ تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد میزبان (دولھن کے والد) مرد مہمانوں کو عقبی زنانہ حصّے میں بلاتا ہے۔ یہ بڑا اہم وقت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت دُلھن کو فوراً لایا جاتا ہے اسی وجہ سے بیچاری کسی کو دیکھ نہیں سکتی۔ دُلھن عجیب کشمکش میں ہوتی ہے زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا اور نگاہیں نیچی رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے برخلاف سب کی نظریں اس غریب پہ مرکوز رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے بیچاری کچھ پریشان سی ہو جاتی ہے۔ دراصل اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لڑکی کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا ہے۔ بالخصوص شخصِ متعلق (دولھا) ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ لڑکی سریھ ڈالنے کے بعد ہی تیزی سے چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اس لڑکے پر نظر تک نہیں ڈال سکتی جو بہت ممکن ہے مستقبل میں اس کا شوہر بن جائے۔ اس کے بعد لڑکے والے اپنے گھر واپس ہو جاتے ہیں۔ اس آمد کو انڈونیشیائی زبان میں "نون تونی" کہا جاتا ہے جس کے معنی ایک نظر دیکھنے کے ہیں۔

لڑکے والے واپس آنے کے بعد دل کھول کر لڑکی کے عیب و ہنر صورت اور سیرت بلکہ اس کی ہر چیز پر بحث کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ اس اہم دلچسپ گفتگو میں بیچارے لڑکے کو حصّہ لینے کی اجازت نہیں ہوتی جس کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ لڑکے کے ساتھ صرف اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ بعض اوقات کسی معاملے میں اس کی رائے دریافت کی جاتی ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس طویل بحث میں جس میں کہ لڑکے کے خاندان کے بیشتر افراد حصّہ لیتے ہیں اگر رشتے کو منظور کر لیا جائے تو اس کے بعد ہی ایک رسمی خط لڑکی کے والدین کو بھجوایا جاتا ہے جس میں اپنے لڑکے سے اس لڑکی کی شادی کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ خط حرفِ آخر نہیں ہے بلکہ فیصلے کا اختیار لڑکی کے والدین کو ہوتا ہے اگر خواہش مان لی جائے تو پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ شادی کی تاریخ ٹھیرائی جائے چونکہ روزِ عروسی اہم ترین ہوتا ہے اس لئے لمبے چوڑے عمل کئے جاتے ہیں اور بعد میں کوئی موزوں دن کا انتخاب کیا جاتا ہے (ہمارے یہاں بھی شادی کی تاریخ بڑی احتیاط سے مقرر کی جاتی ہے اس ضمن میں جوتشیوں سے مدد لی جاتی ہے)

انڈونیشیائی مسلمان عموماً ذی الحجہ میں شادی کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ شادی کے لئے خاص مہینوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں موسم کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ رسمی خط کی قبولیت کے بعد عموماً پوری کوشش کی جاتی ہے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔ مگر بعض اوقات چند رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً لڑکی کے والدین فوری شادی کا انتظام نہ کر سکتے ہوں یا دلھن کی بڑی بہنیں غیر شادی شدہ ہوں۔ مؤخرالذکر صورت میں دوڑ دھوپ کر کے ان کا مسئلہ پہلے حل کر دیا جاتا ہے۔ اس کام کے باعث لڑکی کی شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔

شادی کے لئے دونوں جانب کامل رضامندی کے بعد ہندوستان میں عموماً منگنی کی جاتی ہے انڈونیشیا میں بھی تقریباً یہی طریقہ رائج ہے دولھا کے والدین لڑکی کے گھر تحائف بھیجتے ہیں۔ عموماً زیادہ سے زیادہ تحائف بھجوائے جاتے ہیں تاکہ منگنی نہ ٹوٹنے پائے اس لئے کہ منگنی ٹوٹنے کی صورت میں جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ تحائف کی کثرت منگنی کو مضبوط کرتی ہے۔ یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے والدین اس کے دوگنے تحائف واپس کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ تحائف لڑکے والوں کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں مالدار لوگ بڑے قیمتی تحائف بھجواتے ہیں اور دیگر لوگ حسبِ استطاعت لیکن رواج کے لحاظ سے تین چیزوں کا بھجوانا لازم ہے

خاص نمونے کی انگوٹھی جس میں دو ہیرے یا دو قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں دوسری فراک جسے "بیٹک کین" کہا جاتا ہے اور تیسرے چولی ہوتی ہے۔ متمول افراد ان کے علاوہ زیورات اور کئی کپڑے دیتے ہیں جن میں کئی فراک اور چولیاں شامل ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں علیحدہ رکھا جاتا ہے اس لئے کہ اہم رسمی تحائف تو مذکورہ بالا ہی ہیں۔ ان تحائف میں نہ صرف کپڑے زیورات بلکہ اشیائے خورد و نوش جن میں پھل بھی شامل ہیں بھیجے جا سکتے ہیں۔

شادی سے چند روز قبل دولھا والوں کی طرف سے مزید تحائف بھجوائے جاتے ہیں جیسا کہ ہندوستان میں بھی کیا جاتا ہے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر ہوتی ہیں۔ دولھن کے گھر کو کافی سجایا جاتا ہے۔ کھلے حصے میں بانس گاڑے جاتے ہیں ان پر لکڑی کے تختوں کی چھت ڈالی جاتی ہے ناریل کے پتے بھی لگوائے جاتے ہیں۔ ان پتوں سے مکان کے سامنے کمانیں بھی بنائی جاتی ہیں جس سے شادی کے گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو ایسا ہی کرتے ہیں۔

نکاح کے دن دولھن کو علی الصباح بیدار کر کے غسل کروایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے شاندار لباس عروسی میں ملبوس ہوتی ہے۔ دولھن کو سنوارنے کا کام بڑا مشکل اور طویل ہوتا ہے۔ یہ کام ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو اس کام میں ماہر ہوتی ہے انجام دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی شادی شدہ خواتین ہوتی ہیں جن میں بیشتر دولھن کی رشتہ دار اور قریبی سہیلیاں ہوتی ہیں۔ دولھن کے بالوں کو کنگھی کرنے کے بعد انھیں سلیقے سے جمایا جاتا ہے۔ اس قدر محنت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولھن بہت ہی حسین، دلکش اور جاذب نظر بنے۔ اس کے بعد دو چار عورتیں دولھن کو لے جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی تعداد چھ اور اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔ ان خواتین کو جو سیاہ پوشاک میں ملبوس ہوتی ہیں انڈونیشیائی زبان میں "اسپومینڈریش" کہا جاتا ہے۔ یہ خاص قسم کا سرپوش پہنے رہتی ہیں۔ دولھن کو کمرۂ عروسی میں لے جاتی ہیں جہاں اسے خوبصورتی سے سجائے ہوئے پلنگ پر بٹھایا جاتا ہے۔ اب دولھن کے لئے بہت ہی روح فزا لمحات شروع ہو جاتے ہیں جبکہ نوشہ یہاں آتا ہے۔ دولھا کو بھی ایک ادھیڑ عمر کی عورت لاتی ہے جس کا تعلق دولھن والوں سے ہوتا ہے۔ جوں ہی دولھا گھر میں قدم رکھتا ہے خواتین زرد چاول پھینک کر اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔

(ہندوستان میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے) مگر جدت یہ ہے کہ دولھا کے پیر بھی دھلائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دولھا کو دالان میں لایا جاتا ہے اور ساتھ ہی دولھن کو بھی وہیں لاتے ہیں۔ دولھا و دولھن دونوں سے صدق دلی سے مل کر رہنے کا عہد کروایا جاتا ہے۔ یہ دونوں تاحیات مل کر رہنے کی قسم کھاتے ہیں اور اس وقت تک کہ جب تک موت انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کرے۔ جب تمام مذہبی رسوم ختم ہو جاتی ہیں تو دولھا دولھن ایک دوسرے کے بازو میں بیٹھتے ہیں۔ اس موقع پر انھیں عزیز و اقارب، دوستوں کی جانب سے مبارکباد دی جاتی ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد رسوم کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو زیادہ مزاحیہ اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً دولھا، دولھن کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہے اور انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوتا ہے

جاوا کی شادی کی رسم و رواج میں دولھا کی آمد سے لے کر نکاح تک اختلاف نمایاں رہتا ہے۔ جاوا میں دلچسپ رواج یہ ہے کہ دولھا کا خیر مقدم خود دولھن کرتی ہے۔ نوشہ کی آمد کی خبر سن کر دولھن اپنے رشتہ داروں کے ساتھ گھر کے باہر آتی ہے تاکہ دولھا کا خیر مقدم کر سکے۔ یہاں دو میٹر کے فاصلے سے ایک دوسرے پر پھول اور سر بستہ (پان) پھینکتے ہیں۔ اگر سربستہ دولھا سب سے پہلے پھینکے تو اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا ازدواجی زندگی میں ایک اچھا محافظ ثابت ہوگا اور اگر اتفاق سے دولھن سبقت لے جائے تو بدشگونی سمجھی جاتی ہے اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ دولھا عملی زندگی میں زن مرید ثابت ہوگا۔ اس دلچسپ رسم کا سب سے مزاحیہ و قابل دید منظر وہ ہوتا ہے جب کہ دولھن والوں کی جانب سے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ دولھن پہلے پان پھینکے۔

اس کے بعد دولھن کو ایک اور رسم انجام دینی پڑتی ہے۔ فرش پر ایک برتن میں پانی رکھا جاتا ہے جس میں ایک رکابی اور انڈا ہوتا ہے اس پر پان پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس برتن کے سامنے دولھا کھڑا ہوتا ہے اور دولھن اپنے گھٹنوں کے بل جھکتی ہے اور دولھا کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتی ہے۔ اس کو انڈونیشیائی زبان میں "سمبھا" کہا جاتا ہے۔ انڈے کو توڑنے اور ہاتھوں کے دھونے کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس کے بعد دولھن گھٹنے کے بل کھڑی ہوتی ہے۔ اب دولھن دولھا کو اپنے گھر لے جاتی ہے مذہبی رسومات اس دن بہ نسبت دیگر دنوں کے دوسرے مراسم کے ساتھ

انجام دی جاتی ہیں۔

انڈونیشیا کے مختلف حصّوں میں دولھن کا سنگھار مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ سماٹرا کی دولھن کا لباس ملایا کی دولھنوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ جاوا میں ہندو اثر نمایاں ہے۔ یہاں اختلاف نہ صرف کپڑوں بلکہ پہروں کے ہیک اپ اور پگڑیوں کو دیکھنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سماٹرا کی دولھنیں چولی پہنتی ہیں جس کے دو حصّے ہوتے ہیں نچلے حصے کو "کیبن" کہا جاتا ہے یہ چولی بلاؤز کی مانند ہوتی ہے جس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور یہ گھٹنے تک لمبی ہوتی ہے اس پر تیز تاگے سے نقش و نگار کیے جاتے ہیں۔ ایک برقعہ جسے انڈونیشیائی زبان میں "سلنڈ رنگ" کہا جاتا ہے شانوں پر ڈالا جاتا ہے۔ کیبن اور سلنڈ رنگ دونوں چولی کی طرح سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں ان پر خوب صورت نقش و نگار کیے جاتے ہیں۔ دولھن کے سر کو بہت ہی اہتمام سے سجایا جاتا ہے اسے انگوٹھیاں نکلس اور کنگن پہنائے جاتے ہیں گلے اور کلائی میں بھی زیورات پہنائے جاتے ہیں۔ جاوا کی دولھنیں ... کا جاکٹ پہنتی ہیں جسے انڈونیشیائی زبان میں "کبایا" کہا جاتا ہے۔ اس کے حاشیے پر سنہری نقش و نگار ہوتے ہیں نچلا حصّہ کیبن بھی منقش ہوتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے اس پر پلیٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ دولھن کو تین نکلس اور ایک سنہری کمر پیٹی پہنائی جاتی ہے جس کا بک بڑا ہوتا ہے اور اس میں جواہرات اور قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ دولھن کے لمبے بالوں کو گوندھ کر چنبیلی کے پھول لٹکائے جاتے ہیں۔ سنہری کانٹوں اور حسین پھولوں سے سر ڈھک جاتا ہے۔ "دولھے پر سہا گر یہ کہ چنبیلی کے پھولوں کا بہترین ہار ڈالا جاتا ہے۔ شادی کی رسوم کے اختتام پر یہ پھول دولھن جو اب سینیئر بن جاتی ہے اپنی جونیئر سہیلیوں یعنی غیر شادی شدہ لڑکیوں کو دیتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ جو یہ پھول لگائیں گی ان کی شادی جلد ہو جائے گی (ہندوستان میں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے)۔

صحت منداوب اور تعمیر نو کا علمبردار
باتصویر ماہنامہ
پاسبان
چنڈی گڑھ
ہر ماہ آپ کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا ہے
مشہور و معروف فن کاروں کی ادبی کاوشیں
دلچسپ کہانیاں اور ڈرامے
دل گداز غزلیں اور روح پرور نظمیں
کلچرل، تاریخی، ادبی اور تعمیری موضوعات پر سیر حاصل مضامین
آرٹ پیپر پر دلکش ٹائیٹل اور متعدد دیدہ زیب تصاویر
ضخامت ۴۸ صفحات

قیمت فی پرچہ
چار آنے
سالانہ چندہ
تین روپے

اپنے شہر کے
لوکل ایجنٹ
یا ریلوے بک سٹال
سے طلب فرمائیں

سیل ایجنسی اور نرخنامہ اشتہارات کے لئے منیجر پاسبان پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ چنڈی گڑھ کو لکھیں

موصولات

اردو کریما معہ ضمیمہ الموسوم بہ رحیما از صبر رضوی مخدوم آبادی۔ کریما فارسی کا یہ منظوم ترجمہ ہے۔ قیمت دس آنے۔ ملنے کا پتہ: نسیم احمد مقام و ڈاک خانہ شیخ پورہ۔ ضلع مونگیر

آسٹریلیا کی جھلک۔ از تاج یٰسین علی خاں۔ ملنے کا پتہ۔ الہدیٰ بک ایجنسی مجردگاہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے پیش لفظ نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر طبابت حیدرآباد دکن ۲۷۴ صفحات پر مشتمل سفرنامہ

ہم وحشی ہیں۔ کرشن چندر کے ان افسانوں کا مجموعہ جو فسادات کے زمانے میں لکھے گئے۔ چوتھی بار یہ مجموعہ طبع ہوا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ کتابی دنیا نظیر آباد لکھنؤ

ساز ِینہ۔ احمد عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ جسین و دلکش چھپا ہے قیمت عمہ۔ ملنے کا پتہ۔ آزاد کتاب گھر جمشید پور ۱

کہانی اور اس کا فن۔ از مغنی تبسم ام۔ اے۔ قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ شعور پبلی کیشنز ۶۹۹ عثمان پورہ حیدرآباد دکن۔ یہ کتاب یس انتونوف کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔

دوشیزۂ مصر۔ ناول از اشرف بھوپالی بی اے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ چنگاری دہلی

شبنم کے موتی۔ ناول۔ از حسین علوی۔ قیمت ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ کتابی دنیا لکھنؤ۔

رسالے

ماحول۔ ۱۳، ۱۴۔ ظفر ادیب کی سخت جانی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ معاشی تنگیوں، دنیاوی مصیبتوں اور اپنوں کی چیرہ دستیوں کے باوجود ماحول کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم، ممتاز حسین، کرشن چندر، صالحہ عابد حسین۔ چندر کرن سون رکسا دیویندر ستیارتھی اور کتنے ہی نوجوان ادیبوں کے تخلیقات شامل ہیں۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ۔ ماحول دو ماہی اردو بازار دہلی

ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ ۱۹۵۵ء میں۔ قیمت آٹھ آنے (حیدرآباد دکن)

شفق۔ زیر سرپرستی مولانا ناطق گلاؤٹھوی۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر شفق مومن پورہ ناگپور

ادارہ

ملاحظات

حال ہی میں مدیر نے متعدد اہلِ قلم کی خدمت میں قلمی اعانت کے لئے فرداً فرداً درخواست کی تھی۔ اردو کے نہایت سربرآوردہ ادیبوں نے جلد از جلد توجہ فرمانے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ چنانچہ مولانا نیاز فتح پوری، ڈاکٹر سید عابد حسین، سید مسعود حسن رضوی، کرشن چندر، سردار جعفری، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر سید اعجاز حسین، اپندر ناتھ اشک، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، سید علی عباس حسینی، سکندر علی وجد اور دیگر اہلِ قلم میں سے بعض نے تو اپنے نگارشات ارسال فرمادئے ہیں اور بعض نے جلد بھیج دینے کا وعدہ فرمالیا ہے۔

اس ضمن میں ایک ضروری گزارش کرنا ہے نظمیں اور غزلیں بالخصوص اور مضامین بالعموم بغیر طلب بڑی تعداد میں موصول ہو رہے ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں معیاری بھی ہوتی ہیں لیکن ان سب کو 'آجکل' میں جگہ دینا تنگ دامانی کی وجہ سے ممکن نہیں۔ بعض کرم فرما ایسی چیزیں واپس پہنچنے پر ناخوش بھی ہو جاتے ہیں لیکن ادارے کی بے بسی کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ اس لئے بصد ادب اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ بے طلب مضامین یا نظمیں بھیجنے سے پہلے ادارے کی مشکلات کا اندازہ ضرور کر لیا کریں۔

ہمارے پرانے کرم فرما ڈاکٹر مختارالدین احمدؔ جو اب اپنے نام کے ساتھ آرزوؔ لکھنا پسند نہیں کرتے، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے سفر سے واپس علی گڑھ تشریف لے آئے ہیں۔ آپ نے لندن اور دوسرے مقامات پر ریسرچ کا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے۔ 'آجکل' پر ان کی نظرِ عنایت ہر حال میں رہی ہے۔ چنانچہ وہاں سے بھی آپ نے متعدد مضامین اور نوادر 'آجکل' کے لئے بھیجے۔ آپ کے بخیریت وطن آجانے پر ادارہ ان کا خیر مقدم کرتا ہے۔

'آجکل' کی توسیعِ اشاعت ہر بہی خواہِ اردو کا فرض ہے۔ اس کی دلچسپیوں میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ اگست کا شمارہ 'موسیقی نمبر' ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ بہت سے اچھے مضامین مل گئے ہیں۔ امید ہے یہ شمارہ اپنی مثال آپ ہوگا۔ ضخامت بھی ۱۲۰ صفحے ہوگی اس لئے جو حضرات ابھی سے گاہک بن جائیں گے ان کو یہ شمارہ چندے ہی میں مل جائے گا۔

گرمی آئی

پرشوتم لال ضیا

دھول اڑاتی گرمی آئی — آگ لگاتی گرمی آئی
اتنا گرم ہو گیا پانی — یاد آگئی سب کو نانی
آنے لگے ہیں خوب پسینے — مہنگے ہیں مٹکے مٹکینے
برف نے کتنی دھوم مچائی — برف کی ہے ہر سمت دہائی
آج بھی جو چائے پیتے ہیں — پتہ نہیں کیسے جیتے ہیں
لوگ ترستے ہیں بادل کو — آج نہیں تو اچھا کل کو
کپڑوں سے آتی ہے بدبو — بھاپ لگی ہے اٹھنے ہر سو
کھانوں پہ اڑتی ہے مکھی — بھوک نہیں اب لگتی اچھی

کتھا سناؤں کیا گرمی کی
آہ زباں جلتی ہے میری

نذیر رحمانی

ایشور چندر ودّیا ساگر

بچو! دنیا میں وہی لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور تاریخ میں بلند درجہ پاتے ہیں جو دوسروں کے لئے بھلائی نیکی اور ہمدردی کر جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی نے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

ہاں تو سنو! بنگال کے بیر سنگھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایشور چندر پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنے دیش میں نہ تو تعلیم و تربیت کی روشنی تھی اور نہ بجلی کی۔ نہ ریل موجود تھی نہ ہوائی جہاز۔ آمد و رفت کے ذرائع اتنے کم اور مختصر تھے کہ ایک صوبے کے لوگ دوسرے صوبوں کے باشندوں کو نہیں جانتے تھے۔ ایشور چندر بچپن سے جوان ہوئے اور جوان سے بوڑھے ہو گئے اور پھر جب ان کی وفات ہوئی ہے اس وقت ہمارے دیش کی حالت بدل چکی تھی اور خاص کر بنگال میں ایشور چندر کی کوششوں اور قربانیوں نے لوگوں کے سامنے ترقی کے بڑے بڑے اصول قائم کر دئے تھے۔

ایشور چندر نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک پاٹ شالہ میں حاصل کی۔ ان کے استاد شری کالی کانت چیٹرجی ان کی ذہانت سوجھ بوجھ اور سمجھ داری کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کے باپ ٹھاکر داس بینرجی سے کہا کہ وہ اس ہونہار تیز اور ذہین لڑکے کو کلکتہ لے جا کر اعلیٰ تعلیم دلائیں نو سال کی عمر تھی۔ ایشور چندر اپنے والد کے ساتھ بیر سنگھ سے کلکتہ آ گئے۔ یہاں انھیں سنسکرت کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی ذہانت اور لیاقت کے وہ جوہر دکھائے کہ کالج کے تمام پروفیسر اور پرنسپل حیران رہ گئے وہ انتہائی شوق، دلچسپی اور لگن کے ساتھ پڑھتے لکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ وہ سالانہ امتحان میں اول درجے پر پاس ہوتے اور سرکار ان سے خوش ہو کر انھیں وظیفہ دیتی۔

پندرہ سال کی عمر میں سنسکرت زبان پر وہ اس طرح قادر ہو گئے تھے کہ اس کو اپنی بنگالی زبان کی طرح نہایت آسانی اور صفائی سے بول سکتے تھے۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اسی سنسکرت کالج سے انھیں ودّیا ساگر کا اعلیٰ خطاب دیا گیا اور اسی نام سے وہ آج تک ہندوستان کی تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ عزت مرتبہ اور کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں جتنی محنت اور مشقت کرنا پڑی تھی اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت ہی

غریب اور معمولی آدمی کے بیٹے تھے۔ اُنکے باپ کو صرف دس روپے تنخواہ
ملتی تھی - ان کے ساتھ ان کے دو بھائی اور بھی رہتے تھے - اس ذرا
سی آمدنی میں مشکل سے گھر کی گزر بسر ہوتی تھی، نوکر کی تنخواہ بچانے
کے لئے ایشور چندر اپنے ہاتھ سے خود ہی روٹی ترکاری پکاتے
تھے اور دوسرے کام بھی وہ خود ہی کرلیا کرتے تھے ۔

جب انھوں نے کالج کی تعلیم ختم کرلی تو پھر وہ فورٹ ولیم
کالج میں پچاس روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے اور وہیں انھوں
نے بابو سریندر ناتھ بینرجی کے والد بابو درگا چرن بینرجی کی مدد
سے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس میں بھی کافی مہارت
حاصل کی - آخر انھوں نے ترقی کرتے کرتے اسی کالج کی پرنسپلی
حاصل کرلی - اب انھوں نے اور بھی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کام
کیا - حکومت نے انھیں تین چار ضلعوں کے دیہاتی مدرسوں کا
انسپکٹر بھی مقرر کر دیا - اس طرح ان کی تنخواہ پانچ سَو روپے
ماہوار ہو گئی ۔

قدرت کو اب ان سے اور دوسرے علمی ، ادبی اور قومی
کام لینا منظور تھا - آپ نے سرکاری ملازمت سے علیحدگی
اختیار کرلی اور اپنا ایک پریس قائم کیا - اس میں سنسکرت کی
کتابیں چھاپی جاتیں اور بہت کم قیمت میں فروخت ہوتیں
تاکہ کتابیں زیادہ فروخت ہوں اور بہت سے لوگ انھیں پڑھیں
انھوں نے بنگلہ زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے بنگالی میں بھی
کتابیں چھاپیں - وہ کتابیں اتنی اچھی ثابت ہوئیں کہ سرکار نے انھیں
اسکولوں کے نصاب میں داخل کرلیا - ان کتابوں کی آمدنی ایشور چندر
ودیا ساگر کو پانچ ہزار روپے ماہوار ہونے لگی - لیکن تم کو یہ سُن کر
تعجب ہوگا کہ وہ یہ ساری آمدنی اپنے ہم وطنوں اور غریب آدمیوں
کی خدمت بھلائی اور اصلاح میں صرف کر دیا کرتے تھے

ودیا ساگر نے لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسے بھی کھولنا
شروع کر دئے - کلکتہ میں میٹرا پالی ٹن اسکول اور جو کالج ہے وہ انھوں
نے ہی قائم کیا تھا - اس کالج کی ایک خصوصیت اور بھی تھی اور وہ
یہ کہ اس کا کل انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا - اس کی فیس
معلوم ہے کیا تھی صرف تین روپے ماہوار - مقصد اس سے یہ تھا
کہ غریب سے غریب لوگ بھی آسانی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۶۵ء بہت مشہور ہے - اس
سال بنگال میں ایک بہت بڑا قحط پڑا تھا - اس زمانے میں
ایشور چندر کے مکان پر دس بارہ آدمی دن رات کھانا پکاتے
رہتے تھے تاکہ کوئی ان کے دروازے سے بھوکا نہ جائے - ہزاروں
آدمی ان کے گھر سے کھانا کھا کر جاتے تھے - اس کے علاوہ قحط اور
مصیبت کے مارے لوگوں کو سیکڑوں روپے انھوں نے امداد
کے طور پر تقسیم بھی کئے ۔

۱۸۶۸ء میں بردوان ضلع میں ایک بہت ہی خطرناک
قسم کا بخار پھیلا - ودیا ساگر بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے -
انھوں نے اپنا ذاتی شفا خانہ قائم کیا اور اپنے ڈاکٹر کے ساتھ
خود گاؤں گاؤں کا دورہ کیا - اور مفت دوائیں تقسیم کیں - دسہرہ
کے تہوار پر ان کے مکان پر پانچ ہزار روپے سے زیادہ کی
دھوتیاں غریبوں کو دی جاتی تھیں - کبھی جب وہ اپنے گاؤں بیر سنگھ
میں جاتے تو سیکڑوں روپے لوگوں کو خیرات کر دیتے - ان کی
خوبیاں اور اچھائیاں کہاں تک گنائی جائیں مختصر یہ کہ وہ
اپنی قابلیت ، رحمدلی اور فیاضی کی وجہ سے سارے بنگال
میں مشہور ہو گئے - اب لوگ انھیں ودیا ساگر کے بجائے
"دیا ساگر" کہنے لگے ۔

ودیا ساگر بڑے رعب داب کے آدمی تھے - بڑے بڑے

سرکاری افسران سے ڈرتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ اُنھیں
ودیا ساگر کا دردمند دل غریبوں کے افلاس اور مصیبت کو دیکھ کر
موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔ ان کا دل اتنا دُکھا ہوا کمزور اور حسّاس
تھا کہ وہ غریبوں اور ناداروں کو بُرے حالوں میں دیکھ کر بچوں
کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتے تھے۔ وہ علمیت اور قابلیت
اور دولت و شہرت کے اعتبار سے بہت بڑے آدمی تھے۔ لیکن
اس کے باوجود وہ بہت سادی اور معمولی زندگی گزارتے تھے
پاؤں میں سلیپر اور بدن پر صرف دھوتی اور چادر۔ مکان بھی
بہت معمولی سا۔ بعض اوقات لوگوں کو ان کے پہچاننے میں
بڑی مشکل ہو جاتی تھی

ستر سال کی عمر میں ایسی نیک نام زندگی بسر کرنے کے
بعد جولائی ۱۸۹۱ء میں ودیا ساگر نے اس دُنیا سے کوچ کیا
بچو! تم بھی کوشش کرو کہ ایسے ہی بڑے لوگوں کی طرح تمھاری
ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور لوگ تم کو ہمیشہ یاد رکھیں۔

لطیفے

میزبان (مہمان لڑکے سے) ہاں ہاں! کچھ سموسے اور کھالو۔
مہمان لڑکا۔ جناب اب تو پیٹ بھر چکا ہے
میزبان۔ تو کچھ جیب میں ڈال لو۔ راستے میں کھا لینا۔
مہمان لڑکا۔ جیبیں بھی پُر ہیں جناب۔

ایک مُفت خورے نے اپنے کسی دوست کو مٹھائی کھاتے دیکھ کر
پوچھا۔ کیا کھا رہے ہو۔
اس نے آزردگی سے جواب دیا "زہر"
مفت خورے نے فوراً اپنا ہاتھ طشت میں ڈال دیا اور یہ کہہ کر
کھانے لگ گیا کہ "تمھارے بعد ہمیں بھی جینا حرام ہے"۔

حکیم۔ میرا علاج کامیاب رہا۔ اب کوئی شکایت تو نہیں ہے۔
مریض۔ ابھی مجھے کچے انڈے اور باسی روٹیاں اچھی طرح ہضم نہیں ہوتیں۔

راجہ نواب

بچّہ اور تیتری

اک پیاری پیاری تیتری — گلزار کی ننّھی پری
پھرتی ہے اِتراتی ہوئی — اور ناچتی گاتی ہوئی
اِس پھُول پر بیٹھی کبھی۔ اُس پھُول پر بیٹھی کبھی
وہ پیاری پیاری تیتری

اک بچّہ پیارا پیارا سا — ہے اس کے پیچھے دَوڑتا
وہ اس کے ہاتھ آتی نہیں — جی اس کا بہلاتی نہیں
بیٹھی کبھی اور اُڑ گئی۔ آئی کبھی اور مُڑ گئی
وہ پیاری پیاری تیتری

کہتا ہے وہ اللہ میاں — میں کیا کروں جاؤں کہاں
مجھ کو بنا دے پھُول تو — دے پھُول سا رنگ اور بُو
پھُولوں میں میں پھُولا کروں — اور شاخ پر جھُولا کروں
یا پاس آ جائے مرے۔ آپ اُڑ کے ننھے پھُول سے
یہ پیاری پیاری تیتری

محمد عبید اللہ شریف

خود غرض دوست

ایک دفعہ زاہد، امر اور بکر ایک باغ میں گئے اور مزے سے آم توڑ کر کھانے لگے ۔ دھوپ بہت سخت تھی ۔ مالی ایک درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھا باغ کی نگرانی کر رہا تھا ۔ جب اس کی نظر ان تینوں دوستوں پر پڑی تو وہ سوچنے لگا ۔ کہ انھیں کس طرح پکڑا جائے ۔

آخر ایک ترکیب سُوجھی وہ اُٹھا اور ان کی طرف بڑھا جوں ہی تینوں دوستوں کی نظر اس پر پڑی وہ بھاگنے لگے ۔ مالی نہایت اطمینان اور پیار سے للکارا اور کہنے لگا " بچو ڈرو نہیں تم تو ہمارے محلّے کے بچے ہو آؤ اور مزے سے جی بھر کر آم کھاؤ " یہ سُن کر تینوں قریب آئے اور آم توڑنے لگے ۔

مالی نے زاہد سے کہا " تم ہمارے بچے کے ماسٹر کے لڑکے ہو خوب جی بھر کر آم کھاؤ " ۔ اور امر سے بولا " تم وکیل صاحب کے بیٹے ہو اور وکیل صاحب نے میرا مقدمہ جیتنے کی پوری کوشش کی تھی ۔ اس لئے تم بھی دل بھر کر آم کھا سکتے ہو ۔ لیکن یہ لڑکا معلوم نہیں کس کا ہے اور اس کے والدین نے میری کوئی مدد نہیں کی ۔ یہ کہتے ہوئے مالی نے بکر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا " اس لئے میں اسے ضرور سزا دوں گا " ۔ دونوں خود غرض دوستوں نے بکر کی کوئی پروا نہ کی اور کہا " ہاں ہاں اسے ضرور سزا دو ۔ اور خوب مزے لے کر آم کھانے لگے ۔ مالی بکر کو ایک درخت سے باندھ آیا اور امر کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا " تمھارے باپ نے فریق مخالف سے رشوت لے کر میرے مقدمے کا ناس مارا ہے اس کے بدلے میں تمھیں ضرور سزا دوں گا " ۔ اس طرح امر کو ایک درخت سے باندھ دیا گیا ۔

زاہد ان دونوں کی حالت دیکھ رہا تھا لیکن خود غرضی کی وجہ سے ان کی کوئی پروا نہ کی اور آم کھانے میں مصروف رہا ۔ مالی امر کو باندھ آیا اور زاہد سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا ۔ زاہد پھُولا نہ سمایا تھا ۔ مالی نے موقع غنیمت جان کر زاہد کو پکڑ لیا اور جھاڑ سے باندھ کر تینوں دوستوں کی خُوب مرمّت کرنے کے بعد دھکّے دے کر تینوں کو باغ سے نکال دیا ۔ اس طرح مالی نے ہوشیاری سے کام لے کر تینوں دوستوں کو پکڑ لیا ۔ اگر یہ خود غرض نہ ہوتے تو زاہد اور امر مل کر بکر کو چھڑا سکتے تھے ۔

نصیحت :۔ جس طرح ہم کو کوئی حق نہیں کہ دولت پیدا کئے بغیر اُسے خرچ کریں ۔ اسی طرح ہم کو کوئی حق نہیں کہ دُنیا میں خوشی کا اضافہ کئے بغیر خوشی کو تصرف میں لائیں ۔

فاضل کاشمیری

ہُرد خزاں

اصل

رُتھفاہ گوٗ ہُرد ژاد

ہسہ ہے! ژہٕ کیاہ ناو   رُتھفاہ گوٗ ہُرد ژاد

سلاما - کمالا

گپالا - جمالا

کلین ین ہران چھوی   نوٗدی رنگ بھران چھوی

اڈین خوشش کران چھوی   اڈین یژ کھران چھوی

ژہٕ تے امتحان چھوی

رُتھفاہ گوٗ ہُرد ژاہ

وان برونٹھ سردی   کلین پھیر زردی

اڈیو تراو وردی

سرخ - لاجوردی

زمین تو تہ رنگین   پمیس پتہٕ پھوک شین

کُہک شین - ڈلک شین   سٹھاہ رُت لکان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

رُتھفاہ گوٗ ہُرد ژاد

پھہ گریس دانہ ساران   پھلس ڈیر کھاران

ہمیں لار بہارس

بس کاٹھ وارس

گامت چھ انبار   گام گام سرشار

بے غم تہ رت ہار   بوڈہ تام جواں چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

ترجمہ

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

ارے او بھائی کیا نام ہے تمہارا ؟

سلام بھیا - او کمال - ارے گوپال اور جمال - کیا پٹی باندھے چلے ہو - درختوں سے جھڑی لگی ہے .... کیا کیا رنگ نکھر رہے ہیں مست ہو رہے ہیں کچھ اور اس منظر سے کچھ پست تمہارا بھی امتحان لے رہی ہے فطرت ... بتاؤ تم مسرور ہو کہ مجبور ؟ اب جواب دینا ہی ہوگا - کیوں کہ تمہارا بھی امتحان ہے -

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

اب جاڑا آنے کو ہے ... (اس خیال سے) درخت زرد پڑ گئے لیکن ابھی ابھی کچھ اپنی وردیاں بدل رہے ہیں ... اور کچھ لال اور کچھ لاجوردی رنگوں میں جھوم رہے ہیں -

زمین اب رنگین مزاج ہے - شاید ماہ پوس کی برف کا انتظار ہے اسکو - برف اونچے اونچے پربتوں کی گودیوں میں پل کر جھیل ڈل میں انوکھی جھلکیاں پیش کر رہی ہے - آخر تمہارا بھی امتحان لے رہی ہے

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

دہقان اپنے کھیتوں سے دھان کے گٹھے اٹھا کر لا رہے ہیں اور غلّے کے ڈھیر کھڑے کر رہے ہیں -

ایک لار بیول اور دوسرے نے کاٹھ دور کی قسموں کے دھان کے انبار کر دئے ہیں - گاؤں کا گاؤں سرشار ہے - ہر چھوٹا بڑا بے غم اور ہلکا نظر آ رہا ہے - یہاں تک کے گاؤں کا ہر پیر مرد جوان سال دکھائی دے رہا ہے

آخر تمہارا بھی امتحان ہے

اصل

رُتھاہ گو ہُرد ژاد

ژریو تام ٹھٹھر کر   وندک پوّرہ سنز کر
رٹیو تے جمع کر
جیو تے جمع کر

ژہ دامانہ خالی   ژہ چھوی بانہ خالی
ژہ پھوک پانہ خالی   پکان زمستان چھوی
ژہ تے امتحان چھوی
رُتھاہ گو ہُرد ژاد

دسہرک چھ ایّام   خوش خاص تے عام
دیوت جلوہ رامن
شہرن تہ گامن
ہیوند ۔ سکھ ۔ مسلمان   ییتہ ساری یکساں
"ہے ایس چھ انسان"   پرکھ کہنہ دنان چھوی
ژہ تے امتحان چھوی
رُتھاہ گو ہرد ژاد

یہ سونتھاہ بہارہ   پھوزن لوکہ چارہ
پھوشرادن جوانی
نہ چھانی یہ میانی
ہر دتے خزانہ   چھو بجُرک زمانہ
پتس اکھ بہانہ   یہ دنیا کران چھوی
ژہ تے امتحان چھوی
رُتھاہ گو ہُرد ژاد

یلہ میسانہ دہراتھ   بس روزہ کہنہ راتھ
اوہ تاپہ یارو
دت میاں یارو
ترادت یہ گلشن   کوہ چشمہ تے دن
ژُل رتم دپہ زن   عجیب آسمان چھوی
ژہ تے امتحان چھوی

ترجمہ

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

چڑیاں تک تیاریوں میں لگی ہیں ۔ جاڑے سے نپٹنے کی
تیاریوں میں چیونٹیوں نے بھی اپنا رنگ لگائے ... باقی سب
ذخیرہ اندوز ہوگئے ہیں ۔ ایک تو ہی ہے جس کی جھولی بھی
خالی ہے اور خالی ظرف بھی ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تو سراپا
خالی ہے ۔ نہیں سمجھتے ہو؟ .... جاڑا آرہا ہے ۔ جاڑا
تمہیں بھی اس امتحان میں بیٹھنا ہوگا ۔

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

دسہرے کے ایّام ہیں ۔ ہر خاص و عام خوش ہیں
رام چندر جی مہاراج نے یہاں ہر جگہ شہروں
اور گاؤں میں درشن دئے ہیں ۔ اس لئے یہاں ہر ایک
ہندو ۔ ہر ایک سکھ اور ہر ایک مسلمان بھائی بھائی
ہونے کا گیت گا رہا ہے ۔ اور صحیح معنوں میں انسان ہونے
کا اعلان کر رہا ہے ۔ اس میں آخر تمہارا بھی امتحان ہے ۔

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

موسم بہار، یا موسم بہار ... دل نشین اور رنگین بہار ۔ یہ بچپنے کی سی
حسین بہار ہے ... بہار یا بچپن ۔ بچپن یا بہار ... پھر... ساون کے
دن ۔ گویا دیوانی جوانی کے دن ۔ یہ دن نہ تیرے ہیں اور نہ میرے ۔ پت جھڑ
یا خزاں ... پیری ہے پیری اور بس یہ دنیا ہمیں کیا کھلونے دے کر
بہلا رہی ہے ۔ کھلونے سمجھو یا نفیر کے رنگ میں رنگی ہوئی نیرنگیاں اور آخر
میں ایک بہانہ کرکے ہمیں رخصت کر دیتی ہے ! پھر تمہارا بھی امتحان ہے

ایک مہینہ ہوا خزاں آئے ہوئے

جب ماہ ساون کی صرف چند راتیں باقی رہ گئیں تو یہاں کے
فصلی بٹیروں نے میرے ساتھ سرد مہری دکھائی ....
اور یہ گلشن ۔ کوہسار ۔ چشمے اور جنگلات
چھوڑ کر
یہاں سے اس طرح چلے گئے گویا وہ اپنے نہیں بلکہ پرائے تھے
یہ اس کج رَو آسمان کی قدیم خو ہے ۔ اس میں تمہارا بھی امتحان ہے

اصل

رشتغاه گو ہُرِد ژاد

رُہیہ سونتہ ین یود یم جل تہ کستور

کرن نغمہ خوانی

وڈن آسمانی

بناون یہ گلشن برابر ارم ژن

امی برانژ توشن یہ میون گلستان چھوی

ژہ تنے امتحان چھوی

ترجمہ

ایک جہینہ ہوا خزاں آئے ہوئے

آنے والی بہار میں پھر پھوٹ آئینگے یہ جنڈول اور کستور

اور آ کر سب نغمہ خوانی کریں گے

ہوا پر پر پھیلائے اڑیں گے

اور اس گلشن کو رشک جنت بنائیں گے - اسی

امید پر یہ میرا گلستاں نازاں و شاداں ہے -

تمھارا بھی امتحان ہے

دھنیش ملک

کیا آپ جانتے ہیں

۱ - سانپ کے کان نہیں ہوتے اور وہ مداری کی بین بالکل نہیں سُن سکتا۔ اسے تو مداری صرف آپ ہی کو خوش کرنے کے لئے بجاتا ہے

۲ - بیل لال رنگ نہیں دیکھ سکتا -

۳ - زرافہ (جو کہ ایک لمبی گردن والا چوپایا ہے) اونٹ کی طرح ہفتوں بنا پانی پئے زندہ رہ سکتا ہے جس گھاس کی وہ جُگالی کرتا ہے اس میں سے پانی کھینچتا رہتا ہے -

۴ - کئی قسم کی بھیڑیں بھی ایسی ہوتی ہیں - جو کبھی کبھار ہی پانی پیتی ہیں -

۵ - کنکھجورے کے ۱۰۰ پیر نہیں ہوتے - اس کے تو ۲۱ - ۳۰ یا ۲۰۰ پیر ہوتے ہیں -

۶ - ہم چوہوں کا بولنا نہیں سُن سکتے - ہم تو صرف چھچھوندر کی بولی سُن سکتے ہیں - جیسے کئی لوگ چوہے کی بولی سمجھ بیٹھتے ہیں

۷ - کسی کیڑے مکوڑے کی چھ سے زیادہ ٹانگیں نہیں ہوتیں -

۸ - کسی کیڑے مکوڑے کے جسم میں خون نہیں ہوتا - ان کے جسم میں تو ایک سفید رنگ کی سیّال شے ہوتی ہے جو خون کا کام کرتی ہے

۹ - دُنیا کا سب سے بڑا پرندہ شتر مُرغ ہے - اس کا قد قریب ۸ فٹ اور وزن ۳۰۰ پونڈ ہوتا ہے - یعنی قد میں یہ عام آدمی سے لمبا ہوتا ہے -

۱۰ - دُنیا کے سب سے چھوٹے پرندے کا نام "کیوبن" ہے اسے "گانے والی پری" بھی کہتے ہیں اس کے ایک پر کی لمبائی ایک انچ اور اس کی کل لمبائی سوا دو انچ کے قریب ہوتی ہے - یہ پھُولوں کا رس تو پیتا ہی ہے لیکن چھوٹی چھوٹی مکھیاں اور مکڑیاں بھی کھاتا ہے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ ایک سیکنڈ میں ۷۵ بار پر مارتا ہے - سب سے حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ یعنی شتر مُرغ ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے تو دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتا ہے - اور اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ شتر مُرغ تو اڑ نہیں سکتا - لیکن دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ نہ صرف آگے کی طرف اڑ سکتا ہے بلکہ پیچھے کی طرف بھی اُڑ سکتا ہے (جیسے کہ ریل کا انجن یا موٹر کار راستہ بدلتے وقت پیچھے کی طرف چل سکتی ہے) دیکھا گیا ہے کہ کہ یہ پرندہ پھولوں سے رس چوستے وقت اپنے پر مارتا رہتا ہے اور رس پی کر بنا پیٹھ موڑے ہی پیچھے کی طرف اڑ جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے پر اُلٹا کر بھی اُڑ سکتا ہے -

۱۱ - زندگی کا اچھا سہارا ؟ مخلص دوست -

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم امور بیان کر دئے گئے ہیں۔

قیمت ۴ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارِ نمایاں میں حصہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر پلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیر تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے یہاں کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے | بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی | قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer,
United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—869

آجکل

ستمبر ۱۹۵۶ء

آٹھ آنے

ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دلکش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے۔ قیمت -/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے۔ -/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے۔ -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی
اسکی آواز ہی تو ہے
SPITZENSUPER 950 W
MODEL 450 BO
MODEL 550 WO
MODEL 650 WO
MODEL 750 WO
PHONOSUPER 655 WO
ماڈل 550 WO
6 ویلوز - 4 بینڈز - پلاسٹک کے خوشنما کیبنٹ میں
اے-سی اور ڈی-سی سے چلنے والا قیمت -/350 روپے
ماڈل 450 BO
ڈرائی بیٹری سے چلنے والا - 4 ویلوز - 4 بینڈز صاف اور سریلی آواز والا
قیمت -/340 روپے
ماڈل 650 WO
6 ویلوز - 4 بینڈز - 2 پائیدار اور مضبوط لاؤڈ سپیکر - آواز کو کنٹرول
کرنے کیلئے دونوں کنٹرول لگے ہوئے ہیں - میجک آئی لکڑی کا خوبصورت کیبنٹ
اے-سی اور ڈی سی سے چلنے والا
قیمت -/450 روپے
SIEMENS GERMAN RADIO
سیمینز جرمن ریڈیو
ماڈل 750 WO
اے-سی سے چلنے والا - 7 ویلوز - 6 بینڈز - شارٹ ویو
مائیکرو میٹر - دو پائیدار لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے ہیں -
قیمت -/675 روپے
ماڈل فونو سپر 655 WO
اے-سی سے چلنے والا - ٹیبل ریڈیو گرام لگا ہوا ہے - 6 ویلوز -
4 بینڈز - لکڑی کی چمکدار اور خوشنما کیبنٹ میں - قیمت -/950 روپے
ماڈل سپٹزن سپر 950 W
اے-سی سے چلنے والا - بجلی کی طاقت -
110/125/150/220/240 v. - 9 ویلوز میجک نین، 6 ویو بینڈز
شارٹ ویو مائیکرو میٹر - 8 ٹیونز بٹن
کھلا یا بند رکھا جا سکتا ہے -
8-1 انچ کے تین مضبوط اور
زوردار لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے ہیں
قیمت -/1050 روپے
برانچیں
کلکتہ
گاندھی ہاؤس
P-34 مشن رو ایکسٹنشن
نئی دہلی
57 - ایم بلاک
کناٹ سرکس
بمبئی
3 نیو کوئینز روڈ
(بالمقابل اوپیرا ہاؤس)
مدراس
162، ماؤنٹ روڈ
اورینٹل ریڈیو کارپوریشن
ہیڈ آفس :- ورما بلڈنگ 12/4 ، دہلی - اجمیری گیٹ ایکسٹنشن - نئی دہلی
PRINCE DLH
POR 8U

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- بال مُکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- مُظفّر شاہ

جلد ۱۵ —— نمبر ۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

ستمبر ۱۹۵۶ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- شیلانگ کا ایک منظر
(عمل:- بی، این جیجا)

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ادارہ

مُلاحظات

سیاسی رجحانات بڑی تیز رفتاری سے واقعاتِ عالم پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ آزادی پسند اقوام امنِ عالم کے لئے کوشاں ہیں۔ حال ہی میں وزیرِ اعظم ہندوستان جب کامن ویلتھ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو واپسی پر انھوں نے مختلف یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ اس دوران میں مارشل ٹیٹو، کرنل ناصر اور پنڈت نہرو نے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ امنِ عالم کے لئے ان کی کوششوں کو آزادی پسند ممالک نے بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔

امریکہ نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر مصر کی مالی امداد بند کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ امداد اسوان بند تعمیر کرنے کے سلسلے میں تھی۔ مصر نے امریکہ کے اس اقدام کو جارحانہ تصور کیا اور سویز کمپنی کو قومی ملکیت قرار دے دیا۔ کرنل جمال عبدالناصر نے جب یہ تاریخی اعلان کیا تو مصری خوشی سے ناچنے لگے۔ اس سے مصر کے عوام کے جذبات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر کے اس اقدام کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس پر مالی احتساب کے حکم صادر کر دئے ہیں۔ یہ کشمکش ناگوار صورت اختیار کر رہی ہے۔

کرنل ناصر نے کہا ہے کہ کمپنی سے دس کروڑ ڈالر سالانہ کی جو آمدنی ہوتی ہے اب اُسے اسوان بند کی تعمیر میں استعمال کیا جائے گا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ مدّتوں غلامی کی زنجیروں میں گرفتار رہنے والے ممالک اب اپنی تقدیر بنانے کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ یہ ان کا قدرتی حق ہے اور اس حق سے انھیں محروم کرنا مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے باوجود فریقین کو صبر و تحمل سے اپنے اختلافات کو دُور کر کے امن کی عالمگیر فضا پیدا کرنا چاہیئے۔

۲۳۔ جولائی کو بال گنگادھر تلک کی جنم شتابدی سارے ملک میں بڑے خلوص اور اہتمام سے منائی گئی۔ آزادی کے اس مردِ مجاہد نے برطانوی سامراج کے خلاف اس وقت آواز اُٹھائی جب آزادی کا نام لینا بہت بڑا جرم تھا۔ قید و بند اور جلاوطنی کے مصائب نے اس کے ارادے کو اور استقامت بخشی۔ "سوراجیہ میرا پیدائشی حق ہے۔" یہ نعرہ سب سے پہلے تلک نے لگایا اس کے بعد یہ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ ایک دُور رس سیاست دان، ایک شفیق بزرگ، ایک اٹل ارادے کے مالک اور ایک عالمِ باعمل کی حیثیت سے تلک کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ رَوشن رہے گا ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ او

اردو مصنفین کا رونا حقیقت پر مبنی ہے کہ انھیں اچھے پبلشر نہیں ملتے پبلشر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اردو کی کتابیں بکتی کم ہیں۔ ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت ہے جو کوآپریٹو بنیادوں پر قائم ہو اور اردو کی اچھی کتابوں کی اشاعت اپنے ذمے لے۔ اب بھی اچھی کتاب بازار میں آتی ہے تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے۔ یہ شکایت کہ اچھی کتابیں بکتی نہیں قرینِ قیاس نہیں۔ صالح طبقہ اب بھی خدا کے فضل سے موجود ہے اور شستہ اور شائستہ ادب کا ہمیشہ متلاشی رہتا ہے۔

انجمن ترقّیٔ اردو کا اخبار "ہماری زبان" ہفتہ وار ہونے والا ہے۔ اردو دوستوں کے لئے یہ خبر مسرّت کا موجب ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اخبار اُردو کے نئے مطبوعات کے باب میں بھی اپنے ناظرین کو معلومات بہم پہنچائے گا اور صرف انجمن ہی کی کتابوں کے اشتہار پر اکتفا نہیں کرے گا۔

پبلیکیشنز ڈویژن کے تمام رسالوں کے ادارتی بورڈ مقرر ہوئے ہیں۔ ناظرین یہ جان کر خوش ہونگے کہ اُردو آج کل کے لئے بھی ایک ادارتی بورڈ کی تشکیل ہوئی ہے۔ اسکے اراکین کے نام یہ ہیں۔ پروفیسر ایم مجیب جامعہ نگر، شری گوپی ناتھ امن ایم ایل اے دہلی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد دکن، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونی ورسٹی، پروفیسر رحمان راہی سری نگر کشمیر، ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، ڈپٹی ڈائرکٹر ایڈیٹوریل، ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن، ایڈیٹر آج کل۔

حسبِ دستور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں تمام خط وکتابت ایڈیٹر آج کل اردو کے پتے سے ہی ہونا چاہیئے۔

یحییٰ اعظمی

اے جنّتِ کشمیر

اے شہرِ گل و لالہ و اے وادیِ گل پوش   اے خاکِ ارم و در بر و فردوس در آغوش
ہے تیری ہواؤں میں اثرِ بادۂ سرجوش   ہے تیری فضا مے کدۂ و گل کدۂ بردوش
زیبا ہے جو کرتے ہیں تجھے خُلد سے تعبیر
اے جنّتِ کشمیر

ہر رنگ کے پھولوں سے مزیّن ہے، تری خاک   سبزے ہیں کہ دیبائے مشجّر کی ہے پوشاک
گُل ریز ہیں نسرین و سمن باد فشاں تاک   برپا سرِ ہر شاخ ہے اک بزمِ طرب ناک
طائر ہیں نواسنج کہ بجتے ہیں مزامیر
اے جنّتِ کشمیر

پھولوں کی ہے وادی کہ سجی محفلِ رنگیں   جھیلوں کا ہے پانی کہ بچھی چادرِ سیمیں
ہر جبہ پہ اللہ ہے ہجومِ گُل و نسریں   ہے سنبل و ریحاں سے تری خاک کی تزئیں
اِن تازہ عناصر سے ہوئی ہے تری تعمیر
اے جنّتِ کشمیر

جھرنوں کے پہاڑوں کے درختوں کے مناظر   ہر سمت وہ رعنائیِ فطرت کے مظاہر
وہ زمزمۂ آبِ رواں چشمۂ طاہر   ہیں ڈھیر تری خاک پہ قدرت کے نوادر
جھوم اُٹھے جنھیں دیکھ کے ہر شاعرِ دلگیر
اے جنّتِ کشمیر

ہیں خلدِ نظر سرو و صنوبر کی بہاریں   ہیں جنّتِ نظارہ چناروں کی قطاریں
ہم خلد زمیں کہہ کے تجھے کیوں نہ پکاریں   قدرت کے حسیں ہاتھ تجھے کیوں نہ سنواریں
ہے معجزۂ خامۂ فطرت تری تصویر
اے جنّتِ کشمیر

یہ حسن و جمال اور یہ رنگینی و نزہت   یہ رنگ یہ آب اور یہ گُل کاریِ فطرت
سبزوں کی یہ بہتات شگوفوں کی یہ کثرت   ہے خاک پہ آراستہ پھولوں کی یہ جنّت
ہر قلب و نظر ہے ترے فتراک کا نخچیر
اے جنّتِ کشمیر

ہے فرق پہ جو برف کے تودوں کا حسیں تاج
چوٹی پہ ترے کہسار کی فطرت کی ہے معراج
تو مشرق و مغرب کا ہے مسجودِ نظر آج
کر سکتا نہیں دہر ترے نقش کو تاراج

ہے ربط ہمیشہ سے ہمیں تیرے چمن سے
تیرے گل و ریحاں سے ترے سرو و سمن سے
صدیوں کا تعلق ہے ترے کوہ و دمن سے
ہے نسبتِ دیرینہ تجھے گنگ و جمن سے

ہے شرق سے تا غرب ترے حسن کی تشہیر
وابستہ وطن سے ہے ازل سے تری تقدیر

اے جنتِ کشمیر
اے جنتِ کشمیر

فطرت ہے فدا خود ترے اس نقشِ حسیں پہ
ہے جلوہ گر اک قوسِ قزح روئے زمیں پہ
اللہ رے خطِ سبزہ وہ رخسار و جبیں پہ
دریا کے جداول ہیں کہ ہے نقش نگیں پہ

ہے خاکِ وطن اور تری وادئ رنگیں
جزوِ چمنِ ہند ہیں تیرے گل و نسریں
چل سکتے نہیں اب ستم و جور کے آئیں
ہے مائلِ تاراج عبث گو نششِ گل چیں

ہے صفحۂ ایام کی زینت تری تحریر
یہ خاکِ گل و لالہ ہے ناقابلِ تسخیر

اے جنتِ کشمیر
اے جنتِ کشمیر

وہ بارشِ گل تیرے تل و کوہ و دمن کی
آرائشِ گل صحن و خیابانِ چمن کی
پھولوں سے معنبر وہ فضائیں ترے بن کی
مہکی ہوئی وادی تری وادی ہے ختن کی

پوشیدہ نہیں ہیں تری تاریخ کے احوال
شاہد تری رفعت کے ہیں ماضی کے مہ و سال
کیا کم ہے ترے فخر کو یہ عظمت و اجلال
دنیا میں مسلّم ہے تری خاک کا اقبال

ہے جس کی ہواؤں میں مئے ناب کی تاثیر
اٹھے ہیں تری خاک سے دنیا کے مشاہیر

اے جنتِ کشمیر
اے جنتِ کشمیر

پھر کیف سے جھوم اٹھے تری وادئ گل زار
سرگرمِ نوازش ہوا ابرِ سرِ کہسار
ہر نخل ہے وادی کا مئے ناب سے سرشار
ہر قطرۂ نیساں سے گہر خیز و گہر بار

مٹی تری آب و گلِ ریحاں سے بنی ہے
جانِ چمنستاں تری گل پیرہنی ہے
فطرت کے تقاضوں سے تری خاک دھنی ہے
آسودہ تری خاک میں تیرا وہ غنی ہے

ہے تذکرہ پھولوں کا شگوفوں کی ہے تطہیر
ہے جس کی نوا سوزِ غمِ عشق کی تفسیر

اے جنتِ کشمیر
اے جنتِ کشمیر

غنی کاشمیری

نیاز فتحپوری

مطالعۂ کائنات

اور

فلکیات کے بعض دلچسپ حقائق

جس وقت سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے، اس جستجو سے کبھی فارغ نہیں رہا کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کس طرح آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔

اسی فکر و جستجو نے بیسیوں فلاسفر و حکماء اور نہ جانے کتنے ماہرینِ سائنس پیدا کر دئیے، لیکن اس سوال کا صحیح جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔

اس میں شک نہیں کہ اہلِ سائنس کی ترقیاں حیرت ناک ہیں اور مادی حقائق کی دریافت کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لیکن یہ تمام کاوشیں صرف "کیا" تک محدود ہیں اور جب "کیوں" کا سوال سامنے آتا ہے تو سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔۔

انھوں نے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ جب دو مادی چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو اس سے ایک تیسری چیز اور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ عہدِ حاضر کی سب سے زیادہ اور اہم دریافت، ایٹم ہے جس کی بے پناہ قوت نے آج دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں اتنی زبردست قوت کہاں سے آئی، اس وقت تک اس کا علم کسی کو نہیں اور نہ آئندہ اس راز کے انکشافات کی توقع کی جا سکتی ہے

الغرض حقائقِ مادی تک تو انسان پہونچ گیا ہے۔ لیکن "کُنہِ حقیقت" تک اس کی دسترس اب تک نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ عرفی نے اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

> کُنہِ ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست
> ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من است

اور بیدل جب مطالعۂ کائنات کے سلسلے میں انسانی عجز و نارسائی کو محسوس کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

> بحر بیتابِ کہ آں گوہرِ نایاب کجا ست
> چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
> دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
> کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

خیر یہ باتیں تو اس عالم کی ہیں جس سے مادیین کو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے۔ جب ہم مادی نقطۂ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بھی اخیر میں ہمیں اسی امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

> کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

آئیے ہم آپ بھی اسی حیرت آباد کی سیر کریں اور خود مادیین ہی کے انکشافات کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ کائنات کے چہرے سے جو گوشۂ نقاب انھوں نے اٹھایا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

مطالعۂ قدرت کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز جس نے انسان کو حیرت میں ڈالا ہوگا غالباً آسمان ہے۔ انسان نے اوّل اوّل جب ستاروں کو دیکھا ہوگا تو وہ حیران رہ گیا ہوگا کہ فضا میں یہ بے شمار بکھرے ہوئے روشن نقطے کیا ہیں اور معلوم نہیں اس نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا، لیکن اب کہ ان کی حقیقت بہت کچھ ہمیں معلوم ہو گئی ہے انسان کی حیرانی کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ کیونکہ یہ بے شمار ستارے جو ہمیں رات کو جگمگاتے نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے ہی

نظامِ شمسی کے آفتاب کی طرح، بجائے خود آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے گرد خدا جانے اور کتنے ماتحت ستارے یا کُرے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ حال تو اُن ستاروں کا ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ستارے یا کُرے جو انتہائی دُوری کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، ان کی تعداد کا اندازہ تو ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ انسان اب تک کوئی ذریعہ ایسا دریافت نہیں کر سکا ہے جو اس پردۂ حجاب کے دُور کرنے میں اس کی مدد کر سکے۔

جب ہم ان ستاروں کو دیکھتے ہیں تو دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ یہ کیونکر عالمِ وجود میں آئے، یعنی کائنات کی تخلیق کب اور کیونکر ہوئی۔ اس میں شک نہیں یہ اس سے زیادہ اہم سوال ہے، لیکن صدیوں کی کاوش و جستجو کے بعد حکماء نے چند نظریے ضرور ایسے پیش کئے ہیں جن سے ہم کو اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

(۱) پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے مادہ Matter کے اُن دقیق ذرّات سے ہوئی ہے جنھیں ہم آٹم Atom یا "جوہرِ فرد" کہتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ ہم قوی ترین خُردبین کے ذریعے سے بھی انھیں نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ان آٹم یا جواہرِ فرد یا اجزاء لا یتجزیٰ کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ان میں ایک مرکزی یا بنیادی حصّہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں پروٹن Proton یا مرکزی سالمہ کہتے ہیں اور جس سے ہر وقت مثبت Positive بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا بیرونی حصّہ برقپاروں Electrons کا ہے جو ہر وقت پروٹن (مرکزی سالمہ) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اور جن سے ہر وقت منفی Negative بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

ہر عنصر یا مادہ جس سے کائنات کی تعمیر ہوئی ہے مجموعہ ہے انھیں سالموں اور برقپاروں کا، جن کی تعداد مختلف عناصر میں مختلف ہوتی ہے اور جن میں کمی بیشی ممکن نہیں۔ مثلاً ہائڈروجن کو لیجئے کہ وہ مرکب ہے ایک سالمہ اور ایک برقپارے سے۔ یا ہیلیم Helium جو مرکب ہے چار سالموں اور دو برقپاروں سے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فطرت کا نظام یہ ہے کہ جس مادہ یا عنصر کے جتنے سالمے اور برقپارے مقرر ہیں وہ ہمیشہ اُتنے ہی رہیں گے اور ان میں کمی زیادتی ممکن نہیں۔

(۳) تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم خلا سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل خلا نہیں ہے۔ جس وقت ہم روشن ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ان کے درمیان کوئی شے ایسی حایل نہیں ہے جو ان کی روشنی کو ہم تک نہ پہنچنے دے اور ہم اسی کو خلا یا فضائے بسیط کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فضائے بسیط بریز ہے ایک تُنک یا شفّاف مادے سے جو آفتاب اور دوسرے بے شمار سیّاروں سے نکل کر ہر وقت منتشر ہوتا رہتا ہے۔

(۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ جب دو آٹم یا سالمے یا ہمدگر زیادہ قریب آجاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، اس تصادم سے گرمی یا حدّت پیدا ہوتی ہے اور بڑا آٹم چھوٹے آٹم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فضا میں ایک گرم و روشن بادل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے اصطلاح میں نیولا Nebula سدیم یا سحابیہ کہتے ہیں اور اس کی صورت ایک روشن گیس کی سی ہوتی ہے۔

اب ان چاروں نظریوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو تخلیقِ کائنات کے تدریجی عمل کی صورت یہ قرار پائے گی کہ اب سے اربوں سال پہلے فضا میں ایک بہت بڑا نیولا پیدا ہوا جس کے اندر بے شمار آٹم ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور پھر زیادہ جسم بنانے والے آٹموں کے بعض حصے دورانِ گردش میں ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر علٰحدہ ہوتے گئے اور اپنی دُنیا الگ بناتے رہے جنھیں ہم تیارے کہتے ہیں۔ ان پیدا ہونے والے سیاروں میں بہت سے آفتاب بھی تھے اور انھیں میں سے ایک ہمارا آفتاب[1] بھی ہے۔

جب ہمارا آفتاب بن گیا تو وہ اپنے نیولا کے اندر اربوں سال تک چکّر کھاتا رہا اور اس دوران میں بارہا ایسا ہوا کہ نیولا کے دوسرے بہت سے کُرے گردش کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے، جن میں بعض اتنے بڑے تھے کہ ان کی کشش سے آفتاب کے بعض ٹکڑے علیحدہ ہو گئے، لیکن یہ کشش اتنی قوی نہ تھی کہ وہ آفتاب کی حدِ کشش سے بالکل علٰحدہ ہو جاتے اس لئے وہ آفتاب سے جُدا ہونے کے بعد بھی اس کے گرد چکّر لگانے لگے اور یہی وہ سیارگان توابع ہیں جن سے ہمارا نظامِ شمسی بنا ہے اور جن میں ایک تابع سیارہ ہمارا کرۂ زمین

---

[1] جس نیولا کے اندر ہمارا آفتاب بنا ہے اسے کہکشاں Milky Way کہتے ہیں۔

بھی ہے۔

دُوربین سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فضا کے تمام ستارے ایک سے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض جو حال ہی میں آفتاب بنے ہیں حد درجہ مشتعل ہیں اور اسی لئے ان کی روشنی ہم کو بہت تیز نظر آتی ہے۔ بعض ایسے ہیں جو جل کر اپنی عمر قریب قریب ختم کر چکے ہیں اور حرارت کم ہونے کی وجہ سے سُرخ گیند کی طرح فضا میں چکّر لگا رہے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اپنی آگ میں پھُنک تو رہے ہیں لیکن اپنا مادہ فضا میں منتشر کرتے کرتے بہت سکڑ گئے ہیں اور فنا کی منزل سے قریب تر آگئے ہیں۔

ہمارا آفتاب بھی رفتہ رفتہ اپنی حرارت کھوتا جارہا ہے اور آہستہ آہستہ سکڑتا جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ اس کے اندر حرارت کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور ضائع ہونے والی حرارت کی تلافی اس کے ایٹمی اجزاء کے پھٹتے رہنے سے ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ابھی ۳۰ کروڑ سال تک اس کے ٹھنڈے ہونے کا امکان نہیں۔

کہکشاں کے نبولا کے اندر علاوہ ہمارے نظامِ شمسی کے اور کتنے نظامِ شمسی پائے جاتے ہیں اس کا صحیح علم اس وقت تک نہیں ہوسکا، کیونکہ دُوربین اتنی قوی تیار نہیں ہوسکی جو دُنیائے کہکشاں کے تمام سیاروں کو ہمارے سامنے لا سکے۔ البتہ ۱۹۲۷ء میں مقام ورگو Virgo سے ایک ایسا نظامِ شمسی نظر آیا جس کے آفتاب کی روشنی ہمارے آفتاب سے پندرہ ہزار گنا زیادہ ہے، لیکن اس کے ماتحت سیارے جو اُس کے گرد گھوم رہے ہیں وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے گرد ایک گھنٹے میں چکّر لگایا جاسکتا ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی کے علاوہ دوسرے شمسی نظاموں میں بھی آثارِ حیات پائے جاتے ہیں یا نہیں، اس کے بابت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم اس کا امکان ضرور ہے کیوں کہ زندگی کے لئے ضروری ہے کہ ایک کرہ اپنے آفتاب سے نہ اس قدر قریب ہو کہ وہ شدّتِ حرارت سے جھُلس جائے اور نہ اس قدر دُور کہ ٹھنڈک کی زیادتی سے وہ یخ بستہ ہوجائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہاں ایسے عناصر موجود ہوں جو تخلیقِ حیات کے لئے ضروری ہیں اور ان دونوں باتوں کا ہر کرے میں پایا جانا یقینی نہیں ہے۔

ہر چند ہماری زمین کو کائنات سے وہی نسبت حاصل ہے جو ریگ کے ایک ذرّے کو زمین سے حاصل ہے، لیکن باوجود اس قدر حقیر ہونے کے اس میں زندگی کے تمام شرائط موجود ہیں اور اسی پر قیاس کرکے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ اگر دوسرے کروں کی فضا میں بھی تخلیقِ حیات کے یہی اسباب پائے جاتے ہیں تو وہاں بھی زندگی ہوگی ورنہ نہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے زمینی تجربے کی بنا پر کہتے ہیں ورنہ ہوسکتا ہے کہ دوسرے کُروں میں شرائطِ حیات کچھ اور ہوں، وہاں کے عناصر کی نوعیت ہم سے مختلف ہو۔ مثلاً ہمارے کرۂ زمین کے عناصر میں کاربن کا وجود زندگی کی نہایت اہم شرط تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے کرُوں میں کاربن کی جگہ کوئی اور عنصر یہی کام دیتا ہو اور وہاں کی مخلوق ہم سے مختلف ہو۔

ہر چند دُوسرے نظام ہائے شمسی کی تحقیقات ابھی تک مکمل نہیں ہوسکی ہیں لیکن اس سلسلے میں بعض نہایت دل چسپ باتیں اور بھی معلوم ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ ہزاروں ایسے سیاروں کا پتہ چلا ہے جو کسی نظام شمسی سے تعلق نہیں رکھتے یا اگر کوئی نظام ایسا ہے بھی تو وہ دو سیاروں سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یا یہ کہ بعض سیارے ایسے ہیں جو بظاہر ایک ہی نظر آتے ہیں لیکن دراصل ہیں وہ دو اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا طواف کر رہا ہے۔

سیارے اپنے حجم اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے دو قسم کے ہیں۔ ایک درجہ اوّل کے دوسرے درجہ دوم کے۔ سب سے بڑا سیارہ قدرِ اوّل کا ہے جسے ۱۹۳۵ء میں Dr. O. Struve نے دریافت کیا۔ اس کا نصف قطر ایک ارب ۲۰ کروڑ میل کا ہے یعنی اس کا پورا قطر زمین و آفتاب کے فاصلے سے ۴۰ گنا زیادہ ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی سے قریب ترین سیارہ Alpha Centaur ہے جس کی روشنی ہم تک صرف چار سال میں پہونچ جاتی ہے اور سب سے زیادہ روشن سیارہ Sword Fish ہے جس کا وزن بہ حساب پانچ کھرب ٹن فی سیکنڈ کم ہوتا جارہا ہے۔

جو سیارے ہمیں نظر نہیں آتے وہ ہماری زمین سے اتنی دُور واقع ہیں

کر ہم ریاضی کے اعداد سے ان کے فاصلے کا تعین نہیں کر سکتے۔ اسلئے ماہرینِ فلکیات نے فاصلے کا حساب نکالنے کے لئے روشنی کی رفتار کو اس کا پیمانہ مقرر کیا ہے مثلاً اگر کسی ستارے کی روشنی ہم تک ایک سال میں پہونچتی ہے تو وہ کہیں گے کہ فلاں ستارہ ایک نوری سال کی دوری پر واقع ہے۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے اس لئے اگر آپ ایک نوری سال کو اعداد میں ظاہر کریں گے تو پہلے ایک سال کے سکنڈ بنائیں گے اور پھر اسے ۱۸۶۰۰۰ سے ضرب دیں گے، اس طرح جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ اتنے اعداد پر مشتمل ہوگا کہ اس کا لکھنا اور پڑھنا دونوں مشکل ہے، پھر یہ تو ایک ہی نوری سال کے اعداد ہوں گے۔ لیکن بعض ستارے جن کی روشنی ہم تک لاکھوں سال میں پہنچتی ہے ان کے اعداد کی طوالت کس حد تک پہنچے گی۔ الغرض اسی دشواری کو سامنے رکھ کر ستاروں کے فاصلے کا حساب نوری سال پر قائم کیا گیا ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہو کہ ستاروں کا فاصلہ مقرر کرنا محض قیاس ہی قیاس ہے اور صداقت کو اس سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ ماہرینِ فلکیات کے ان بیانات کی بنیاد ریاضی پر قائم ہے جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں۔

رات کے وقت آپ کو آسمان پر ایک روشن سڑک نظر آتی ہے جسے آپ کہکشاں کہتے ہیں۔ دُور بین سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ کروڑوں ستاروں کا جمگھٹ ہے اور اسی جمگھٹ کے درمیان کسی جگہ ہمارا نظامِ شمسی بھی واقع ہے، لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ فضائے بسیط میں صرف یہی ایک کہکشاں نہیں ہے بلکہ نہ جانے اور کتنی کہکشائیں پائی جاتی ہیں اور وہ سب ایک دوسرے سے اتنی دُور واقع ہیں کہ ایک کی روشنی دوسری تک سیکڑوں سال میں پہونچتی ہے۔

پھر کائنات نام صرف انہیں ستاروں اور کہکشاؤں کا نہیں ہے جو ہمیں نظر آتی ہیں بلکہ اس میں بے شمار مرئی و غیر مرئی نیبولا بھی شامل ہیں جو ہنوز گیسی حالت میں ہیں اور ابھی تک وہ منجمد ہو کر کُرّے نہیں بن سکے ہیں۔ بہت سے نیبولا ایسے بھی ہیں جن کے اندر کُرّے بننا شروع ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک بن نہیں چکے۔

پھر آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ جس طرح ہر نظامِ شمسی کے سیارے اپنے آفتاب کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح تمام نظامِ شمسی مع اپنے تابع سیاروں کے خود بھی کسی اور نظام کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ ہمارا نظامِ شمسی بھی ستاروں کے ایک جھنڈ کی طرف جسے Lyra کہتے ہیں بہ حساب ۱۲ میل فی سکنڈ بڑھتا جا رہا ہے اور اس طرح ہماری زمین ہر گھنٹہ میں ۲۰ ہزار میل اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کائنات کی فضا اتنی وسیع ہے کہ ان میں باہم تصادم ممکن نہیں۔

کائنات کی اس وسعت کا اندازہ قابلِ فہم صورت میں اس طرح کر سکتے ہیں کہ اگر فضائے بسیط کے ارب در ارب سیاروں کو چیونٹی کے برابر چھوٹا فرض کریں تو ان میں ہر چیونٹی ایک دوسرے سے ۴۰ میل کے فاصلے پر نظر آئے گی اور اگر ایکسپریس ۶۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرے تو زمین سے قریب تر سیارے تک پہونچنے کے لئے اسے ۴ کروڑ سال درکار ہوں گے۔

زمین اور ہمارے نظامِ شمسی کے دوسرے سیارے آفتاب ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور آفتاب ہی ان کو روشنی اور گرمی پہونچاتا ہے، لیکن آفتاب کے مقابلے میں اس کے تابع سیاروں کے حجم کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم آفتاب کو ایک بڑا سا چکوترا فرض کر لیں تو ہماری زمین اس کے مقابلے میں آلپین کے سرے کے برابر ہوگی اور مشتری Jupiter جو ہمارے نظامِ شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے محض واسکٹ کے بٹن کے برابر، رہ گئے عطارد Mercury، مریخ Mars اور زہرہ Venus سو ان کی حیثیت ریت کے ذرّے سے زیادہ نہ ہوگی۔

ہمارے نظامِ شمسی نے ایک عظیم الشان فضا کو گھیر رکھا ہے جس کا قطر ۵۔ ارب میل اور محیط سترہ ارب میل ہے۔ لیکن تمام کائنات کے مقابلے میں یہ نہایت حقیر فاصلہ ہے، اتنا حقیر کہ اگر آفتاب اور اس کے تابع سیارے سب معدوم ہو جائیں تو بس ایسا معلوم ہوگا جیسے لاکھوں چراغوں میں سے ایک چراغ گُل ہو گیا۔

زمین آفتاب سے ۹۲۸۹۰۰۰۰ (نو کروڑ ۲۸ لاکھ ۹۰ ہزار) میل دُور ہے۔ یعنی اگر بالفرض آفتاب پر ایک عظیم الشان توپ چلائی جائے تو اس کی آواز چودہ سال میں زمین تک پہونچے گی۔ یا اگر ایک ریل گاڑی ۳۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلے تو وہ ۳۴۱ سال میں آفتاب تک پہونچے گی، بشرطیکہ مسلسل چلتی رہے۔

آفتاب اور زمین کا یہ فاصلہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن دوسرے ستاروں
کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ثریا کے ستارے ہماری زمین سے
۲۰۹۹۵۶۵۶۱۹۲...... میل دور ہیں اور کہکشاں کی دوری
......۳۳۲۳۴۲۳۴۴۲۱۳ میل قیاس کی گئی ہے۔
چونکہ اس قسم کے فاصلے اور بُعد ظاہر کرنے کے لئے ہندسے کافی نہیں ہوتے
اس لئے سہولت کی غرض سے یہ فاصلے روشنی کی رفتار سے متعین کئے جاتے ہیں،
جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔

آفتاب کی سطح ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بڑے بڑے گہرے غار پائے جاتے
ہیں جن سے ہر وقت لوہا، سوڈیم اور ٹین وغیرہ کی مشتعل گیس شعلوں کی صورت
میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ آفتاب ایک آتشیں کرہ ہے اور اس کے التہاب کی
شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کے شعلے دو لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اوپر کو
چڑھتے ہیں اور ان میں سے بعض ۸۰ ہزار میل بلکہ اس سے زیادہ بلندی تک
پہونچ جاتے ہیں۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں اس کے ایک شعلے کا مشاہدہ کیا گیا جو
پہلے ۴۰ ہزار میل کی بلندی تک پہونچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ بلندی ۸۰ ہزار میل
تک پہونچ گئی اور دوسرے گھنٹے میں وہ ساڑھے تین لاکھ ۵۰ ہزار میل بلند ہوگیا۔

آفتاب کی اتنی زبردست حرارت کا سبب یہ ہے کہ اس کے مادہ کے
ذرے اور برقپارے ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اس
ٹکراؤ سے غیر معمولی حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

یوں اگر آپ دیکھیں تو آفتاب ایک صاف روشن کرہ نظر آئے گا لیکن
دوربین سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے سیاہ داغ بھی ہیں۔
داغوں کی دریافت کا فخر گیلیو اور فرلیشیوس کو حاصل ہے جنھوں نے سب سے
پہلے ۱۶۱۱ء میں انھیں دریافت کیا۔

یہ داغ دراصل وہاں کے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کے آتشیں مادے
ہر وقت نہایت تیز آندھیوں کی صورت میں نکلتے رہتے ہیں۔ آفتاب کے
داغ ایک حالت پر نہیں رہتے بلکہ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات
دو تین یا اس سے زیادہ داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے اور کبھی ایک
ہی داغ تقسیم ہوکر متعدد داغوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

بعض وقت داغ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ خالی آنکھ سے نظر
آنے لگتے ہیں چنانچہ جون ۱۸۴۳ء میں ایک عظیم الشان داغ نظر آیا جس کا
عرض ۷۷ ہزار میل سے زیادہ تھا۔ اس سے قبل ۱۸۳۷ء میں جو داغ نظر آئے
ان کی مجموعی پیمائش تین ارب ۸۰ کروڑ میل تھی۔ ۱۸۹۲ء میں داغوں کا ایک مجموعہ
دکھائی دیا جس میں تنہا ایک داغ دو ارب چورانوے کروڑ میل کا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں
آفتاب کے ایک کنارے پر ایک داغ نظر آیا جس کا طول چند دنوں کے بعد ۲ لاکھ
۲۵ ہزار میل ہوگیا اور عرض ۷۴ ہزار میل۔ یہ داغ ۴۰ دن تک قائم رہا۔ بعض وقت
داغوں میں اس قدر جلد تغیر پیدا ہو جاتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شکل کچھ سے
کچھ ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سطح آفتاب پر آگ کا جو تلاطم ہر وقت
برپا رہتا ہے اس کی صورت بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔

آفتاب کے داغوں کا زمین پر بھی خاص اثر پڑتا ہے، چنانچہ جب آفتاب
کی سطح پر زیادہ داغ پائے جاتے ہیں تو قطب نما کی سوئی ٹھیک شمال کی طرف
نہیں رہتی بلکہ بعض ممالک میں مشرق کی طرف اور بعض ممالک میں مغرب کی
طرف ہٹ جاتی ہے اس کے علاوہ اس سوئی کا اضطراب بھی بڑھ جاتا ہے
جب فروری ۱۸۹۲ء میں عظیم الشان داغ نظر آیا تو دوپہر کے وقت کچھ دیر کے
لئے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تاروں نے بھی کام دینا چھوڑ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب کائنات میں کوئی اہمیت رکھے یا نہ رکھے لیکن ہمارے
لئے وہ بڑی اہم چیز ہے۔ اسی کی روشنی اور حرارت کی وجہ سے زمین کے تمام جاندار
زندہ ہیں اور اس کی بدولت ہمارے باغ اور کھیتیاں بارآور ہوتی ہیں۔

زمین کو جتنی حرارت آفتاب سے پہونچتی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر
زمین کے گرد ۸۰ گز موٹی تہ برف کی جم جائے تو آفتاب کی حرارت ایک پل میں
اس کو گھلا کر رکھ دے یا ایک منٹ میں ۷۳ ہزار ٹن پانی کو کھولا دے۔

نظام شمسی سے ہماری زمین کے علاوہ آٹھ سیارے اور متعلق ہیں، پہلے
انھیں صرف سات (سبع سیارہ) سمجھا جاتا تھا لیکن اب ان میں دو کا اضافہ
اور ہوگیا ہے۔ جن دو سیاروں کا اضافہ ہوا ہے، ان کے نام یورانوس
Uranus اور پلوٹو Pluto ہیں۔

یورانوس آفتاب سے ۱۷۸ کروڑ میل دور ہے اور پلوٹو اس سے بھی زیادہ
بعید فاصلے پر واقع ہے۔ نظام شمسی کے باقی چھ سیاروں کے نام یہ ہیں:-

مریخ Mars مشتری Jupiter زحل Saturn
زہرہ Venus نیپچون Neptune عطارد Mercury

جن کے دلچسپ حالات آپ پھر کبھی سنیں گے۔

جمیل مظہری

تلاش

بہلا نہ جی عدم میں تو رختِ سفر بدوش — نکلے رفیقِ عشق کو اپنے پکار نے

پہونچے جو اس دیارِ مسافر فریب میں — گھیرا مجھے زماں و مکاں کے حصار نے

دیوارِ ماہ و سال کھڑی کر دی وقت نے — پردے گرا گرا دئے لیل و نہار نے

سارا غبار اپنے بیابانِ شوق کا — آنکھوں میں میری جھونک دیا اس دیار نے

جب دامنِ شعور نے پونچھی نظر کی گرد — دیکھا اِدھر اُدھر نگہِ اعتبار نے

ہر عارضِ حسیں سے اُلٹ کر نقابِ رنگ — ڈھونڈھا کسی کو دیدۂ حیرت شعار نے

دیکھی جہاں کسی کے خد و خال کی جھلک — نظریں نثار کیں مری آنکھوں کے پیار نے

کتنی حسین باہوں نے ڈالے گلے میں ہار — پہنا مگر نہ طبعِ تلوّن شعار نے

صید افگنوں نے بڑھ کے جو پھینکی کمندِ زلف — کچھ دیر اس سے کھیل کے توڑا شکار نے

سینوں پہ سر کو رکھ کے دلوں کی صدا سنی — نغمہ دیا مگر نہ کسی کے ستار نے

اس نے تبسم اس نے خلش دے تو دی مگر — سمجھا نظر کا درد نہ گل نے نہ خار نے

اس جستجو میں ہو گئی زندگی کی شام — مانگا خراج اپنا غمِ روزگار نے

اُترا خمارِ بادۂ ذوقِ نظر جمیل — ساغر دئے جو مے کدۂ اعتبار نے

آئے تھے کس تلاش میں یہ بھی رہا نہ یاد — اس طرح گم کیا مجھے لیل و نہار نے

اب دل میں شوق ہے نہ طبیعت میں ولولے — جو کچھ تھا پاس چھین لیا اس دیار نے

خالی نہ کس طرح سے ہو جھولی شعور کی
لوٹا ہے مجھ کو مل کے خزاں اور بہار نے

علی عباس حسینی

مُردار چمڑا

سعیدہ شاعرہ تھی، ادیبہ تھی، فن کار تھی، نازک مزاج تھی، صاحبِ ذوق تھی، دولتِ حسن و جمال سے آراستہ تھی۔ اس کی حسّاس طبیعت پہ ادب و فن، علم و ہنر کا رنگ چڑھا تھا۔ اس کا سیلون اور اس کی لائبریری دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ سیلون ایک ہشت پہل بڑا سا ہال تھا۔ سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کے فرش پہ اتنا موٹا ایرانی قالین کہ چلنے والوں کے ٹخنوں تک پاؤں چھپ جائیں۔ دیواروں پہ قدِ آدم حلبی شیشے اور ان پہ مینا کا کام، نازک بیلوں میں مختلف رنگوں کے ایٹیشن چھوٹے بڑے نگ۔ ان سے اوپر یورپ اور ایشیا کے کلاسیکی مصوّروں کے تیار کردہ مرقعے۔ چھت پہ پوری بہار آئی ہوئی۔ ثمردار درختوں سے خوشۂ انگور کی طرح ہزار بتی شگفتہ جھاڑ کوئی فرانس کی شاہی کی یادگار، کوئی چیک صنعت کا نمونہ۔ صوفے، [illegible] سیاں، کوچ مختلف صدیوں کی نایاب یادگاریں تھیں۔ ان کی بغلوں میں اطالوی فن کاروں کے بنائے ہوئے مجسمے تھے۔ آٹھوں کونوں پہ منگ خاندان کے زمانے کے چینی مرتبان رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی میزیں، اسٹول جو اکثر کرسیوں کے سامنے تھے، وہ روس، مصر اور جاپان کی یاد دلاتے تھے۔ غرض سیلون کیا تھا خاصا نمائش کا کمرہ تھا، جہاں کی ہر چیز دیدہ زیب بھی تھی اور تاریخی بھی۔

سعیدہ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا یہ سیلون ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو ادیبوں، مصوّروں اور فن کاروں سے بھرا رہے اور ہر وقت شعر و ادب، آرٹ اور جمالیات پہ گفتگو ہوتی رہے۔ یہی اس کی جنت تھی، یہی اس کے لئے فردوس کی آخری منزل——

اور بے چارے مصنف، شاعر، فن کار اس کے ہاں آنے میں پس و پیش ہی کیوں کرتے؟ اسٹوڈی بیکر چھ سیٹر موٹر ان کے لانے اور گھر چھوڑنے کے لئے موجود رہتی۔ شربت، چائے، کافی سے ضیافت کی جاتی۔ بنارسی سفید پان کی گلوریاں، چاندی سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی بنارس کی پتی، مشکی تمباکو، قوام کے ساتھ چبانے کے لئے، اچھی سے اچھی سگریٹیں، قیمتی سے قیمتی ہوانا سیگار پینے کو۔ کیک، بسکٹ، پیسٹری، تازہ تازہ پھل کھانے کے لئے ملتے۔ بس اتنا ہی تو ہوتا کہ اپنا ہی کلام نہ سنانا پڑتا بلکہ سعیدہ کے سڑے گلے اشعار بھی سننا پڑتے اور اس کی خالص رومانی کہانیوں پہ بھی جھوم جھوم کر واہ وا کرنا پڑتی۔ لو اتنی خاطر مدارات، تواضع و تکریم کے بعد تعریف کے دو چار کلمے کہہ دینے میں زبان تو نہ گھستی تھی؟ مصنف و فن کار فرض شناس ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کو ادائے فرض کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ وہ خود ہی فرض ادا کرنے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے؟ جھوٹ موٹ کی تعریف بھی تو ایک قسم کا فرض ہے اور وہ بھی جبکہ اس کے دام میں موٹر کی سواری بھی ملتی ہو، خاطر تواضع بھی کی جاتی ہو، اور اپنے "دردِ زہ" کا مفت علاج بھی ہوتا ہو۔

سعیدہ خوش تھی، بہت خوش تھی۔ وہ ہر روز ایک غزل، ایک نظم کہہ لیتی یا ایک کہانی لکھ ڈالتی۔ تعریف ہمیشہ تخلیق کی رفتار کو بڑھا دیتی ہے اور تعریف ہمیشہ خریدی جا سکتی ہے۔ دام میں کبھی کبھی خونِ دل دینا پڑتا ہے مگر اکثر سیم و زر دو سکوں ہی سے کام نکل جاتا ہے۔ اسی لئے صاحبانِ فن ہم عصر بھی کبھی تعریفوں کے پھول سعیدہ کے صندلی تلووں کے نیچے بچھاتے، کبھی تعریفوں کے تاج اس کے سر پہ پہناتے، اور کبھی تعریفوں کے ہار اس کے نازک گلے میں ڈال دیتے۔ ذہنی حیثیت سے نہ سہی مگر صورت شکل کے لحاظ سے سعیدہ اس قصیدہ خوانی کی مستحق بھی تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد، متناسب اعضا، گورا رنگ آفتابی چہرہ، لمبے لمبے کالے بال، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، متواں

ناک، پتلے عنابی ہونٹ، موتی کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور چھوٹی پتلی ٹھوڑی پر ایک سیاہ تل۔ جب وہ براکیڈ کے غرارے، لَدی کے جمپر اور قوس قزحی رنگ کے کامدانی کے دوپٹے میں ملبوس ہو کر مہمانوں کی پذیرائی کے لئے تیز قدم کرے میں چلتی تو محسوس ہوتا مور ناچ رہا ہے۔ تتلی اُڑ رہی ہے اور ڈوبتا سورج بھاگتے ہوئے ٹکڑا ابر کو مختلف رنگوں میں ڈوب دے رہا ہے۔

سعیدہ کی آواز بھی سُریلی تھی اور اس کے بات کرنے اور کلام سُنانے کا انداز بھی پیارا تھا۔ لوگ پیٹھ پیچھے جو چاہیں کہیں مگر سعیدہ کا سامنا ہوتے ہی ہر ایک کا جی یہی چاہتا کہ وہ اسی سے مخاطب رہے، اسی سے باتیں کرتی رہے اور اسی سے مسکرا کر کہے۔ "آپ نے بڑی زحمت کی۔ مجھے بڑا ڈر تھا کہ آپ مجھ ناچیز کے ہاں آنے کے لئے شاید وقت نہ نکال سکیں گے۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر میری بڑی سرفرازی بھی!"

سعیدہ ہر چھوٹے بڑے مصنف، شاعر اور فن کار سے یہی کہتی۔ یہ اس کا روزمرہ تھا، مگر اس میں آورد کم اور آمد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں، اس کی آنکھوں سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ مہمان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے آتے ہی سعیدہ کو سارے جہان کی نعمتیں مل گئیں اور وہ خوشی میں جامے سے باہر ہُوا چاہتی ہے۔

لیکن سعیدہ کی خوشیوں اور مسرتوں کے ہرے بھرے باغ میں ایک جھلسا، سوکھا ہُوا ٹھونٹھ بھی تھا اور وہ تھی اس کے شوہر اشرف کی ذات۔ اشرف کوئی کم رُو جوان نہ تھا۔ وہ چھ فٹ کا چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں والا مرد تھا۔ سعیدہ کی ساری سہیلیاں سعیدہ کی نظر بچا کر اسے دو ایک بار گھور تیں ضرور، مگر اشرف کی نظر میں تو صرف سعیدہ ہی سعیدہ تھی۔ اس کی موجودگی میں دوسروں کا وجود و عدم سب برابر۔ بس وہ بیوی ہی کو آنکھوں سے پئے جاتا، کھائے جاتا، شربت کی طرح، شراب کی طرح، کتاب کی طرح۔

اشرف چمڑے کا بہت بڑا تاجر تھا۔ مختلف شہروں میں اس کے گودام تھے، خود بمبئی میں اس کی ٹینری تھی۔ صبح آٹھ بجے سے دس بجے رات تک وہ کھالیں خریدتا، ان کی دباغت کا کام دیکھتا، تیار کھال مختلف کمپنیوں کے لئے لدواتا اور بھجواتا رہتا تھا۔ اگر اسے ان کاموں سے آدھ گھنٹے کی بھی فرصت مل جاتی تو وہ موٹر تیز بھگاتا ہوا سعیدہ کے سیلون میں ضرور آتا۔ اسے ادیبوں کے مجمع میں دیکھ کر سعیدہ کے چہرے پر سراسیمگی اور آزردگی کی لہر ضرور دوڑ جاتی۔ وہ جو پہلے موم کی بنی ہوئی تھی یک لخت پتھر کی بن جاتی

تھی۔ اس کی آمد ہمیشہ محفل کا رنگ بدل دیتی تھی۔ وہ آتے ہی کہتا:

"ہلو! ہلو! ہلو! ارے میاں کچھ کھانے کو بھی ملا کہ محض شاعری ہی سے پیٹ بھر رہے ہو تم لوگ؟"

اب آپ ہی بتائیے کہ کسی غزل کے درمیان یا کسی کہانی کے بیچ میں کھانے پینے کا ذکر کرنا کتنی مہمل سی بات ہے۔ پیٹ تو ہر وقت بھرا جا سکتا ہے۔ پلاؤ قورمہ نہ سہی سادا کھانا تو سب ہی کو مل جاتا ہے، لیکن روح کی پیاس مٹانے اور بجھانے کے لئے تو مخصوص ساعتیں ہیں۔ جہاں وہ گھڑی گزر گئی روح ہمیشہ کے لئے پیاسی بھوکی رہ گئی۔ یہ نازک سی بات، جو سعیدہ کا جزوِ زندگی بن چکی تھی، چمڑے کے تاجر کے دماغ میں کیسے آتی۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ اپنے سوال کے بعد ہی خود ہی قہقہہ بھی لگایا جاتا۔ گویا اپنے اوچھے پن پر ڈھول پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار بھی ضروری تھا۔

اس قہقہے میں دوسرے سننے والوں کو کتنی ہی آسودگی، کتنا ہی اطمینان اور کتنی ہی دل نواز موسیقیت محسوس ہوتی ہو مگر سعیدہ کے روحانی انبساط کے لئے تو وہ صورِ اسرافیل کا کام دیتا۔ سعیدہ کو محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم و جان کا ہر تار جھنجھنا اُٹھتا۔ وہ "شی — شی" یا "ہش — ہش" کہہ کر اپنے پھڑکتے لبوں پر انگلی رکھ کر اشرف کو خاموش تو کر دیتی تھی مگر پھر فضا بالکل برباد اور خراب ہو جاتی۔ اب ہر دماغ میں شعر و نغمہ کی جگہ میز پر چُنی ہوئی نعمتیں ہوتیں اور ہر نظر میں معشوق و محبوبِ خیالی کی جگہ کیک اور پیسٹری گھومنے لگتی۔ سعیدہ کو ادبی جلسہ جلد سے جلد ختم کر کے اس نشست کو کھانے پینے کی پارٹی میں تبدیل کر دینا پڑتا اور سعیدہ کی جگہ اشرف اس جلسے کی جان بن جاتا۔

مگر اشرف سعیدہ کی آزردگی محسوس کر لیتا اور کسی نہ کسی شاعر یا ادیب سے حسنِ تدبیر سے اس پر اصرار کرا دیتا کہ چائے کا دَور ختم ہوتے ہی سعیدہ اپنی نئی تخلیق ضرور سنائے اور ہر سننے والا حق نمک ضرور ادا کرے۔ سعیدہ اس حُسنِ اخلاق کا سہرا محرک کے سر باندھتی، خاموش اشرف اس سے بھی محروم رہتا۔ بلکہ جب وہ بے اعتنائی سے اُکتا کر کام کا بہانہ کر کے سیلون سے نکل جاتا تو سعیدہ یہی کہتی — "انھیں نہ تو ادب سے کوئی لگاؤ اور نہ ان کے لئے شعر میں کوئی مزہ۔ بس کھانا پینا ہو یا مُردار چمڑے کا کام —! توبہ!"

نوجوان ادیب ایسے مواقع پر اظہارِ ہمدردی کرکے مخصوص نوازشوں سے سرفراز کئے جاتے، ان کو سعیدہ کے ساتھ سینما، ڈانس اور دوسری تقریبوں میں مفت شرکت کی عزت ملتی اور وہ "دوست" کے مخصوص لقب سے پکارے جاتے۔ وہ اپنے طور پر بڑبڑاتی — "کیا ضرورت ہے ایسے جلسوں میں ان کے تشریف لانے کی! پھر آتے ہیں تو دس منٹ کے لئے، اپنے کمرے میں جاکر نہا دھوکر کپڑے بدل کر کیوں نہیں آتے۔ جس مصنف اور شاعر کو دیکھو یہی شکل کرآتا ہے۔ سر میں تو شیو اور تیل، کپڑے صاف ستھرے، سرمہ لگائے ہوئے، عطر ملے ہوئے، تازہ شیو بنائے ہوئے اور یہ ہیں کہ نہ ڈھنگ کے کپڑے نہ بال میں کنگھا، نہ [illegible] کی بو، بالکل حیوان صورت، حیوان سیرت!"

یہی رونا وہ سہیلیوں سے روتی۔ جب وہ اس کے سیلون، اس کی محل نما کوٹھی، اس کے ساز و سامان، اس کی نفیس و رنگین موٹروں کا ذکر کرتیں تو وہ مسکرا مسکرا کر آن کی باتیں سنتی مگر جب وہ اسے اتنے دولت مند اور چاہنے والے میاں کے ملنے پر مبارکباد دیتیں تو اس کے ہلالی ابرو تلواروں کی طرح کھنچ جاتے۔ وہ کہتی۔ "ہے ہے بی بی، یہ نہ کہو، دیکھتیں نہیں کہ میں کتنی پیلی پڑگئی ہوں، کیسی گھلی جارہی ہوں۔ ہر روز میری روح تحلیل ہوتی جارہی ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ اللہ نے مجھ کو کیسا جوڑ دیا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ چوڑے سے چکلے ہاتھ پاؤں ہیں، گورا چٹا رنگ ہے تو بس وہ سب کچھ ہوگئے — ارے ان میں آدمیت چھو تک نہیں گئی ہے۔ ایک شعر بھی تو موزوں نہیں پڑھ سکتے تشبیہہ، استعارہ، صنعتیں، تلمیحیں، زبان و بیان کی باریکیاں، لطافتیں، روزمرہ و محاورہ، کچھ بھی تو ان کے پلے نہیں پڑتا۔ کبھی کوئی بات شاعرانہ انداز سے نہ کہیں گے۔ کسی مجسمے، کسی تصویر کو دیکھ کر ان کے چہرے پر انبساط کی لہر نہ دوڑے گی۔ منہ سے واہ نہ نکلے گی — !"

سہیلی کہتی — "ارے نہ مسکراتے ہوں گے ان مردانہ تصویروں اور ننگی مجسموں پر۔ تم کو تو دیکھ کر بِکس جاتے ہیں تمھاری ادنیٰ مسکراہٹ حاصل کرنے کے لئے بیسیوں چکیں تو کاٹتے ہیں۔ مٹھی بھر بھر کر سونا تو تمھارے قدموں تلے ڈال دیتے ہیں......!"

سعیدہ اور بھی چراغ پا ہوجاتی۔ وہ کہتی۔ "ارے تم کیا جانو، یہ سب کا ہے کے لئے کرتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے سمیٹ کر اپنے سینے میں بھر لیں۔ میری ہڈیاں پسلیاں بھینچ بھینچ کر توڑ ڈالیں۔ جب اکیلے ہوں گے تو مجھے بس اس طرح گھوریں گے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ چیخ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر گھر میں رہیں گے تو ہر وقت بنیائن تہمد کھینچے رہیں گے۔ لاکھ صبح شام بنیائن بدلواتی ہوں مگر جہاں جسم پر پڑی اور سڑی ہوئی مچھلی کا جال بن گئی — معلوم ہوتا ہے مرداچھٹے کی ساری بُو ان کے جسم میں سرایت کرگئی ہے۔ بس وہ قریب آئے اور ناک سڑنے لگی! —"

ایک سہیلی بولی۔ "مجھے تو مردانی بنیائن کی وہی کھٹی کھٹی بُو پسند ہے۔"

سعیدہ نے اس کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ وہ صوفے سے اچک کر سنگار میز کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے کپڑوں میں بہت سا سینٹ لگایا اور لیونڈر کی شیشی لے کر سہیلیوں تک آئی۔ ہر ایک کے جسم ہی پر نہیں بلکہ ہوا پر بھی بہت سا لیونڈر انڈیلا جب جاکر اسے تسکین ہوئی۔ وہ کیا کرے "مرداچھٹے" کی بُو سے اسے ہمیشہ متلی سی ہونے لگتی تھی۔

ان دنوں اشرف سے سعیدہ کی ناخوشی ایک خاص وجہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ اسے ایک "دوست" نے اطلاع دی تھی کہ ایک ہز ہائینس چغتائی کی تصویروں کا ایک سٹ نکالنا چاہتے ہیں۔ ہز ہائینس نے اسے لیا تھا پچاس ہزار میں، لیکن اب جو ریاست کے نکل جانے سے تنگی محسوس ہوئی تھی تو وہ اسے پچیس ہی ہزار میں نکالنے کے لئے تیار تھے۔ سعیدہ ان کے اس سٹ کی تعریف مختلف لوگوں سے سن چکی تھی۔ وہ ایسے زرّیں موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ اشرف سے مُصر تھی کہ اس پچیس ہزار کا بندوبست فوراً ہونا چاہیئے۔ یہ تصویریں ضرور لے لی جائیں، مگر اشرف برابر ٹالتا رہا۔ کہتا تھا آج کل پیسوں کی کمی ہے پچیس ہزار کی رقم تفریحی کاموں میں نہیں لگائی جا سکتی۔ سعیدہ اشرف کا یہ عذر روپیہ نہ دینے کا بہانہ سمجھتی تھی، مگر تھی یہی حقیقت اشرف اس وقت بالکل کنگال ہو رہا تھا۔ وہ سعیدہ پر دل و جان سے عاشق تھا وہ اس کی خوشی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے اپنی بساط سے کہیں زیادہ سعیدہ کی خوشی پر صرف کیا تھا۔ تین برس کی شادی شدہ زندگی میں وہ سعیدہ کو پچیس تیس لاکھ روپے دے چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اپنی ہی پونجی سے کام چلا تھا۔ پھر اسے قرض ادھار بھی لینا پڑا اور وہ ہر طرف سے ہار کر اسی سفید ہاتھی کا بوجھ اٹھانے کے لئے تجارتی جوا کھیلنے لگا۔ اس نے گھوڑ دوڑوں میں بازی لگائی، اس نے سٹا کھیلا اور وہ شیئر مارکٹ کا کھلاڑی بن گیا۔ یہ تجارتی جوا ایسا روگ ہے جیسے پال کر کبھی کوئی پروان

نہیں چڑھ سکتا۔ اس کے لئے کروڑوں کا سرمایہ ہونا چاہیئے، اور سیکڑوں کی تعداد میں بے ایمانیاں کرنے والے خفیہ ساتھی اور مددگار۔

اس زہریلی شراب کا چسکا لگایا اشرف کے اس سیٹھ دوست نے جو اس کے کارخانوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اشرف کو چھوٹی چھوٹی ٹپیں دیں، ان میں اسے پچیس تیس ہزار کا فائدہ ہوگیا۔ یہ سمجھا سیٹھ کے خوش رکھنے کا گُر لگا ہاتھ لگا۔ سیٹھ کی گھر پر دعوت کی۔ سعیدہ سے ملاقات کرادوں تو یہ اور بھی خیال رکھے گا۔ وہاں سعیدہ کو اپنی تفریح سے کہاں فرصت۔ نہ اس نے دعوت کا کوئی انتظام کیا اور نہ میز پر وہ ساتھ بیٹھی۔ اس کا اپنا پہلے سے ہی پروگرام بن چکا تھا۔ وہ کچھ نوجوان ادیبوں اور فن کاروں کو ساتھ لے کر سینما دیکھنے چلی گئی۔ سیٹھ نے اس بے اعتنائی کو اپنی انتہائی ذلّت سمجھا۔ اسے اشرف سے اور کد پیدا ہوگئی۔ خود غرضی میں بدلہ لینے کے خیال نے نمک مرچ کا اضافہ کیا۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا کا مصداق بنا۔ اس نے مخلص بن کر ایک دیوالیہ کمپنی میں لاکھوں روپے اشرف سے لگوا دئے۔ وہ ایک دن تو اس کے حصّوں کا بھاؤ خود ہی بڑھاتا رہا۔ جب اشرف پوری طرح پھنس گیا تو اس نے سارے حصّے کوڑیوں کے مول بکوانا شروع کر دئے۔ کمپنی ٹوٹ گئی اور اشرف کا دیوالہ نکل گیا۔

اشرف جانتا تھا بیوی کو تجارتی کاروبار کے ذکر ہی سے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ وہ سعیدہ سے کیا کہتا۔ وہ اسے بہانہ سمجھ کر اور ناخوش ہو جاتی۔ اس کا دماغ پھٹا جاتا تھا، اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، مگر اس نے لب سی لئے، اس نے کچھ نہ کہا۔ اتفاق یہ کہ اسی شام کو راجہ کا پیغام آیا ——— "اگر آپ تصویروں کا سٹ لینا چاہتی ہیں تو بارہ گھنٹے کے اندر لے لیجئے ورنہ مجبوراً دوسرے گاہک کو دے دینا پڑے گا۔" بس صبح اُٹھتے ہی سعیدہ نے حکم جاری کر دیا "جس طرح بنے مجھے آج پچیس ہزار مل جانا چاہئیں۔ فوراً چیک کاٹ کر مجھے دو!"

اشرف نے کہا۔ "بیگم چیک کاٹ کر کیا کروں گا۔ بنک میں ایک پیسہ نہیں!"

سعیدہ پاؤں پٹک کر بولی۔ "میں کچھ نہیں جانتی! قرض اُدھار لو کارخانہ بیچو، اپنے کو بیچو مگر مجھے روپے لاکر دو!"

اشرف گھبرا کر باہر جانے لگا۔ وہ بولی "گھر پلٹنا تو روپے کر آنا، خالی ہاتھ ہرگز نہ آنا!"

اشرف نے سعیدہ کو حسرت بھری نظر سے دیکھا اور گردن جھکائے نکل گیا۔ کارخانے پہنچا تو وہاں قرض خواہوں کا پورا گروہ منتظر ملا۔ سب کا تقاضا کہ روپے ادا کرو ورنہ قرقی لاتے ہیں۔ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ وعدہ کرکے ٹالا۔ مگر کرے تو کیا کرے۔ روپیوں کا بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ مختلف جگہوں پر ٹیلیفون کیا، جن سے لین دین بیوپار تھا اُن سے قرض مانگا، ٹکا سا جواب ملا۔ بنکوں کے منیجروں اور ایجنٹوں سے ملاقات کی، سب نے قرض دینے سے انکار کیا۔ سب کو جیسے یقین تھا کہ اس ڈوبتے کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہی وہ خود بھی ڈوب جائیں گے۔

شام کو تھکا ماندہ وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھرا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ گیٹ وے آف انڈیا کی طرف جا نکلا۔ برسات کا زمانہ تھا، پانی برس چکا تھا، مگر ہوا تیز تھی اور سمندر کا مدوجزر زوروں پر تھا۔ وہ سمندر کے کنارے والی دیوار پر کہنیاں رکھ کر بپھرے ہوئے بحر کے سماں سے لطف لینے لگا۔ خود اس کے دل و دماغ میں کچھ اسی طرح کا تموّج تھا۔ زندگی میں کبھی سکون نہ پیدا ہوا۔ خود سے چھوٹے پیمانے کی تجارت کو بڑھا کر سرمایہ داروں کی ٹولی میں گھسا۔ نہ جانے کتنی دشوار گزار منزلوں کو پار کرنا پڑا۔ کیسے کیسے ہفت خواں طے کئے۔ ابھی فروغ حاصل ہو چکا تھا کہ سعیدہ کے عشق نے دیوانہ بنایا۔ کوششیں کیں، تدبیریں کیں، اُس بُت کو رام کیا، بیوی بنا کر گھر لایا۔ مگر وہ معشوقہ کی معشوقہ ہی رہی۔ اس کی خوشی کے لئے اچھے خاصے چلتے ہوئے دھندے کو لتاڑا۔ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلایا۔ سعیدہ کی فرمائشیں پوری کرنے میں بال بال مقروض ہوا اور سب کچھ داؤں پر لگا کر ہار گیا۔ اس قربانی کے بدلے میں ہاتھ کیا آیا۔ کچھ بھی نہیں۔ نہ رفاقت ملی، نہ خدمت کرنے اور دردِ دکھ بٹانے کی خواہش۔ وہی تنہائی، وہی اکیلا پن۔ سعیدہ نے نہ تو اس کی روح کی تڑپ کو پہچانا، نہ اس کے لپکتے ہوئے جذبات کی گرمی بٹائی۔ دونوں کے جسم یقیناً ملے مگر کبھی ایک نہ ہوئے، کھانے کو ٹکڑا ملا ضرور مگر اسی انداز سے جیسے بھوکے کتے کے سامنے ہڈی پھینک دی جائے۔ جیسے بھکاری کے چپنی میں چٹکی بھر آٹا ڈال دیا جائے، جیسے دہکتے تنور میں چلو بھر پانی کا چھینٹا مارا جائے۔

اشرف کے کھولتے ہوئے دماغ میں کچھ اس طرح کے خیالات اُبھرتے اور مٹتے تھے کہ دفعتہً اُبلتی ابل کھاتی، اُچھلتی موج آئی اور پشتے سے ٹکرا کر وہ فوّارہ اٹھایا کہ اشرف کے کپڑے بھیگ گئے۔ ساتھ ہی میٹھی سُریلی آوازوں میں بچوں اور عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا

اسی کی طرح اس طوفانی منظر سے لطف لینے والے بچے، عورتیں، جوان، بڈھے سب موج کے اس آبشار سے بچنے کے لئے سڑک تک پیچھے بھاگتے دکھائی دیئے۔ اسے تعجب بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی، غصہ بھی آیا، جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ واہ یہ لوگ بھی کچھ سعیدہ ہی کے سے ہیں۔ سمندر کی چمک بھڑک سے لطف اندوز تو ہونا چاہتے ہیں، اونچی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس اس کے سینے میں جو سنہری دئے جلاتا ہے اس سے آنکھ تو سینک سکتے ہیں مگر اس کے آغوش میں جاکر اس کے دل کے داغ کو نہیں مٹا سکتے۔ اس کے منہ سے غم و غصہ کا کف نہیں پونچھ سکتے..... اور ویسے ہی اس کے کان بجنے لگے "گھر آنا تو خالی ہاتھ نہ آنا! خالی ہاتھ ہرگز ہرگز گھر نہ آنا! ہرگز ہرگز نہ آنا!" — اور اس کے پاس خالی ہاتھوں کے سوا اب اور کیا تھا۔ نہ کارخانہ نہ گودام، نہ دوکان، نہ ملازم نہ دوست، اور..... اور...... اور نہ بیوی!

ویسے ہی سمندر دونوں ہاتھ پھیلائے آواز دیتا ہوا بڑھا۔ "آ، میرے پاس چلا آ! تیرا گھر یہاں ہے! تیری جگہ میرے دل میں ہے۔ ہر قطرے کو ایک نہ ایک دن یہیں آنا ہے۔ تو کیوں بھٹکا بھٹکا پھرتا ہے۔ کیوں ناقدروں میں گھرا کھڑا ہے، کیوں اجنبیوں سے آسرا لگائے بیٹھا ہے، آ، جلد آ، میری گود میں آ!"

اشرف کھل کھلا کر ہنسا اور پشتے پر چڑھ کر پلٹتی موجوں کے ساتھ ہو لیا۔

سعیدہ کو غش پر غش آتے رہے، مگر کوٹھی بھی بکی اور سیلون کا پورا عجائب خانہ بھی، نہ کوئی مجسمہ بچا، نہ کوئی تصویر، نہ فرنیچر، نہ قالین، نہ جھاڑ، نہ فانوس۔ سب کچھ کوڑیوں کے مول نیلام ہو گیا اور اب سعیدہ ایک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر آرٹ مسٹرس ہے۔ اور وہ ایک ایسے مکان کی پہلی منزل پر رہتی ہے جس کے صحن اور نچلے حصے میں دباغت کا کام ہوتا ہے اور اسے اس کی بو سے نہ تو کے آتی ہے نہ چکر آتا ہے اور نہ درد سر ہوتا ہے — شاید وہ اب خود ہی مُردار چمڑا ہے!

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

رضا علی وحشت کا انتقال

عیدالاضحےٰ کے دوسرے دن خان بہادر رضا علی وحشت ڈھاکے میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم اردو کے پرانے اساتذہ میں سے تھے۔ غزل میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ دل کی بات کہتے تھے ؎

خدا گواہ کہ ہوں ترجمانِ دل وحشت
کہے ہیں شعر نہیں کی ہے شاعری میں نے

کلکتہ اور اس کے نواح میں آپ سے فیضِ سخن حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ آپ نے اردو ادب اور اردو شاعری کی گراں بہا خدمات کی ہیں لیکن ناقدر شناس زمانے نے آپ کو آپ کا حق بھی نہ دیا۔ خود موصوف ہی کا شعر ہے ؎

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

کرشن چندر

رُوس میں اُردو

ماسکو کے ہوائی اڈّے پر سب سے پہلی آواز جو مجھے سُنائی دی۔ وُہ تھی — "آداب عرض، کرشن جی!" یہ آواز ادیبوں کی یونین کے مترجم کی تھی۔ اس آواز کو سُن کر میں ایک لمحے کے لئے چونک گیا۔ کیونکہ بیروت سے یہاں تک اب تک نامانوس اور اجنبی آوازوں سے واسطہ پڑا تھا جن کے سمجھنے میں بے حد دشواری ہوتی تھی۔ یہاں جو یہ آواز کانوں میں پڑی تو ایک عجیب قربت سی محسوس ہوئی۔ یوں معلوم ہُوا جیسے ہمارے وطن کا اک تازہ جھونکا رخساروں کو مس کر گیا۔

بعد میں یہ آواز اور دُوسری بہت سی آوازیں، شُستہ و رفتہ اُردو میں گفتگو کرنے والی آوازیں بہت مانوس ہو گئیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے معلوم ہُوا کہ نہ صرف ماسکو میں بلکہ رُوس کے دوسرے حصّوں میں بھی جہاں جہاں میں گیا اُردو زبان بہت مقبول اور معروف ہے۔ نہ صرف ماسکو یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جاتی ہے بلکہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی سینکڑوں طلبا اور اساتذہ اردو زبان سے اپنی گہری دل چسپی اور شغف کا ثبوت دے رہے ہیں۔ تاشقند میں، اپی سی سی میں، سیرے دان میں، لیننگراڈ میں بہت سے اُردو جاننے والے اور بولنے والے ملے جو اُردو زبان سے، اُردو ادیبوں سے، مختلف اُردو ادیبوں کے مختلف شعری اور نثری اندازِ بیاں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے کئی بار گھنٹوں بات چیت ہوتی رہی اور میں نے یہ دیکھا کہ زبان و بیان اور تلفّظ کی دقتوں کے باوجود اور اس امر کے باوجود کہ یہ لوگ کبھی ہندوستان نہیں آئے تھے یہ لوگ اپنا مافی الضمیر اُردو زبان میں بخوبی ادا کر لیتے تھے۔ اور چند ایک کا لب و لہجہ تو اس قدر صاف تھا کہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ کبھی ہندوستان نہیں گئے اور پھر بھی اس قدر عمدہ اُردو کیسے بول لیتے ہیں۔ اگر میں انھیں خود اپنی آنکھوں سے اُردو میں گفتگو کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تو کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لوگ دہلی اور لکھنؤ کے قُرب و جوار میں کبھی نہیں رہے۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جن کا تلفّظ اتنا عمدہ رہا ہو۔ عام طور پر رُوسی اردو کو اس طرح بولتے ہیں جس طرح ہم میں سے بہت سے لوگ انگریزی بولتے ہیں۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے لیکن پھر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ماسکو یونیورسٹی کو اور دوسری یونیورسٹیوں کو اور فارن لینگویج انسٹی ٹیوٹ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے اردو اساتذہ مستعار لینے چاہئیں۔

ماسکو ریڈیو سے جو ایشیائی پروگرام نشر ہوتے ہیں ان میں اردو، ہندی اور بنگالی کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ شروع میں ان تینوں زبانوں کے لئے ایک ہی شعبہ تھا لیکن اب تین مختلف شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ اردو کا ایک الگ شعبہ ہے اور اس میں بڑے سلیقے سے کام ہوتا ہے۔ اور اس کے پروگرام سوویت دیس کے باہر اور خود سوویت دیس کے اندر بڑی دل چسپی سے سُنے جاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی خبروں کے علاوہ ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ اُردو شاعری، اُردو افسانہ اور اردو تنقید پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن اُردو ڈراموں کا فقدان ہے۔ ہاں اردو افسانوں کو "سنگیت روپک" میں ڈھال کے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ روپک اُردو ڈرامے کا بدل نہیں ہو سکتے۔ مگر شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ماسکو میں ہندوستانی آبادی بہت کم ہے اور ریڈیائی ڈراموں کے لئے اچھی آوازوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔ شاید مستقبل قریب میں جب ہندوستان اور سوویت دیس میں کلچری تال میل زیادہ گہرا ہونے لگے گا تو یہ مشکل پیش نہ آسکے گی۔

اُردو کی ترویج و اشاعت میں ہندوستانی موسیقی اور خاص طور پر فلمی موسیقی کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اس بات کا

احساس نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی فلمی موسیقی اپنی جاذبیت، رس اور لوچ کے باعث، ہندوستان سے باہر کس قدر مقبول ہے۔ عرب ممالک میں، اطالیہ میں اور خود سوویت دیس میں ہمارا فلمی سنگیت بہت مقبول ہے۔ ماسکو ریڈیو کے نہ صرف ایشیائی پروگراموں میں بلکہ گھریلو پروگرام میں بھی میں نے ہندستانی فلمی موسیقی کے ریکارڈ سنے ہیں۔ وہ روسی لڑکیاں جو اُردو کا ایک لفظ نہیں جانتیں، ساحر لدھیانوی کا گیت "سُن جا زندگی کی داستان" مہینوں کوشش کر کے سیکھتی ہیں اور ماسکو ریڈیو پر کورس کی صورت میں گاتی ہیں۔ سیرے وال مشہر کے چوک میں اور اس کی تفریح گاہوں میں میں نے "جلتا ہے قرار ہے" کو مقبول دیکھا ہے۔ کرسمس کے دنوں میں تاشقند کے نوائی تھیٹر کے باہر ازبکی اور روسی دھنوں کے علاوہ نوشاد کی دھنوں پر اُردو گیتوں کو پاپولر ہوتے دیکھا ہے۔

ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری کو روس کے لوگ نہ صرف اردو شاعروں کی حیثیت سے جانتے ہیں بلکہ فلمی گیت لکھنے والوں کی حیثیت سے بھی۔ اور اُن کی غنائیت کی تعریف کرتے ہیں۔ چلتے چلتے یہ بھی کہہ دوں کہ تاشقند یونیورسٹی کے طلباء میں بے حد مقبول ہے۔ اور طالب علموں کی اکثر ایسی مجلسوں میں جہاں اُردو جاننے والا میری مترجم کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، تاشقند کے اُردو گیت گا کے مجھے سنائے گئے، اور مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ تاشقند کو روس میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ سوویت دیس میں دو بار میں نے ریل کا سفر کیا اور دونوں بار ملک کے مختلف حصوں میں، ایک بار آرمینیا جاتے ہوئے، دوسری بار لینن گراڈ جاتے ہوئے، لیکن دونوں بار ریل گاڑی کے لوکل ریڈیو پر اُردو گانے سننے کو ملے۔ دوسرے گیت بھی تھے، کوریائی، چینی، انڈونیشی، روسی یوکرینی، لیکن ان کے ساتھ اُردو کے گیت بھی سننے کو ملے۔ مجھے یاد ہے صبح کا وقت تھا لینن گراڈ ابھی آیا نہ تھا، بس پو پھٹ رہی تھی۔ چاروں طرف برف کا سپید اندھیرا تھا۔ سپاٹ میدان، سپاٹ آسمان کہیں کہیں فر کے جنگل نظر آ جاتے مگر وہ بھی برف پوش۔ میں گاڑی کے ریشمی پردے ہٹا کر کھڑکی سے باہر اس منظر کو دیکھ رہا تھا جس میں ساری کائنات یخ بستہ اور منجمد معلوم ہوتی تھی کہ یکایک ریڈیو بجنے لگا "جاگ سوزِ عشق جاگ"

میں یکایک چونک گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے وطن نے مجھے دور سے پکارا۔ جیسے نئی نویلی صبح میں چنبیلی کے لاکھوں گجرے چمک اُٹھے۔ جیسے اس یخ بستہ منظر پر لاکھوں آفتاب اُتر آئے۔ یوں پردیس میں وطن کی میٹھی بولی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔ جب میں نے کنڈکٹر کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا "مگر ہم تو اکثر آپ کے ملک کے گیت اس ریڈیو پر سناتے ہیں۔ لوگ سمجھیں نہ سمجھیں۔ ان کے اندر ایک پکار ہوتی ہے جو دل پر اثر کرتی ہے۔"

اُردو کا چرچا سوویت ادیبوں کی انجمن کے ذریعے سے خاص طور پر ہو رہا ہے یوں تو ہندوستان کی سبھی زبانوں سے سوویت دیس کی زبانوں میں تراجم منتقل کئے جا رہے ہیں لیکن ان میں اُردو کو ایک مُوقر اور ممتاز جگہ حاصل ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کی مختلف زبانوں سے ۱۱۶۔ ادیبوں کی تخلیقات کو ترجمے کے ذریعے سے روسی زبان میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان میں ٹیگور کو چھوڑ کے پھر اُردو ادیبوں ہی کا نمبر آتا ہے جن کی کتابیں وہاں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور ہاتوں ہات فروخت ہو جاتی ہیں۔ اس وقت اردو نثر سے زیادہ ترجمے کئے گئے تھے۔ کیونکہ شعری مواد کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اور شروع شروع میں اس کام کے لئے موزوں مترجم بھی دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اب یہ کمی ایک حد تک پوری ہو چکی ہے اور اب اقبال، جوش، فراق، فیض، سردار، مجاز، ندیم، ساحر، مجروح اور دیگر شعراء کے کلام کا روسی ترجمہ شروع ہو چکا ہے اور اس طرح سے یہ خوبصورت زبان جسے آج تک کسی دربار نے نہیں نوازا اپنی عوامی بولی کا مزا اور اپنے میٹھے مشترکہ کلچر کا ورثہ لے کر باہر جاتی ہے اور مختلف ملکوں اور مختلف عوام کے درمیان محبت کا پُل بناتی ہے ✽

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۷ء کا شمارہ

جنگِ آزادی نمبر

ہوگا

مفصل اعلان کا انتظار کیجئے (ادارہ)

ضروری نوٹ

غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے۔ اگر واپسی کے لئے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ مضمون کے ساتھ ہوگا۔

اثر لکھنوی

کیا سمجھے

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتاب "غزل اور مطالعۂ غزل" میں لکھنوی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ناسخ، آتش اور اُن کے شاگردوں کی شاعری کی خوب مٹی پلید کی ہے۔ آتش کی غزلوں میں اُن کے نزدیک اچھے اشعار بہت ہی کم ہیں۔ ایک رمق اور ناسخ کا کلام توانا بستدا تا انہتا رکاکت، ابتذال اور رعایت لفظی کا بدترین نمونہ ہے۔ ترکیبیں شاندار لیکن اُن کے اندر کچھ نہیں۔ کوئی بڑا خیال، کوئی پُرخلوص جذبہ، کوئی واضح نظریۂ حیات، کسی طرح کا لوچ اور بانکپن نہیں۔ یہی حال ان دونوں اُستادوں کے شاگردوں کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس قول میں حقیقت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ میں فی الحال آتش کے کلام سے بحث نہیں کروں گا کیونکہ اس کا منتخب کلام مع مقدمہ شائع کرنے کا قصد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ امر قطعاً نظر انداز کر دیا کہ اُس دَور میں صرف لکھنؤ ہی بد مذاقی کا شکار نہیں تھا۔ دہلی میں بھی یہی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ نصیر اور ایک حد تک ذوق کی شاعری لکھنوی شاعری کی آوازِ بازگشت ہے غالب اور مومن دونوں نے ناسخ کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو مومن جرأت کی طرف جھکے اور غالب نے میر کا دامن تھاما۔ شیفتہ جن کی سخن فہمی کے غالب مداح تھے اپنے تذکرۂ گلشن بے خار میں ناسخ کی تعریف کے پُل باندھ دیتے ہیں اور آتش کو ناسخ کا ہم پایہ ماننے کی قباحت کا اظہار کر کے ناسخ کے، ایسے اشعار بھی انتخاب میں شامل کرتے ہیں کہ ان کی خوش فہمی پہ شک ہونے لگتا ہے۔ مثلاً

ہم نے جو بتی بنائی ہے ترے مو باف کی ـــــ نافۂ مشکیں بنا ہے منہ ہر اک ناسور کا

ضعف ایسا ہوں کہ میں اگر ہوا سے اڑ گیا
میرے پیکر میں ہے عالم کاغذی تصویر کا

کی ہے یاں شدت سے شدت برشگالِ اشک نے
کیوں نہ زوال آ جائے عالم سبزے کے آغاز کا

اپنے صنم کو لے کے شبِ وصل باغ میں ـــــ بھاگا میں آشیانۂ مرغِ سحر سے دور
وہ اُدھر رخصت ہوا اُٹھا اِدھر طوفانِ اشک
تیرتا جاتا ہے اس قاتل کا توسن آب میں

(شیفتہ کے انتخاب میں ایسے بے ہودہ اشعار کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس کے بھی کان کاٹے ہیں)

سب تو سب ناسخ اور آتش کی مقبولیت دیکھ کر بوڑھے مصحفی کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اپنے دیوان ششم کے دیباچے میں لکھا ہے:

"غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بردو تبِ ایشاں (یعنی ناسخ و آتش) گفتہ..... (ناسخ) بر طرزِ ریختہ گویان سادہ در عرصۂ قلیل خطِ نسخ کشیدہ و از خیالش بر قدم او خواجہ آتش ہم در رسیدہ سمند تیز گام خیال را از دائرہ چرخِ اثیر بیروں برد۔ عاصی ہم از گروہِ سادہ گویاں بود...."

غالب ناسخ و آتش کے دواوین میں تیر و نشتر پاتے ہیں۔ ناسخ کے یہاں آتش سے نسبتاً کم۔

ظاہر ہے کہ محض پوچ اور لچر اشعار کی بنا پہ ناسخ کی شہرت نہیں تھی۔ اس کے دواوین میں اچھے اشعار بھی ہیں اور معقول تعداد میں ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے مبتذل اشعار ہی کو ناسخ کی کل کائنات سمجھا ہے۔ کسی کے کلام سے محض بے وقر اشعار کا انتخاب کرنا اور اچھے اشعار کو نظر انداز کر دینا کہاں کا انصاف ہے اور کس حد تک مستحسن ہو سکتا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو آنا صنے چند الفاظ میں

بیان کر دی:

"(ناسخ کی) غزلوں میں شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم۔"

ڈاکٹر صاحب نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے مگر ذہنِ نقاد بات کی تہ کو نہ پہنچنا تھا نہ پہنچا۔ بے اختیار میر کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

نعمت زنگار رنگِ حق سے بہرہ بخت سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

پہلے میں ناسخ کی انھیں غزلوں میں سے چند غزلوں کے اشعار بطورِ نمونہ دے کر جن سے ڈاکٹر صاحب نے لئے ہیں اُن کی خوش فہمی و خوش سلیقگی ثابت کروں گا بعد از اں کلامِ ناسخ سے اپنا انتخاب الانتخاب اختصار کے ساتھ پیش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب کا انتخاب	اسی غزل سے اثر کا انتخاب
۱۔ ایکدم یار کے بوسوں سے نہ ملتی فرصت گردشِ دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا	۱۔ اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا
۲۔ سفر ہم نے کیا یادِ لبِ جاناں میں دنیا سے چراغ اپنی لحد پر چاہیئے لعلِ بدخشاں کا	۲۔ مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا ۳۔ ترا دیوانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے یقیں ہر روزنِ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا ۴۔ کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا نہ اُلجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا
۳۔ تو نے جو پانی پیا ہے اے بتِ شیریں دہن آبخورے میں ہے عالم کوزۂ فرہاد کا	۵۔ سب سے ہے طرزِ وفا اک مجھ سے انداز جفا کس سے جا کر میں کروں شکوہ تری بیداد کا ۶۔ کوئی غنچہ ہے کوئی گل ہے کوئی پژمردہ ہے دیکھتے ہیں ہم تماشا گلشنِ ایجاد کا ۷۔ محوِ عشق ایسا ہوں کرتے ہیں اگر اعدا بھی ظلم شبہ ہوتا ہے اسی محبوب کی بیداد کا ۸۔ رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں گل کو گلچیں کا خطر، بلبل کو غم صیاد کا

ڈاکٹر صاحب کا انتخاب	اسی غزل سے اثر کا انتخاب
۴۔ آبلے چیچک کے جب نکلے عذارِ یار پر بلبلوں کو برگِ گل پر شبہۂ شبنم ہوا	۹۔ خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند آسماں پیشِ زمیں ہر بار تواضع خم ہوا (غمِ دوراں کو غمِ جاناں سے متحد کرنے کو حال کے ایک شاعر سے منسوب کرنے والے سینیں) ۱۰۔ جوش پر طوفانِ اشک اے دیدۂ پُرنم ہوا آگے تھا اک ہجر کا غم اب غمِ عالم ہوا
۵۔ دلِ رقیب میں سامانِ روسیاہی ہے کہ جس طرح کوئی رکھے خضاب شیشے میں	۱۱۔ بہار آئی بھروں اب شراب شیشے میں اُتاروں شکلِ پری آفتاب شیشے میں
۶۔ رفتارِ ناز میں یہ لچک جاتی ہے کہ بس گویا تری کمر میں صنم استخواں نہیں	۱۲۔ وہ دور ذرا ایک رنگ پہ وضعِ جہاں نہیں وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں ۱۳۔ آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گردِ راہ حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہیں ۱۴۔ حاصل تجھے بصارتِ یعقوب ہو، اگر یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں ۱۵۔ منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی تہنا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں ۱۶۔ پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

اور اب ناسخ کے عمدہ اشعار میں سے چند شعر سنیئے جو باعثِ ننگ نہیں بلکہ قابلِ رشک ہیں جن کی بنا پر اُس کے معاصرین کو لالچ آیا کہ ہم بھی ایسے شعر کہیں۔

۱۔ نام رکھت ہے کہیں لغزشِ مستانہ کہیں
نہیں شغلِ حرم و خانۂ خمار جدا

۲۔ جب تصوّرِ یار کا باندھا ہم آپ آئے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا

۳۔ مست کہتے ہیں جس کو ابرِ بہار
گوشہ ہے میرے دامنِ تر کا

۴۔ عمرِ جاوید چھوڑ کر لی تو نے — دیکھنا حوصلہ سکندر کا

۵۔ تماشائے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنجِ عزلت میں
ہمارے بورئے کا نقش خط ہے ساغرِ جم کا

۶۔ یہ ہوا ایسا چاہیئے عاشق خیالِ دوست میں — غیر اگر بوسے تقیس ہو یا لکی آواز کا

۷۔ کھینچ لائی وادیٔ ہستی میں بے تابی مجھے — رہ گیا پیچھے عدم میں قافلہ آرام کا

۸۔ آہ یہ بت پرستی حق پرستی کے عوض — رہ گیا ہے کیسی خواری سے گلستان اسلام کا

۹۔ رات جدھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا — غیرتِ مہتاب اپنا دامنِ نظارہ تھا

۱۰۔ نہیں ٹھہرتی نہیں اپنے حسن پر اس کی — شعاعِ نور سے آئینہ آفتاب ہوا

۱۱۔ بات جیسی نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی
بوجھ ان سے سینکڑوں من خاک کا کیونکر اٹھا

۱۲۔ مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں — دل دُکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

۱۳۔ ملاقاتِ دو روزہ کو یہاں آتے ہیں ہم لیکن
سرائے دہر نے سب کو مقامِ جنگ ٹھہرایا

۱۴۔ ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اے شیخ — اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

۱۵۔ آتی ہے عالمِ بالا سے صدا مانگ سو دوں
امتحاں کو بھی میں لیکن کبھی سائل نہ ہوا

۱۶۔ ہوں چراغ اس بزم کا ناسخ کہ جس میں لاکھ بار
پتلیوں کا عالمِ مستی تماشا کر گیا

۱۷۔ خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں — سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

۱۸۔ وصفِ جنت جب کئے واعظ نے منبر پر شروع
صاف میں سمجھا کہ کرتا ہے بیانِ کوئے دوست

۱۹۔ جو وہاں پہنچا وہی آگاہ اس عالم سے ہے
اور ہی کچھ ہیں زمین و آسمانِ کوئے دوست

۲۰۔ وصل میں تھا جو سے بیزار میں — ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

۲۱۔ مجھی سے عشق ہے سو دیکھتا ہے تیری صورت کو
عبث باندھی ہے تہمت بت پرستی کی برہمن پر

۲۲۔ ناسخ ہے آنکھوں پہ مشقِ تصور اس قدر — جس سمت کرتا ہوں نظر وہ آتا ہے نظر

۲۳۔ سر پہ سوزاں داغِ سودا پاؤں میں زنجیرِ اشک
تیری محفل میں کھڑی ہے صورتِ دیوانہ شمع

۲۴۔ ماہِ نو ہے مثلِ ابرو لیکن اس کا رو نہیں — ماہِ کامل صورتِ رو ہے مگر ابرو نہیں

۲۵۔ رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
دل ہی دل میں ہم اُسے یاد کیا کرتے ہیں

۲۶۔ گر آنکھ ہے تو باطنِ انساں کی سیر کر — کیا کیا طلسم دفن ہیں مشتِ غبار میں

۲۷۔ بیٹھا نشہ ایسا ہے بے ہوش ہوں میں
غم گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مدہوش ہوں میں

۲۸۔ نہیں ممکن خمِ گردوں میں ٹھہرنا میرا
مستیٔ عشق سے وہ بادۂ سرجوش ہوں میں

۲۹۔ تری آنکھیں نہیں یہ دونوں پلّے ہیں ترازو کے
ہمیشہ نیک و بد کو تولیں ناسخ اس ترازو میں

۳۰۔ ایک کو عالمِ حیرت میں نہیں ایک سے کام
شمعِ تصویر سے روشن شبِ تصویر نہیں

۳۱۔ کیونکر کہوں عارفِ خدا ہوں — معلوم نہیں کہ آپ کیا ہوں

۳۲۔ اُمیدِ وصال اب کہاں ہے — اُس گل سے برنگِ بو جدا ہوں

۳۳۔ کس نے چہرے سے اُٹھائی ہے لبِ دریا نقاب
کوندتی ہیں بجلیاں لہروں کے بدلے آب میں

۳۴۔ رہنمائی میری کرتی ہے مجھے پامالِ خلق — نقشِ راہِ منزلِ مقصود مثلِ جادہ ہوں

۳۵۔ دیکھنا کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم
آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں

۳۶۔ گا غوری سومنات ایک سی دونوں میں ہے
کچھ تفاوت ان دنوں ہندو مسلماں میں نہیں

۳۷۔ زندگی زندہ دلی کا ہے نام — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۳۸۔ وصل میں سمجھے ہے یار یوں غفلت سے ہے
عین دریا میں ہے گو کشتی جس طرح گرداب

۳۹۔ ایک سیکڑوں سے قیدیٔ زندانِ ولی — بوئے گل پیاملتی ہے باغ کی دیواروں کو

۴۰۔ جو ضعیفوں کو ستائے گا سزا پائے گا — آسیہ دکھ پاتے ہیں جو روندتے ہیں دانے کو

۴۱۔ بہتر ہے اس کے جو ہو نشہ وہ ہو اس کے دیکھنے سے
نہ جام بادہ پہنچے گا تمہاری چشمِ مستانوں سے

سلطنتِ اودھ کی تباہی کی پیش گوئی۔

۴۲۔ بجھ رہی وصالِ یار میں کیا اضطراب کو — دریا میں بے قرار ہے ساں موجِ آب کو

۴۳۔ سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں — ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ

۴۴۔ آئینہ خانہ ہے عالم، عکس افگن ہے وہی
ہے فروغِ مہر و ذرات ایک ہی تنویر سے

۴۵۔ پھر بہار آئی کہ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

۴۶۔ لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے موسمِ نا و نوش ہے

۴۷۔ صدقے ہو تیری چال پہ کیوں نہ نسیمِ ہر سحر
نقشِ قدم سے رہگذر دامنِ گل فروش ہے

۴۸۔ منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ ہیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے[ؔ]

۴۹۔ رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں — کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

۵۰۔ تو وہ ماہ مصر خوبی ہے کہ تیرے عشق میں
مدتوں سے اختروں کا کارواں گردش میں ہے

۵۱۔ کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

۵۲۔ ساکن دل تو ہوا آنکھوں کو ترساتا ہے کیوں
جس قدر دل صاف ہے ویسی نگہ بھی پاک ہے

۵۳۔ چھلک چھلک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جامِ مے
یہ مے کدہ مقام نہیں ہے غرور کا

۵۴۔ کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے — نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

۵۵۔ دمِ بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا — جھونکا جو ہی نسیم کا سن سے نکل گیا

۵۶۔ چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر — بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

۵۷۔ رہتا ہے ہمیں دھیان تمہارا ہی ہمیشہ — تم کو نہیں آتا ہے کبھی دھیان ہمارا

۵۸۔ انساں کو انساں سے کینہ نہیں اچھا — جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

۵۹۔ مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ آبِ نیساں کا
دُرِ نایاب ہو سکتا ہے آنسو ہو نہیں سکتا

۶۰۔ مزرعِ امید نا سبز خشک ہے — الغیاث اے ابرِ احساں الغیاث

۶۱۔ عین دریا میں بھی گردش سے نہیں دم بھر قرار
سعی کرنا ختم ہے اے سالکو گرداب پر

۶۲۔ کیا ملیں تنکے سے سائیں کو نڈی سونٹا چھوڑ کر
پاس ہے اکسیر کی بوٹی نہیں پرواے زر

۶۳۔ مردوں کو جلاتی ہے تری ناز کی آواز — اعجاز کا اعجاز ہے آواز کی آواز

۶۴۔ تو ہے گلدستۂ گلزارِ نزاکت اے گل — چاہیئے تیرے لئے تارِ نظر کی بندش

۶۵۔ طور و موسیٰ ذرہ صحرائے عشق — نوح و طوفاں قطرہ دریائے عشق

۶۶۔ گورا گورا بدن سفید لباس — یہ لطافت تو نسترن میں نہیں

۶۷۔ عالم ہے محو آئینہ خانے کی سیر میں — اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں

۶۸۔ وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

۶۹۔ آنکھ کی مند بت ہوا موجود — کوئی مجھ سا بھی بت تراش نہیں

۷۰۔ آنکھ کیا دل کیا حرم کیا دیر کیا بت خانہ کیا
کون سی جا ہے وہ ہرجائی جہاں ملتا نہیں

۷۱۔ ہرگز مجھے نظر نہیں آتا وجودِ غیر
عالم تمام ایک بدن ہے میں دیدہ ہوں

۷۲۔ سودائے عشق غیر کہاں ہے برنگِ گل
اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

۷۳۔ یوں خیالِ روئے جاناں ہے دلِ بیتاب میں
جس طرح سے عکس ہو مہتاب کا گرداب میں

۷۴۔ دولتِ بیدار جائے پر ادب جانے نہ پائے
بہرِ تعظیم اٹھ کھڑا ہوں تم جو آؤ خواب میں

۷۵۔ عشق کو کس کے دل سے لاگ نہیں — کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

۷۶۔ میخانۂ خراب یہ عالم اگر نہیں — پھر کس لئے کسی کو کسی کی خبر نہیں

۷۷۔ دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف
جب سے نہیں ہے طاقتِ رفتار پاؤں میں

۷۸۔ نورِ عرفاں جو نہ ہو جہل کی ظلمت میں نہاں
ایک ہی تجکو نظر آئیں یہ مظہر لاکھوں

۷۹۔ دل بنا عاشقی میں خود مختار — اور مجبور کر دیا ہم کو

؎ یہ مارکس سے بھی پہلے لکھنؤ کا ایک بدنام شاعر کہتا ہے! اخ

۸۰۔ سب برگِ گل کترے کے زمیں پر گرادئے
بلبل نے باغ میں جو ترے دیکھ پائے ہونٹھ

۸۱۔ وہی عاشق ہے جو عالم کو مرقع سمجھے
ہر طرف پیشِ نظر یار کی تصویر رہے

۸۲۔ یہ بھی اُس ماہ کے کیا میری طرح عاشق ہیں
جو ستارا ہے وہ بیدار نظر آتا ہے

۸۳۔ کیا نظر میں سما گیا وہ گل — پردۂ چشم بھی گلابی ہے

۸۴۔ عشق جب کامل ہوا ہے عینِ حسن — آگ میں پڑ جائے جو شئے آگ ہے

۸۵۔ جو ترا نقشِ قدم ہے پھول ہے — نکہتِ گل رہ گزر کی دھول ہے

۸۶۔ ہے مرا مقصود حاصل ہر جگہ — ہر مقام اب منزلِ مقصود ہے

۸۷۔ میں کیا کہ پائے نکہتِ گل میں بھی ان دنوں
بیڑی پڑی ہے موجِ نسیم بہار کی

۸۸۔ پہروں پھر بات مرے منہ سے نکلتی ہی نہیں
یاد آجاتی ہے تیری جو کوئی بات مجھے

۸۹۔ جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

۹۰۔ بلائے جاں ہے نظر سے اگر نظر مل جائے
مگر ہے لطف بڑا دل سے دل اگر مل جائے

۹۱۔ پُر ہیں شیشے تو جام خالی ہے — گردشِ آسماں نرالی ہے[1]

۹۲۔ دمبدم اُٹھتے چلے جاتے ہیں لوگ — دہر گویا بزمِ برہم خوردہ ہے

۹۳۔ جوشِ حباب بادہ نہیں خم میں ساقیا — مینائے آسماں میں ہیں اختر بھرے ہوئے

۹۴۔ خاکساری بھی نہ چھوڑے دے خدا جس کو عروج
آسماں پر ماہِ تاباں ہے زمیں پر چاندنی

۹۵۔ سیرِ چمن کو تو نہیں جاتا تو رنگِ گل — اڑ کر غبارِ گیسوئے موجِ نسیم ہے

۹۶۔ آتی جاتی ہے جا بجا بدلی — ساقیا جلد آ ہوا بدلی

۹۷۔ آج تک مشہور ہے قصہ جو برقِ طور کا
جا پڑا تھا اک شرر تیری تجلی گاہ سے

۹۸۔ سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے

۹۹۔ اس ماہ کی فرقت میں جو تارے نکل آئے
تاروں سے سوا اشک ہمارے نکل آئے

۱۰۰۔ تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ — پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے

یہ "مُشتے نمونہ از خروارے" ہے۔ مگر فاضلِ ادب ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ناسخ کے کلام میں ابتذال و رکاکتِ لفظی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا!
وائے بر حالِ سخن . . . .

---

[1] سرمایہ دار اور مزدور کا فرق۔ ایک اس قدر دولت مند ایک اس قدر نادار۔ اثر

کلامِ وحشت مرحوم

یہ کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف — ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا — کیا ہے شکر کے پردے میں قسمت کا گلہ میں نے

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی — کہ یہ بھی چاہیئے رنگینیٔ چمن کے لئے

کیوں مجھ کو نہ خود رفتہ کئے دیتی ہے یا رب — وہ بوئے دلآویز کہ ہم دوشِ صبا ہے

قمر مرادآبادی

لمعات

یہ مقام زندگی بھی بڑا عبرت آفریں ہے
جہاں شمع جل رہی ہے وہیں روشنی نہیں ہے

مری زندگی میں تم ہو مجھے کوئی غم نہیں ہے
مری صبح بھی حسیں ہے مری شام بھی حسیں ہے

وہ حرم ہو یا کلیسا کوئی معتبر نہیں ہے
جہاں قلب مطمئن ہو وہی منزلِ یقیں ہے

جو نظر نظر گراں ہے جو نفس نفس حزیں ہے
وہی آرزو جواں ہے وہی زندگی حسیں ہے

مری آرزو کا مقصد ترا لطف ہی نہیں ہے
جو نظر کہ ہے گریزاں وہ نظر بھی دل نشیں ہے

یہ طلسم رنگ و بو ہے تو یہاں نہ ڈھونڈ ان کو
وہ جہاں نظر پڑے تھے یہ مقام وہ نہیں ہے

تری بزمِ ناز میں ہو جسے اذنِ بار یابی
وہ خطا بھی دل کشا ہے وہ گناہ بھی حسیں ہے

مرے اشک کیوں اٹھائیں ترے دامنوں کے احساں
ابھی اپنا پیرہن ہے ابھی اپنی آستیں ہے

مرے ذوقِ جستجو کی ہے تجھی کو شرم رکھنا
مرے ساتھ بے خودی ہے کوئی کارواں نہیں ہے

مری زندگی چمن ہے میں چمن کی زندگی ہوں
مجھے فکرِ گلستاں ہے غمِ آشیاں نہیں ہے

قمر اس کے پوچھنے کو سبھی پوچھتے ہیں لیکن
جسے ذوقِ خودکشی ہو وہی صاحبِ یقیں ہے

فرید عارفی

مکالمات

شب سیاہ نے چھیڑی سحر کے نور کی بات
بہت قریب ہوئی جا رہی ہے شعور کی بات

ہمیں فسانے کا دعویٰ بجا سہی لیکن
کسی کو راس بھی آئی کبھی غرور کی بات

سنا رہے ہیں وہ عرشِ بریں کے افسانے
زمیں کی بات ہی جن کے لئے ہے دور کی بات

غمِ حیات کی تلخی سے دل نہ گھبرائے
ذرا تو چھیڑیئے کیفیتِ سرور کی بات

جو تیرے مستوں سے نظریں ملا نہیں سکتے
وہ خاک سوچ سکیں گے ترے حضور کی بات

رخِ حسیں پہ حجابوں نے ڈال دی ہے نقاب
کسی نے چھیڑ دی شاید کلیم و طور کی بات

فرید نام پہ میرے ہراساں نہیں ہوتی
نئے جہاں، نئے آدم، نئے شعور کی بات

طرفہ قریشی

باقیات

زندگی کے بعد بھی کچھ زندگی باقی رہے
آدمی مٹ جائے قدرِ آدمی باقی رہے

قعر میں بھی فارغ البالی ہو مرہونِ خیال
خشک آنکھوں پہ بھی ایقانِ نمی باقی رہے

ہے وہی تکمیل گاہِ علم و عرفانِ جہاں
جس جگہ صرف ان کے جلوے کی کمی باقی رہے

تیرگیٔ عشق میں بھی مسکرا سکتا ہوں میں
دل میں لیکن تیرے غم کی روشنی باقی رہے

عشق غیر آسودہ تلخیٔ دوراں ہو نہ جائے
اے مزاجِ حسن تھوڑی بے رخی باقی رہے

اہلِ ہمت کے لئے ہر مرحلہ آسان ہے
شرط یہ ہے جذبۂ منزل رسی باقی رہے

شاعری تخیل کی انگڑائیوں کا نام ہے
فکر کی پرواز و وجدانِ آگہی باقی رہے

سینۂ نے سے نوائے دل نشیں پیدا تو ہے
کاش اے طرفہ مذاقِ نغمگی باقی رہے

لوکمانیہ بال
گنگا دھر تلک

شملے کي

اوٹا کمنڈ کي جھیل

دارجلنگ کا خوبصورت نظارہ

نیني

روڈ

وادیِ گل مرگ (کشمیر)

اودے پور کا جل محل اور پچھولا جھیل
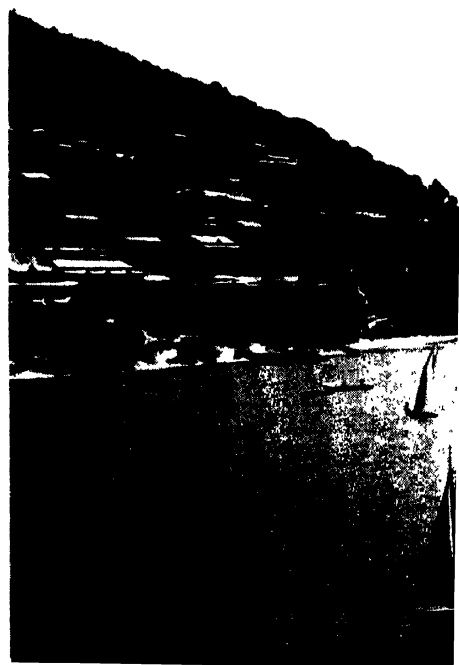
پنڈت جواہر لعل نہرو کے حالیہ غیر ملکی دورے کی چند تصاویر

آئر لینڈ کی راجدھانی ڈبلن کے ہوائی اڈے پر
پنڈت نہرو گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں

لندن کے گلڈ ہال میں پنڈت نہرو کو لندن شہر کی
آزادی کا اعزاز دیئے جانے کی تقریب

پالم ہوائی اڈے پر راشٹرپتی
پنڈت نہرو کو الوداع کہ رہے ہیں

پنڈت نہرو سیریا کے وزیر اعظم کے ساتھ

کہہ کر حقہ پینے لگے۔ اس کے بعد ہم آپس میں باتیں کرنے لگتے اور مولانا اپنے "سروش" کے ساتھ خاموش مکالمہ شروع کر دیتے۔ انھیں سروش کی رضا جوئی کا بڑا خیال رہتا تھا اور اس کی نازک مزاجی سے بہت ڈرتے تھے۔ ان کا خیال نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ شاعر کی ذرا سی غیر پسندیدہ حرکت اور غیر شاعرانہ لغزش سروش سے تعلق ٹوٹ جانے کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ "ہاں میاں سروش سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔" یہ فقرہ مولانا نے اس وقت بھی کہا تھا جب ڈاکٹر اقبال نے حافظِ شیراز کے متعلق چند اشعار اپنی مثنوی میں لکھے اور اس کے بعد بھی ہم نے کئی ہزار مرتبہ اُن کے منہ سے سُنا۔ بہرحال ہم باتیں کرتے ہوتے یکایک مولانا کو کچھ خیال آ تا یا کوئی نیا شعر ہو جاتا تو دھم سے ہماری بزمِ گفتگو میں آ کودتے اور وہ شعر سُنا کر ہماری داد یا بیداد پر توجہ کئے بغیر پھر اپنے سروش کے پاس چلے جاتے۔ ہم اپنی گفتگو کے سلسلے کو دوبارہ برہم ہونے کے انتظار میں پھر شروع کر دیتے اور یہ چکر یونہیں چلتا رہتا۔

اصلاح کا ڈھنگ

نیا شعر سُناتے وقت مولانا نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تازہ اور نو وارد ہے ارشاد ہوتا "کیا شعر یاد آیا ہے" اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ ہمارا شعر ہے اور ابھی ابھی ہوا ہے۔ ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے اور مولانا شعر سُنا کر ذہنی طور پر پھر روپوش ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہماری بحث میں دخل دے کر کچھ ادبی نکتے بھی بیان کرنے لگتے، مگر بہت ہی مختصر طور پر۔ کئی بار ایسا بھی ہُوا کہ مولانا نے سروش کو چھٹی دے کر بہت سا وقت ہمارے ساتھ بات چیت میں صرف کر دیا۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی ہم لوگوں سے بھی شعر کی فرمائش ہو جاتی۔ شروع شروع میں تو ہم مبتدیوں کی طرح گھبرا بھی جاتے تھے لیکن مولانا اس توجہ اور شفقت سے سنتے کہ چند ملاقاتوں کے بعد ساری جھجک جاتی رہی۔ مولانا ہر شعر پر کچھ نہ کچھ داد دیتے اور جب ہم سُنا چکتے تو اور باتیں کرنے لگتے۔ (حقے سے اس دوران میں بھی تغافل نہیں برتا جاتا تھا) اب مولانا ہمارے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور ہماری غزلوں کے قابلِ اصلاح اشعار ان کے دماغ میں چکّر لگا رہے ہیں۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ اچھے شعر تو داد دے کر رخصت کر دئے جاتے اور جو اصلاح کے قابل ہوتے وہ سب کے سب محفوظ رہتے۔ باتیں کرتے کرتے یکایک کسی سے ارشاد ہوتا۔ "ہاں بھئی ذرا اپنا وہ شعر تو پڑھو جس میں۔ . . . . . " شعر پڑھ دیا جاتا۔ مولانا فرماتے "واہ بھئی واہ بہت اچھا شعر ہے۔ حد ہو گئی۔ اچھا بھلا اگر یہ ایک لفظ یوں کر دیا جائے؟ ہاں میاں خوب شعر ہے تمہارا۔ واہ بھئی واہ!" پورا مصرع شاذ و نادر ہی بدلتے تھے۔ بس ایک آدھ لفظ یا جملے پر اکتفا کرتے اور اتنی ہی تبدیلی سے شعر سچ مچ آسمان پر پہنچ جاتا۔ جس شعر میں زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہو یا نفسِ مضمون میں خامی نظر آئے اس کے متعلق صاف کہہ دیتے "اسے جانے دو۔" لیکن ایسا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ شعر کی کمزور رگ پر اُنگلی رکھ کر اسے خونِ صالح سے بھر دینے کا فن مولانا کو خوب آتا تھا اور اس فن میں ان کا ثانی میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔ حفیظ صاحب تو مولانا کے شاگرد ہی تھے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ حفیظ صاحب کے شاگرد کو بھی کئی بار اس تبرک سے نوازا گیا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اس دوران میں مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کے عادات و خصائل کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔ اس مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مولانا کے واحد حقیقی شغل یعنی شاعری کو اُن کی زندگی تصوّر کریں تو یہ ایک فرزانۂ روزگار کی قابلِ رشک حد تک مربوط اور معقول زندگی تھی۔ لیکن اگر زندگی عام عادات و خصائل، حرکات و سکنات اور روزمرہ کے اقوال و افعال کا نام ہے تو ہمارے زمانے کے بہترین فارسی شاعر اور ایک مجذوب کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ گرامی سچ مچ فنا فی الشعر تھے۔ شعر میں استغراق کا یہ عالم تھا کہ کسی مصرع پر مصرع لگانے کو کہہ دیا جائے تو دُنیا بھر کے ضروری سے ضروری کاموں سے فراغت ہو جاتی تھی۔ کسی کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس بیسویں صدی میں ایک پڑھے لکھے آدمی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ریل کا ٹکٹ کہاں سے اور کیونکر لیا جاتا ہے۔ اگر جالندھر سے لاہور جانے کے لئے ریل گاڑی میں بٹھا دیا جائے اور کوئی شخص منزلِ مقصود پر اُتارنے والا نہ ہو تو بڑے اطمینان سے راولپنڈی، پشاور بلکہ قطبِ شمالی تک چلے جائیں اور شاید ایک مرتبہ بھی نہ پوچھیں کہ اب لاہور کتنی دُور رہ گیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر اقبال فرمایا کرتے تھے کہ "گرامی شعر میں تلمیذِ روح الامین ہے اور باقی تمام معاملات میں۔ . . . "

غرض یہ کہ عام حرکات و سکنات میں مولانا کی زندگی ان لوگوں سے بہت مختلف تھی جنھیں عقلِ انسانی سے بہرہ ور سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو یہ حالت کہ جس شعر میں ایک آدھ جملے سے زیادہ تبدیلی کی ضرورت ہو اُسے فوراً عاق کر دیا جاتا اور دوسری جانب یہ عالم کہ اگر ہم نے کسی شاعر کی تعریف شروع کر دی تو مولانا بھی اس کے گُن گانے لگے اور تھوڑی دیر کچھ اور باتیں کرنے کے بعد ہم

میں سے کسی شاعر کی بُرائی کی تو مولانا نے پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ ہاں میں ہاں ملادی اور شاعر بے چارے کے بخیے اُدھیڑ کے رکھ دئے۔ ایک مرتبہ داغ کے اچھے اچھے شعر پڑھ کر تعریف کی جارہی تھی۔ مولانا نے فرمایا — "بھئی کیا بات ہے داغ کی۔ زبان کا بادشاہ، بندش کا استاد، سچ مچ فصیح الملک تھا حضور نظام نے جہاں اُستاد کا خطاب یونہیں نہیں دے دیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں وہ دو جہاں اُستاد تھا۔ ہاں میاں کیا بات ہے داغ کی۔" مجھے شرارت سوجھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو چکیں تو حفیظ صاحب کو مخاطب کرکے داغ کا یہ شعر پڑھا ؎

تم کو ہے وصل غیر سے انکار اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

قاضی رحمت اللہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول شعر کہتا تھا داغ بھی۔" مولانا خدا جانے کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ یہ سُن کر فوراً حاضر ہوگئے۔ "بازاری اوباشوں کا شاعر تھا۔ ساری عمر جھک مارتا رہا۔ ہمارے سامنے جھک مارتا تھا۔" (اس قسم کی حرکتیں ہمیشہ مولانا کے سامنے ہی ہوا کرتی تھیں) اس قسم کی گفتگو میں انھیں ہمیشہ مرحوم یا غائب شاعر کی روح کو ثواب پہنچانے سے زیادہ ہم لوگوں کی دل داری کی فکر رہتی تھی جنھیں ان کا حقیقی محبت اور شفقت سے لبریز دل اپنے "احباب" کہا کرتا تھا۔ لیکن آبگینوں کو یوں ٹھیس سے بچانے میں کسی تکلف یا کوشش کو ذرا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ بس مولانا کی عادت سی ہوگئی تھی اور اس عادت کے حُسن و قبح پر غور کرنے کی نہ کبھی فرصت ملی نہ ضرورت محسوس کی گئی۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ شعر کے معاملے میں بھی کوئی اللہ کا بندہ گرامی کو گمراہ کر سکتا تھا۔ یہی تو ایک دُنیا تھی جس کے متعلق بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو گرامی سے سیانا وہ دیوانہ!

اکبر الٰہ آبادی

ایک دن اکبر الٰہ آبادی کے مختلف اشعار پڑھے جارہے تھے۔ ہم سب خوب تعریفیں کررہے تھے۔ یکایک مولانا کو ایک شعر "یاد آگیا" بڑے جوش اور خلوص سے فرمایا ؎

بلاغت تعبیہ معنی است مُضمر
کلامِ اکبر است اللہ اکبر!

ہم پھڑک گئے۔ قاضی رحمت اللہ نے تجویز کیا کہ یہ شعر اکبر کو لکھ بھیجیں۔ مولانا فوراً منع کرنے لگے۔ "نہ نہ۔ بالکل نہ بھیجنا۔ وہ مغرور ہو جائے گا کہ گرامی نے میری تعریف کی ہے۔ غرور آجائے تو سروش سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں میاں مت بھیجو یہ شعر!" ہم نے تعمیلِ ارشاد کا وعدہ کیا۔ اور کچھ اور باتیں ہونے لگیں۔ آخر مجلس برخاست ہوئی۔ تو جاتے جاتے فرمانے لگے "ہاں بھئی وہ شعر ضرور بھیج دینا اکبر کو۔ کہنا تمھارے خادم گرامی نے لکھا ہے۔ بہت بڑا شاعر ہے اکبر۔ اس کے دل میں قوم کا بڑا درد ہے۔ واہ بھئی واہ! سبحان اللہ۔" کہاں تو یہ خوف کہ گرامی سے اپنی تعریف سُن کر اکبر مغرور ہو جائے گا اور کہاں "تمھارے خادم گرامی!"

پُرانے اُستادوں کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔ اکثر اُستادوں کی غزلوں پر بڑی کامیاب غزلیں لکھیں۔ لیکن سُناتے وقت ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ آج ہم نے فلاں استاد کا مُنہ چڑایا ہے۔ ساتھ ہی اُنگشتِ شہادت ہونٹوں پر مار مار کر توبہ توبہ کہتے جاتے۔ ایک دن آتے ہی فرمایا۔ "آج ہم نے خواجہ کمال خجندی کا مُنہ چڑایا ہے۔ وہ تو حافظ کے بھی اُستاد تھے میاں۔ توبہ توبہ! ذرا اُن کا مطلع تو سُنو ؎

گفت یارا زغیرِ ما پوشاں نظر۔ گفتم بچشم
وانگہے دُزدیدہ در ما می نگر۔ گفتم بچشم

دوسرا شعر خوب جھوم کے پڑھا ؎

گفت اگر سر در بیابانِ غمم خواہی نہاد
تشنگاں را مژدۂ از ما بہ بر۔ گفتم بچشم

اس کے بعد اپنی غزل سنائی۔ اس وقت تین شعر یاد ہیں ؎

گفت می خور غوطہ در خونِ جگر، گفتم بچشم
ریز خونابِ جگر از چشمِ تر، گفتم بچشم

گفت شب بر بست رخت آمد سحر آئے بوالفضول
داستانِ شکوہ کم کم۔ مختصر، گفتم بچشم

گفت اے حسرت نصیبے آئے بوالہوس آہر زہ گرد
وا ببیچاں ہر طرف تارِ نظر، گفتم بچشم

اسی طرح ایک دن صائب کے مشہور ترتیب کا جواب پیش کیا۔ دونوں کے شعر حاضر ہیں

صائب ؎ بہ قدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن اُستادن نشستن خفتن و مُردن

گرامی ؎ مروّت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی، شکستی، سوختی، انداختی، رفتی

پھر اس پر ایک بہت ہی پیاری غزل کہی۔ لیکن جب وہ چھپی۔ تو یہ شعر اس میں شامل نہ تھا۔

حفیظ کا سجع

ایک دن حفیظ صاحب کے والد شمس الدین مرحوم شریک صحبت تھے۔ دونوں ہم عمر اور ہم وطن۔ چناں چہ مولانا نے اپنے مستقل ذہنی اور روحانی ذہنی مردش کو چھٹی دے دی اور دونوں بزرگوں میں بے تکلف باتیں ہونے لگیں۔ اس روز مولانا کو ہماری مغل دنیا سے کچھ غیر معمولی محبت ہوگئی تھی جس کے باعث ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ ہم سب کچھ دیر کے لئے مبہوت سے ہوگئے یعنی مولانا نے اپنا حقّ حیدمنٹ کے لئے حافظ صاحب کو عنایت کر دیا۔ مولانا کو حفیظ صاحب سے دلی محبت تھی۔ حافظ صاحب سے گفتگو ہونے لگی تو جام چھلک پڑا اور مولانا کو سجع پر سجع "یاد" آنے لگا۔ مجھے اس وقت صرف ایک شعر اور ایک مصرع یاد ہے۔ شعر میں باپ بیٹا دونوں موجود ہیں۔ جس پر جوش محبت سے مولانا نے یہ شعر پڑھا وہ میری دسترس سے باہر ہے صرف الفاظ حاضر کر سکتا ہوں ؎

آفات و بلا ز خویشتن رانیم یا حافظ و یا حفیظ خوانیم

حفیظ صاحب کا پورا نام محمد حفیظ ہے۔ "ابو الاثر" شفیق استاد کا عطیہ تھا۔ مصرع سنیئے ؎

اللہ مستعان و محمد حفیظ یاد

مجموعۂ کلام

مولانا کو سارا کلام زبانی یاد تھا۔ ہمیں خیال آیا کہ یہ قیمتی سرمایہ ان کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ ایک دن تجویز پیش کی گئی کہ مولانا ہر روز کچھ نہ کچھ ہمیں لکھوا دیا کریں۔ صاف انکار کر دیا۔ فضول محنت ہے۔ خواہ مخواہ کا دردِ سر۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے تو کبھی حضور نظام کو لکھ کر نہیں دیا وغیرہ وغیرہ ہم نے اشاروں اشاروں میں خاموش ہو جانے کی سازش کر لی۔ پھر دو چار دن کے بعد شاعری اور شعر کو قومی سرمایہ بنا کر اس کی اہمیت پر باہمی لیکچر بازی شروع کر دی۔ کسی نے کہا شکسپیئر کے ڈرامائی کلام کے بغیر انگریز قوم کی حکومت اور سلطنت کا یہ عالم ہرگز نہ ہوتا۔ کوئی بولا۔ فردوسی اور سعدی نہ ہوتے تو آج دنیا میں ایران کا وجود تک نہ ہوتا پھر نہایت ہی عجیب و غریب دلائل سے مولانا پر یہ ثابت کر دیا کہ ان کا کلام قوم کا سرمایہ ہے اور اگر انھوں نے اسے یوں چھپائے رکھا تو قوم کو شدید نقصان پہنچے گا اور وہ قیامت کے دن اللہ اور رسول کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

تیر نشانے پر بیٹھا۔ قوم کی امانت میں خیانت کے تصوّر اور اللہ رسولؐ کے نام نے مولانا کو ایک لمحے کے لئے تو لرزہ بر اندام کر دیا۔ چناں چہ ایک مقفل صندوقچی اور لکھنے کا سامان اسی وقت خرید کر مولانا کے گھر پہنچا دیا گیا اور دوسرے ہی دن سے کلام پوری باقاعدگی کے ساتھ ضبط تحریر میں آنے لگا۔ مگر اس میں بھی ایک مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی۔ یعنی کسی روز ہم صبح نو دس بجے کے قریب مولانا کے ہاں چلے جائیں تو مولانا سلام کا جواب دینا تو در کنار جلد جلد کاغذ سمیٹنے لگتے۔ جو کچھ لکھا ہو صندوقچی میں رکھ کر بڑی احتیاط سے قفل لگاتے اور کنجی جیب میں ڈال لیتے۔ اس کے بعد بڑے تپاک سے ہماری مزاج پرسی ہوتی۔ بعض اوقات یہ مرحلے اتنی دیر میں طے ہوتے کہ اس دوران میں مولانا کا ملازم غلام محمد ہمیں چائے بھی پلا دیتا۔ اب مولانا آواز دیتے۔ ارے بھئی غازی صاحب آئے ہیں پنڈت جی آئے ہیں انھیں چائے پلاؤ۔ غلام محمد کہتا۔ "وہ تو پی چکے۔" ارشاد ہوتا۔ "تو پھر پان دو سگرٹ پلاؤ۔" وہ کہتا۔ "پان سگرٹ بھی پیش کر چکا ہوں۔" اس پر بگڑ جاتے۔ "ارے تو پھر انھیں چائے ہی پلا دے، کچھ کرے گا بھی۔" پھر دس پندرہ منٹ باتیں ہوتیں اور اس کے بعد مولانا جیب سے کنجی نکالتے اور صبح سے اب تک لکھے ہوئے سب کاغذ نکال کر ہمارے حوالے کر دیتے۔ "دیکھو کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی۔ گرامی آفتاب بر لب بام ہے۔ ستر ابہترا ہو گیا اور آپ لوگوں نے بڑھے کو باشقّت قیدی بنا دیا ہے۔" اب وہ قومی سرمایہ جس کی حفاظت کے بارے میں پہلے اس قدر احتیاط کی گئی تھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتا اور رخصت ہوتے وقت اگر ہم صندوقچی میں رکھ کر نہ جائیں تو عین ممکن ہے اُڑ اُڑا کر گلی میں چلا جائے۔ کیونکہ مولانا تو یہ امانت ہمارے سپرد کر کے گویا سرخرو ہو چکے تھے۔

افسوس کہ یہ صحبت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ میں کالج کی تعلیم حاصل کرنے لاہور چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد حفیظ صاحب کو بھی غم روزگار لاہور لے آیا۔ اس دوران میں رباعیوں کی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی مگر دوسرا کلام بہت تھوڑا ہے۔ اس کا معتد بہ حصہ اپنے خالق کے ساتھ ہی چلا گیا طباعت کلام کی سعادت مولانا کے ایک فاضل شاگرد مولانا عظامی اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہوئی۔

مہاتما جی کا قصیدہ

سنہ ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کے حادثے اور مارشل لاء کی ابتلا کے بعد کانگرس کا اجلاس امرت سر میں ہوا۔ کانگرس میں مہاتما گاندھی کے اقتدار کا آغاز یہیں سے ہوا تھا اجلاس کے بعد مہاتما جی نے جالندھر آنے کا وعدہ فرمایا تھا آٹھ دن شہر میں ایک میلا سا لگا رہا۔ اس وقت مولانا نے گاندھی جی کی شان میں ایک دو حرفے کا قصیدہ لکھا۔ افسوس کہ اب ذہن سے اُتر چکا ہے۔ ایک مصرع میں گاندھی کی بوریا نشینی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

شناخت تو ئے ریا را نہ بوریا گاندھی

اور مقطع یوں تھا ؎

جناح، مالوی، کچلو، گرامی، انصاری زدند نعرہ کہ آمد مہاتما گاندھی

پھر جب عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور کانگرس کارکنوں پر حکومت کا تشدد بڑھنے لگا تو مولانا کا وتیرہ ہو گیا کہ کسی معمولی والنٹیر کے جیل جانے کی اطلاع بھی ملتی تو اس کے لئے ایک دو رُباعیاں کہہ دیتے۔ یہ کلام ضبطِ تحریر میں لانے کا اس وقت سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ مولانا ریاست حیدرآباد کے منصب دار تھے۔ پس یہ سرمایہ مولانا کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

مولانا کے حافظے اور سروش سے ان کے "انہماک" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان دونوں کے تصادم سے بعض اوقات عجیب و غریب واقعات پیش آجاتے تھے۔ ایک دن باتیں کرتے کرتے مولانا نے چلم بھرنے کے لئے اپنے ملازم غلام محمد کو آواز دی۔ بیگم نے فرمایا نماز پڑھنے گیا ہے۔ غالب کی طرح گرامی بھی ہمسایۂ خدا تھے، یعنی مسجد اور مولانا کا مکان دیوار بدیوار تھے۔ پس مولانا مطمئن ہو گئے کہ ابھی آجائے گا اور پھر چونکہ چلم بھر دی گئی اس لئے معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ لیکن ہونی شُدنی۔ عصر کے وقت مولانا کو پھر ملازم کی ضرورت پڑ گئی اور اندر سے پھر وہی جواب ملا۔ لیکن مولانا کی چلم بھر دی گئی اور بظاہر قصہ ختم۔ اس کے بعد مولانا آرام فرمانے لگے اور ملازم کم بخت ان کے دماغ کے کسی گوشے میں کبھی نہ ختم ہونے والی نماز میں مشغول ہو گیا۔ اب گرامی کی جانے بلا کہ اس دوران میں وہ بے چارہ واپس بھی آسکتا ہے اور گھر کے کئی دھندے ٹھیک کر کے ظہر کے بعد عصر اور عصر کے بعد مغرب کی نماز پڑھنے بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ خوابِ استراحت سے جاگ کر جب تیسری مرتبہ غلام محمد کو پکارا تو وہ پھر مسجد میں تھا۔ ایک ہی دن میں تیسری مرتبہ خدائے کائنات سے اپنے تنخواہ دار ملازم کے اس ناقابلِ فہم اختلاط کا ذکر سن کر تھلائے سخن آپے سے باہر ہو گیا۔ چنانچہ بیگم کے مُنہ سے ابھی نماز کا لفظ نکلا ہی تھا کہ مولانا کڑک کر بولے۔ "یہ کیا لغویت ہے؟ جب پوچھو نماز جب بلاؤ نماز۔ نمک حرام کام چور، قربِ مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

لاہور میں مولانا کا قیام ڈاکٹر اقبال کے مکان پر ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی مہمان داری اور دیکھ بھال ڈاکٹر صاحب کا خادمِ خاص علی بخش ہی کر سکتا تھا۔ علی بخش کو مولانا سے عقیدت بھی تھی اور محبت بھی۔ اس لئے اکثر و بیشتر مولانا کی بدحواسیوں کا شکار ہوتا تھا۔ ایک دن کھانے پر بیٹھے تو علی بخش سے کہا۔ "بھئی آج کل گوبھی نہیں ملتی؟" اس نے کہا۔ "آج کل تو گوبھی کا موسم ہے، بہت ملتی ہے آپ شام کو کھانا کھائیں تو آج ہی پکا لی جائے۔" (مولانا رات کا کھانا شاذ و نادر ہی کھاتے تھے) شام کو کھانا آیا تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے۔ عرض کیا گوبھی۔ بس بگڑ گئے۔ "لاحول ولا قوۃ۔ صبح گوبھی، شام گوبھی، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے تم! لے جاؤ میں نہیں کھاتا!" علی بخش کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا۔ اب چپ رہو۔ یہ بے چارے صبح کو گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد اجانے اپنے تصور میں اب تک کتنی بار اور کتنے من گوبھی کھا چکے ہیں۔

مولانا عبدالمجید سالک کو گرامی سے جتنی عقیدت تھی گرامی کو سالک صاحب سے اتنی ہی محبت تھی۔ لیکن سالک کی زندہ دلی تو ایک بلائے بے درماں ہے چنانچہ مولانا گرامی کی بہت سی بدحواسیوں کی ذمہ دار یہی زندہ دلی تھی۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ خود سالک صاحب کی زبانی سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

ایک دن تیسرے پہر ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا۔ باہر مولانا کرسی پر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پر آٹھ دس سنترے پڑے تھے۔ میں نے کہا۔ مولانا سنترے منگائے ہیں؟ کہنے لگے ہاں۔ ابھی علی بخش بازار سے لایا ہے۔ اب میری رگِ شرارت پھڑکی۔ میں نے کہا مولانا یہ تو کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا؟ آپ کہتے ہیں تو ضرور کھٹے ہوں گے۔ یہ علی بخش بڑا ہی احمق ہے۔ اسے کیا معلوم سنترہ کس کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد علی بخش کو بلا کر کہا۔ یہ کھٹے سنترے کیوں اُٹھا لائے؟ وہ کہنے لگا۔ مولوی صاحب میٹھے ہیں۔ اس پر بگڑ کر کہا۔ واہ میٹھے ہیں۔ سالک صاحب جیسا معتبر آدمی تو کہہ رہا ہے کھٹے ہیں اور یہ میٹھے بتا رہا ہے۔ علی بخش سمجھ گیا۔ ایک طرف ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے سنتروں کو ٹٹول کر دیکھا اور کہا۔ مولانا غلطی ہو گئی۔ یہ تو ناگپوری ہیں ضرور میٹھے ہوں گے۔ یہ سُن کر شگفتہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ جی ہاں ضرور میٹھے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ سارے شمالی ہندوستان میں علی بخش جیسا "سنترہ فہم" آدمی موجود نہیں۔

اور یہ سب کچھ جان لینے کے بعد جب بدحواس گرامی کا الہامی کلام دیکھتے ہیں تو مولانا ہی کا یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے ؎ کہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار این چنیں باید

جی ایل ادیب لکھنوی

لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک

قوموں کی زندگی میں واقعات دفعتاً ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ ان کے سامان بسا اوقات صدیوں سے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔ تعمیر پہ تعمیر ہوتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اسی سلسلے میں مردِ از غیب بروں آید و کارے بکند' ایک یا چند عظیم شخصیتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کے ہاتھوں اقتضائے وقت کی تکمیل ہوتی ہے۔ آزادیٔ ہند کی داستان میں بال گنگا دھر تلک کی ایسی ہی ہستی ہے۔ یہ شمعِ آزادی کا وہ پروانہ تھا جس کے سوز نے فروغِ شمع پیدا کیا۔ وہ ایک جادو بیان مقرر تھا جس کے اقوال نے لوگوں کے دل مضبوط کئے۔ وہ مردِ میدان تھا جس کے افعال نے قوتِ عمل بڑھائی۔

بال گنگا دھر تلک کی ولادت ۲۳۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو رتنا گری میں ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ معرکہ آرا سال تھا جب اُس جنگِ آزادی کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی جس کا بعد میں قوجی غدر نام رکھا گیا۔ ان کے والد ایک معلم تھے جو بعد کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ تلک کا نام بونت راؤ رکھا گیا جو کثرتِ استعمال سے بال ہو گیا۔

بال گنگا دھر تلک کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ ان کے والد انھیں سنسکرت کے شلوک، حساب اور امرکوش کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ کم عمری ہی میں بہت بڑا علمی ذخیرہ ان کے دماغ میں محفوظ ہو گیا دس برس کی عمر میں پونا کے ایک مدرسے میں داخل کرائے گئے۔ ان کے ذہن کی رسائی اور حافظے کی طاقت پر اکثر معلمین تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ ریاضی سے خاص دل چسپی تھی اور ورزش سے خاص رغبت تھی۔ آپس میں اکثر صلح اور جنگ کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت یہ خیال کس کو تھا کہ ایک روز انھیں دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا ہوگا جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ انھیں ایسے طلباء کے چھیڑنے میں خاص لطف آتا تھا جو بناؤ سنگار بہت کرتے تھے یا شان دکھلاتے تھے۔

انھوں نے ۱۸۷۶ء میں بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اس کے بعد ایل ایل بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں ان کا رجحان قومی خدمت کی طرف ہو گیا اور اپنے ایک دوست مسٹر آگرکر کے ساتھ تعمیری کاموں کی طرف توجہ دینے لگے۔ یہ انہماک اس درجہ عملی صورت اختیار کر گیا کہ انھوں نے وکالت کا خیال چھوڑ دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ بغیر معقول تعلیم کے اجتماعی ترقی نہیں ہوسکتی۔ مختلف قوموں میں مختلف وقتوں میں بڑے بڑے قومی مصلح اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ چین میں سن یاٹ سین اور روس میں ٹالسٹائی نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ مسٹر تلک نے اپنے دوستوں اور ملکی کارکنوں کا تعاون حاصل کیا اور ایک مدرسہ جاری کیا۔ ان کی پُرجوش مخلصانہ کوششوں سے یہ مدرسہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ صرف تین ماہ کی مختصر مدت میں طلبا کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ گئی۔ آخر ۱۸۸۴ء میں جب طلباء کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو دکن ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی۔ اسی سوسائٹی نے فرگوسن کالج قائم کیا۔

۱۸۸۱ء میں تلک مہاراج اور مسٹر آگرکر نے عوام میں تعلیمی اور سیاسی واقفیت پیدا کرنے کے لئے دو اخبار 'کیسری' اور 'مرہٹی' جاری کئے۔ کیسری کی ادارت کے فرائض مسٹر آگرکر کے سپرد ہوئے اور مرہٹی کے مدیر تلک مہاراج خود ہوئے۔ اسی سال کچھ مضامین کی بنا پر حکومت نے دونوں مدیروں کو گرفتار کر لیا اور چار چار ماہ قید کی سزا دی۔ حکومت کے اس رویّے نے تلک کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ رائے عامہ کی زبردست اکثریت ان کو حاصل ہو گئی۔ جب ان کو جیل

سے رہا کیا گیا تو تلک اور آگرکر کی جے کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ ہزاروں آوازیں ایک ساتھ دلوں سے نکل کر زبانوں پر آ رہی تھیں۔ اتنے بڑے مجمع نے جیل کے دروازے پر ان کا خیر مقدم کیا کہ حکامِ وقت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

۱۸۹۵ء میں تلک مہاراج کو بمبئی کی مجلسِ قانون ساز کا ممبر چنا گیا۔ یہاں آزادی کے ساتھ آپ نے اہلِ وطن کے جذبات کی ترجمانی کی اور اظہارِ خیالات میں اتنی ہمت اور جوش سے کام لیا کہ عوام پر آپ کا اثر اور بھی بڑھ گیا۔ ۱۸۹۶ء میں جب مہاراشٹر میں زبردست قحط پڑا تو حکام کی بے پروائی کی بدولت عوام کی نگاہیں تلک مہاراج کی طرف اٹھیں اور عوام کی امیدیں انھیں سے وابستہ ہو گئیں۔ انھوں نے اخبارات کے ذریعے سے حکومت پر صرف نکتہ چینی کرنا ہی اپنا فرض نہیں سمجھا بلکہ گاؤں گاؤں میں جانے والی ٹولیاں بنائیں۔ کھانے اور رسد کی بہم رسانی کا انتظام کیا۔ متعدد امدادی انجمنیں قائم کیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلک مہاراج کی رہنمائی مسلّم ہو گئی اور ہزاروں دلوں پر ان کی بادشاہت ہو گئی۔

۱۸۹۶ء میں ہی طاعون کی وبا بہت زور سے پھیلی۔ سرکاری ملازمین بالعموم اور انگریز فوجی بالخصوص بجائے مدد پہنچانے کے عوام کو طرح طرح کی اذیت دینے لگے، حتیٰ کہ عورتوں کی عصمت پر بھی حملے کئے گئے۔ لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ آپٹے کر نامی ایک پُر جوش نوجوان نے پلیگ کمیٹی کے صدر مسٹر رینڈ کو قتل کر ڈالا۔ حکومت نے انتقامی جذبے کے تحت بہت سے معصوم اور بے گناہوں کو گرفتار کر لیا۔ چونکہ آزاد خیالی کی بنا پر حکومت تلک مہاراج کو ہمیشہ اشتباہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی اسی لئے انھیں بھی اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ ان کے اخبار کے ذریعے سے حکومت کے خلاف جذبۂ بغاوت کو فروغ دیا گیا۔ چنانچہ تلک مہاراج کو ڈیڑھ سال کی سزا دی گئی۔ اس وقت عدالتوں میں انتظامی افسروں کا اس قدر اثر تھا کہ انصاف کا بسا اوقات خون ہو جایا کرتا تھا۔ اپیل کی گئی مگر اعلیٰ عدالتوں نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو بحال رکھا۔

جس طرح ایران کے قومی شاعر کو قید سے رہا کرانے کے لئے پروفیسر براؤن مصنف "ادبیاتِ ایران" نے کوشش کی اور کامیاب ہوئے، اسی طرح تلک مہاراج کو رہا کرانے کے لئے بااثر ہندوستانیوں اور ادب نواز یورپین حضرات نے کوشش کی۔ پروفیسر میکس میولر جیسے افراد نے اثر ڈالا اور میعاد سے چند ماہ قبل ہی انھیں رہا کر دیا گیا۔ غیر ممالک میں تلک مہاراج کی شہرت کا بہت کچھ سبب ان کا ایک بلند پایہ مضمون تھا جو انھوں نے علم نجوم کی بنا پر ویدوں کی قدامت ثابت کرنے کے لئے لکھا تھا۔

تقسیم بنگال کے موقعے پر آپ نے حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔ عوام میں ان کا اقتدار بڑھتا ہوا دیکھ کر حکومت نے محسوس کیا کہ تلک مہاراج کا عوام سے رابطہ خطرناک ہے اور انھیں آزاد نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں ان پر غداری کا الزام لگایا گیا اور ان کو ۶ سال کے لئے مانڈلے جیل میں بھیج دیا گیا۔ اسیری کے زمانے میں آپ نے وہ عظیم الشان کتاب لکھی جس کو "گیتا رہسیہ" کہتے ہیں۔ یہ فلسفۂ عمل پر بہترین کتاب ہے۔ اصل کتاب بھگوت گیتا ہے۔ مگر اس پر جو فاضلانہ تنقید کی گئی ہے۔ وہ بجائے خود ایک تفسیر بن گئی ہے۔ اسی قید کے دوران میں ان کی شریکِ زندگی نے رحلت کی۔ اسی زمانے میں سر والنٹائن شرول نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "انڈین ان رسٹ" تھا۔ اس کتاب میں ہندوستان اور یہاں کی سیاسی تحریکوں کو جی کھول کر بُرا بھلا کہا گیا تھا۔ تلک مہاراج کے لئے یہ قومی توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ انگلستان جا کر انھوں نے سر والنٹائن شرول پر مقدمہ دائر کیا۔ حکومت ہند نے مسٹر شرول کے حق میں پورا زور لگایا۔ آخر وہی ہوا جو ان حالات میں اکثر ہوتا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ تلک مہاراج کے خلاف ہوا لیکن انگلستان میں ان کو ہندوستان کی موافقت میں پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل گیا۔ لیبر پارٹی خاص طور پر اس سے متاثر ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی اس وقت شری تلک نے کہا کہ ہمیں حکومت کی اسی حد تک مدد کرنی چاہیئے جہاں تک حکومت ہمارے ساتھ ہمدردی کرے۔ اس وقت ان کا یہ اعلان "سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے" آج ایک زرّیں حقیقت بن گیا ہے۔

۱۹۱۶ء میں آپ کی ساٹھویں سال گرہ کے موقع پر آپ کو ایک لاکھ روپیہ نذر کیا گیا۔ آپ نے یہ تمام رقم ہوم رول لیگ کو دے دی۔ ۱۹۱۸ء میں آپ کانگریس کے صدر چنے گئے لیکن انگلستان چلے جانے کی وجہ سے صدارت نہ کر سکے۔

۱۹۲۰ء میں مانٹیگو اصلاحات کی عملی مخالفت کرنے کے لئے آپ نے ڈیموکریٹک سوراجیہ پارٹی بنائی لیکن آپ کی عمر نے وفا نہ کی۔ اسی سال ۳۱ جولائی کی رات کو فلکِ سیاست کا یہ درخشندہ ستارہ غروب ہوا۔ شاعرِ قوم حضرت چکبست لکھنوی نے آپ کی وفات کے موقع پر وہ مرثیہ کہا تھا جس کا مشہور مصرعہ ہے

قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

آپ کی زندگی کا ایک واقعہ جس سے آپ کے عالم باعمل ہونے پر روشنی پڑتی ہے، یوں منقول ہے: مشہور قومی کارکن پنڈت سندرلال جی تلک مہاراج سے کچھ ہدایات لینے کے لئے پہلی بار گئے تو انھوں نے دیکھا کہ آپ صبح سے شام تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن کو حیرت ہوئی کہ وہ سندھیا پوجا کچھ نہیں کرتے۔ پنڈت سندرلال جی نے ان سے دریافت کیا تو جواب ملا کہ صبح سے شام تک میری مصروفیت عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔

غرض تلک مہاراج نے اعلیٰ دماغ، دردمند دل، قوی حافظہ اور زبردست قوتِ عمل پائی تھی، ان کی کشادہ پیشانی، دل کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی نظر، جاذبِ توجہ تھی۔ ان کی ساری زندگی قوم و ملک کی خدمت میں گزری۔ انھوں نے اپنے قول و فعل سے لوگوں میں آزادی کی رُوح پھونک دی جس کی وجہ سے آج بھی ہر دل میں اُن کی یاد تازہ ہے ؎

تُو نہیں آج مگر فیض ترا جاری ہے

"گرام راج" کا راستہ

"دیہی صنعت کی بربادی گاؤں والوں کی موجودہ خستہ حالی کی ذمہ دار ہے۔ آج گاؤں والوں کو خوراک کے علاوہ اپنی تمام ضروریات شہر سے خرید کر لانا پڑتی ہیں۔ گاؤں والے تمام خام اشیا مثلاً روئی، تلہن اور گنّا پیدا کرتے ہیں، مگر انھیں تیار شدہ سامان حاصل کرنے کے لئے یہ چیزیں شہر والوں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گاؤں والے قطعی طور پر شہروں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

گاؤں والے اپنی قیمتی چیزیں دودھ اور مکھن اسی لئے فروخت کرتے ہیں کہ انھیں کپڑا وغیرہ خریدنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ پیسہ ایک ایسی بلا ہے جس کی قیمت برابر بدلتی رہتی ہے۔ روپے پیسے کے چلن نے سماج میں جھوٹی قدریں پیدا کر دی ہیں۔ اگرچہ گاؤں والا حقیقتاً امیر ہے کیونکہ وہ اناج، ترکاریاں اور دودھ وغیرہ پیدا کرتا ہے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس شہر والے کے پاس کاغذی نوٹ اور چند سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں، مگر وہ خود کو امیر سمجھتا ہے۔

گاؤں والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ سچ مچ امیر ہیں اور انھیں اپنا دودھ اور مکھن بازار میں لے جا کر شہر والوں کے مقرر کردہ داموں پر نہیں فروخت کرنا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہر والے یہ چیزیں خریدنے کے لئے گاؤں میں آئیں گے اور تب گاؤں والے اپنی مرضی کے مطابق سودا کر سکیں گے۔"

(آچاریہ ونوبا بھاوے)

رتن پنڈوروی

ادبیاتِ سنسکرت

سنسکرت جسے دیوبانی یا دیوتاؤں کی زبان کہا جاتا ہے "سنس" اور "کرت" سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی مکمّل، مزّین، آراستہ، پیراستہ، پختہ، پاک، مقدّس اور عمدہ کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر ہندوستانِ قدیم کی وہ پاک زبان ہے جس میں فصاحتِ اکمل و بلاغتِ ارفع کے نازک ترین معانی پوشیدہ ہیں۔

تاریخِ تمدّن کا دَورِ جدید اور انکشافِ سنسکرت

انکشافِ سنسکرت کے انقلاب خیز نتائج و عواقب پر غور کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اسلافِ ہند کے جملہ علوم و فنون کا گنجینہ اور ہنود کی کتبِ مقدّسہ کا مصدر یہی زبان ہے۔ اربابِ تحقیق کے ہزاروں سال کے تصوّرات اسی کی بدولت تہ و بالا ہو گئے ہیں اور اسی کے فیض سے علومِ جدیدہ معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ امریکن سوسائٹی کے پریذیڈنٹ پروفیسر ایم بلوم فیلڈ انکشافِ علومِ سنسکرت سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:۔

"جب سے یونانی اور لاطینی کے مطالعے کا رواج ہے۔ تاریخِ تمدّن میں ایسا کوئی انقلاب آفریں واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا جیسا اٹھارھویں صدی کے آخری حصّے میں سنسکرت کا انکشاف ہے۔"

لسانیات و تاریخیات کی تحقیقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر علومِ سنسکرت کا معرکتہ آلارا اثر نہ پڑا ہو۔ اس کے مطالعے سے ہند کے ابتدائی زمانے پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ السنۂ اضافی کا علم اسی کی برکت سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ لسانیات اور اضافیات مذاہب، نسبتی قوانین، مختلف شعبہ ہائے تاریخ و فلسفہ یا تو اس کے سبب ہدایت وجود پذیر ہوئے یا اس کی تحقیقات کے نتائج سے ان کی قلب ماہیت ہوئی۔

انگلستان کے ایک سربرآوردہ ماہرِ علومِ سنسکرت پروفیسر ای جے ریپسن اسی ضمن میں فرماتے ہیں:

"انیسویں صدی کے اربابِ تحقیق و تفحّص نے زبانِ سنسکرت کو یونانی، لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں کا منبع قرار دیا ہے۔ اس کی بدولت ہند اور یورپی قوموں (جو چینی ترکستان سے آئرلینڈ تک آباد ہیں) کے نہایت پرانے زمانے پر بہت گہری روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ زبان کی مشابہت سے اُن کے تمدّن، معاشرت اور مذہبی عقائد کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ سنسکرت کے مطالعے سے انسان کی زبان کا تصوّر کلیتہً بدل گیا ہے۔ اسی کے فیض سے اربابِ علم پر انتہائی قدیم زمانے کے حالات منکشف ہوئے ہیں۔ اس کا اثر اہلِ مغرب کی حیاتِ عقلی و مشاغلِ ذہنی پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ چنانچہ دَورِ حاضرہ کے بلند پایہ ماہرِ سنسکرت پروفیسر اے اے میکڈانل اس امر کی تصدیق یوں فرماتے ہیں:

"احیاءُ العلوم کے بعد تاریخِ تمدّن میں عالمگیر اہمیت کا ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جیسا علومِ سنسکرت کا انکشاف ہے۔ السنہ، مذاہب، مشاغلِ عقلیہ کے کوائف اور پچاز فکر کے کارنامے اسی پُرانی زبان میں بھرے پڑے ہیں۔ ہندوؤں کا سارا تمدّن کلیتاً اسی میں بند ہے۔"

گو اس انقلاب کا اثر علم کے تمام شعبوں میں رونما ہے مگر سب سے بڑا اثر مذہب اور فلسفے پر پڑا ہے۔ ڈاکٹر ونٹرنیٹس پراگ (ریسیما) یونیورسٹی کے بلند پایہ ماہر ادبیاتِ سنسکرت اس انقلاب کی نسبت جو علمِ سنسکرت کے رواج سے

دُنیا کے علوم میں واقع ہوا ہے۔ یوں لکھتے ہیں:-

"ملکِ ہند کے قدیم ادبیات کی چھان بین سے پُرانی اور نئی زبانوں کی باہمی مناسبت واضح ہو کر تاریخِ تمدّن میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کی بدولت زمانہ قبل التاریخ کی قوموں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔"

یہ معتبر اقتباسات ظاہر کرتے ہیں کہ علم سنسکرت کے مغرب میں رواج پذیر ہونے سے اربابِ تحقیق کے عملی تصورات میں عظیم ترین تغیّرات واقع ہوئے ہیں۔

سنسکرت کا چرچا اور مغرب

سکندر کے حملے کے بعد یونانیوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون سے کچھ واقفیت پیدا کی تھی جیسا کہ اسلافِ یونان کی تصنیفات سے عیاں ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عربوں کی مساعیِ حسنہ کی بدولت اہلِ یورپ کو بھی ہندو علوم سے متعلق قدرے واقفیت ہو چکی تھی۔ سولھویں صدی کے بعد جو پادری ہندستان میں تبلیغ کرنے کے لیے آئے تھے انھوں نے سنسکرت زبان کی تحصیلِ علم شروع کی اور اس میں معقول دستگاہ پیدا کر کے پہلے بھرتری ہری کے اقوال کا ترجمہ کیا پھر سنسکرت کی گرامر مرتب کی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ہندو دھرم کی مقدس کتابوں سے واقفیت حاصل کر لی۔

گو انگریز سترھویں صدی کے شروع سے ہندوستان میں تجارت کر رہے تھے مگر سنسکرت کی ترقی کا خیال وارن ہسٹنگز سے پہلے کسی کو نہ آیا۔ وہ فارسی اور بنگالی زبانوں پر عبور رکھتا تھا علوم و فنون اور ادبیات میں اس کا شوق بدرجہ اتم تھا۔ سنسکرت زبان کے مطالعے اور تحقیق کے لئے اس نے انگریزوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کلکتے میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ علماء کی ایک مجلس رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نام سے قائم کی جس میں ادبیاتِ مختلفہ کی تحقیق و تدقیق کا کام شروع ہوا۔ اہلِ ہند پر ان کے رسم و رواج اور دھرم شاستر کے اصول پر حکومت کرنے کے مقصد سے دھرم شاستر کے مطابق ایک ضابطہ مرتب کرایا جس کا ترجمہ پہلے فارسی میں پھر فارسی سے انگریزی میں ہوا۔ مگر بلادِ مغرب میں علومِ سنسکرت سے دلچسپی پیدا کرنے کی لاثانی شہرت کے مالک سر ولیم جونز تھے جنھوں نے سنسکرت میں مہارتِ تامہ پیدا کر کے ۱۷۸۹ء میں شکنتلا کا کامیاب ترجمہ شائع کیا۔ یہی کتاب بعد میں جرمن زبان میں طبع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جرمن علماء بھی سنسکرت کی طرف مائل ہو گئے۔

ولیم جونز وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں کی باہم موافقتِ بے حد کا دعویٰ کیا۔ مسٹر میکس مولر نے مزید جستجو کر کے اسی قول کا اعادہ کیا۔ کول بروک کی تحقیقات سے سنسکرت کے علوم اہلِ مغرب پر روشن ہوئے۔ اس نے سنسکرت کی متعدد مشہور کتابیں اپنی زیرِ نگرانی طبع کرائیں۔ ان میں سنسکرت کا لغت "امرکوش" پانِنی کی گرامر اور ہِتوپدیش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جرمن زبان میں شیلے وغیرہ کی کوشش سے رامائن، منوسمرتی، بھاگوت پران، گیتا اور شکنتلا کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد نل دمن کے ترجمے نے تو جرمنوں کو سنسکرت کا شیدا بنا دیا۔ جرمن شعراء مثلاً روکراٹ وغیرہ نے سنسکرت کے بہترین منظومات اپنی زبان میں منتقل کر کے تمام روشن خیال جرمنوں میں ہندو قوم اور اس کے عدیم النظیر علوم و فنون کے لئے جذبۂ احترام پیدا کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں ایک فرانسیسی ادیب نے دارا شکوہ کے فارسی اپنشدوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں شائع کیا۔ جس سے فرانس اور جرمنی کے اربابِ ذوق میں ہندو فلسفہ کے مطالعے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اس سے چند سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بھی انگریزی زبان میں چند اپنشدوں کا ترجمہ شائع کرایا تھا۔ سنسکرت کے فرانسیسی فاضل برنوف کے زمانے میں یورپ میں ویدوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ میکس مولر اور راٹ ایسے ادیب اسی کے تلامذہ میں تھے۔ اُن کا یہ کارنامہ لائقِ صد ہزار تحسین و آفرین ہے کہ انھوں نے چوتھائی صدی کی سعیِ بلیغ کے بعد ویدوں کا ترجمہ انگریزی میں شائع کیا۔

اسی زمانے میں دو جرمن محقّقوں نے سنسکرت کا ایک مستند لغت سات جلدوں میں مرتب کیا۔ ایک جرمن عالم نے ۱۸۵۲ء میں ادبیاتِ سنسکرت کی ایک جامع و مبسوط تاریخ شائع کی۔ یہاں سے سنسکرت کی داستان کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں چالیس سال کی وسیع و معنی خیز تحقیق کے جامع نتائج شامل ہیں۔

۱۸۹۱ء میں ایک ممتاز جرمن محقق نے سنسکرت کتب کی جامع فہرست مرتب کرنی شروع کی جس میں ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں کے تمام قلمی سنسکرت نسخے بالترتیب درج تھے۔ پورے بارہ سال کے بعد ۱۹۰۳ء میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۱۸۹۷ء میں جرمن محقق بیولر کے زیر اہتمام قاموسِ سنسکرت مرتب ہونی شروع ہوئی۔ ۱۹۲۵ء تک اس کے بائیس حصے شائع ہو چکے تھے۔ اس میں مشرق و مغرب کے تیس استادانِ سنسکرت بیولر کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ یہ جامع اور اکمل کتاب ڈیڑھ سو سال کی تحقیق کا نچوڑ ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ چالیس حصوں میں یہ کتاب مکمل ہو گی۔ یورپ اور امریکہ میں علم سنسکرت کی فروعاتِ مختلفہ کے صدہا عالم موجود ہیں۔ اس جامع و دیدہ ریز تحقیق سے ہندو تہذیب و تمدن کی تین ہزار سال کی صحیح اور معتبر تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔

تاریخِ ہند کی تدوین

اس ضمن میں ہندی تہذیب کی قدامت کا ذکر بھی فائدے سے خالی نہیں۔ موہنجو دارو (ضلع لڑکانہ صوبہ سندھ) اور ہڑپہ (ضلع منٹگمری مغربی پنجاب) کی کھدائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندی تہذیب مصر اور میسوپوٹیمیا کی قدیم ترین تہذیب سے بھی قدیم ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ میسوپوٹیمیا کی سمیرین، اسیرین، بیبلونی اَن، خالدی وغیرہ کے علاوہ مصر، ایران، یونان اور روم کی تہذیبیں حوادثِ زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں لیکن ہندی تہذیب ہزاروں سال سے گردشِ ایام کے بحرِ بیکراں میں تلاطم خیز امواج کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی ہوئی ہنوز زندہ ہی نہیں بلکہ جہاں استاد ہونے کا فخر رکھتی ہے۔ اس نے ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک کی جنگلی اقوام کو مہذب بنایا۔ سر آرل سٹائن نے تبت اور وسط ایشیا کے علاقے میں ایسے کھنڈرات دریافت کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اپنے ملک سے باہر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف سائبیریا سنکیانگ و تبت تک اور دوسری طرف ایران اور افغانستان سے مجمع الجزائر شرق الہند کا وسیع خطہ اسی کے زیر اثر تھا۔

ٹیکسلا اور پاٹلی پتر کی کھدائی، میگستھنیز، فاہیان ہیون سانگ کے سفرناموں، ایڈیکا، راج ترنگنی، ہرش چرتر، پرتھوی راج راسا، چانکیہ نیتی، مدرا راکشس ایسی مستند کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندی تہذیب ایک عالمگیر تہذیب تھی اور سنسکرت زبان دنیا کے ہر حصے پر چھائی ہوئی تھی چنانچہ عہدِ محمود کے مشہور ہیئت دان البیرونی نے اپنی کتاب تحقیقِ ہند (جو ہندوؤں کے مذہب اور تمدن پر حقیقی روشنی ڈالتی ہے) میں صاف لکھا ہے کہ ہندی تہذیب مرجعِ خلائق تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قدیم ہند میں تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا اور ہماری تاریخ کے ماخذ تسلی بخش نہیں ہیں وہ بابو رمیش چندر دت بنگالی عالم کی رائے پر غور کریں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قدیم ہند تاریخ کے ماخذوں سے بہت تاریخی مسالہ دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ کے لئے دستیاب نہیں ہوتا۔"

اس سے آگے بڑھ کر مغرب میں سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو جانے سے ملک ہند کی پرانی تاریخ میں ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ آج سے سو سال پہلے معتبر تاریخ ہند کا آغاز سکندر کے حملے سے ہوتا تھا مگر سنسکرت اور پالی گرنتھوں کی چھان بین کی بنا پر اربابِ تحقیق نے معتبر زمانۂ تاریخ عیسوی سے ایک ہزار قبل قرار دیا ہے۔

کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں مستشرقین نے ہندوستان کے ملکی اور تمدنی حالات پر محققانہ مضامین لکھے ہیں جن کی معلومات ویدک لٹریچر، برہمن گرنتھوں، اپنشدوں، وید سوتروں اور بدھ مت کی پالی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ مغربی ماہرین سے قطع نظر ہندو محققین نے بھی ہندوستان کے زمانۂ قدیم کے اصولِ حکمت، لوکل سیلف گورنمنٹ، کشتری قبائل، زمانۂ سلف کے اقتصادی حالات، آئینِ حکومت، ہندو نظام اور معاصلات پر عالمانہ بحث کی ہے۔

لوازمِ تمدن سے ادبیاتِ سنسکرت کا تعلق

لفظِ تمدن کا اطلاق علوم و فنون، طرزِ حکومت، نظامِ معاشرت اور باہمی مشارکتِ عمل پر ہوتا ہے۔ تہذیب اور تعلیم بھی اسی ضمن میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے وہ لوازم مراد ہیں جن کی وجہ سے انسان وحوش سے ممتاز و ارفع شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ علم تمدن کے نامور محقق پروفیسر ایس میکنزی صاحب لکھتے ہیں:

"تعلیم کے جامع ترین معنی فطرتِ انسان کی تکمیل ہیں۔ ادبیات میں سائنس اور آرٹ کی انتہائی اغراض ہی شامل ہیں۔ شاعری مذہب اور سائنس کا سرتاج فلسفہ ہے جو دنیا پر عمیق نگاہ ڈالتا ہے۔"

ایک اور محقق کا قول ہے:

"تمدن فطرتِ انسان کی تکمیل کا ثمر ہے، عقل ارادت سے، ارادت تصور سے اور تصور خواہشات و جذبات سے مربوط ہے۔ تمدن میں نہ صرف مذہب اور فنونِ حکمرانی شامل ہیں بلکہ سائنس بھی اس کا جزو لاینفک ہے۔ اور یہی نہیں ان تینوں کا جوا ثر

معاشرت پر پڑتا ہے وہ بھی اسی ذیل میں شمار ہوتا ہے۔"

آرائے محققین کے مطابق ادبیاتِ سنسکرت پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے تمدن کی اغراض خاطر خواہ طریق پر انجام پذیر ہو سکتی ہیں۔ پروفیسر میچا ملٹکی رائے میں سنسکرت زبان کی شستگی و لطافت میں لوگوں کی ترقی کا معیار پوشیدہ ہے۔ اسکی اسلافِ ہند کی تہذیب و ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔ سنسکرت ایک ایسا آسمان ہے جس پر معاشیات، سیاسیات، ادبیات، دینیات، سخن وری، علومِ طبعی، فنونِ لطیفہ، حکمت اور فلسفے کے ستارے لازوال آب و تاب کے ساتھ درخشاں نظر آتے ہیں۔ المختصر یہ کہنا بے جا نہیں کہ سنسکرت کا علمی سرمایہ لامتناہی ہے۔

سنسکرت کی خصوصیات

سنسکرت دُنیا بھر کی زبانوں سے قدیم ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت لطافت و شیرینی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ تخیل اور معاشرت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سے چھوٹا ہو۔ یونانی و لاطینی۔ جو اس کی بیٹیاں ہیں مدت ہوئی اس دُنیا سے محو ہو چکی ہیں مگر سنسکرت ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی۔ اس کے جاننے اور بولنے والے ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور دیگر حصوں میں بھی ہیں۔ ذیل میں مغربی محققین کی آراء نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سرمایۂ الفاظ دنیا کی تمام زندہ و مُردہ زبانوں کے سرمایے سے افضل و برتر ہے۔

۱۔ سر ولیم جونسٹر جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے زبان دان تھے لکھتے ہیں :۔

" اگر سنسکرت کی قدامت سے چشم پوشی کر کے فقط اس کی ترکیب و بندش پر غور کیا جائے جب بھی یہ زبان سب سے عجیب نظر آتی ہے۔ یونانی سے بلحاظ رفعت و جلالت اور لاطینی سے باعتبار کثرتِ الفاظ یہ بدرجہا بہتر و افضل ہے۔ لطافت اور شیرینی میں بھی ان دونوں سے فائق ہے۔"

۲۔ مسٹر میکس مولر رقم طراز ہیں :۔

" سنسکرت زبانوں کی زبان ہے۔ اسے لسانیات سے وہی نسبت ہے جو ریاضیات کو فلکیات سے ہے۔"

۳۔ جرمن محقق ہیرایچ کی رائے ہے :۔

" لہجے کی شستگی اور الفاظ کے سرمایے کے لحاظ سے سنسکرت دُنیا کی تمام زبانوں سے افضل ہے۔ اس کے فلسفیانہ خیالات کی رفعت و عمق اور شعراء کے تخیلات و تخلیقات کی نزاکت کسی صورت میں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس کے بانیوں نے جو فلسفیانہ اصطلاحات اختراع کی ہیں ان کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ مسائل کی تشریح آسان ہو گئی ہے۔"

۴۔ جرمنی کا نامور عالم شلے گل جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ علم سنسکرت کی تحقیقات کی نذر کر دیا ہے۔ یوں لکھتا ہے۔

" اس کا نام سنسکرت یعنی کامل اور تراشیدہ نہایت موزوں ہے۔ اس کی ترکیب اور گرامر یونانی سے بہت مشابہ ہے مگر اس سے بدرجہا منظم ہے۔ علاوہ ازیں جو خواص اور زبانوں میں فرداً فرداً پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اس میں بہ یک وقت نظر آتے ہیں۔ مثلاً یونانی کی جامعیت، لاطینی کی قوّتِ بیانیہ اور عبرانی کا عرفان سنسکرت میں ایک ہی جگہ ملتا ہے۔ اگر محض علم السنہ کے اصول کے مطابق دیکھا جائے تو سنسکرت گرامر کی ترکیب سب سے افضل اور منزہ ہے۔ اس کا ہر اندازِ تلفظ، تراوشِ ترکیب دیگر جملہ زبانوں سے فصیح ہے۔"

۵۔ ڈی، اے، ٹال بائنز لکھتا ہے :

" یہ وہ زبان ہے جس کی ابتدا تاریخِ دنیا کے سب سے پرانے کواُنف سے بھی بہت مدت پہلے ہوئی تھی۔ اس میں الہیات، شاعری، سائنس اور فلسفے پر قابلِ قدر کتابیں پائی جاتی ہیں جو کروڑوں سال سے کروڑوں آدمیوں پر اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔"

۶۔ سنسکرت کے مشہور محقق ڈاکٹر ونیٹس رقم طراز ہیں :۔

" زمانۂ قدیم سے سنسکرت لٹریچر کا جو اثر دیگر اقوام کی مذہبی زندگی پر پڑا ہے وہ حدودِ ہند سے آگے تبت، چین، جاپان، کوریا، لنکا، جزیرہ نما ملایا اور جزائر شرق الہند تک رُونما ہُوا ہے اور مغرب میں وسط ایشیا، چینی ترکستان تک پہنچا ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے ہندی کتبے اور سنسکرت نسخے برآمد ہوئے ہیں جن سے ہندو خیالات کا اثر ظاہر ہے۔"

ادبیاتِ سنسکرت کی ہمہ گیری۔ دورِ حاضرہ کی تحقیق و تلاش سے ثابت

ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کا اثر صرف ہندوستان ہی میں محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک اس سے مستفید ہوئے۔ ہندوستانی تہذیب لنکا، نیپال برما، چین، جاپان، کوریا، تبت، ختن تک پھیلی ہوئی تھی۔ کنشک نے چینی ترکستان بھی اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ حال ہی میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کو وہاں کی کھدائی سے ہندو تہذیب کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ہے۔ سنسکرت، پراکرت اور کھروشٹی زبانوں میں کئی مسودے بھوج پتر، ریشمی کپڑوں اور لکڑی کی تختیوں پر لکھے ہوئے ملے ہیں نیز بدھ کے بت، پتھر کے کتبے اور سکے بھی ملے ہیں جن پر سنسکرت عبارت کھدی ہوئی ہے۔ لنکا تو رام چندر جی کے وقت ہی سے ہندو شائستگی کا دل دادہ تھا پھر اشوک نے وہاں بدھ مت پھیلایا جو آج تک جاری ہے۔ برہما کا لفظ ہی ہندوستان سے اپنا تعلق ظاہر کر رہا ہے۔ سیام سنسکرت کے لفظ شیام سے بگڑ کر بنا ہے۔ یہ ملک سولھویں صدی تک ہندوؤں کے زیر اثر رہا۔ جاوا کو سنسکرت میں یودویپ اور سماٹرا کو سورن دویپ کہتے ہیں۔ پانچویں صدی میں جب فاہیان جزیرہ جاوا میں گیا تو اس وقت وہاں ہندو مت زوروں پر تھا۔ جزیرہ بالی میں اب بھی ہندو مت جاری ہے۔ لوگ رامائن اور مہابھارت کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ ان کتب کی زبان سنسکرت ہے لیکن حروف ان کے اپنے ہیں۔ کمبوڈیا میں پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک ہندی تہذیب اور سنسکرت زبان کا دور دورہ رہا۔ کمبوڈیا کے شمال میں چمپا کی ریاست پندرھویں صدی تک ہندوؤں کے زیر اثر رہی۔ سر آرل سٹائن نے ختن اور صحرائے گوبی میں دریافت کا کام کیا تھا۔ وہاں سے ہندوستانی سکے، دستاویزات گنیش کی مورتیاں، بدھ کے قد آدم بت۔ رام چندر جی کے بیٹے لو اور کش کے نام کے سکے اور برتن برآمد ہوئے تھے جو ظاہر کرتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں سنسکرت کہاں کہاں پھیلی ہوئی تھی۔ گپت خاندان کے عہدِ حکومت میں ٹیکسلا، سارناتھ، اجنتا اور نالندہ میں عظیم الشان یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ یہاں ہر علم اور ہر فن کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ مذہبی علوم، فلسفہ، قانون، سائنس، طب، فنونِ لطیفہ وغیرہ سب کی تعلیم سنسکرت زبان میں دی جاتی تھی۔ کتابوں کا خرچ حکومت دیتی تھی۔ پال سلطنت کے زمانے میں وکرم شلا کی یونیورسٹی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ پرانے اتہاس اور پرانوں کے مطالعے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ جنگِ مہابھارت ختم ہونے پر پانڈوؤں نے اشومیدھ یگیہ کیا اور وہ ربع مسکون کے ہر گوشے میں گھومے یہاں تک کہ آبنائے بیرنگ کی راہ جو ان دنوں خاک نائے تھی، امریکا پہنچے اور وہاں ہندو تہذیب اور سنسکرت پھیلائی۔ چنانچہ محکمہ آثارِ قدیمہ کی معرفت امریکا سے پانڈوؤں کے کئی جنگی ہتھیار برآمد ہو چکے ہیں۔ جنگ مہابھارت میں شامل ہونے والا مہا مدر راجہ ببرواہن امریکا ہی سے آیا تھا۔ مہابھارت اور کالک پران کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بھگوان کرشن نے ایران پر بھی حملہ کیا تھا اور اسے اپنی عمل داری میں شامل کیا تھا۔ اور افغانستان میں ہندوؤں کی حکومت تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ مہرشی بیاس خود وہاں گھومتے رہے ہیں۔ اس کے بعد کالی داس، بھوبھوتی، شنکر آچاریہ، کمارل بھٹ، چانکیہ، بان بھٹ، چندکوی، چرک، اشوگھوش، دسومتر، ناگارجن، امر سنگھ مصنف امرکوش، راجہ ہرش، راجہ بھوج، راجہ بکرم دتیہ، رامانج، شری ہر، دھنونتری، وراہ مہر، آریہ بھٹ، برہم گپت جیسے شہرۂ آفاق علماء کے احسان سے سنسکرت زبان تا ابد سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ عہدِ ماضی کو چھوڑ کر زمانۂ حال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں صدہا پروفیسر اس کی تعلیم و تربیت اور تحقیقات میں مصروف ہیں۔ ایشیا میں ہندوستان سے قطع نظر چین، جاپان اور سیام وغیرہ کی تعلیم گاہوں میں بھی اس کا چرچا ہے۔ قلمی نسخوں کی نقل کا کام بیسیوں مغربی کتب خانوں میں ہو رہا ہے۔ اس کی تحقیقات کے نتائج کی اشاعت کے لئے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں کئی رسالے شائع ہوئے ہیں۔ اس کی قدیم کتابیں کئی مقامات پر ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ پرانے نسخوں کی تلاش میں بیش از بیش سرگرمی کا اظہار ہو رہا ہے۔ مہذب دنیا کے جتنے ارباب علم ادبیات سنسکرت کے تجسس اور تحصیل میں مصروف نظر آتے ہیں اتنے نہ تو یونانی اور لاطینی کی تحقیق میں مشغول ہیں اور نہ کسی بیرونی زبان کی ادبیات کی چھان بین میں اتنی دل چسپی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان خیالات کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ سنسکرت مردہ زبان ہے۔ ذیل کے اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ بلادِ مغربیہ کے علماء سنسکرت کو متروک نہیں سمجھتے۔ پروفیسر اے اے میکڈانل رقم طراز ہیں:۔

"سنسکرت آج کل ہزاروں برہمنوں کی زبان ہے۔ وہ اس سے اظہارِ خیال کا کام لیتے ہیں۔ علمی مقاصد میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ کتابیں اور رسالے اب بھی اس میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہزارہا کتب خانوں میں قدیم قلمی نسخوں کی نقل ہو رہی ہے۔ پرانے زمانے کے دستور کے مطابق وید اب بھی ازبر کئے جاتے ہیں۔ مہابھارت، بھگوت گیتا، بھاگوت پران بر سرِ عام بآوازِ بلند پڑھے جاتے ہیں جو اس امر پر دال ہیں کہ سننے والے

اسے عموماً بہت مشہور سمجھتے ہیں۔ جب میں نے شانتی نکیتن میں "مدرارا کشس" اور "رام چرت" کے سنسکرت ڈرامے دیکھے جو طلبا نے مردوں اور عورتوں کے مجمع کے سامنے کئے تھے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ سامعین سنسکرت بات چیت سے لطف اندوز ہوتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اب بھی سنسکرت میں شعر کہے جاتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ہندو علماء ادق مسائل پر اسی زبان میں بحث کرتے ہیں۔"

پروفیسر ونٹرنیٹس کی رائے ہے:۔

"ادبیات سنسکرت میں وہ تمام علوم و فنون شامل ہیں جو بلحاظ ادب وسیع ترین معنوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ دینی اور دنیوی علوم، رزمیہ کتابیں، ڈرامے، اخلاقی نظمیں، گیت، افسانے اور سائنس کی تصنیفات بھی موجود ہیں۔ برہمنوں اور بدھ مت کے مقلدوں کی دینی کتابوں میں ہر مسئلہ اور موضوع پر بحثیں پائی جاتی ہیں جیسے مناجات، یگیہ کے بھجن، منتر، دیوتاؤں کے قصے، واعظ، الٰہیات و دینیات کی کتابیں، فنِ مناظرہ کی تصنیفات ایسی بیش بہا چیزیں ہیں جن سے محققینِ مذاہب کسی صورت میں چشم پوشی نہیں کر سکتے۔"

مدت ہوئی۔ ڈبلیو سی ٹیلر نے کلکتہ میں سنسکرت لٹریچر پر ایک عالمانہ لیکچر دیا تھا جس کے دوران میں انھوں نے کہا تھا کہ:۔

"یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ باوجود صدہا سال کے تغیرات کے ہندوستان میں ایک ایسی زبان ابھی تک موجود ہے جو لطافت و جامعیت میں بے نظیر اور یورپ کی السنۂ قدیم کی ماخذ ہے۔"

تخیلاتِ عقلی میں سنسکرت نظم سب سے فائق ہے۔ اس کے علوم، سائنس کی قدامت کا یقین ملکی حساب سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصنام کی وسعت کا تصور انسانی ادراک سے بعید ہے۔ فیثا غورث کے مسائل اور افلاطون کی خیالی الہٰیات اسی کے فلسفے کا نتیجہ ہیں۔ اس کا دھرم شاستر ایسا گوناگوں ہے کہ رہتی دنیا تک اس کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ میکس مولر لکھتا ہے

"ہندو دنیا کی ادبیات اور الٰہیات کے موجد ہیں۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر ادبیاتِ ہند کی تحقیقات سے معتد بہ روشنی نہ پڑی ہو۔ یا اسے نئی تحریک نصیب نہ ہوئی ہو۔ ملک ہند سے جو روشنی حاصل ہوئی ہے اس کی بدولت دینیات و اصنامیات کی کما حقہٗ وضاحت ہوتی ہے۔"

سر الگزنڈر کننگھم جو سنسکرت کے نامور عالم تھے رقم طراز ہیں:۔

"تاریخ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ واضح ہو کہ چند برگزیدہ فلاسفروں کے خیالات اور جمہور کی دینیات آپس میں شیر و شکر ہو جائیں۔ برہمن مت کے عقائد، خدا کی وحدانیت، آفرینش عالم اور بقائے روح کے دل چسپ کرشمے سنسکرت میں نظر آتے ہیں۔"

پادری وارڈ نے اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے:۔

"جن گوناگوں مباحث و مسائل پر ہندوؤں نے خامہ فرسائی کی ہے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شعبۂ علم ان کی جستجو اور غور و فکر سے نہیں چھوٹنے پایا۔ ان کی فلسفیانہ تصنیفات اور دھرم شاستر کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین عجیب و غریب حکمت اور ہمہ گیر صلاحیتِ عقلی سے آراستہ تھے۔"

ان ممتاز اور معتبر آراء سے صاف ظاہر ہے کہ ادبیات سنسکرت کی جامعیت بے نظیر ہے۔ انسان نے جن علوم کو ترقی دی ہے وہ سب کے سب سنسکرت میں بھرے پڑے ہیں جس سے ہندو لٹریچر کی ہمہ گیری اور بے پایاں تحمل کی داد دینی پڑتی ہے۔ نیز یہ کہنا پڑتا ہے کہ سنسکرت ہندوستان میں اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ چناں چہ بنارس اور گورکھ پور کو دورِ حاضرہ میں بھی سنسکرت جرائد و رسائل شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ مثلاً "منجو بھاشنی" ہفتہ وار "سوریہ اودے" پندرہ روزہ اور "سوپربھات" ماہوار — ان رسائل میں ادبیات کے مختلف پہلوؤں پر مختلف مضامین شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں الہ آباد، بنارس، گورکھ پور، بمبئی، کلکتہ، متھرا، آگرہ، مدراس، پونا، بڑودہ اور لکھنؤ وغیرہ شہروں میں سینکڑوں نئی نئی کتابیں آئے دن سنسکرت میں چھپتی ہیں۔

سنسکرت گرنتھوں کے قلمی نسخے

اس واقفیت کا بہم پہنچانا بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ مہذب دنیا میں سنسکرت زبان کی قلمی کتابیں کس قدر موجود ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا بھی

لانات سے ہے کہ ذیل میں صرف قلمی مسودات کا ذکر ہوگا۔ زیورِ طباعت سے آراستہ کتب اس مجموعے سے علیحدہ سمجھنی چاہئیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ وسط ایشیا کے وحشی اور لٹیرے حملہ آوروں نے (جن میں ہُن سب پر سبقت لے گئے تھے) ہندوستان کے سینکڑوں شاندار مندر، حویلیاں، تاریخی عمارتیں، کتب خانے نہایت بے دردی سے برباد کر ڈالے تھے۔ اس کے باوجود اب تک لاکھوں نسخے دستیاب ہو چکے ہیں اور ابھی بے شمار زیرِ حجاب ہیں (جو کسی ملک کے کتب خانوں کی فہرست میں شامل نہیں ہیں)۔ اغیار بھی یہاں سے بے شمار قیمتی اور کمیاب نسخے ہتیا لے گئے جو اب کسی صورت میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔

بایں ہمہ ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں جو قلمی کتابیں موجود ہیں اُن کی فہرستیں کئی اونٹوں کا بوجھ ہیں۔

۱۸۶۵ء میں میکس مولر نے قلمی نسخوں کا شمار دس ہزار بیان کیا تھا۔ اس کے بعد لاکھوں نسخے اور برآمد ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ سنسکرت میں ۱۹۳۸ء تک ۶۳۰۰ قلمی نسخے موجود تھے اور ڈی اے وی کالج لاہور کی سنسکرت لائبریری میں ۴۶۰۰، کوئنس کالج بنارس میں ۴۵۰۰، ایشیاٹک کلکتہ سوسائٹی کے کتب خانے میں ۲۵ ہزار قلمی کتابیں۔ سنسکرت ساہتیہ پریشد کلکتہ کے پاس ۵ ہزار، راج شاہی کی ورندری سرچ سوسائٹی کے قبضے میں ۵ ہزار۔ اڈیار لائبریری مدراس میں ۳۰ ہزار، تنجور کے شاہی کتب خانے میں ۱۲ ہزار، تری وندرم کے شاہی کتب خانے میں دس ہزار، میسور کے کتب خانے میں ۱۶ ہزار، بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونہ میں ۲۰ ہزار، آنند آشرم پونا میں ۸ ہزار، یونیورسٹی بمبئی کے شعبۂ سنسکرت میں ۳ ہزار، ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی برانچ کے پاس ۸ ہزار۔ بڑودہ کے کتب خانے میں ۱۶ ہزار، دربار لائبریری بیکانیر میں ۵ ہزار، دربار لائبریری الور میں چھ ہزار اور دربار لائبریری جموں میں ۱۲ ہزار۔ ان سب کی میزان تین لاکھ ترسٹھ ہزار ہے۔ مگر شاہی کتب خانہ نیپال اور کئی ریاستوں کے کتب خانوں میں ہزاروں قلمی کتابیں محفوظ ہیں وہ اس سے خارج ہیں۔ اسی طرح پنڈتوں اور بعض دیگر اصحاب کے پاس مختلف مقامات میں جو نسخے موجود ہیں وہ بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اب ممالک یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرست ملاحظہ ہو:

عجائب خانۂ برطانیہ کے شعبۂ سنسکرت میں ۴ ہزار، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۸ ہزار۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۰۵ء میں وزیرِ اعظم نیپال نے ۵ ہزار کے قریب قلمی نسخے آکسفورڈ یونیورسٹی کو بطور تحفہ دیئے تھے ان میں بیسیوں بالکل نایاب ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ۵ ہزار، پیرس کے کتب خانے میں دس ہزار نسخے ہیں۔ مگر یورپ میں سنسکرت کی قلمی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ برلن میں ہے۔ یہاں تیس ہزار نسخے موجود ہیں۔ میونخ اور ٹیوبنگن کی یونیورسٹیوں میں دو دو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ پایۂ تخت روس کے کتب خانے میں دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ آسٹریا کے صدر مقام ویانا میں چار ہزار۔ گویا یورپ میں ایک لاکھ کے قریب سنسکرت کی کتابیں موجود ہیں۔ ۱۹۳۸ء تک ساڑھے چار لاکھ قلمی کتابیں معلوم ہو چکی ہیں۔ ناظرین اندازہ لگائیں کہ آج تک ان اعداد و شمار میں کتنا معتدبہ اضافہ ہو چکا ہوگا۔

فنِ تحریر کا مسئلہ

ادبیاتِ سنسکرت کی قدامت سے وابستہ فنِ تحریر کا نازک سوال بھی ہے۔ وید، برہمن، اپنشد، فلسفہ، سائنس اور ادب کی کتابیں جس خط میں بند ہیں وہ برہمی یعنی دیوناگری کہلاتا ہے۔ جس میں ۳۴ حروف صحیح اور ۱۲ حروف علت ہیں۔ بلادِ مغرب کے اربابِ تحقیق مدت سے سنسکرت کا مقابلہ دوسری زبانوں سے کرتے چلے آئے ہیں اور اس موضوع پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر مغربی زبانوں میں صدہا کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۰۳۰ء میں چینی زبان میں "سنسکرت کی ابتدا" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف ہوئی تھی اور ۱۷۲۹ء میں شاہ چین نے بھی اس مسئلے پر ایک کتاب لکھی تھی۔ میکس مولر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سنہ ۳ قبل مسیح تک ہندو فنِ تحریر سے سراسر نابلد تھے۔ مگر کئی سال بعد پروفیسر ریس ڈیوس اور سہایم ہولزمن نے پالی زبان کے گرنتھوں سے یہ ثابت کر دیا کہ مہاتما بدھ سے پہلے فنِ تحریر رائج تھا۔ رائے بہادر پنڈت گوری شنکر اوجھا اجمیری نے تیس سال ہوئے ایک کتاب ہندی میں تصنیف کر کے میکس مولر کو دندان شکن جواب دیا تھا۔ پروفیسر ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر نے اپنی تحقیقات سے پنڈت گوری شنکر کے جواب میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ راقم نے آپ ہی کے ایک عالمانہ مضمون سے ضروری معلومات اخذ کی ہیں۔ پروفیسر مذکور کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف و نحو اور لغات بغیر تحریر کے ناممکن ہے اور ان دونوں فنون کی کتابیں ویدوں کے بعد معرضِ وجود میں آئی تھیں اور ان سے بھی پہلے چھندو ودیا یعنی علم عروض آشکارا ہوا تھا۔ کیونکہ وید منتروں کا صحتِ تلفظ، صحتِ لحن اور صحتِ ترنم سے پڑھنا پروہتوں کا سب سے مقدس اور مقدم فرض تھا۔ غلط قرأت سے

پرماتما کی ناراضی کا اندیشہ لاحق تھا۔ پروفیسر موصوف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تحریر میں حروف اور ہندسے لازمی چیزیں ہیں۔ بعض رچاؤں میں دس ہزار اور ایک لاکھ کا ذکر ملتا ہے۔ یجروید میں پچیس ہزار، ایک لاکھ، دس لاکھ، ایک کروڑ، دس کروڑ، ایک ارب اور ایک کھرب یا دس کھرب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ رگ وید میں ایسے منتر ملتے ہیں جن میں مختلف پہاڑے دہرائے گئے ہیں۔ اگر فنِ تحریر مروج نہ ہوتا تو ہندسے، پہاڑے اور رقمیں کس طرح وجود میں آ سکتی تھیں۔ اس لئے صاف عیاں ہے کہ ویدوں کے ظہور کے زمانے ہی میں فنِ تحریر رائج ہوگیا تھا۔

سر ولیم یونز نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ براہمی حروف جن میں اشوک کے کتبے کندہ ہیں سامی حروف سے ماخوذ ہیں۔ کئی محقق اسی خیال کے حامی ہیں۔ ایک جرمن ماہر ادب لازن نے پہلے پہل یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دیوناگری حروف غیر قوم سے مستعار نہیں لئے گئے۔ ای ٹامس نے بھی اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے۔

سر الگزنڈر کننگھم نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ دیوناگری اسی ملک کی پرانی زبان سے بگڑ کر تیار ہوئی ہے۔ اب تازہ ترین تحقیقات کی بنا پر پروفیسر بھنڈارکر بھی اسی خیال کی حمایت کرتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد سے پرانے زمانے کے برتن برآمد ہوئے تھے جن پر کچھ نشان نظر آتے تھے۔ صاف کئے گئے تو وہ حروف نکلے۔

اس قسم کے ۳۰ نشان مولوی یزدانی صاحب مہتمم محکمہ اثریات حیدرآباد نے نقل کئے ہیں۔ مدراس کے عجائب خانے میں بھی اس قسم کے باسن پائے گئے ہیں۔ ان میں سے پانچ حروف پروفیسر صاحب مذکور نے شناخت کرلئے ہیں جو دیوناگری سے ملتے ہیں۔ اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ قدیم ہندوؤں میں فنِ تحریر رائج نہ تھا۔

ہنومانا ٹک جو فی زمانہ متبرک سمجھ کر پڑھا جاتا ہے ہنومان جی نے پتھر کی سلوں پر لکھا تھا۔ اور بالمیک جی کے پاس ادب کے خیال سے وہ سلیں سمندر میں پھینک دی تھیں۔ بعد میں راجہ ہرش نے سمندر سے نکلوائی تھیں۔ اگر فنِ تحریر رائج نہ تھا تو یہ ناٹک کس طرح لکھا گیا۔

امثلۂ مذکورہ بالا سے صاف عیاں ہے کہ زمانۂ قدیم ہی میں فنِ تحریر رائج تھا۔

سی۔ راجگوپال اچاری

روشنی آئی!

(تامل کہانی)

ہری پورہ دُلھن کی طرح سجا ہُوا تھا۔

گاؤں کے اسکولوں کی سفیدی اُجالے کو شرما رہی تھی۔ کئی سالوں سے بے توجہی کا شکار کالی دیوی کے مندر کا جوبن آج دیکھنے کا تھا، کوئی رخنہ کسی دیوار سے مُنہ نہیں چڑا رہا تھا۔ چھت کو ایک نئے انداز سے آراستہ کیا گیا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے تالاب کی سطح پر آج گندگی کا کوئی نشان موجود نہ تھا — لوگ خوشی سے بے سُدھ ہوکر جھوم رہے تھے — سامنے پٹواری تیزی کے ساتھ دھوبی کی کٹیا کی جانب سے آرہا تھا۔ اس کے صاف ستھرے لباس اور سر پر سجی پگڑی سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کی ساری خوشیاں اسی کی دین ہیں — چاروں طرف عورتوں اور بچوں کے جمگھٹ لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی دوشیزائیں ایسی اِترا رہی تھیں جیسے آج کسی نے ان کی گود چاند تاروں سے بھر کر انھیں نہال کر دیا ہو۔

نئے سال کا پہلا دن ہری پورہ کے لوگوں کے لئے روشنی کی نوید لے کر آیا تھا۔ آج سے ان کا گاؤں بھی قومی توسیعی سروس کے تحت آگیا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے اس کی افتتاحی تقریبات منائی گئیں۔ یہاں کے ایم، ایل، اے جناب اساری جی کی ان تھک کوششوں کے طفیل ہری پورہ کے باسیوں کو یہ دن دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ضلع کے کلکٹر کے ہاتھوں افتتاح کی کارروائی عمل میں لائی گئی اور گاؤں والوں نے اظہارِ تشکر کے طور پر دیہاتی ترقیاتی کمیٹی کی قیادت کے لئے رکن اسمبلی اساری جی کو منتخب کر کے کام آگے بڑھانے کا جتن کیا۔

سب سے پہلے گاؤں میں بجلی کے تار اُجالے کے نقیب بن کر آئے۔ سڑک کا اندھیرا خلاؤں میں کھو گیا — لیکن ایک عجیب مصیبت تھی۔ بجلی کے کھمبے صرف چار مقامات پر نصب کئے جا سکتے تھے۔ اس مسئلے کا حل نکالنے کے لئے کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا اور اس میں ڈپٹی کلکٹر کی یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی کار۔ جان پایا جا رہا تھا کہ ایک کھمبا کالی دیوی کے مندر کے سامنے نصب کیا جائے، دوسرا تالاب پر اور تیسرا ہری جن بستی میں، اور چوتھا کھمبا اساری جی کے گھر کے سامنے۔

"میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے سامنے بجلی لگائی جائے۔" اساری کی آواز گونجی۔ "اس کے بجائے اگر کھمبا مدالیار اسٹریٹ پر لگایا جائے تو مناسب رہے گا۔"

"یہ ہے خدمت کا سچا جذبہ —" ڈپٹی کلکٹر داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر روشنی نے گاؤں کو جگمگا دیا۔

روشنی کی سُرخ کرنیں رات کی تاریکیوں کا جگر چیر کر اپنی نور پاشی سے آنکھوں کو خیرہ کرنے لگیں — راتیں، جو اُجاڑ اور سنسان بن کر رہ گئی تھیں اُجالے کی چمک پا کر نکھر گئیں۔ رات گئے تک بچوں کی آنکھ مچولی کا کھیل جاری رہتا، خوب دُھومیں مچائی جاتیں۔

ہری پورہ کے باسی فخر سے سینہ تان کر چلتے — اور اس طرح ہری پورہ پورے تعلقے کے لئے اپنی ضیا باری کی وجہ سے مثالی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

"ہماری باری کب آئے گی۔"

یہ سوال تعلقے کے ہر گاؤں کے مُنھ پر تھا۔ خصوصاً نشاط پورہ کے لوگ بہت زیادہ بے چین تھے۔ کیونکہ یہ گاؤں ہری پورہ سے بالکل لگا ہُوا تھا۔ نشاط پورہ کی پنچایت نے جب اپنی مانگ رکن اسمبلی اساری جی کے سامنے رکھی تو انھوں نے مبہم سا یقین دلایا جو لوگوں کو مطمئن نہ کر سکا۔

"ہری پورہ تمھارے سسر کا گاؤں ہے جو ہر جگہ سے پہلے تم نے وہاں بجلی

لگوادی۔" جھنجھلا کر لشا ط پورہ والوں نے طعنے دینا شروع کر دیئے۔

"یہ بات نہیں" اساری نے یقین دلانے کی کوشش کی۔" ہمارے گاؤں نے ضروری رقم فراہم کی تب کہیں جا کر یہ انعام اسے مل سکا۔ اگر آپ بھی مطلوبہ فنڈ جمع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کی فضاؤں میں بھی اُجالا نہ پھیل جائے۔"

"آپ کا چلن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے اساری جی۔" کمار گونڈر نے جس کی کچھ زمینیں ہری پورہ میں اساری کی زمین سے ملحقہ تھیں، طنزاً کہا۔

اساری اور کمار کی زمینیں ایک ہی تالاب سے سیراب کی جاتی تھیں۔ یہ تالاب تین سال میں صرف ایک بار پانی سے فیض یاب ہوتا تھا۔ اس لئے اساری کا کنواں ہی ان زمینوں کی سیرابی کا واحد ذریعہ تھا۔ بدقسمتی سے کمار کے پاس کوئی کنواں نہ تھا۔ چنانچہ جب تالاب خشک ہو جاتا تو اس کی فصلوں پر سوکھا پڑ جاتا اس کے برعکس اساری کا مزارع سامی ہمیشہ ان کھیتوں سے اپنے مالک کی جھولیاں بھر دیتا۔

ایک رات کنوئیں پر سے پانی کھینچنے کا سامان کسی نے چرا لیا۔ سامی نے اپنے مالک کو اس کی اطلاع دی:

"یہ یقیناً اس موچی کی حرکت ہے جو کمار کا مزارع ہے۔ ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔"

اساری کی سمجھ اندھیروں میں بھٹکنے لگی۔ اس نے سوچا۔ اگر سامی صحیح کہتا ہے تو مجھے پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیئے۔ مگر پھر خود ہی سوچا کہ پولیس میرے نقصان کی تلافی کیا کر سکے گی۔ لہٰذا کمار سے گفتگو کرنے کی ٹھان کر وہ اس کے گھر پہنچا۔ اور اس سے کہا سامی غریب آدمی ہے اور اُسے اس طرح نقصان پہنچانا کسی طرح بھی زیبا نہیں۔

اس پر کمار بھڑک اُٹھا: "کون کہتا ہے کہ سامان میرے چکیلی (موچی) نے چرایا ہے یہ سراسر بکواس ہے۔"

"اگر چکیلی مندر میں دیوی کی قسم کھائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔"

"منظور۔" کمار گونڈر نے کہا۔

ہری پور کا کالی کا مندر پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اور اس قسم کے تمام تنازعات وہاں دیوی کی قسم کھا کر طے کئے جاتے تھے۔

جس دن اساڑھ کے مہینے کا نیا چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا۔ تب چکیلی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے مندر میں آیا۔ دونوں گاؤں کے کسان جمع تھے۔ پجاری نے ملزم کے ہاتھ میں مقدس راکھ دے کر قسم کھانے کو کہا۔

"یہ چوری"۔

اس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ پلک جھپکتے ہی وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ مجمع نے چکیلی کا تعاقب کیا مگر وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔

" وہ کانڈی گیا ہوگا۔ کیونکہ پچھلے ماہ سے وہ اپنی بیوی سے یہی کہہ رہا تھا۔" کچھ دیہاتی بولے

"یہ اساری کی چال ہے ۔۔۔" کمار گونڈر بڑبڑایا۔

بہر حال بات کچھ بھی ہو۔ اساری اپنے گم شدہ سامان کو پھر نہ پا سکا ۔۔۔ رہی کمار گونڈر کی بات تو اس کا بھرم اب پوری طرح کھل گیا تھا۔

اگلے سال ہری پورہ میں مزید ترقیاتی کام ہوئے۔ مندر میں دو تین کھڑکیوں کا اضافہ کیا گیا اور بجلی کا ایک بڑا بلب کالی کے چرنوں میں بھی جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

اساری نے انسانیت کی خدمت کے لئے جو بیج بوئے تھے وہ پھول بن کر مہکنے لگے۔ اور اس کی لگاتار کوششوں اور لگن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی تجویز گاؤں کی بہبودی کے لئے رکھتا ڈپٹی کلکٹر کی منظوری اس کے لئے یقینی ہو جاتی۔ ہری پورہ والوں کے لئے اساری کا نام خوش حالی کی ضمانت بن گیا۔

اساری کی نانی اس کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ خدا کا کرنا ایک دن کیا ہوا کہ اچانک اُس پر دیوتاؤں کا اثر ہو گیا۔ اس نے اپنے بال بکھیر لئے۔ اور دیوانوں کی طرح اُچھل اُچھل کر گانے لگی:

"میرے بیٹے پرہیز کر ۔۔۔ پرہیز
تیرا فعل تقدس کا منھ چڑا رہا ہے
بجلی کی روشنی اچھوت ہے
تیل ہی میری روشنی ہے ۔۔۔ سچی روشنی،
باز رہ میرے بیٹے، باز رہ!"

"میری نشیت پہلے گاؤں کے لئے

مجھے کسی نئے عطائی کی ضرورت نہیں
تم نے دیوار میں جو سوراخ کیا ہے وہ مجھے مطلق پسند نہیں
باز رہ میرے بیٹے ۔ اس گناہ سے باز رہ ۔"

اساری کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی نانی پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ چیرٹے دیوتا نہ اترے ——— یہ اساری کے امتحان کا وقت تھا ۔ مگر وہ اس میں کامیاب رہا ۔ اس نے ترقیاتی کاموں سے ہاتھ نہ اٹھایا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جوں ہی کھڑکیوں کی تکمیل ہوئی اور بجلی نے نور پھیلایا ، مندر میں ایک بڑا تہوار منایا گیا ۔ مندر کی نئی چھب دیکھنے کی تھی ۔ چاروں طرف اجالے کی برکھا ہو رہی تھی اور سب ہی اس " نورانی رم جھم " سے مگن تھے ۔

دوسری صبح گاؤں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی ۔
" ہمارے لئے کتنی ان ہونی ہوئی ہے یہ ——— کاش ہم نے نانی جی کے کہے پر عمل کیا ہوتا ۔ "

ہر گاؤں والے کی زبان پر یہی الفاظ تھے ۔
پچھلی رات جب تہوار اپنی پوری شان سے خاتمے کو پہنچا تو کسی چور نے وہ تمام جواہرات چرا لئے جس سے کالی کی تزئین کی گئی تھی ۔ پولیس نے چوری کا پتہ چلانے کی پوری کوشش کی ۔ کئی گھروں کی تلاشیاں ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے یہ سب بے سود رہا ۔

دیہاتیوں نے خواہ مخواہ کی تاویلات سے آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا !
بجلی نے مندر میں ایک بڑی بھیڑ ضرور اکٹھی کر دی تھی ۔ لیکن سچے پرستاروں کے لئے اب وہاں کیا جگہ تھی ——— ورنہ کون تھا جو کالی کے مندر میں داخل ہو کر مقدس چڑھاوے کی چوری کر سکتا ؟ بھلا کوئی سچا بھگت دیوی کی بے حرمتی کا ہے کو کرنے لگا ؟

روشنی آئی تو اعتقاد جاتا رہا ۔ قرنہا قرن کی مندر کی عظمت کا اب کوئی دھندلا نقش بھی کسی دل پر نہ تھا ۔
بھلائی کے کچھ منصوبوں میں ایسا بھی ہوتا ہے !!

(کرو کشینز انگریزی سے ترجمہ   مترجم ۔ آفاق احمد)

نئے عشری سکّے

یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے جب نئے عشری سکّے چلیں گے تو اوسط درجے کے آدمی کا سب سے بڑا تردد یہ ہوگا کہ آنوں اور پائیوں کے تبادلے میں اسے کتنے نئے پیسے ملیں گے۔ لیکن یہ کوئی فکر و پریشانی کی بات نہیں کیونکہ نئے سکّے رائج ہونے کے بعد بھی نئے اور پرانے دونوں ہی سکّے کافی مدّت تک چلتے رہیں گے۔

نئے نظام کے تحت روپیہ کو نئے پیسوں کی ۱۰۰ اکائیوں میں منقسم کیا جائے گا جبکہ موجودہ نظام کے تحت روپیہ ۱۹۲ پائیوں یا ۶۴ پیسوں میں منقسم ہے۔ ذیل کے گوشوارے میں نئے سکّوں کے مقابلے میں موجودہ سکّوں کی اکائی ظاہر کی گئی ہے لیکن ان کا مساوی ہونا ضروری نہیں ہے۔

نیا پیسہ	موجودہ سکّہ
۱ نیا پیسہ	ایک پیسہ
۲ نئے پیسے	۲ پیسے
۵ نئے پیسے	ایک آنہ
۱۰ نئے پیسے	۲ آنے
۲۵ نئے پیسے	۴ آنے
۵۰ نئے پیسے	۸ آنے
۱۰۰ نئے پیسے (ایک روپیہ)	۱۶ آنے (ایک روپیہ)

مذکورہ گوشوارے سے ظاہر ہے کہ ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ نئے پیسے (ایک روپیہ) کے متوازی موجودہ سکّوں میں علی الترتیب چونی، اٹھنی اور ایک روپیہ ہے۔ لیکن پرانے سکّوں میں نئے سکّوں کے ایک نیا پیسہ، ۲، ۵ اور ۱۰ نئے پیسے کے متوازی کوئی سکّہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ نئے سکّے ایک پیسہ، ۲ پیسہ، ایک آنہ اور دوانی کے قائم مقام ہو جائیں گے۔

یکم اپریل ۱۹۵۷ء کو اس نظام کے تمام سکّے رائج نہیں کئے جائیں گے بلکہ ایک نیا پیسہ اور ۲، ۵ اور ۱۰ نئے پیسے جاری کئے جائیں گے اور ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ نئے پیسے یعنی نیا روپیہ بعد میں کسی تاریخ کو رائج کئے جائیں گے۔ جوں جوں نئے سکے زیادہ تعداد میں رائج ہوتے جائیں گے موجودہ سکّے بتدریج واپس لئے جائیں گے اور توقع ہے کہ واپسی کا یہ سلسلہ تین سال کی مدّت میں مکمّل ہو جائے گا لیکن عبوری دَور میں نئے اور پرانے سکوں کے تبادلے کی شرحوں کا جاننا ضروری ہے۔

حساب کی تیار جدول

مرکزی وزارتِ مالیات نے لوگوں کو تبادلے کی شرحیں سمجھانے کی غرض سے دو ریڈی ریکنر (حساب کی تیار جدولیں) مرتّب کئے ہیں جو رقموں کے لین دین کے اہم مقامات پر بکثرت دستیاب ہوں گے

ریڈی ریکنر نمبر۱ میں ایک پائی سے ایک روپے تک کی شرح تبادلہ دی گئی ہے جس کا خاص مقصد یکم اپریل ۱۹۵۷ء کو کتابوں کے باقیات کا تبادلہ ہے۔ ریڈی ریکنر نمبر۲ عام لوگوں کے استعمال کے لئے ہوگا۔ اس میں آنوں اور پیسے کی اصطلاحات میں تبادلے کی شرح دی گئی ہے جو صرف ۳، ۶ اور ۹ پائیوں میں ظاہر کی گئی ہے۔

تبادلے کی جدول صرف اُسی وقت استعمال کی جائے جب لین دین میں حقیقتاً سکّے استعمال کئے جائیں۔

ریڈی ریکنر نمبر۱

ریڈی ریکنر نمبر۱ بنیادی طور پر کتابوں کے باقیات کے تبادلے کے لئے ہے۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ بعض معاملات میں کچھ دشواریاں پیش آئیں لیکن موجودہ سکوں کی مختلف رقوم نئے پیسے کی اتنی ہی رقوم سے قابلِ تبادلہ ہوں گی۔

ابتدائی مرحلوں پر تھوڑے سے نقصان کا امکان ہے۔ لیکن نئے رائج سکّوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ نقصان بھی کم سے کم رہ جائے گا۔ علاوہ ازیں لین دین کے دوران میں نقدی پیش کرنے سے حساب ہموار ہوگا۔ یہ بہت مشکل ہے کہ اس ہمواری کے وقت کوئی شخص فائدہ اُٹھانے کی غرض سے پیسے ہی پیسے یا دوسرے کم قیمت کے سکّے پیش کرے لیکن بڑی رقوم کے پیش کرنے سے نقصان کا تناسب کم سے کم ہو جائے گا۔ بہرکیف عبوری دور کے بعد اس نوعیت کی کوئی دشواری باقی نہ رہے گی۔

آنے پائیوں کو نئے پیسوں میں بدلنے کا آسان طریقہ

یہ جدول فقط کسی واحد لین دین کے معاملے میں مقررہ قیمت کے موجودہ سکّوں کی حقیقی چکوتی رقم کے موقعے پر ہی استعمال کی جائے۔

(جب کسی بھی لین دین کے معاملے میں حقیقی چکوتی رقم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے موجودہ یا نئے سکّے کی قیمت کو کسی دوسرے سکّے میں بدلنا مطلوب ہو تو سو نئے پیسوں کو ایک روپے یا سولہ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ہی ماننا چاہیئے)

آنے / پائی	نئے پیسے
۱ پائی	۱ نیا پیسہ
۲ پائی	۱ نیا پیسہ
۳ پائی	۲ نئے پیسے
۴ پائی	۲ نئے پیسے
۵ پائی	۳ نئے پیسے
۶ پائی	۳ نئے پیسے
۷ پائی	۴ نئے پیسے
۸ پائی	۴ نئے پیسے
۹ پائی	۵ نئے پیسے
۱۰ پائی	۵ نئے پیسے
۱۱ پائی	۶ نئے پیسے
ــــ ایک آنہ	۶ نئے پیسے
۱ آنہ ۱ پائی	۷ نئے پیسے
۱ آنہ ۲ پائی	۷ نئے پیسے
۱ آنہ ۳ پائی	۸ نئے پیسے
۱ آنہ ۴ پائی	۸ نئے پیسے
۱ آنہ ۵ پائی	۹ نئے پیسے
۱ آنہ ۶ پائی	۹ نئے پیسے
۱ آنہ ۷ پائی	۱۰ نئے پیسے
۱ آنہ ۸ پائی	۱۰ نئے پیسے
۱ آنہ ۹ پائی	۱۱ نئے پیسے
۱ آنہ ۱۰ پائی	۱۱ نئے پیسے
۱ آنہ ۱۱ پائی	۱۲ نئے پیسے
ــــ دو آنے	۱۲ نئے پیسے
۲ آنے ۱ پائی	۱۳ نئے پیسے
۲ آنے ۲ پائی	۱۴ نئے پیسے
۲ آنے ۳ پائی	۱۴ نئے پیسے
۲ آنے ۴ پائی	۱۵ نئے پیسے
۲ آنے ۵ پائی	۱۵ نئے پیسے
۲ آنے ۶ پائی	۱۶ نئے پیسے
۲ آنے ۷ پائی	۱۶ نئے پیسے
۲ آنے ۸ پائی	۱۷ نئے پیسے
۲ آنے ۹ پائی	۱۷ نئے پیسے
۲ آنے ۱۰ پائی	۱۸ نئے پیسے
۲ آنے ۱۱ پائی	۱۸ نئے پیسے
ــــ تین آنے	۱۹ نئے پیسے
۳ آنے ۱ پائی	۱۹ نئے پیسے
۳ آنے ۲ پائی	۲۰ نئے پیسے
۳ آنے ۳ پائی	۲۰ نئے پیسے
۳ آنے ۴ پائی	۲۱ نئے پیسے
۳ آنے ۵ پائی	۲۱ نئے پیسے
۳ آنے ۶ پائی	۲۲ نئے پیسے
۳ آنے ۷ پائی	۲۲ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۳ آنے ۸ پائی	۲۲ نئے پیسے
۳ آنے ۹ پائی	۲۳ نئے پیسے
۳ آنے ۱۰ پائی	۲۴ نئے پیسے
۳ آنے ۱۱ پائی	۲۴ نئے پیسے
— چار آنے	۲۵ نئے پیسے
۴ آنے ۱ پائی	۲۵ نئے پیسے
۴ آنے ۲ پائی	۲۶ نئے پیسے
۴ آنے ۳ پائی	۲۷ نئے پیسے
۴ آنے ۴ پائی	۲۷ نئے پیسے
۴ آنے ۵ پائی	۲۸ نئے پیسے
۴ آنے ۶ پائی	۲۸ نئے پیسے
۴ آنے ۷ پائی	۲۹ نئے پیسے
۴ آنے ۸ پائی	۲۹ نئے پیسے
۴ آنے ۹ پائی	۳۰ نئے پیسے
۴ آنے ۱۰ پائی	۳۰ نئے پیسے
۴ آنے ۱۱ پائی	۳۱ نئے پیسے
— پانچ آنے	۳۱ نئے پیسے
۵ آنے ۱ پائی	۳۲ نئے پیسے
۵ آنے ۲ پائی	۳۲ نئے پیسے
۵ آنے ۳ پائی	۳۳ نئے پیسے
۵ آنے ۴ پائی	۳۳ نئے پیسے
۵ آنے ۵ پائی	۳۴ نئے پیسے
۵ آنے ۶ پائی	۳۴ نئے پیسے
۵ آنے ۷ پائی	۳۵ نئے پیسے
۵ آنے ۸ پائی	۳۵ نئے پیسے
۵ آنے ۹ پائی	۳۶ نئے پیسے
۵ آنے ۱۰ پائی	۳۶ نئے پیسے
۵ آنے ۱۱ پائی	۳۷ نئے پیسے
— چھ آنے	۳۷ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۶ آنے ۱ پائی	۳۸ نئے پیسے
۶ آنے ۲ پائی	۳۹ نئے پیسے
۶ آنے ۳ پائی	۳۹ نئے پیسے
۶ آنے ۴ پائی	۴۰ نئے پیسے
۶ آنے ۵ پائی	۴۰ نئے پیسے
۶ آنے ۶ پائی	۴۱ نئے پیسے
۶ آنے ۷ پائی	۴۱ نئے پیسے
۶ آنے ۸ پائی	۴۲ نئے پیسے
۶ آنے ۹ پائی	۴۲ نئے پیسے
۶ آنے ۱۰ پائی	۴۳ نئے پیسے
۶ آنے ۱۱ پائی	۴۳ نئے پیسے
— سات آنے	۴۴ نئے پیسے
۷ آنے ۱ پائی	۴۴ نئے پیسے
۷ آنے ۲ پائی	۴۵ نئے پیسے
۷ آنے ۳ پائی	۴۵ نئے پیسے
۷ آنے ۴ پائی	۴۶ نئے پیسے
۷ آنے ۵ پائی	۴۶ نئے پیسے
۷ آنے ۶ پائی	۴۷ نئے پیسے
۷ آنے ۷ پائی	۴۷ نئے پیسے
۷ آنے ۸ پائی	۴۸ نئے پیسے
۷ آنے ۹ پائی	۴۸ نئے پیسے
۷ آنے ۱۰ پائی	۴۹ نئے پیسے
۷ آنے ۱۱ پائی	۴۹ نئے پیسے
— آٹھ آنے	۵۰ نئے پیسے
۸ آنے ۱ پائی	۵۱ نئے پیسے
۸ آنے ۲ پائی	۵۱ نئے پیسے
۸ آنے ۳ پائی	۵۲ نئے پیسے
۸ آنے ۴ پائی	۵۲ نئے پیسے
۸ آنے ۵ پائی	۵۳ نئے پیسے

آنے پائی	نئے پیسے
۸ آنے ۶ پائی	۵۳ نئے پیسے
۸ آنے ۷ پائی	۵۴ نئے پیسے
۸ آنے ۸ پائی	۵۴ نئے پیسے
۸ آنے ۹ پائی	۵۵ نئے پیسے
۸ آنے ۱۰ پائی	۵۵ نئے پیسے
۸ آنے ۱۱ پائی	۵۶ نئے پیسے
— نو آنے	۵۶ نئے پیسے
۹ آنے ۱ پائی	۵۷ نئے پیسے
۹ آنے ۲ پائی	۵۷ نئے پیسے
۹ آنے ۳ پائی	۵۸ نئے پیسے
۹ آنے ۴ پائی	۵۸ نئے پیسے
۹ آنے ۵ پائی	۵۹ نئے پیسے
۹ آنے ۶ پائی	۵۹ نئے پیسے
۹ آنے ۷ پائی	۶۰ نئے پیسے
۹ آنے ۸ پائی	۶۰ نئے پیسے
۹ آنے ۹ پائی	۶۱ نئے پیسے
۹ آنے ۱۰ پائی	۶۱ نئے پیسے
۹ آنے ۱۱ پائی	۶۲ نئے پیسے
— دس آنے	۶۲ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱ پائی	۶۳ نئے پیسے
۱۰ آنے ۲ پائی	۶۴ نئے پیسے
۱۰ آنے ۳ پائی	۶۴ نئے پیسے
۱۰ آنے ۴ پائی	۶۵ نئے پیسے
۱۰ آنے ۵ پائی	۶۵ نئے پیسے
۱۰ آنے ۶ پائی	۶۶ نئے پیسے
۱۰ آنے ۷ پائی	۶۶ نئے پیسے
۱۰ آنے ۸ پائی	۶۷ نئے پیسے
۱۰ آنے ۹ پائی	۶۷ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱۰ پائی	۶۸ نئے پیسے
۱۰ آنے ۱۱ پائی	۶۸ نئے پیسے
— گیارہ آنے	۶۹ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱ پائی	۶۹ نئے پیسے
۱۱ آنے ۲ پائی	۷۰ نئے پیسے
۱۱ آنے ۳ پائی	۷۰ نئے پیسے
۱۱ آنے ۴ پائی	۷۱ نئے پیسے
۱۱ آنے ۵ پائی	۷۱ نئے پیسے
۱۱ آنے ۶ پائی	۷۲ نئے پیسے
۱۱ آنے ۷ پائی	۷۲ نئے پیسے
۱۱ آنے ۸ پائی	۷۳ نئے پیسے
۱۱ آنے ۹ پائی	۷۳ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱۰ پائی	۷۴ نئے پیسے
۱۱ آنے ۱۱ پائی	۷۴ نئے پیسے
— بارہ آنے	۷۵ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱ پائی	۷۶ نئے پیسے
۱۲ آنے ۲ پائی	۷۶ نئے پیسے
۱۲ آنے ۳ پائی	۷۷ نئے پیسے
۱۲ آنے ۴ پائی	۷۷ نئے پیسے
۱۲ آنے ۵ پائی	۷۸ نئے پیسے
۱۲ آنے ۶ پائی	۷۸ نئے پیسے
۱۲ آنے ۷ پائی	۷۹ نئے پیسے
۱۲ آنے ۸ پائی	۷۹ نئے پیسے
۱۲ آنے ۹ پائی	۸۰ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱۰ پائی	۸۰ نئے پیسے
۱۲ آنے ۱۱ پائی	۸۱ نئے پیسے
— تیرہ آنے	۸۱ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱ پائی	۸۱ نئے پیسے
۱۳ آنے ۲ پائی	۸۲ نئے پیسے
۱۳ آنے ۳ پائی	۸۳ نئے پیسے

۱۳ آنے ۴ پائی — ۸۳ نئے پیسے
۱۳ آنے ۵ پائی — ۸۴ نئے پیسے
۱۳ آنے ۶ پائی — ۸۴ نئے پیسے
۱۳ آنے ۷ پائی — ۸۵ نئے پیسے
۱۳ آنے ۸ پائی — ۸۵ نئے پیسے
۱۳ آنے ۹ پائی — ۸۶ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱۰ پائی — ۸۶ نئے پیسے
۱۳ آنے ۱۱ پائی — ۸۷ نئے پیسے
چودہ آنے — ۸۷ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱ پائی — ۸۸ نئے پیسے
۱۴ آنے ۲ پائی — ۹۸ نئے پیسے
۱۴ آنے ۳ پائی — ۸۹ نئے پیسے
۱۴ آنے ۴ پائی — ۹۰ نئے پیسے
۱۴ آنے ۵ پائی — ۹۰ نئے پیسے
۱۴ آنے ۶ پائی — ۹۱ نئے پیسے
۱۴ آنے ۷ پائی — ۹۱ نئے پیسے
۱۴ آنے ۸ پائی — ۹۲ نئے پیسے
۱۴ آنے ۹ پائی — ۹۲ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱۰ پائی — ۹۳ نئے پیسے
۱۴ آنے ۱۱ پائی — ۹۳ نئے پیسے
پندرہ آنے — ۹۴ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱ پائی — ۹۴ نئے پیسے
۱۵ آنے ۲ پائی — ۹۵ نئے پیسے
۱۵ آنے ۳ پائی — ۹۵ نئے پیسے
۱۵ آنے ۴ پائی — ۹۶ نئے پیسے
۱۵ آنے ۵ پائی — ۹۶ نئے پیسے
۱۵ آنے ۶ پائی — ۹۷ نئے پیسے
۱۵ آنے ۷ پائی — ۹۷ نئے پیسے
۱۵ آنے ۸ پائی — ۹۸ نئے پیسے
۱۵ آنے ۹ پائی — ۹۸ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱۰ پائی — ۹۹ نئے پیسے
۱۵ آنے ۱۱ پائی — ۹۹ نئے پیسے
ایک روپیہ — ۱۰۰ نئے پیسے

ریڈی ریکنر نمبر ۲

سادہ حاضر حساب کی جدول آنے پائیوں کو نئے پیسے میں بدلنے کے لئے

یہ جدول فقط کسی واحد لین دین کے معاملے میں مقررہ قیمت کے موجودہ سکوں کی حقیقی چکوتی رقم کے موقعے پر ہی استعمال کی جائے۔

کسی بھی لین دین کے معاملے میں حقیقی چکوتی رقم کے علاوہ کسی دوسرے موجودہ منصُ سکے کی قیمت کو کسی دوسرے سکے میں بدلنا مطلوب ہو تو ۱۰۰ نئے پیسوں کو ایک روپیہ یا سولہ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ماننا چاہیئے۔

آنے اور پائیوں کے ہم پلہ "نئے پیسے" کو معلوم کرنے کے لئے جدول کو استعمال کرنے کے متعلق ہدایات

اوّل اُفقی کالم کو دریافت کریں جو آنوں کی دی گئی تعداد کے مساوی ہے۔ پھر عمودی کالم کو دریافت کریں جو پائیوں کی دی گئی تعداد کے مساوی ہے۔ جہاں پر یہ دونو کالم باہم منطبق ہو جائیں وہی مقام یا نمبر نئے پیسوں کے مساوی ہے

آنے / پائیاں	صفر	۳	۶	۹
۰	۰۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	۰۰	۰۰	۰۰

سیّدہ فرحت

ننّھی چڑیا اور مُنّی بچّی

آجا آجا چڑیا آ جا — میٹھا سا اک گیت سُنا جا

پیار سے میں ہوں تجھے بُلاتی — پاس مرے تو کیوں نہیں آتی

تیری ادا یہ مجھے نہ بھائے — آئے اور پھر سے اُڑ جائے

میز کے اُوپر پھدک رہی ہے — کُرسی پر اب اُچک رہی ہے

آجا میری گود میں آ جا — لے یہ میٹھا بسکٹ کھا جا

میری تو بن جا ہم جولی — مل کر کھیلیں آنکھ مچولی

بھائی بہن بھی گھر پہ نہیں ہیں — وہ دونوں اسکول گئے ہیں

کب سے میں بیٹھی ہوں اکیلی — تُو بھی تو میرے ساتھ نہ کھیلی

رُوٹھ کے تجھ سے اب روؤں گی

روتے روتے میں سوؤں گی

حامد اللہ افسر

سنگیت

بہت دن کی بات ہے۔ ہمارے دیش میں ایک راجہ تھا جس کے دان پُن کا بڑا چرچا تھا۔ یہ راجا جنتا کو سکھ پہنچانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے دُور دُور تک مشہور تھا، راجہ کے دربار میں ہر فن کے بڑے بڑے ہوشیار اور قابل لوگ موجود تھے، انھیں میں راجہ کا درباری گویّا شنکر بھی تھا۔

یہ گویّا اتنا اچھا گاتا تھا کہ سارے دیش میں اس کی شہرت تھی، جب کبھی وہ گاتا تو سننے والے محو ہو جاتے اور انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے کوئی چیز انہیں آسمان کی طرف اُٹھائے لئے جا رہی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ راجہ راج کاج سے تھک کر آتے اور شنکر کو بلوا کر اس کا گانا سنتے، اس کی رسیلی اور دل لبھانے والی آواز راجہ کا دل خوش کر دیتی۔ ان کی تھکان دُور ہو جاتی اور ان کی طبیعت میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی۔

راجہ ہر ایک سے اپنے درباری گویّے کی تعریف کیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ کسی راجہ کے دربار میں اتنا اچھا گویّا نہیں ہے۔

ایک دن راجہ نے شنکر کا گانا سن کر اس سے کہا۔ "شنکر! تمہارے رسیلے راگ سن کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ شاید ہی سارے سنسار میں کوئی اتنا اچھا گاتا ہو جتنا اچھا تم گاتے ہو۔"

جب کبھی راجہ اس قسم کی باتیں کرتا تو شنکر خاموش اور اداس سا ہو جاتا۔ ایک دن راجہ نے اس سے پوچھا۔ "شنکر کیا بات ہے، تم اداس کیوں ہو گئے، کیا سوچنے لگے۔ کیا سنسار میں کوئی تم سے بھی اچھا گانے والا موجود ہے؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "مہاراج! میرا اُستاد مجھ سے بھی اچھا گاتا ہے۔"

راجہ۔ "تمہارا اُستاد کون ہے، کہاں ہے، اُسے بلاؤ، ہم اس کا گانا ضرور سنیں گے۔"

شنکر: مہاراج! میرا اُستاد ایک جوگی ہے، ایک سادھو ہے۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں۔ اس کا استھان یہاں سے بہت دُور ہے۔ وہ اپنا سارا وقت دھیان گیان میں صرف کرتا ہے، مہاراج! اس کی آواز ایسی مدھر اور ایسی سریلی ہے کہ سنسار بھر میں اس کا جواب نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیونکر آپ کو اس کا گانا سنواؤں۔

راجہ: شنکر! ہم تمہارے اُستاد کا گانا ضرور سُنیں گے، وہ یہاں نہیں آ سکتے تو ہم خود اُن کے استھان پر چل کر ان کا گانا سُنیں گے۔

شنکر: مگر مہاراج! وہ کسی کو اپنا گانا نہیں سناتے۔ کبھی کبھی اپنی موج میں گانے لگتے ہیں۔ اس وقت کوئی سُن لے تو سُن لے۔

راجہ: ہم اُن کی کٹیا پر ضرور جائیں گے کیا عجب ہے کہ اس وقت اپنی موج میں ہوں اور ہمیں ان کا گانا سننے کا موقع مل جائے۔

آخر ایک دن راجہ شنکر کے ساتھ سادھو جی کی کٹیا کی طرف روانہ ہوئے۔ دو دن اور دو رات یہ قافلہ چلتا رہا۔ تیسرے دن صبح کو درختوں کے جھنڈ میں راجہ کو ایک چھوٹی سی جھونپڑی نظر آئی۔ یہی سادھو جی کی کٹیا تھی۔ اُس وقت سادھو جی اپنی کٹیا کے سامنے آسن جمائے آنکھیں بند کئے تپسیا میں مصروف تھے اور پورب سے اُٹھتے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے چہرے کی چمک کو اور بڑھا رہی تھیں۔

شنکر نے راجہ کو اشارہ کیا کہ اب آپ آگے نہ بڑھئے اور جہاں ہیں وہیں خاموشی سے کھڑے رہئیے۔ اس کے بعد وہ کٹیا کے پیچھے والی جھاڑیوں میں بیٹھ کر گانے لگا اور جان بوجھ کر غلط سُر نکالے، جیسے ہی سادھو جی کے کان میں شنکر کی آواز پہنچی — — وہ ایک دم بولے۔ "بے سُرا ہو گیا، بھیّا، بے سرا۔"

بس اسی کا شنکر کو انتظار تھا۔ یہی سوچ کر وہ بے سُرا ہوا تھا کہ سادھو جی مجھے ضرور ٹوکیں گے، اس نے سادھو جی کی بات سُن کر جواب دیا۔

"مہاراج! آپ خود ایک دفعہ گا دیجیے تاکہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جائے۔"

اب کیا تھا، سادھو جی نے گانا شروع کر دیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رسیلی اور مدھر آواز سے ساری فضا جھومنے لگی' جیسے ان کے گلے سے ایک نور کی ندی بہہ رہی ہو۔ جنگل کی خاموشی میں بہشت کا سماں بندھ گیا۔

راجہ سادھو جی کے سنگیت میں ایسا کھویا کہ اسے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ میں کہاں ہوں اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

جب شنکر آیا تو راجہ نے اس سے کہا۔ "سادھو جی کے سنگیت کے متعلق جو کچھ تم نے مجھ سے کہا تھا وہ تو اس سے زیادہ مدھر نکلا۔ آخر تمہارے گانے میں یہ کیفیت کیوں نہیں ہے، تم ان کے ہی تو چیلے ہو، پھر تم ان کی

طرح کیوں نہیں گاتے۔"

شنکر نے جواب دیا۔ "مہاراج! میرے گانے میں وہ کیفیت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے، میں تو آپ کو۔ ایک دنیا کے راجہ کو۔ خوش کرنے کے لئے گاتا ہوں اور سادھو جی بھگوان کو خوش کرنے کے لئے گاتے ہیں۔"

سید شاہد حسین

شریری غزل

بجی گھنٹی جو چھٹی کی تو ہنستے گاتے ہم نکلے
کسی موٹے سے مولا بخش کے سہہ کر ستم نکلے

بتاؤ ہاتھ پر پڑنے سے اس کے حال کیا ہوگا
نظر آجاتے ہی جس بید کے ہم سب کا دم نکلے

کبھی جب بھول کر بستے کو اپنے کھول بیٹھے ہم
پھٹی نکلیں کتابیں اور سب ٹوٹے قلم نکلے

نتیجہ گاہ سے نکلے تو اِس حالت میں نکلے ہم
کہ لے کر اپنے دل میں فیل ہو جانے کا غم نکلے

بہانہ ٹانگ کی تکلیف کا ایسا کیا ، ہم نے
کہ لنگڑاتے چلے اور گر پڑے جب دو قدم نکلے

نکالا ممتحن نے نقل کرنے پر تو بولے ، ہم
"بہت بے آبرو ہو کر ترے کمرے سے ہم نکلے"

قومی آواز - ۴-جون ۱۹۵۶ء

وِدیاوتی

لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک

"سوراج سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ملک
میں ایسا رہوں جیسا کہ ایک انگریز انگلستان میں"

ہندوستان کے مغربی گھاٹ پر واقع رتنا گیری میں ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ء کو گنگا دھر تلک جی نے جنم لیا۔ ان کا اصلی نام کیشو تھا۔ برہمنوں میں جنم لینے کی وجہ سے اپنے طبقے میں کافی عزت اور تعظیم سے دیکھے جاتے تھے۔ جوانی کی حدوں کے پار کرنے کے بعد وہ ایک آزادی پسند اور بلند خیال نوجوان ثابت ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری لینے کے بعد انھوں نے عہد کیا کہ وہ سرکاری نوکری نہیں کریں گے اور اپنی زندگی کا بیشتر وقت آزادی کی لڑائی کے لئے دیں گے۔ تلک جی نے اپنے دوستوں کی مدد سے پریس قائم کر کے دو اخبار نکالے جن میں ایک انگریزی کا "مراٹھا" تھا اور دوسرا مراٹھی زبان میں "کیسری" تھا۔ ان اخبارات کی اشاعت اور ان کے جاری ہونے سے ان کے مقاصد کو پھیلانے اور لوگوں کو اپنے ساتھ لانے میں بہت مدد دی۔ ان دونوں تلک کے پُر مغز مضامین کا کیسری میں بہت چرچا تھا۔ وہ سرکار کی خامیوں کو اپنے قلم سے منظرِ عام پر لاتے رہے۔

کچھ مدت بعد وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انھیں کانگریس دکن اسٹینڈنگ کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا۔ دوبارہ بمبئی ودھان سبھا کے ممبر ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں صوبہ بمبئی اور بھارت کے دوسرے حصوں میں ایک مہلک قحط پڑا۔ اس قحط میں انھوں نے عوامی بھلائی کے بہت سے اہم کام کئے۔ بازاروں میں اناج کی دوکانیں کھلوائیں اور ضرورت مندوں کو اناج حاصل کرنے میں مدد دی۔

"کیسری" میں تلک جی کے مضامین پر بغاوت کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کو ضمانت پر بھی رہا نہ کیا گیا۔ لیکن بہت لمبی مدت کے بعد دو مرتبہ ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بعد ان کو ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی۔ اس مقدمے کے فیصلے کے لئے ایک جیوری مقرر کی گئی جس میں چھ انگریز اور تین ہندوستانی جج شامل تھے اور فیصلے میں تلک جی کو اٹھارہ ماہ قید با مشقت کا حکم سنا دیا گیا۔

جیل میں انھوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ بالآخر وہ کانگریس کے نیتا بن گئے جو مکمل آزادی کی متمنی تھی۔ اس پارٹی کو تشدد والی پارٹی کہا جانے لگا اور تلک جی پر الزام لگایا جانے لگا کہ وہ ملک میں بغاوت

اور بدنظمی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس دور میں ہندوستان میں فسادات شروع ہو گئے۔ انھوں نے "کیسری" میں لکھا کہ "بھارت کو سوراجیہ دے کر ہی لوگوں کو قتل و خون اور غارت گری سے روکا جا سکتا ہے۔" ان کے مضامین کو اس زمانے میں زبردست شر انگیز اور قابلِ اعتراض گردانا گیا اور ایک بار پھر انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں

زوردار بحث کی۔ پانچ روز تک مقدمہ چلتا رہا اور آخرکار انھیں چھ سال کے لئے جلاوطن کر کے مانڈلے (برما) جیل میں بھیج دیا گیا۔ ان کے جیل جاتے ہی ملک بھر میں بے چینی پھیل گئی اور بمبئی میں عام ہڑتال ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں جب جلاوطنی کی مدت ختم ہوئی تو آپ ہندوستان آئے اور اپنے اخبارات میں دوبارہ مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۱۵ء کے بعد انھوں نے جو کام کئے ان سے ان کی اپنے ملک سے بے پناہ محبت اور ایثار کا پتہ چلتا ہے۔ تلک جی نے ۱۹۱۶ء میں کانگریس کانفرنس میں حصّہ لیا اور اپنی تقریر میں کہا: "سوراجیہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دیش میں ایسا ہوں جیسا کہ ایک انگریز انگلینڈ میں۔"

مہاراشٹر کی جنتا نے ان کی ۶۱ ویں سالگرہ پر ایک لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی اور انہیں مہاراشٹر کا بے تاج بادشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ آپ ۱۹۱۹ء میں جب انگلینڈ کے دورے سے واپس آئے تو صحت اُن کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ پھر بھی انھوں نے کام کو مقدم سمجھا۔ اور بالآخر دیش کا ان تھک محنتی اور آزادی کا متوالا ۳۱۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو اپنے ملک کی آزادی کا ارمان لے کر چل بسا اور ملک کے ہزاروں لوگوں کی جے کار کے نعروں کے درمیان ان کا انتم سنسکار سمندر تٹ پر کیا گیا۔

ایک مُفت خورے نے اپنے کسی واقف کو مٹھائی کھاتے دیکھ کر پوچھا "کیا کھا رہے ہو؟"۔ اُس نے آزردگی سے جواب دیا: "زہر۔"
مُفت خورے نے فوراً اپنا ہاتھ طشت میں ڈال دیا اور یہ کہہ کر کھانے لگ گیا کہ "تمھارے بعد ہمیں بھی جینا حرام ہے۔"

یوسف شاہ کرنولی
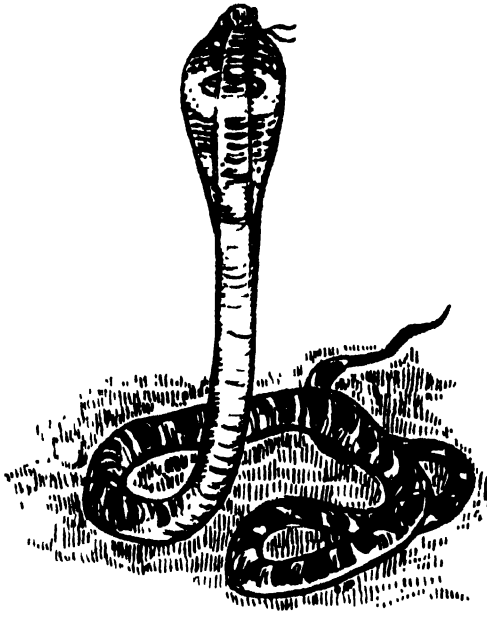
شاہدہ .... سید کی بڑی بہن

سید .... شاہدہ کا چھوٹا بھائی

بلقیس جہاں ..... شوکت علی کی بیوی

شوکت علی ...... سید اور شاہدہ کے ابا جان

محمود صاحب .... شاہدہ اور سید کے چچا جان

حیدر خاں ...... گھر کا ملازم۔

(پردہ اٹھتا ہے)

ایک کمرے میں چند کرسیاں اور دو صوفے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے جس میں محمود صاحب میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ اتنے میں شاہدہ اور سید اندر داخل ہوتے ہیں۔

شاہدہ۔ (سید سے) چچا جان تو آرام فرما رہے ہیں۔

سید۔ ٹھہرو تو میں قریب سے دیکھ آؤں۔

شاہدہ۔ اچھا دیکھو تو سہی

سید۔ (پلنگ کے پاس جاکر آہستہ سے) سچ مچ چچا جان تو مزے کی نیند سو رہے ہیں۔

شاہدہ۔ (سید سے) سید میرے قریب آؤ۔

سید۔ کیوں؟

شاہدہ۔ ارے آؤ بھی...

سید شاہدہ کے قریب جاتا ہے۔ شاہدہ اس کے کان میں کچھ کہتی ہے اور دونوں مسکراتے ہوئے کمرے کے باہر چلے جاتے ہیں۔

(تھوڑا وقفہ)

شاہدہ اور سید دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کمرے میں دونوں چیختے ہیں اور چیخوں کی آواز سے محمود صاحب کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ محمود صاحب گھبرا کر اٹھتے ہیں اور چاروں طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سید۔ چچا جان جلد اٹھیے وہ دیکھئے سانپ اس دیوار کے بازو میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے (سید ہاتھ سے سانپ کی طرف اشارہ کرتا ہے)

محمود صاحب گھبرا کر دروازے کے پاس چلے جاتے ہیں اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔

سید۔ چچا صاحب! سانپ کے مارنے کے لئے کچھ تو کیجیئے نا۔

شاہدہ۔ ہاں چچا جان! آپ تو بہت دلیر ہیں۔ کچھ تو کیجیئے نا۔

محمود صاحب ۔ نہیں ... میں نہیں ماروں گا (گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہیں)
شاہدہ ۔ کیوں چچا جان آپ نے تو کئی شیر ہاتھی پچھاڑے ہیں ۔ اور
اب ایک معمولی سانپ مارنے میں پس و پیش کر رہے ہیں ۔
محمود صاحب ۔۔ ارے کیوں بک بک کر رہے ہو ۔ جاؤ جلدی سے حیدر خاں
کو بلا لاؤ وہ مار دے گا ۔

(سعید اور شاہدہ دونوں حیدر خاں کو بلانے چلے جاتے ہیں ۔ اور
محمود صاحب ڈر کے مارے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں ۔۔)

(تھوڑا وقفہ)

شوکت علی، بلقیس جہاں، شاہدہ اور سعید تمام کمرے کے اندر داخل ہوتے
ہیں اور اُن کے پیچھے محمود صاحب چوروں کی طرح دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں ۔
شوکت علی ۔ (سانپ کو دیکھ کر) ارے یہ تو کالا ناگ ہے ۔
محمود صاحب ۔ (ہکلاتے ہوئے) ۔ ہا ہا ہاں بھائی جان یہ کالا ناگ ہے ۔
شاہدہ ۔ ابّا جان ! چچا جان تو سانپ کو مارنے سے ڈرتے ہیں ۔
محمود صاحب ۔ (سینہ تان کر) واہ بھلا ہم ڈرنے والے ہیں ۔ دیکھو ابھی
مارے دیتے ہیں ۔
محمود صاحب ہاتھ میں ایک موٹی لاٹھی لے کر سانپ کے قریب جاتے ہیں ۔
جوں ہی قریب پہنچتے ہیں ۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور لاٹھی چھوٹ جاتی ہے ۔
لاٹھی گرنے کی آواز سے سانپ سرسر رینگنے لگتا ہے اور ایک کونے میں جا کر رُک
جاتا ہے ۔ محمود صاحب کی "بہادری" پر سب ہنس دیتے ہیں ۔
شوکت علی (ہنسی کو روکتے ہوئے) کیوں محمود صاحب تم تو مارنے گئے تھے نا
(محمود صاحب جواب دینے کی بجائے خاموش کھڑے رہتے ہیں)
شاہدہ ۔ ابا جان ! میں سانپ کو مارے دیتی ہوں ۔
بلقیس جہاں ہائے اللہ ! یہ تم کیا کرتی ہو ۔ میری بچی ! یہ کالا ناگ ہے ۔ اگر مار
نشانے پر نہ پڑے تو وہ تمہارا جانی دشمن بن جائے گا ۔
سعید ۔ (لاٹھی اٹھاتے ہوئے) آپ تمام ہٹ جائیے میں مارے دیتا ہوں ۔
شوکت علی (سعید کے ہاتھ سے لاٹھی چھینتے ہوئے) اچھا تو آج کل نابالغ
بھی سانپ کو مارنے لگے ۔
سعید ۔ دیکھئے مارتا ہوں یا نہیں

(حیدر خاں کمرے میں داخل ہوتا ہے)

شوکت علی ۔ ارے تو کہاں مر گیا تھا کم بخت دیکھ تو سہی کمرے میں سانپ
آ گیا ہے ۔
حیدر خاں سانپ کے قریب جاتا ہے اور لاٹھی لے کر نشانہ جماتے ہوئے
مارتا ہے ۔ لاٹھی کی آواز ہوتے ہی سانپ آگے نکل جاتا ہے اور وار
خالی جاتا ہے ۔ حیدر خاں دوبارہ لاٹھی اُٹھا کر مارتا ہے مگر وہ وار بھی
چُوک جاتا ہے)
شوکت علی اور بلقیس جہاں اور بھی پریشان ہیں اور محمود صاحب تو بس ہیں
دروازے کے پاس ٹھہرے ہوئے کانپ رہے ہیں ۔
شوکت علی (حیدر خاں سے) یہ تم سے نہیں ہو گا ۔ باہر جا کے کسی کو بلا لاؤ ۔

(حیدر خاں باہر چلے جاتا ہے)

(تھوڑا وقفہ)

حیدر خاں کمرے میں داخل ہوتا ہے
حیدر خاں ۔ سرکار باہر تو کوئی نہیں ہے ۔
(یہ سن کر سعید سانپ کی طرف بڑھتا ہے اور سانپ کو اُٹھا لیتا ہے
اور تمام چیختے ہیں)
شاہدہ ۔ ارے آپ لوگ کیوں چیخ رہے ہیں یہ ڈرامہ تو چچا جان کی بہادری
کا اندازہ لگانے کے لئے کھیلا گیا تھا ۔ یہ تو مصنوعی سانپ ہے ۔
یہ دیکھئے اس کا برقی پلگ ۔۔ جو اس مصنوعی سانپ سے لگا
ہوا ہے ۔ (سوئچ بورڈ کے پاس برقی پلگ دکھلاتے ہوئے)
تمام ہنس دیتے ہیں اور محمود صاحب شرمندگی سے پانی پانی ہوئے جا رہے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

یہ کتابیں پڑھیئے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقّی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقّی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان
سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۱۰۲، صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم موضوعات بیان کر دئے گئے ہیں
قیمت ۴ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارنمایاں میں حصّہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیر تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے ہاں کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو کی علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خدوخال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس ملک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی	قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer
United Press Government of India, Old Secretariat Delhi

Regd No D -509